گیان پیٹھ انعام یافتہ

آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

آگ کا دریا

(ناول)

राजकीय उर्दू पुस्तकालय
گورنمنٹ
اردو لائبریری
پٹنہ
۱۹۳۸ء
पटना-४

اس لیے جو اکیلا ہوتا ہے اسے ڈر لگتا ہے۔ پھر اس نے سوچا میرے سوا کوئی موجود نہیں تو پھر مجھے کاہے کا ڈر ہے ؛ لہٰذا اس نے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیا مگر اسے مسرت حاصل نہ تھی۔

کیوں کہ تنہائی میں اداسی ہوتی ہے۔

اور اداسی سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنی روح کی تنہائی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ گوتم نے اپنے آپ سے کہا۔

مندر بہت پرانا تھا۔ آس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پجاری بھی نظر نہ آیا جس سے وہ پوچھتا کہ شراوستی جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے۔ یہاں سے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے غنیم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور بیہڑ اور ان گنت ندی نالے۔ اور ان سب کو عبور کر کے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا۔ مندر کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاؤں کی سمت بڑھا۔ سرجو کے پار اودھیا کی روشنیاں جگنوؤں کی ایسی جھلملا رہی تھیں۔ بارش کی دھند میں سارا منظر نیلا اور اودا سا دکھلائی دیتا تھا جس میں نارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں۔ گوتم نے آبادی میں پہنچ کر دو تین دروازوں پر دستک دی۔ رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال درکار تھی۔ ایک نیچے پتے پکے مکان کے دوار پر روشنی جل رہی تھی ۔۔۔ ادھیڑ عمر کا گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شاکیہ منی کا کوئی بھکشو سمجھا۔ پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا۔ اور اس کے اجالے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے۔

”آج کل یہاں شاکیہ منی کے بھکشوؤں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تم ان ہی میں سے ہو۔“ اس نے دسان سے کہا۔ ”جب سے یہ نئی ہوا چلی ہے لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی گھر بار چھوڑ کر جنگل بسا رہی ہیں۔“

”مجھے تھوڑی سی دال دے دو۔“

گرہست نے چراغ برآمدے کی منڈیر پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی۔ اس کے بعد پھر سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ” رکمنی۔ ایک برہمن برہمچاری ہمارے دوار پر آئے ہیں۔“

پھر وہ گوتم سے مخاطب ہوا: ”وہ سامنے نگر میں ایک بٹیا ہیں۔ رانی ریتو کا کی ایسی روپ وان۔ کل میری بی بی جب ہاٹ کے لیے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے اس نے سنا کہ وہ بٹیا بھی کسی وہار میں جانے والی ہیں ۔۔۔ یہ اندھیر دیکھو۔“ اتنے میں اس کی بی بی آٹا دال لے آئی جو گوتم نے اپنی چادر پھیلا کر اس سے لے لیا اور اسے دعا دی۔ گرہنی نے جھک کر اسے پرنام کیا اور اندر چلی گئی۔

اس کا میاں خوش دلی سے ہنستا رہا۔ "اچھی ہوا چلی ہے۔ میں تو کہتا ہوں ماں باپ اب اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر سے بھی نشچنت ہو گئے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

اناج کی پوٹلی باندھنے کے بعد گوتم ذرا کی ذرا برآمدے کے کھمبے سے ٹکا۔ یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ گوتم کا جی چاہا کہ کچھ دیر رک کر اس سے باتیں کرے۔ مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عیش و آسائش کی طرف راغب ہو رہا ہے چنانچہ اس نے فوراً اس خیال کو دل سے نکال پھینکا گو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ بودھ طالب علموں کا گروہ ادھر آیا ہوا ہے۔ اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گزر جائے گی۔ اسے بودھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحثنے مباحثہ کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔

"وہ لوگ کدھر گئے ہیں؟" اس نے گرہست سے پوچھا۔ "یہ تو مجھے پتا نہیں۔ باہمن تم اندر کیوں نہیں آجاتے۔ آؤ بیٹھو۔ تمہاری سیوا تو میرا دھرم ہے۔"

"نہیں اب میں چل ہی دوں۔" گوتم نے جواب دیا۔ وہ اپنی اس عزت و تکریم کا عادی تھا۔ چلتے پھرتے ہر جگہ اس کا ادب کیا جاتا۔ سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو راہ گیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطریں کرتے۔ غریب کسان اسے آنکھوں پر بٹھلاتے۔ محض اس لیے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا محافظ۔

گرہست نے چراغ منڈیر پر سے اٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گوتم چند لمحوں تک اندھیرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اندر بچے کھیل رہے تھے۔ گرہست کی بی بی، سانولی دبلی سی لڑکی جس نے اسے آٹا لا کر دیا تھا، چولھے کے آگے بیٹھی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر پہاڑی مینا کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ کس قدر پرسکون منظر تھا۔ اس سے بھی اسے ڈر لگا۔ گرہیہ اگنی کے مدھم اجالے میں جگمگاتی ہوئی لڑکی، جو اس معمولی صاف ستھرے پکے مکان کی مالکن تھی، برآمدے پر جھکے ہوئے کیلے کے ٹھنڈے پتے، پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی مینا۔ گرہیہ اگنی یونہی جلتی رہتی ہے۔ اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا کے انگاروں کی آگ سے ایک اور گھر کے چولھے کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہی آگ دلہن پرسھ گھر سے لے کر نکلتا ہے۔ یہ سارے دور ہر انسان پر گزرتے ہیں۔ اس پر بھی گزریں گے۔ مناظر کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ وہ کبھی نہ سمجھ پایا۔ شراوستی میں اس کا سہ منزلہ مکان تھا جس کے برآمدے کے چوبی کھمبوں پر رنگین نقش و نگار بنے تھے۔ اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اونچا تھا۔ اس کا باپ بہت دولت مند آدمی تھا اور اس کی بہن کا بیاہ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے ہوا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال

آگ کا دریا

GOVT. URDU LIBRARY
ACC. N 32119
PATNA

قرۃ العین حیدر

پروفیسر اسلم آزاد، رکن بہار قانون ساز کونسل کے
ترقیاتی فنڈ سے طلبہ کی فلاح کے لیے فراہم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

AAG KA DARYA

by

Qurratul-Ain-Hyder

Year of Edition 2009
ISBN -81-85360-65-0
Price Rs. 600/- (Library Edition)

نام کتاب	:	آگ کا دریا
مصنفہ	:	قرۃ العین حیدر
سنِ اشاعت	:	۲۰۰۹ء
قیمت	:	۶۰۰ روپے (لائبریری ایڈیشن)
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail : info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

زہرا حیدر کے نام

Govt. Urdu Library
32119

عرضِ مصنّف

اس ناول کے متعلق افسانہ طرازی اور افواہوں کا سلسلہ اسقدر مستحکم ہو چکا ہے کہ اسکی تردید اب میرے بس کی بات ہی نہیں رہی حال ہی میں قدرت اللہ شہاب مرحوم کا شہاب نامہ شائع ہوا جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں ــــ "مارشل لا لگتے ہی ایک روز صبح سویرے قرۃ العین حیدر میرے ہاں آئی۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرہ اداس۔ آنکھیں پریشان۔ آتے ہی بولی اب کیا ہوگا... تو گویا اب بھونکنے پر بھی پابندی عاید ہے۔ عینی نے بڑے کرب سے پوچھا... آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آنسو چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کسی قدر لاپرواہی سے کہا۔ ارے بھئی روز روز بھونکنا کون چاہتا ہے لیکن بھونکنے کی آزادی بھی تو عجیب نعمت ہے..... میرا اندازہ ہے کہ... سنسر شپ کے تخیل ہی سے اسکے ذہن کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔ کچھ عجب نہیں اسی جھٹکے کے ردِ عمل نے اسکے قلم کی باگ آگ کا دریا کی طرف موڑ دی ہو[1]ــــ" بخوف طوالت پورا اقتباس نہیں دیا۔ شہاب صاحب بیحد نیک اور شریف انسان تھے۔ غلط بیانی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن انکے حافظے نے یقیناً انکو دھوکا دیا کیونکہ یہ ساری ڈرامائی منظر نگاری افسانہ ہے پہلی بات یہ کہ میں بال بکھرا کر آنکھ میں آنسو بھر کر سرد آہیں نہیں کھینچتی۔ "بھونکنا" وغیرہ میرا طرزِ گفتگو ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ آگ کا دریا میں نے ۵۶ء میں شروع کیا ۵۸ء میں ختم ہوا۔ مارشل لا ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں نافذ ہوا۔ اسوقت ناول کا مسودہ لاہور میں تھا اور دسمبر ۵۹ء میں مکتبہ جدید نے اسے شائع کیا۔ پہلے اڈیشن کے آخری صفحے پر تصنیف کے سنہ موجود تھے۔ لہٰذا "سنسر شپ کے ذہنی جھٹکے" نے میرا قلم آگ کا دریا کی طرف نہیں موڑا۔

آگے چل کر شہاب صاحب مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ چند ہفتوں بعد رائٹرز گلڈ کے قیام کے سلسلے میں مشورہ کرنے قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابن الحسن ابن سعید اور عباس احمد عباسی انکے دفتر میں گئے۔ یہاں بھی شہاب صاحب بھول گئے۔ کیونکہ دراصل مذکورہ بالا حضرات نے میرے دفتر میں آکر مجھ سے اس مجوزہ انجمن میں شرکت کے لیے کہا تھا (اس واقعے کا تذکرہ کارِ جہاں دراز ہے جلد دوم میں کر چکی ہوں جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔)

دسمبر ۵۹ء میں اس ناول کی اشاعت کے چند روز بعد ن۔م۔ راشد نے اس پر ریڈیو تبصرہ کیا (مطبوعہ آہنگ کراچی) چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں ــــ "اس صحبت میں صرف ایک نئی کتاب سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ وہ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہے جسے شائع ہوئے ابھی دس پندرہ دن ہی ہوئے ہیں۔ ایک ہی ناول پر بحث کرنے کا جواز صرف یہ ہے کہ یہ ناول یقیناً اردو ناول نگاری میں بیحد اہمیت حاصل کر کے رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے "وقت" کے ساتھ جو تجربہ کیا ہے وہ تکنیک کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے....

"اس ناول میں طلعت نام کی لڑکی گویا وہ خود ہیں اگرچہ طلعت اور کرداروں کے برعکس کہیں بھی یوں نہیں ابھرتی کہ آدمی اسے ناول کا ایک ضروری کردار کہنے پر مجبور ہو جائے... جہاں تک اس ناول کا تعلق ہے یہ اپنی تمام پہنائی کے باوجود ہندوستان کی آبادی کے ایک طبقے کی داستان ہے۔ یہ یو۔پی کے مسلمان کا وہ المیہ ہے جس میں ہندوستان کی تقسیم نے اسے مبتلا کر دیا تھا... اگرچہ ہندوستانی مسلمان کی اس کشمکش کا تجزیہ قرۃ العین حیدر نے بڑی چابکدستی سے کیا ہے اور تکنیک کے اعتبار سے اسکی بڑی اہمیت ہے لیکن اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کی اشاعت

---

[1] شہاب نامہ۔ صہ ۴۳۱ ۔ سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور ۱۹۸۶ء۔

بڑی حد تک بوقت کی راگنی ہے۔"

دوسرا طویل مضمون ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا تھا جو ساقی (اپریل ۱۹۶۰ء) میں چھپا۔ "... اب میرا خواب بھی ٹوٹ گیا۔ اور انکے موضوع پر انکی طرح ہی سوچ رہا ہوں۔ صاحبزادی کیا وسعت نظری ہے۔ کیا بالغ نظری ہے... درجنیاں زلف سے آگے بڑھ جاتی ہیں..." وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ پورا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ انہی مرحوم نے اسی ماہ جنگ میں سراج رضوی کا "آگ کا دریا" کے خلاف مضمون چھپنے کے بعد سے اپنے مضامین میں صاحبزادی کی خوب خوب تنقیص کی اور آگ کا دریا کے جواب میں ایک ناول بھی تصنیف کیا۔ جس کا نام سنگم تھا۔

"کارِ جہاں دراز ہے" میں تفصیل لکھ چکی ہوں۔ سراج رضوی کوئی صاحب تھے جنکے متعلق اب سنا ہے (نجانے اسمیں کتنی صداقت ہے) کہ کسی نجی معاملہ کے سلسلے میں ان بریگیڈیر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے جو مارشل لاء کے تحت ایک نوع کے ادبی محتسب مقرر کیے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۶۰ء میں سراج رضوی صاحب کا ایک طویل اور نہایت بیہودہ مضمون اس ناول کے خلاف روزنامہ جنگ کراچی میں شائع ہوا جس میں ایک انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ مصنفہ مشہور بھارتی کمیونسٹ ڈاکٹر رشید جہاں کی سگی بھانجی ہیں!) اسی مضمون کا ترجمہ کراچی کے ایک انگریزی روزنامے میں اسی روز شائع ہوا۔

ہماری ایک "تہذیبی خصوصیت" یہ بھی ہے کہ کسی خاتون کی مخالفت منظور ہو تو سب سے پہلے اسکے متعلق افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ مولانا رازق الخیری مرحوم اڈیٹر عصمت نے تحریر فرمایا "... انہوں نے آگ کا دریا ناول لکھا تو جہاں ایک حلقے میں دھوم مچ گئی وہاں حاسد ادیب انگاروں پر لوٹنے اور اول فول بکنے لگے۔ یوں بھی اس بچی سے نہایت لغو باتیں منسوب کی جا رہی تھیں۔ تل کا پہاڑ، پر کا کوا اور میل کا بیل بنانے کے سلطان بادشاہ ہیں۔ لیکن جہاں تل ہو نہ پر نہ میل وہاں بھی وہ نہیں چوکتے —"

(ماہنامہ عصمت کراچی۔ ص ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

جمیل الدین عالی نے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سراج رضوی صاحب کو نوٹس بھجوایا، مئی ۱۹۶۰ کو انکا غیر مشروط معافی نامہ فوراً جنگ میں چھپ گیا اسکے بعد وہ منظر سے غائب ہو گئے۔ معاملہ رفت گذشت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول پاکستان میں ایک روز کے لیے بھی BAN نہیں ہوا نہ مصنفہ سے کسی قسم کا سرکاری تعرض کیا گیا۔

ناول سنسر شپ کیے جانے کی افواہ غالباً اس وجہ سے پھیلی کہ کتابت کی تصحیح کرتے وقت میں نے کئی جملے اور پیراگراف حذف کر دیے تھے جو پروف ریڈنگ کا عام قاعدہ ہے

عجلت میں وہ صفحات اسی طرح پریس میں بھیج دیے۔ ایک باب، میں میں نے محض "ہندوستان ۱۹۴۷" لکھا تھا اسکی نہایت احمقانہ تاویل یہ کی گئی کہ باقی عبارت سنسر کی نذر ہو چکی ہے۔

اس تمام ہنگامے سے البتہ اسقدر کوفت ہوئی کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق آدم جی ایوارڈ کا مستحق محض آگ کا دریا کو سمجھتے ہیں میں نے خود کو ججوں کی کمیٹی میں شامل کروالیا۔ اور یہ ادبی انعام شوکت صدیقی کی خدا کی بستی کو دیا گیا۔ لوگوں نے کہا ادبی انعامات کے لیے اکثر کیا کیا جوڑ توڑ کیے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ —— وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایڈورٹائزنگ... فلمز اینڈ پبلیکیشنز وزارت اطلاعات و نشریات سے منسلک تھی۔ اواخر ۱۹۶۰ء میں ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے مشرقی پاکستان گئی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کارِ جہاں دراز ہے" جلد دوم، ص ۲۷۹)۔

واپسی پر اسی محکمے کے لیے DECIMAL COINS کے متعلق پاکستان کی پہلی کارٹون فلم کا اسکرپٹ لکھنے کے بعد میں والدہ کو بغرض علاج لندن لے گئی۔ اسوقت تک متعدد اہلِ قلم مغرب میں سکونت اختیار

کر چکے تھے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو والد مرحوم کے عزیز دوست تھے انہوں نے چند برس قبل مجھ سے کہا تھا تم واپس کیوں نہیں آجاتیں۔ برطانیہ میں مستقل قیام کے بجائے ہندوستان واپسی کا تعلق آگ کا دریا سے نہیں ہے۔

اب کچھ گزارش ناول کے متعلق۔ میں نے اورلینڈو، سدھارتھ یہ ناول لکھنے کے بعد پڑھے۔ پردہ مجاز کبھی پڑھا ہی نہیں۔ ایک طویل داستان کو مختلف ادوار میں چند کرداروں کے ذریعے پیش کرنا قطعی ایسا انوکھا خیال نہیں جسکے لیے اس قسم کی اور کتابوں کا مطالعہ ضروری ہو۔ ایک ہی نام کے کرداروں کے بار بار نمودار ہونے کی وجہ سے یہ بھی سمجھا گیا کہ یہ ناول آواگون کے بارے میں ہے۔ ناظرین۔ یہ ناول آواگون کے بارے میں نہیں ہے۔
گوتم نیلمبر نام میں نے خود اختراع کیا تھا۔ یہاں آن کر پتہ چلا کہ نیلمبر نام کے ایک فلسفی ہند قدیم میں گذرے ہیں۔
آخری دور کا ماحول تقریباً وہی ہے جو پہلے ناولوں کا ہے۔ گلفشاں لکھنؤ اور خیاباں دہرہ دون ۲۱ فیض آباد روڈ اور آشیانہ دہرہ دون ہی ہیں چنانچہ "کارِ جہاں دراز ہے" میں ان دونوں مکانوں کے متعلق لکھتے ہوئے بار بار خیال آیا کہ یہ سب تو میں آگ کا دریا میں لکھ چکی ہوں لہٰذا جگہ جگہ قلم زد کرنا پڑا۔ قدیر مع بیوی آگ کا دریا میں اپنے اصلی نام سے آگئے تھے۔ لہٰذا انکا نام کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اول) میں بدل کر نذیر کر دیا۔
گھسیاری منڈی اور بیرو روڈ لکھنؤ کا پرائیویٹ اسکول "آگ کا دریا" میں اور "کارِ جہاں دراز ہے" (جلد اول) دونوں میں موجود ہے (امریکن ناول THE ROOTS کی اشاعت سے قبل "کارِ جہاں دراز ہے" آجکل دہلی میں بالاقساط شایع ہوا تھا)۔ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ سوانحی ناول اس امریکن کتاب کی تقلید میں لکھا گیا۔

ن۔ م۔ راشد کا یہ خیال صحیح ثابت نہ ہوا کہ آگ کا دریا کی اشاعت بے وقت کی راگنی ہے کیونکہ گذشتہ تیس سال کے دوران اقبال اور فیض کے علاوہ پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب آگ کا دریا ہے جسکے اب تک ان گنت غیر قانونی اڈیشن شایع ہو چکے ہیں ستم ظریفی یہ ہے ان کے پہلے صفحے پر "حقوق بحق مصنفہ محفوظ" بھی درج ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ "اس کی اشاعت کے لیے مصنفہ سے اجازت حاصل کر لی گئی ہے"۔ دو سال قبل فرینکفرٹ انٹرنیشنل بک فیئر میں منعقدہ ناشروں کے ایک سیمنار میں جب میں نے کہا کہ اس کتاب کو گینس بک آف ریکارڈز میں جگہ ملنی چاہیے کہ روزِ اول سے آجتک اسکے ناشرین سو فیصدی منافع کما چکے ہیں تو کسی کو ہرگز یقین نہ آیا۔ ہندوستان میں ۱۹۶۱ء ہی میں جالندھر میں جو کتاب راتوں رات چھاپ لی گئی تھی اس میں عجلت کے مارے ہیگل کو سہگل لکھا گیا تھا!
میرے خیال میں اتنی عرضِ مصنف کافی ہے۔

قرۃ العین حیدر

نئی دہلی
۲۱ر دسمبر ۸۸ء

مَیں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقت ور مٹیالا دیوتا ہے۔ تُند مزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اپنے غیظ و غضب کا مالک، تباہ کُن
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنھیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے۔ سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔
خاتمہ کہاں ہے ـــــ بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چُپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے ؟
خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
(سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا ـــــ یا غلط چیزوں کے خوف کا)
یہ لمحے مستقل ہیں۔ جس طرح وقت مستقل ہے
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھُپا ہے
لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا
لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے، قائم بھی رکھتا ہے۔

مَیں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا

کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے۔
اور ان کے واسطے، جو ابھی پچھتانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے،
پچھتاوے کا گُلِ سُرخ
جو ایک ایسی کتاب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی۔
آگے بڑھو مسافرو۔ ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو۔
آگے بڑھو۔ تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا
یا جو دوسرے ساحل پر اترو گے۔
اس لمحے، کہ دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے،
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو
یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں۔ جانو
کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے)
وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا۔
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو۔ آگے چلو
اور مسافرو اور ملاحو!
تم، جو گھاٹ پر اترو گے اور
تم، جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی یہ تمھاری منزل ہے۔
کرشن نے ارجن سے میدانِ جنگ میں کہا:
الوداع نہیں۔ بلکہ۔ آگے بڑھو
مسافرو!

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

(۱)

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہوچکی تھی۔ گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے پڑ رہے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔ گوتم کو خیال آیا۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس تھا۔ اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پار کرنا تھی۔ گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے ہنسنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں۔ گوتم نے سوچا۔ انہیں بھلا کون سے مسئلے حل کرنا ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے۔ خصوصاً اس کیسری ساری والی لڑکی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا۔ اس کے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، اس کے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھوئیں۔ قریب پہنچ کر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے پانی میں چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف پیَرنے میں مصروف ہوگیا۔

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کوئی ودیارتھی جان پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے دوسرے مسافروں کا انتظار کرتے رہے۔ کشتیاں، جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں، ان میں چولھے روشن کیے جا چکے تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا۔

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپک کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا۔

"بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہوگی۔" نرملا کو اپنے بھائی کا خیال آگیا۔ جو اسی طرح کی ان گنت ندیاں، چٹیل میدان اور دشوار گزار پہاڑیاں عبور کر کے بہت دور تکشلا گیا ہوا تھا اور اب تک

نہیں ٹوٹا تھا۔

"جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔" تیسری لڑکی نے بے دھیانی سے پوچھا۔ اس لڑکی کا نام سروجنی تھا۔

"ہوتا کیا ہے۔ جھک مارتے ہیں۔ کسی نئے دھرم کا ادشکار کر لیتے ہیں یا کسی نئے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔" نرملا نے جل کر جواب دیا۔ اس کا اکلوتا بھائی تکشسلا میں ریاضی اور صرف و نحو سے سر کھپانے کی بجائے یہاں گھر پر رہتا تو کیا چمپک اس سے بیاہ نہ کر لیتی۔

"باہمن بچارے کریں بھی کیا۔ پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں؟ پڑھنا تو ان کے بھاگیہ میں لکھا ہے۔" سروجنی نے منہ لٹکا کر کہا۔

ندی کے وسط میں پہنچا تو بارش کی دوسری بوند گوتم کے سر پر آن گری۔ برسات کی وجہ سے ندی کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا۔ سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ چوڑا جسے پاٹلی پتر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا۔ اس نے پیرتے پیرتے پلٹ کر ایک بار دیکھا۔ گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی موجود تھی جس کے بالوں میں چمپا کا پھول تھا۔ ان لوگوں کو مینہ میں بھیگنے کا بھی ڈر نہیں۔ گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک ہو گیا۔ سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا زادِ راہ چنڈی دیوی کو سونپ کر اپدھیا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے مو قلم تھے اور سفید ریشم کے چند ٹکڑے۔ اس کا کمبل تھا۔ ایک سفید رنگ کی دھوتی اور چمڑے کے چپل۔ اس نے بے پروائی سے پوٹلی اٹھائی، پیر صاف کر کے چپل پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا۔ چاروں اور بڑا سناٹا تھا اور مندر کے آنگن میں تنہا اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کیسی خوف ناک بات ہے۔ نی شکل برہما جب شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو اس سے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے؟ کیا انسان کو دوسرے کے وجود پر اعتماد نہیں؟ گوتم نیلمبر نے خوف کے جذبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا۔ زندگی کا خوف۔ موت کا خوف۔ زندہ رہنے کا خوف۔ رگ وید میں لکھا تھا کہ ابتدا میں خودی تھی جو پُرش کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے کہا یہ میں ہوں۔ چنانچہ وہ خود کو "میں" سمجھنے لگا۔ اسے ڈر لگتا تھا چونکہ وہ تنہا تھا

تھا- فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب ساری دنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہوگی- وقت اس کا اپنا تھا- فراخ دلی کے ساتھ وہ فلسفوں کو پرکھتا اور سوچتا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ چیزوں سے وہ خوف زدہ تھا- بارش میں بھیگتی لڑکیاں جو اس پار گھاٹ پر بیٹھی تھیں- برگد کا یہ جنگل جس میں نارنجی لباس پہنے بھکشوؤں کی ٹولی کہیں گھوم رہی ہوگی- اس ادھیڑ عمر کے باتونی گرہست کی بیوی جس کا نام رکمنی تھا- یہ سب چیزیں کیوں تھیں؟

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا- آنگن میں پہنچ کر اس نے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر چولھا بنایا اور مٹی کی ہانڈی میں چاول ابالنے کے لیے چڑھا دیے-

پکی دال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا- سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی- چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا تھا- ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی- سارا جنگل اندھیارے میں سائیں سائیں کر رہا تھا- صبح سویرے اٹھ کر اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے- اس نے سوچا- اسی وقت دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی- چند لمحے منتظر رہنے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ رہا- نیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا- اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی-

"تم کون ہو بھائی؟" نیچے سے کسی نے پوچھا-

"میں ہوں-" گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا-

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں کا کوئی نام نہیں ہوتا-"

"تفریق کے لیے نام ضروری ہے-"

"شراوستی کے جن پنڈتوں کے گھرانے میں پیدا ہوا وہاں دوسرے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا-"

"بھائی گوتم نیچے آجاؤ-"

"تم خود اوپر کیوں نہیں آتے-"

"اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے-"

"ہوں-"

"تم کو کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو۔"

"بھائی،" گوتم نے اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا، "کیا تم بھگوت ہو؟"

"نہیں — مگر تم مندر سے نیچے نہیں اترو گے؟"

"نیچے سانپ ہوں گے اور کیڑے مکوڑے۔ اور کیڑے مکوڑوں سے دوستی کرنا میں نے ابھی شروع نہیں کیا۔" اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا: ممکن ہے یہ آواز کسی جین سنیاسی کی ہو۔ پاٹلی پتر کے شاہی خاندان نے جین عالموں کو بہت سر چڑھا رکھا تھا اور باضابطہ ان کے سدھانت کا مطالعہ کرتے تھے۔ "میں یہاں پتھر کے فرش پر لیٹا ہوں۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔" اس نے باآواز بلند پھر کہا۔ سوفسطائی۔ شک پرست — دہریے — منطقی — جنگلوں جنگلوں بحثیں کرتے مل جاتے تھے۔ یہ بھی ان میں سے کوئی دل چلا ہے۔ گوتم نے سوچا۔ ان گنت منطقی گنگا کی وادی میں گھومتے پھرتے تھے۔ ماہرینِ کلام روایتی مذہب پر حملے کرتے۔ آراء اور اشیاء کی اضافیت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے۔ ان میں سے بہت سے مابعد الطبعیاتی نظریات کے حامل تھے۔ اکثر مادہ پرست تھے۔ جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سوفسطائی بھی۔ انھی گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے شہزادے اور بادشاہ جٹائیں بڑھائے سادھوؤں کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور پچھلی صدی میں کپلا وستو کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کرکے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا۔ ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے۔ خیالات کی اس سلطنت میں انھوں نے بھی، جو شاکیہ منی سدھارتھ کہلائے، فلسفے کی ایک اور نو آبادی قائم کردی تھی۔

باسٹھ مختلف نظریے — اور زندگی ایک ہے — اور انسان تنہا ہے۔ گوتم نے آنکھیں بند کرلیں اور اسی طرح لیٹا رہا۔

"تم کون ہو بھائی؟" کچھ دیر بعد گھبرا کر اس نے دوبارہ آواز دی۔ "اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔ گو اگر تم اپنی اصلیت مجھ سے چھپانا چاہو تو مجھے کوئی آپتی نہیں۔"

"نام آوازوں کی ایک کستنٹی ہے بھائی گوتم۔ اور ہری شنکر کی آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں۔ کیونکہ یہی میرا نام ہے۔"

"بھائی ہری شنکر کیا تم کرشن واسو دیو کے بھگوت ہو؟"

"نہیں، میں اس سمے اتر پچھم کی اور سے آرہا ہوں جہاں شیو کی ارادھنا کی جاتی ہے۔ گوتم میں

نے کاشمیر کی برف میں بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی ہیں۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے۔"

"میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی۔ مجھے اس کا بڑا دکھ ہے۔"

"صرف اسی کا دکھ ہے؟ تم نے دکھ کے فلسفے پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم؟"

"آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔"

"جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفے اور ساہتیہ کے بجائے گنت ودیا اور قانون اور طبیعیات پر زیادہ دھیان دیتے تھے۔ لیکن رنج سے میرا بڑا گہرا سمبندھ ہے گوتم نیلمبر۔"

"کیا تم اجینی سے آرہے ہو؟"

"نہیں۔ اس سے بھی بہت آگے سے۔"

"ٹکسشلا؟"

"ہاں۔"

"میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے۔ تم نے اپنی تعلیم ختم کرلی؟"

"ہاں ——— پھر میں بہت لمبے سفر پر نکل گیا۔ اپار سمندر کے کنارے میں نے دوارکا کے درشن کیے۔ میں متھرا گیا۔ برہم ورت میں ہستناپور کے کھنڈر میں نے دیکھے۔ گوتم میں نے اندازہ لگایا کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے۔ کیا تم کبھی وقت کے خوف سے لرزے ہو؟"

"ہاں ——" گوتم نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔ سانولے مندر کے برآمدے پر جھکے ہوئے پیپل کے پتے سرخ نظر آرہے تھے۔

"کیا تم بودھ ہو؟" گوتم نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"ہاں تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں گیا تو ایک گرہست نے مجھے بتلایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک ٹولی ادھر آئی ہوئی ہے۔"

"تم بھی —— ہو ——؟"

"میں نے اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

"اور دل کا ——؟"

"دل اور ذہن کا کیا سمبندھ ——؟"

"میں تم کو ایک بات بتلاؤں ——؟" اتنا کہتے کہتے دوسرا نوجوان منڈیر کود کر مندر کے برآمدے

میں آگیا۔ بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑاؤں اتار کر ایک طرف کو پھینکے اور چنڈی کے سامنے سے دیا اٹھا کر اس کی روشنی میں گوتم کو دیکھنے لگا۔ گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے بھی دلچسپی سے نووارد کو دیکھا جو بہت دور سے آرہا تھا۔

"تم یہیں کہیں آس پاس کاشی واشی میں پڑھتے ہو ــ؟" دوسرے لڑکے نے گوتم کے قریب پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں شراوستی میں پڑھتا ہوں۔ کاشی کی پاٹ شالہ تو خالی مہاپنڈت تیار کرتی ہے۔"

"اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر ــ؟"

"تم بھی اس اندھیارے میں سے نمودار ہو کر مجھ سے یہی سوال کرنے آئے ہو ــ؟" گوتم نے چڑ کر کہا۔ اب ہوامیں خنکی آچلی تھی۔ جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا، جو سرجو پر سے بہتی آرہی تھی، اس کے جھونکوں میں چراغ کی لو جھلملا اٹھی۔ گوتم نے اپنے نئے ساتھی کو غور سے دیکھا۔ اس کا ذہین اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سا نظر آیا۔ گہری سیاہ جڑی ہوئی بھنویں اور کتابی چہرہ اور گھنگھریالے بال۔ یہ شکل میں نے پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے۔ گوتم نے ہڑبڑا کر سوچا اگر یہ اپنے گھنگھریالے بال منڈوا دے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو۔ ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ ہے۔

"تم نے اپنا سر نہیں گھٹوایا ــ کیسے بھکشو ہو؟" گوتم نے ذرا بشاشت سے سوال کیا۔

"میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

"اور تمھارا سنگھ ــ؟"

"میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں۔ میں آزاد ہوں۔ اور مزید آزادی کی تلاش میں مصروف۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو ــ؟"

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا: "اس پار کا۔"

"اچھا۔" گوتم ذرا چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"تمھیں اتنا اچنبھا کاہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے۔ ممکن تھا کہ میں ہستناپور میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یاوادیپ میں۔" ہری شنکر نے تبسم کے ساتھ گوتم کو دیکھا۔

"تم یہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو۔"

"ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازلی اور ابدی اجنبی ہیں۔"

گوتم خاموش ہو گیا۔ ہری شنکر، اس نے اپنے دل میں کہا، تم بحث میں مجھے ہرا نہیں سکو گے۔ شاکیہ منی بھی آخر اسی کوشل دیس کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی شراوستی میں آ کر برسوں رہے۔ انھیں پری نروان حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی مگر سارا ملک ایک نئے نارنجی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہوئی۔ "جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تج کر جنگل بسا رہی ہیں۔" اس نے با آواز بلند دہرایا۔ "تمہیں ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے؟" اس نے ذرا جھنجلا کر کہا۔ "بھکشو کا فلسفہ اور تمہاری ساری پری بھاشا اپنشدوں میں موجود ہے۔ شاکیہ منی شروع سے آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے۔ خود بدھ کا لفظ وید سے نکلا ہے۔ کوئی چیز خیالات کی دنیا میں نش کیول اور غیر متعلق نہیں ہے۔ تم کا پریوگ کیوں کرتے ہو؟"

ہری شنکر چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ذرا مسکرا کر پوچھا: "تم کو لڑکیوں کی کیا فکر ہے۔ کوئی خاص لڑکی وہار میں جانے والی ہے ——؟"

"تم لوگ اس طرح ہنستے کیوں ہو —— ؟ دیکھو تمہارے آنند پر کیا بیتی تھی۔" گوتم نے اور زیادہ چڑ کر کہا۔

"گوتم نیلمبر میں اس سمے بحث بالکل نہیں کرنا چاہتا۔" ہری شنکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا۔

"تم کاہے سے بھاگ رہے ہو۔" گوتم نے غصے سے پوچھا۔

"تم کاہے کی تلاش میں ہو —— ؟" ہری شنکر نے کہا۔ "میرے یہاں تو ساری تلاش ختم ہو چکی۔"

"اگر میری درسگاہ میں اعلیٰ اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی کھڑاؤں تمہاری ناک پر لگاتا ——!"

ہری شنکر نے قہقہہ لگایا: "اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنا لیتا۔"

"تم خود پرست ہو۔"

"اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو۔"

"تمہیں ناٹک سے دلچسپی ہے۔؟" گوتم نے موضوع گفتگو بدلا۔

"تھی۔" مختصر جواب ملا۔

"اچھا۔؟ مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سمے کھیلتے ہو۔" ہری شنکر خاموش رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ گوتم جوش میں آکر بولتا رہا: "تین سو سال ہوئے تمہارے تکشلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانِنی تھا۔ اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی۔ جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو۔ الفاظ کو بھی ملتوی کر دیکھو۔"

ہری شنکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل بیٹھ گیا۔ "گوتم میں نے پانِنی کی آٹھوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں کاشمیرا کے مدرسوں میں گیا ہوں جہاں سنسکرت کو مکمل بنایا جا رہا ہے۔ میں نے یاونوں کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکا دن کی بھی۔ لیکن اب میں الفاظ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

"کیونکہ۔" ہری شنکر کہتا رہا، "زبان۔ الفاظ وعدے کرتے ہیں جو نبھائے نہیں جاتے۔ خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں۔ ان کے معنی کی کھوج میں بھاگنا شروع کیا تو بھٹک کر میں کہاں سے کہاں جا نکلا۔ اسی وجہ سے گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ۔"

"لیکن۔" گوتم نیلمبر نے ہری شنکر کی بات کاٹی۔ "لیکن اوم کے تین حرفوں اور ساپا سا کے تین سروں کے درمیان —— تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے۔ آواز آکاش کا ایک گُن ہے۔"

"کہے جاؤ۔" ہری شنکر بولا۔

"برسپتی مادہ پرست آکاش کو نہیں مانتے۔ تم تو مانتے ہو۔"

"مگر تمہارے ہمنام — گوتم — نے تو کہا تھا کہ اگر آواز ابدی ہے تو زبان سے پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہیے۔ کیونکہ آکاش اور ہمارے کانوں کے درمیان کوئی روک نہیں ہے۔" ہری شنکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لفظ بھی ابدی ہے۔" گوتم نے جواب دیا۔ "حرف م ہمیشہ سے موجود ہے۔ یا حرف ن۔ اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہو گا اس کی آواز یہی رہی ہو گی۔ جیمنی کہتا ہے کہ آواز اس لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد رہتی ہے اور بیک وقت ہر جگہ موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جا سکتی۔"

"اور اسی لیے ویدوں کو۔ کیونکہ وہ الفاظ ہیں۔ کبھی رد نہیں کیا جا سکتا۔؟" ہری شنکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

تم کیسے فلسفی ہو جو الفاظ میں یقین نہیں رکھتے۔" گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "پانِنی، تمہارے

تکشسلا کے استاد، نے کہا تھا اپنے یا دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔ الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے۔ اور مادہ ابدی ہے۔ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔ اور مادہ برہما ہے۔"

"وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گڑبڑ پھیلائی ہے۔" ہری شنکر نے دوبارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"معنی اصل چیز ہے۔" گوتم نے جواب دیا۔ "پانینی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ کا ماحصل خالص وجود ہے۔ ست۔ اصلیت۔ اور مختلف چیزوں کے لیے برہما کے الگ الگ نام ہیں۔ وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور۔ گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں۔ تم۔ ہری شنکر یہ سب مہان آتما ہے۔"

"تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے۔"

"انت کے آگے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ۔"

"پرم آتما اور جیو آتما میں اودّیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے۔ لہذا لفظ اور غیر لفظ دو برہما ہیں۔ اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو سکتا ہے۔"

"وہ غیر لفظ میں خود ہوں۔" ہری شنکر نے کہا۔ گوتم خاموش ہو گیا۔

"علیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے۔ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی مانند نہیں ہے۔ صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے تعلق نہیں۔ سمجھے۔ سب وقتی ہے۔ اور مصیبت ہے۔ سروم دکھم دکھم۔" ہری شنکر نے کہا، "جسم اور آتما دونوں خالی ہیں۔ دونوں کے اکٹھا ہونے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا۔ آتما ابدی نہیں ہے۔ انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے۔ محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے۔ ایک لڑکی تھی۔ سو رہے ہو بھائی گوتم۔؟"

"نہیں۔ کہے جاؤ۔"

"ایک لڑکی تھی۔ اس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا۔ وہ بھی سایا سا میں زمان و مکان کو محیط کر لیا کرتی تھی۔ دنیا پر وہ صبح صبح بھیرو اور میگھ بجاتی۔ دوپہر کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی۔ تب میں اس سے دیپک اور شری راگ سنتا۔ رات پڑے وہ ہنڈول گاتی۔

اس لڑکی کو سنگیت کا جنون تھا۔"

"تم نے گیت اور الفاظ ملتوی کر دیے مگر سُر باقی رہیں گے۔ سُر اٹل ہیں۔" گوتم بولا۔

کچھ دیر بعد ہری شنکر نے پھر کہنا شروع کیا: "میں جب اتر کوشل کی سرحد پر واپس پہنچا تو گلم اتھان کے پہرے دار نے للکار کر مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں۔ میں نے جواب دیا اور یہی تم سب کا حشر ہو گا۔ اس چکر سے بچنے کی کوشش کرو۔

"تم اس کا مطلب سمجھے؟ پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کہا۔ یہ بھی کوئی فلسفی جان پڑتا ہے اور پھر وہ دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ مگر میں جب ایودھیا میں داخل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ سُر ابھی باقی ہیں۔ گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت زبردست ہے۔ ملک۔ بستیاں۔ نئے نئے لوگ۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ میں نے پاٹلی پتر سے لے کر پشکر وتی تک سارا راستہ یہی کھڑاؤں پہنے پہنے طے کیا ہے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر گومتی کے کنارے لکھش ناوتی آباد ہے جسے سری لچھمن نے بسایا تھا۔ سنگم پر پریاگ ہے۔ پھر کانیا کبج اور ہستنا پور۔ تکشلا۔ اس کے آگے سرحد کا شہر پشکر وتی۔ اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا مگر منڈل کے سُر برابر میرا پیچھا کرتے رہے۔ تب کئی سال میں تکشلا میں رہا اور میں نے انہیں بھلائے رکھا۔ یہاں لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں۔ تم مجھ سے لفظ اور آواز کی ابدیت کی بات کرتے ہو۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھے معلوم ہے۔ یہ سب جگنوں کے سحر کا اثر ہے۔ اصلیت کچھ نہیں۔ سروم دکھم۔ دکھم۔

"سنا ہے وہ پراچین ایودھیا کی رانی رینوکا کی ایسی خوبصورت ہے۔"

"کس کا ذکر کرتے ہو؟" ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔ پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا۔

"مقدس سرجو۔۔۔ رگ وید میں بہنے والی ندی۔۔۔ میری ماں۔ جانے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی۔ سامنے میرا شہر ہے۔" ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس کے کانوں میں آتی رہی۔ خوبصورت۔ شاندار ایودھیا۔ کتنے زمانے سے اسی جگہ پر دونی راتوں کو جگمگا تا رہا ہے۔ کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈگ وجے (فاتح عالم) رام چندر۔ اجودھیا۔ اج کا۔ برہما کا شہر۔ جسے کوئی جیت نہیں سکتا۔ تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے؟ یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو؟ راج محل میں بسنت کا تہوار منایا ہے؟ یہیں پر چہل پہل رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن میرے منتظر ہیں۔۔۔ جس طرح سری

کرشن کو اپنی بہن سبھدرا پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا۔ مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور وفاداریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اَودھ (وچن) لوٹ آیا — رام نے چودہ برس کی بن باس کے بعد لوٹنے کا وچن دیا تھا۔ میں بھی واپس آیا ہوں مگر سد معارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے بھی آزاد کر دیا ہے — میری بہن — رام چندر کی بہن شانتا کی ایسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے تھے کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی ایسے ہی نرملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں — دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے۔" اس نے اداسی سے بات ختم کی۔

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ باہر درختوں پر بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔ برسات کا موسم ہے۔ یہ موسم سارے بھکشو وہاروں میں بسر کرتے ہیں۔ گوتم کو خیال آیا۔ اس نے کروٹ بدل کر ہری شنکر سے پوچھا۔ "تم برسات کا زمانہ کہاں گزارو گے؟"

"پتا نہیں۔"

"تمہارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟"

"میرے ہم سفر۔ تمہارا مطلب ہے۔"

"ہم سفر ہی کہہ لو۔"

"یہ بھی معلوم نہیں۔"

"تکشلا تو برہمنوں کی درس گاہ ہے۔ تم وہاں کہاں پہنچ گئے۔"

"میں — میں تو پھتاؤں کے دیس بھی رہا ہوں۔ جہاں اتر کے نیلی آنکھوں والے سفید فام ولائتی شیو کی عبادت کرتے ہیں — میں نے ایراوتی[1] اور چندر بھاگ[2] کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں۔ پورب میں ونگا تک گیا ہوں۔ میں نے برہم پتر اور سندر بن اور چندر دیپ کی دلدلوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال کندھوں پر جھٹکائے مرگ نینی لڑکیاں ہرے بانس کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور پریوں کی طرح گاتی ہیں۔ گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت عظیم ہے۔ اس کی وسعت سے ڈرتے رہو — کائنات — اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے ہیں؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں اور یہاں سے کہاں جائیں گے؟ تم جو برہما سے واقف ہو ذرا بتلاؤ دکھ یا سکھ میں مبتلا کس کے حکم سے ہم یہاں رہ رہے ہیں؟ وقت یا فطرت — یا حادثے — یا عناصر کو سبب سمجھا

---

[1] راوی [2] چناب

جائے یا اسے جو پُرش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتما ہے۔" ہری شنکر نے بات ختم کی۔

"اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوئی ہے، آزادی میں موجود رہتی ہے اور آزادی میں سمو جاتی ہے۔"

"وہی ابدیت۔" ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "آزادی اور ابدیت خود ایک اور قید نہیں؟"

بارش تیزی سے شروع ہو گئی۔ دیا ہوا کے جھونکے سے بجھ چکا تھا۔ شنکر نے اینٹوں کا تکیہ بنا کر سرہانے رکھ لیا۔ گوتم نے اپنی سفید چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندھیرے میں پلکیں جھپکایا کیے۔ پھر پُروائی کے جھونکوں سے انہیں بھی نیند آ گئی۔

اس رات گوتم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے۔ مندر کی کوٹھڑی میں سے نکل کر چنڈی دیبی پانچ گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں۔ پھر وہ کیسری ساری والی لڑکی میں تبدیل ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی۔ پہلے وہ دلہن بنیں۔ رستی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا۔ پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت۔ درگا سے بھی زیادہ خوفناک۔ آلتی پالتی مارے اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ میری ماں۔ میری ماں۔ گوتم نے لرز کر کہا۔ لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا میں تمہاری ماں نہیں۔ ارے میں تو ویشالی کی — اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک بیل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر ٹپ سے آنگن میں آن گری اور گوتم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شنکر بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ ندی کے کنارے چنڈال کسی کی لاش مرگھٹ کی سمت لئے جا رہے تھے اور کشتیوں کی روشنیاں اندھیرے میں اگیا بیتال کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنے شروع کر دیے۔ بہت دیر بعد اسے نیند آئی۔

منہ اندھیرے جب شنکر کی آنکھ کھلی اس وقت گوتم چنڈی پاٹھ میں مصروف تھا۔ گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے۔ آم کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا۔ گوتم عبادت کے بعد باہر نکلا تو ہری شنکر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ دفعتاً گوتم نے اس سے پوچھا — "ویشالی میں کون رہتا تھا —؟"

"میں ویشالی کی کسی مہیلا سے واقف نہیں۔" شنکر نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا۔ اور پھر ہنسنے لگا۔ گوتم کو اس کی بے تکی ہنسی پر بہت غصہ آیا۔

وہ دونوں مندر کی سیڑھیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آ گئے۔ ندی کے کنارے بھکشوؤں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا۔

"تم اب شراوستی واپس جاتے ہو۔" شنکر نے پوچھا۔

"ہاں۔ تم نہ چلو گے؟ وہاں سے کچھ فاصلے پر کپلاوستی ہے۔ ادھر پورب میں کوسی نگر ہے اور گیا۔ تم ان سب جگہوں کی یاترا کے لیے نہ جاؤ گے؟"

"تم اپنا مطلب بیان کرو۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تم میرے آشرم میں ٹھہر سکتے ہو۔ یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر حاضر ہے۔"

"میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے ہو۔"

"یہی بات دوسری طرح بھی کہی جا سکتی ہے۔ تم میرا راستہ کھوٹا کر رہے ہو بھائی ہری شنکر۔ پگڈنڈی پتلی ہو اور دو راہگیر آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک کو ہٹ جانا چاہیے ورنہ دونوں کھڈ میں جا گریں گے۔" گوتم نے کہا۔

"پھر میں تمھارے ساتھ شراوستی کیوں چلوں — اس لیے کہ تمھیں میرے مذہب سے دلچسپی ہے یا اس لیے کہ تم ایودھیا کی کماری چمپک کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

ہری شنکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیروا پہناوا نہ پہن رکھا ہوتا تو میں تمھاری ٹھکائی کر دیتا۔ گوتم نے دل میں کہا۔

وہ دونوں آبادی چھوڑ کر شراوستی کی طرف بڑھنے لگے۔

آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے۔ ہوا میں کچی کلیوں کی مہک اڑ رہی تھی۔ کدم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا۔ کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور کپاسی ساریاں پہنے کسان عورتیں ادھر سے ادھر آ جا رہی تھیں۔ اسوک کے جنگلوں میں جگہ جگہ جو دیو استھان اور دیوگرہ بنے تھے گوتم ان پر پھول چڑھاتا راستہ طے کرتا رہا۔ شنکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔

شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاؤں کی فصیل کے اندر داخل ہوئے۔ ان گنت مور چاروں اور باغوں میں گھوم رہے تھے۔ چھپروں کے نیچے مور کے پروں کے پنکھے اور مورچھل تیار کیے جا رہے تھے۔ چوپال میں گانا ہو رہا تھا۔

گوتم اور ہری شنکر کو ڈیں کے من پر بیٹھ گئے — پل کی پل میں سارے میں خبر پھیل گئی۔ دو ودیارتھی گاؤں میں مہمان آئے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت شروع ہوئی۔ شنکر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکھیاں نذر کرنے کے لیے لے کر آئی۔ گوتم نے لڑکی کے ہاتھ سے

GOVT. URDU LIBRARY, PATNA

پنکھیا لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے پروں پر انگلیاں پھیریں۔ لڑکی بڑے ادب سے اشر باد کی منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی۔ یہ پنکھے کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو بھیجے جائیں گے۔ کیسے کیسے لوگ ان کو استعمال کریں گے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ پنکھیا جو میں چھوڑ رہا ہوں یہی بیو دھیا کے بازار میں جا کر بکے گی اور شاید وہ لڑکی ہی اسے خرید لے۔ پھر اس نے دونوں پنکھیاں واپس کر دیں۔ ''ہمیں عیش و آرام کا حکم نہیں۔ ہمیں یہ تمہارے خوبصورت پنکھے نہیں چاہئیں۔ مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔ لڑکی نے پنکھیاں اٹھالیں اور پرنام کے لیے جھکی۔ اور شنکر چونکہ بھکشو کا نارنجی لباس پہنے تھا اس نے آگے بڑھ کر شنکر کے پاؤں چھوئے۔

''تمہارا نام سجاتا تو نہیں۔'' گوتم نے ہنس کر اس سے پوچھا اور شنکر پر نظر ڈالی۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

''نہیں۔ میرا نام نند بالا ہے۔ سجاتا میری بڑی بہن ہے۔'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاؤں کی طرف لوٹ گئی۔

''بھائی گوتم۔ ہر زمانے میں، ہر موڑ پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی۔ کوئی سجاتا۔ اور وہ تمہارے نزدیک آکر تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے۔ آنکھیں کھول لو۔'' ہری شنکر نے کہا۔

صبح سویرے پھر وہ اپنے سفر پر چل کھڑے ہوئے اور دو دن تک چلتے رہے۔ اب شراوستی زیادہ دور نہ تھا۔ شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی۔ سڑک پر دو رویہ درخت لگے تھے جن کے پرے امراء کے مکانات تھے۔ ان مکانوں کے باغوں میں نقلی پہاڑیاں بنی تھیں اور امرود اور انار کے درختوں کے جھنڈ تھے جن پر سبز پروں والے طوطے شور مچا رہے تھے۔ پالتو مور مرمریں تالابوں کے کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے۔ جامن کے درختوں میں جھولے پڑے تھے۔ مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی ہلکی دھوپ میں دور سے جگمگا رہی تھی۔

برابر کی پگڈنڈی پر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا بجاتا گزر گیا۔

چلتے چلتے دفعتاً رک کر شنکر نے گوتم کو مخاطب کیا۔ ''بھائی گوتم۔ ویشالی کی امبا پالی بھی۔ گوچیک اور سجاتا اور نند بالا سب ایک ہیں۔ اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو۔'' اور پھر یکلخت شنکر پگڈنڈی پر سے اتر کے واپس شیشم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا۔ گوتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

(۲)

شراوستی کا خوبصورت شہر راپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا تھا۔ اس کے اتر میں ذرا فاصلے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پہاڑ استادہ تھے ——————— اور دیودار کے گھنے جنگلوں اور آس پاس ترائی کے نرکلوں میں باگھ اور چیتے گھومتے تھے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اوپر سے آرہا تھا جہاں مان سرور کی جھیل تھی جس کی شفاف لہروں پر دنیا کی آتما کا راج ہنس اکیلا تیرتا تھا۔ ہماوت کے اونچے برفانی پہاڑ وِنگا اور کامروپ تک پھیلے تھے۔ ان پہاڑوں کے اس پار اُتر میں سونے کی رنگت والے کنولوں کا دیس تھا۔ وادیوں میں ان گنت رپہلے آبشار اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں تھیں اور خوشبودار پتوں کے درخت اور دھان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروکل بنے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے —— شہزادے اور مفلس برہمن —— اور کشتری امیرزادے علم حاصل کرنے میں جٹے رہتے تھے۔

انھیں جنگلوں میں۔ پہاڑیوں کی ڈھلوان پر، جہاں دن میں بھی گھپ اندھیرا رہتا تھا، ہاتھی پلے تھے۔ راجہ سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے۔ ہاتھی پکڑنے والے ہانکا لگاتے۔ درباریوں کا پڑاؤ ہوتا۔ جنگل میں منگل لگ جاتا۔ ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والوں اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے سکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا۔ ان کی لڑکیاں مونگے اور فیروزے کے روپہلی زیور پہنے بالوں کی مینڈھیاں گوندھے ہاٹ بازار کے لیے جب میدانوں کی طرف آتیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برنگی سیاہ، سرخ اور زرد دھاریوں والی پوشاک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں۔

اتر کوشل کی ریاست میں نگر، پور اور نگریاں —— شہر اور قصبے اور گاؤں ان ہرے بھرے میدانوں میں آباد تھے۔ جنگلوں کی افراط تھی جن کی لکڑی سے خوبصورت مکان بنائے جاتے۔ اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کٹتے جاتے تھے۔

شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا، دور کے دیشوں سے آئے ہوئے لوگ

یہاں رہتے تھے۔ الگ الگ محلوں میں کاری گر، سنار، بزاز، آڑھتی اور دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں۔ ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین۔ چوروں تک کی منڈلی مع ایک باضابطہ شاستر کے موجود تھی۔ بارہ مہینے چہل پہل رہتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگارخانوں میں مصروف رہتیں۔ ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا۔ ناٹک اور ناگ کنائیں زرق برق کپڑے پہنے، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں۔ چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھلاتے۔ بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں، اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا۔ تہواروں کے موقعے پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے۔ ڈوم نقلیں کرتے۔ دیش ناریاں چھن چھن کرتی اپنی گلیوں میں ٹہلتیں۔ امیر زادیاں سولہ سنگار کیے تھالیوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی۔

رتھ کار، مٹی کے برتن بنانے والے، کلال اور بید کی ٹوکری بننے والے شہر کے باہر رہتے تھے۔ آبادی سے بالکل الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی۔ ان کا پنچم طبقہ چاروں ذاتوں سے کم تر تھا۔ محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ یہی ان کا پیشہ تھا۔ وہ صرف مردوں کی اُترن پہن سکتے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور محض کانسی کے گہنے استعمال کریں۔

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شراوستی میں کپلا دستی کے شاکیہ منی آن کر رہے تھے۔ اور انہوں نے اور ان کے حواریوں نے اپنے واعظوں میں بتلایا تھا کہ آدمی پیدائش کی بناء پر نہیں عمل کی بناء پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب نارنجی لباس والے بھکشوؤں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اور اچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کر رہی تھیں۔

شراوستی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی۔ گرمیاں آتیں تو امراء اپنے باغات میں تالابوں کے کنارے جا بیٹھتے یا خنک تہ خانوں میں آرام کرتے۔ شام کے سمے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا۔ بوڑھی عورتیں موتیا اور چنبیلی کے گجرے گھروں کی ڈیوڑھیوں پر لے جا کر بیچتیں۔ خوبصورت لڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں میں سے نیچے جھانکتیں۔

شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری تور ما سندھ اور ایران اور عرب کے اصیل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے۔ گاؤں کی سمت جانے والے سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں

کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی نرم روی سے چلتی رہتیں۔

(۳)

"مون برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند، سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈکوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی لہر حاصل کی ہے اور اب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں۔ جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہرلتے ہیں۔ اسی طرح ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی بولی کی نقل کرتا ہے۔ سب کے سب تلیا میں لیٹے برساتی راگ الاپنے میں جٹے ہیں۔"

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بارش جھما جھم برسنا شروع ہو گئی تھی۔ مینڈک ٹرا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہا غل مچا رہا تھا۔ ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں۔ رگ وید میں صدیوں پہلے برکھا رت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی وہ منظر مکمل طور پر ویسا کا ویسا اس کے سامنے موجود تھا۔ کٹی کے پھوس پر لوکی کی بیل پھیلی تھی۔ اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے۔ وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا۔ سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی۔ امن اور سکون کا راگ۔ میگھ ——؟ اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے، کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پا سکا۔ مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں۔ — اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف کو رکھ دی اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ ساون کی پورنماشی آ گئی تھی اور پڑھائی شروع ہونے والی تھی۔ گوتم نیلمبر اپنے آشرم واپس آ چکا تھا۔ آشرم شہر سے دور اسوک کے جنگل میں واقع تھا۔ ندی کے کنارے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے۔ اس پار گرد کے کھیت تھے جو سرکار کی طرف سے آشرم کو ملے تھے۔ بارش تھمتی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے۔ خزاں کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے ہنس آتے اور بسنت کے زمانے میں شمال کی اور لوٹ جاتے۔ طالب علم جب صبح صبح اشنان اور عبادت کے لیے گھاٹ پر جاتے تو انھیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیاسیوں کی طرح مراقبے میں ڈوبے ملتے۔

گوتم اپنے گرو کے پاس، جنھیں اچاریہ کا درجہ حاصل تھا، مدتوں سے پڑھ رہا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ اس دوران میں اس نے ناٹک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پائی تھی۔ اپنے

آشرم سے باہر دوسری درس گاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ؟ اس کے معلّم نے سوچا تھا۔ مگر گوتم کے سامنے یہی راستہ اٹل تھا۔ راج دربار میں پروہت کی مسند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا۔ ممکن ہے ایک روز وہ ایکا پروہت کے رتبے تک پہنچ جائے اور اتر کوشل کے علاوہ دوسری ریاستوں کا مشیر بھی بنے۔ وہ بہت ذہین لڑکا تھا اور اس کے پورے دیس میں علم کی قدر بہت کی جاتی تھی۔ اسے فنونِ جنگ بھی سیکھنے پڑے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ مغرب کے کورو پنچالوں کے ہاں سیناپتی کو پروہت پر فوقیت حاصل تھی۔ گوتم اندر پرستھ جاکر فوج میں نوکری کر سکتا تھا مگر اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ صرف ناٹک لکھا کرے گا۔ فن کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرے گا۔ تصویریں اور مجسمے بنائے گا۔ شاعروں نے سماج سے ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا۔ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے اس کے گرو کو دکھ پہنچے۔

گرو چیلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے، عالموں کے بادشاہ جنک اور رشی دتاتریہ کے زمانے سے، چلا آ رہا تھا۔ اسی آشرم کے آس پاس — ایک ہزار سال قبل — سرجو کی ایک شاخ ٹلیناندی کے کنارے ایک مشہور درس گاہ موجود تھی۔ یہ کنج، جہاں گوتم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے، یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہوں گے۔

دوسرے لڑکے۔ دوسری لڑکیاں۔

برہمچاریہ کی زندگی بسر کرکے لڑکیاں بھی اکثر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں۔ رگ وید کی کئی نظمیں اور "راہبات کے نغمے" لڑکیوں نے لکھے تھے۔ شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں — لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہوں گی۔ گوتم کو اکثر خیال آتا۔

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوتم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کر دی گئی تھی۔ اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا اور اس نے الٰہیات، تمثیل، ادب، بھوت ودیا (علم عناصر)، ریاضی، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، اخلاقیات، اداکاری، کیمیا، طبیعات — نصاب کے سبھی علوم پڑھائے گئے تھے۔ فنِ سپہ گری کے علاوہ وہ راگ ودّیا کا ماہر تھا۔ اتر پردیش کے رہنے والے اہلِ زبان سمجھے جاتے تھے۔ گوتم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا۔

برسوں سے اس کی زندگی اسی ڈھرے پر چل رہی تھی۔ وہ ماں باپ سے الگ آشرم میں رہتا۔ گرو کے جاگنے سے قبل طلوعِ آفتاب سے پہلے اٹھ بیٹھتا۔ ندی پر جاکے نہانے کے بعد جنگل کے خاموش ترین

حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا۔ درختوں کے مقدس کنجوں سے، جو دیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے منسوب تھے، اس سمے سریلے بھجنوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔ عبادت کے بعد گوتم آبادی میں جاکر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا، پھر لکڑیاں چن کر لاتا اور گرو کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی۔ آشرم میں روزانہ چاول ابالے جاتے تھے اور جو کی روٹی بنتی تھی۔ شراوستی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے۔ شہر کی دعوتوں میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا۔ لیکن طالب علم کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ لہٰذا گوتم اور اس کے ساتھی گرو کو کھلانے کے بعد الگ الگ بیٹھ کر خود بھی ساگ پات ہی کھاتے۔

اس دیس کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا۔ آشرم میں دن میں دس بار جھاڑو بہارو کی جاتی۔ پیتل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدوں میں رکھے جگر جگر کرتے۔ بات بے بات پیر دھوئے جاتے۔ تنکا بھی فرش پر نظر آتا۔ پھر باغ کی صفائی کی جاتی۔ اس ساری مشقت کے بعد پڑھائی ہوتی۔ پڑھائی کے بعد یاد رہے۔ برہمچاریہ کے قوانین کٹھن تھے۔ گوتم کو شروع سے سکھلایا گیا تھا کہ وہ عطر پھول استعمال نہیں کر سکتا۔ سرمہ لگانے، جوتا پہننے، بارش یا دھوپ میں چھتری لے کر چلنے کی اسے سختی سے ممانعت تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بتلایا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیے۔ رات بیٹھ کر گزارنی مستحسن ہے۔ موٹا جھوٹا پہننا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وطیرہ ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے۔ بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاؤ۔ زبان نہایت صاف اور شستہ بولو۔ ایک لفظ بھی غیر فصیح منہ سے نہ نکلنے پائے۔ لڑکیوں کا مذاق کبھی نہ اڑاتا۔ عیش و عشرت، راگ رنگ سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ شہر کے سرکاری قمار خانے میں معززین شہر جمع ہو کر جوا کھیلتے۔ گوتم، جو طالب علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا، محض خواب ہی میں سکوں کے درشن کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دوشالہ اوڑھے گھٹنوں کے بل بیٹھا پانسے پر پانسا داؤ پر لگا رہا ہے اور اس کے چاروں اور عجیب عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں۔ ایسے لوگ جو اس نے جاگتے میں شراوستی کے بازاروں میں بھی کبھی نہیں دیکھے تھے۔

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرماں بردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا۔ لہٰذا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھر یا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا۔

ناچ گھر کی سیڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنگھرو سنبھالے اترتی یا چڑھتی نظر آجاتیں۔

سبھی طالب علم اسی طرح گرو کے تابع تھے۔ بعض بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے۔

بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لا کر دیتے اور اکثر خود بھوکے رہ جاتے۔ پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم ارونی، جو ٹکسشلا میں پڑھتا تھا، اپنے استاد کے کھیتوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے بند باندھنے کے بجائے خود ہی پانی کی باڑھ کی زد میں لیٹ گیا تھا۔

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات اور نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور رہے۔ شیخی اور خود نمائی کے جذبات پر قابو پائے۔ دماغ کا سکون اور دل کا صبر و ضبط حاصل کرے۔

ساون کی پورنماشی سے لے کر پوس کی پورنماشی تک پڑھائی ہوتی تھی۔ طریقۂ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا۔ چیلا سوال کرتا۔ گرو اس کا جواب دیتا۔ پھر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر آپس میں بحث و مباحثے ہوتے۔ بال کی کھال نکالی جاتی۔

اگر کبھی سیاسی ہنگاموں، جنگوں یا بیرونی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ملتوی کرنا پڑتی یا تہواروں کی چھٹیاں ملتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کٹی میں بیٹھا چراغ جلائے رات رات بھر نظمیں لکھا کرتا۔ گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے برا شگون تھا۔ مرگھٹ میں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا منع تھا۔

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگلوں میں گیدڑ چلاتے۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے۔ اوڑھنے کے لیے راجن سے کمبل مانگتے ہیں۔ گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی جب وہ اپنے شاندار مکان کے ایک اندرونی کمرے میں گرم کپڑوں میں ملفوف، چھپر کھٹ پر لیٹا پنچ تنتر کے قصے، چندا ماموں اور ان کی بی بی روہنی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا۔ چندا اس کے ماموں تھے۔ سب بچوں کے ماموں تھے۔ کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بہت بڑا تھا۔ وہ ماں کا بھائی تھا اور ماں بے حد قابل تکریم ہستی تھی۔ جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے۔ سارا جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا۔ چندا ماموں اوپر کھڑے میں تیرا کرتے۔ اسے اپنی ماں یاد آجاتی۔ پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف و نحو میں منہمک ہو جاتا۔

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تنہا اپنے موقلم اور رنگوں کی کلیاں لے کر دور دور نکل جاتا۔ اسی طرح وہ ایودھیا گیا۔ ایک مرتبہ کوسمبی جا پہنچا۔ مگدھ میں راج گیر کے کھنڈر اس نے چاندنی رات میں دیکھے اور بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ کر اس نے بھیم بسار کی زندگی کے آخری دنوں کے متعلق ایک ناٹک لکھا۔ یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف و نحو میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے۔ قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی ایک حل کھوجے۔ ہری شنکر جو اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا مگر اس کے معدومیت کے فلسفے سے بھی گوتم کو ڈر لگا۔ قدیم برہمنوں کا فلسفہ مسرت کا فلسفہ تھا۔ زندگی سے، موسیقی

سے، زندہ رہنے کی لگن سے بھرپور لیکن اپنشدوں کی اداسی کو شاکیہ منی نے اور گہرا کر دیا تھا۔ وہ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سرجو کے گھاٹ پر بیٹھی لڑکی یاد آجاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ایودھیا واپس لوٹ کر اسے تلاش کرے۔ پتا چلائے کہ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے؟ شنکر، اس کمبخت منحوس بودھ بھکشو سے، جو پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا، اس کا کیا تعلق ہے؟

اقامتی درس گاہوں میں نئے نئے نظریوں کی ہوا وقتاً فوقتاً چلا کرتی تھی۔ اسی طرح اپنشدوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے۔ ان کی شرحیں لکھی گئیں۔ مختلف مدارس فکر قائم ہوئے۔ بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا۔ گوتم نیلمبر کے جامعہ میں بہت سے لڑکے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے۔ گوتم کی کٹیا میں شام پڑے دوسرے طالب علم آ بیٹھتے۔ شہر کے مصور، سنگتراش، اداکار، شاعر، لیکھک اور دوسرے لوگ جن کا فنون لطیفہ سے تعلق تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا۔ گوتم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جمتی۔ لپے پتے فرش پر چٹائی بچھا دی جاتی۔ درمیان میں چراغ جلتا رہتا۔ رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے۔ ادب اور فنون کے پرانے اور نئے نظریوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ سنگیت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ سیاسیات کا بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ گوتم کے دوستوں میں سبھاؤں کے نیتا شامل تھے۔ طالب علم تھے جو سیاسیات پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ ان محفلوں میں سیاسی موشگافیاں کی جاتیں۔ ریاست اور عدم ریاست میں کیا فرق ہے؟ راجہ اور پرجا میں کیا تعلق ہونا چاہیے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائیداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتما بدھ کی سکھ وتی سے ممیز کرتی ہے اور سکھ وتی وہ کیفیت ہے جن میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور سیاست کی حدود سے ماوراء ہو کر انسان یا جانور بن جاتا ہے یا خدا۔ ملکیت ۔ "یہ میرا ہے" ۔ کے تصور اور دھرم کے احساس سے ریاست بنتی ہے اور ملکیت کی اجازت ریاست عطا کرتی ہے۔ ملکیت ریاست کا نتیجہ ہے اس کی وجہ نہیں۔ لہٰذا سیاست کے طالب علموں نے طے کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں اور عورتیں زیور پہن کر بغیر مرد کی رکھوالی کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت ۔۔۔ فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے۔ مہابھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ یعنی سزا نہ ہو تو طاقتور کمزور کو اس طرح نگلیں جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے اور مہابھارت کی کتاب "شانتی" میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدد پسند ہے۔ لہٰذا "یہ میرا ہے" کا فقرہ بھلا دینا چاہیے ۔ مامتوا ۔ احساس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔ ظلم انسان کی فطرت

میں داخل ہے۔ تہذیب اسے اخلاق سکھاتی ہے اور متمدن بناتی ہے۔ ریاست ڈنڈ کے ذریعے انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے۔ بادشاہ ڈنڈدھر ہے۔ مگر وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ لہٰذا منو نے حکم دیا تھا کہ نالائق بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے۔ ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے۔ مہابھارت اور منو دونوں کے نزدیک حکومت کا سخت گیر ہونا لازمی تھا کیونکہ انسان فطرتاً بد تھا۔ عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے ورن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں۔ سپاہی کو محاذ پر مرنا ہوگا۔ طالب علم شادی نہیں کرسکتا۔ بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے۔ یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ چنانچہ جب ریاست ظہور میں آتی ہے تو پرجا کے ساتھ لامحالہ ورن آشرم کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ اگر پرجا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورن آشرم کا خاتمہ ہے۔

سیاسیات کے بڑے متضاد نظریے تھے جو گوتم نے پڑھے۔ جیمنی نے کہا تھا کہ افعال۔ اچھے یا برے۔ اپنے نتائج خود پیدا کرتے ہیں۔ ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دیا گیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے۔ لہٰذا جیمنی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی حکومت کے لیے کسی الٰہی نظام کی ضرورت نہیں۔ گوتم کے بدھ ساتھی بھی یہی کہتے تھے۔

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا۔ یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا۔ یونان، مصر، بابل، نینوا اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس اس دیس کا معاشی نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا۔ شہنشاہ بھی اب تک نمودار نہ ہوئے تھے۔ ترائی کے علاقوں میں کشتریوں کی جمہوریتیں مہابھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں۔ بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا۔ اسے الوہی درجہ بھی حاصل نہ تھا۔ کرم کی طاقت کے ساتھ کسی خود مختار حکومت کی گنجائش نہیں رہتی۔ کرم نے ہر شے کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا: "لہٰذا خدا بھی پاداش اور مکافات کے قانون کو نہیں توڑ سکتا" اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں مطلق العنان حکومت کا قیام ناممکن تھا۔

جمہوریتوں کے زمانے میں کوی نے بادشاہ کو سنگھ مکھیا کی حیثیت سے مخاطب کرکے کہا تھا: "تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے۔ اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر۔ تجھ کو عوام نے اپنا بادشاہ چنا ہے۔ انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل۔ تو جو گویا ہے گوالا۔ ورونا۔ اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوالی کر۔" سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ جنوب کے راجہ بھوج کہلاتے تھے۔ شمال کے وراٹ۔ مغرب کے سوراٹ۔ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہوچکی

تھی۔ یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے تھے۔ جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکراٹ بادشاہ، جو سارے ملک کا حاکم ہو، ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ چکر ورتی بادشاہ — جس کی مملکت کے رتھ کا پہیہ بغیر کسی روک کے چلتا رہے۔

اور شاکیہ منی نے کہا تھا: میں شہنشاہ ہوں اے سیلا۔ میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے۔

(۴)

وشنو گپتا — گوتم نیلمبر کی کٹی میں ایک شام حسبِ معمول محفل جمی تھی۔ اکلیش نے، جو نیا نیا ٹکسشلا سے لوٹ کر آیا تھا، ایک نئے نام کا ذکر کیا: "وشنو گپتا۔ نیتی پر اس کے وچار بھی سننے کے قابل ہیں۔ ٹکسشلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی دھوم مچا رکھی تھی۔ میں نے سنا ہے وہ آج کل کسم پور کے دربار میں موجود ہے۔"

"تم کیا کرتے رہتے ہو؟" گوتم نے اکلیش سے پوچھا۔

"میں — میں نے ایک نئی مورتی شروع کی ہے۔ کسی روز شہر آؤ تو دکھلاؤں۔"

"تم شیلا کاروں کی منڈلی میں شامل ہو گئے؟ کیوں کشتریوں کا نام ڈبوتے ہو!" گوتم نے اسے چڑانے کو کہا۔

"ٹکسشلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ کوئی جنگ ہی شروع نہیں ہوئی۔ کیا کرتا۔!" اکلیش نے ہنس کر جواب دیا۔

"جنگ —؟" ولمیشور، جو ایک کونے میں بیٹھا ایک انیچھی ایسے شاعر سے زبردستی ان کی نظم سن رہا تھا، کان کھڑے کر کے بولا: "تم کو کسم پورے کی تازہ ترین خبریں معلوم ہیں؟"

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "دھن نند جو لا مکھی کے منہ پر بیٹھا ہے۔" وہ کہتا رہا۔ "اتنی بڑی فوج کا خرچ دیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔" پھر جو گیشور نے مڑ کر کہا، یہ شراوستی میں وقائع نویس تھا، "دودھ، دہی، نمک، کھانڈ، گھاس، لکڑی، پھل، پھول، ترکاری،

بیگار، ڈھور ڈنگر — ہر چیز میں سرکار اپنا حصہ بٹا رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو پرجا چپ رہے گی—؟'

ملک کے سیاسی حالات پر زور شور سے گفتگو شروع ہوگئی۔ گوتم ایک طرف کو خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے۔ واقعات دہرائے جا رہے تھے۔ رائیں دی جا رہی تھیں۔ ان سب میں شامل اور سب سے الگ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ خود بھی اپنے تئیں بحث مباحثے میں شامل پایا۔ کبھی وہ جوش میں آکر زور سے بولتا کبھی ہنستا کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑنے لگتا۔ لیکن ایک گوتم نیلمبر کٹیا سے باہر موجود تھا۔ جنگلوں میں گھوم رہا تھا۔ سرجو کی لہروں کو عبور کرنے میں مصروف تھا۔ ترائی کے نرکلوں میں گھاس پر سر رکھے لیٹا تھا۔ جبکہ یہ گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں سے مگدھ کی سیاست پر تبادلۂ خیالات کرنے میں منہمک رہا۔

مگدھ میں ان دنوں نندوں کی حکومت تھی جو خدائے دولت کُبیر سے بھی زیادہ امیر تھے۔ مگدھ ملک کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ ایک زمانہ تھا جب کوشل بھی عروج پر تھا۔ اجین کے بادشاہ مہاسین نے یہاں کی شہزادی سے شادی کی تھی۔ مہاکوشل اور اور پرسن جیت جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں۔ عہدِ عتیق میں، جب ایودھیا اس سارے دیس کی راجدھانی تھی، اس کے سورما شہزادے دور دور دکن اور لنکا تک مہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے۔ ایودھیا کے شاہی خاندان کی ایک شاخ نے شراوستی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکیہ اور کاشی کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کوشل کی طاقت کی ٹکر جنوبی مگدھ سے ہوئی۔

مگدھ والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گڑبڑ پھیلاتے آئے تھے۔ یہاں کا ایک راجہ جراسندھ جنگِ عظیم میں سری کرشن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا اور بھیم کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ پرستان کا ایسا شہر گری وُرج اس کا پایۂ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زور آور تھا۔ مہابھارت میں لکھا تھا کہ بھوج ہنس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر پچھم بھاگ گئے تھے۔ گری ورج کے قلعے میں سینکڑوں بادشاہ اس نے قید کر کے رکھے تھے، جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں، اور انہیں سری کرشن دیو کی یتر نے آکر آزاد کیا تھا۔ اسی جراسندھ کے باپ راجہ برابدرتھ نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور و فکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رانیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور رشیوں میں جا کر فلسفی سا کیا نہ کا بیلا بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکشش جنم لیں گے۔

مگر جنگِ عظیم سے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متھلاپوری کی راج دلاری ایودھیا کے

شہزادے سے بیاہ کر آئی تھی۔ کوشل دیس کی اس بہو کا نام سیتا تھا۔

ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں کبھی نہ آیا تھا۔ یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی۔ ان کی اونچی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا اور مگدھ کے برہمن اور کشتری بھی کوشل دیس والوں کی نظروں میں حقیر تھے۔ پچھلی دونوں صدیوں میں شیش ناگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی۔ اس خاندان کے بادشاہ بھیم بسار کے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھارتھ نے اپنے فلسفوں کا پرچار کیا تھا۔

— زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کنڈگرام میں پیدا ہوا۔ اہنسا کی تلقین کرتا سارے دیس میں گھوما ——— اور پھر دور ونگا کے گھنے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ کپلاوستو کے لمبنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو گری ورج کی سبز پہاڑیوں پر چلا۔ نرنجن ندی میں نہایا۔ پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا۔ شراوستی اور کاشی کے باغوں میں، جہاں ہرن کلیلیں بھرتے تھے، اس نے وعظ کہے اور جو کوسی نگر میں مرا۔

بھیم بسار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے۔ اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا۔ اس کے چاروں اور سرسبز پہاڑیاں تھیں اور خوبصورت دریا اور اس کی سرزمین شاداب تھی اور سونا بہا کر لانے والی سون ندی اس میں بہتی تھی۔

کوشلا دیوی۔ شراوستی کی شہزادی۔ مہاراجہ پرسین جیت کی بہن۔ بھیم بسار کی ملکہ نے گری ورج کے اثر میں راج گیر آباد کیا۔ لیکن اس کے بیٹے اجات سترو نے اپنے باپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا اور خود سنگھاسن پر جا بیٹھا۔ رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی۔ تب شراوستی کے پرسن جیت نے گرج کر کہا: "میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی۔" اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں اور کوسی نگر اور ویشالی اور شراوستی مگدھ کے مقابل میں صف آرا ہوئے۔

تب مگدھ کے وزرا نے ویشالی والوں کے حملے روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی۔

مگر اجات سترو جیتا اور اپنے ماموں، راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا۔ اس کے پوتے اودے نے کسم پورہ آباد کیا۔ پاٹلی گرام۔ پشپ پورہ۔ پاٹلی پتر۔ پھولوں کا شہر۔ پریوں کا شہر۔ ملک کا سب سے عظیم الشان دارالسلطنت۔ جہاں سون ندی کے کنارے کنارے دیش ناریوں کے نقرئی

بجرے تیرا کرتے۔ جہاں پاٹلی کی کلیاں بالوں میں سنوارے سنہری آنکھوں والی سوناکشی لڑکیاں مرمریں چبوتروں پر رقص کرتیں۔

اور گوتم سدھارتھ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ شہر آگ اور سیلاب اور جنگ کے نذر ہوگا۔ اودے، اس شہر کا بانی، ایران کے شہنشاہ داریوش اوّل کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا۔

گوتم نیلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی۔ اکلیش اور جو دوسرے طالب علم تکشلا سے واپس آتے گوتم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے ملک کے متعلق پوچھتا۔ پارسیکاؤں کے شہنشاہ، جو بہت زبردست اور مطلق العنان تھے، (ان کی راج نیتی کے اصول جانے کیا ہوں گے؟) ان کے مذہب میں اگنی کی پرستش مقدم تھی۔ وہ ویدوں کے سارے خداؤں کو پوجتے تھے۔ وایو کے علاوہ، جسے وہ وامیو کہتے تھے، وہ سورج دیوتا متر اکو مانتے تھے۔ ان کی زبان سنسکرت کی بہن تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریہ تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں؟ گوتم نے اداسی سے کہا۔ انسانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیے۔ کسی ایک قوم کا دوسری قوم کو تسخیر کرنا، کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی بیخ کنی کرنا غلط ہے۔ اخلاقی گناہ ہے۔ سیاست کے نظریے کی بات مت کرو کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی کو کھاتی ہے۔

ایرانیوں نے جب گندھارا دیس پر حملہ کیا وہاں کے راجہ نے بھیم بسار کے پاس اپنا سفیر بھیجا تھا۔ ہخامنشی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر پچھمی علاقوں کو اپنا باج گزار بنائے رکھا۔ سب سے زیادہ چاندی یہیں سے ایرانی خزانے میں داخل کی جاتی تھی۔

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی۔ اتنی زبردست کہ ایک لمحے کے لیے اسے احاطۂ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا۔ اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اتراپتھ صوبے بھی شامل تھے اور سرپوشش کے بعد دارا نے کہا تھا: "میں دارایوش ہوں۔ شہنشاہ۔ شاہوں کا شاہ۔ ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں۔ اس وسیع و عریض زمین کا حاکم — گشتاسپ کا بیٹا۔ ایرانی۔ ایرانی کا بیٹا۔ آریہ۔ آریہ گھرانے کا فرزند —" اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پر تیرتے تھے۔

اور داریوش اوّل کے بیٹے ارتخشیر نے اتراپتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا:
"یہ علاقے، جہاں دیو پوجے جاتے تھے، اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان دیووں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دیں۔"

"سُوس کی کیا خبریں ہیں، تم تو وہاں ہو آئے ہو۔" وقائع نویس نے اکلیش کو مخاطب کیا۔
"پچھلے دنوں کچھ تاجر پرسی پولس سے جان بچا کر تکسشلا آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایران میں بہت زبردست لڑائی چھڑی ہے۔"
"کہیں اور جنگ چھڑ گئی۔۔؟" دملیشور نے دوسرے کونے سے سر اٹھا کر سوال کیا۔
"یاونوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹکارا پایا ہے، ایرانی سلطنت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ تمھیں ایک بات بتا دوں،" اکلیش نے گوتم کو مخاطب کیا، "دشنوگپتا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمارے دیش کو بھی ایک چترانت ریاست کی ضرورت ہے۔ جس کی دنیا کے چاروں کھونٹ تک وسعت ہو۔ مضبوط سامراجیہ۔"
"مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہیے۔" گوتم نے کہا۔
"ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی۔" اکلیش اطمینان سے کہتا رہا۔ "پچھلے دنوں اردشیر سوئم قتل ہوا۔ پھر اس کے بیٹے کو زہر دیا گیا۔ ان کے یہاں اتنی خون کی ندیاں بہی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انھیں کوئی بھائی بھتیجا زندہ نہ ملا اور وہ ایک دور کے عزیز دارا کو پکڑ کر لائے۔ پرسی پولس کے تاجر کہتے تھے کہ دارایوش سوئم بہت بہادر بادشاہ ہے لیکن اس غریب کو یاونوں کے سیناپتی سکندر نے شکست دی جو دور پچھم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا ہے۔"
گوتم سنتا رہا۔ بھاری فوجیں۔ خون کی ندیاں۔ شکست فتح۔ اکلیش کتنے مزے سے یہ خوفناک واقعات بیان کر رہا تھا۔
"اور اب سارا ایران سکندر کے ہاتھ میں ہے۔" اکلیش نے بات ختم کی۔
"یعنی پارسیکاون کی چترانت ریاست کا مالک، اب جس کا تم نے نام لیا۔ سکندر، یہ ہے؟" گوتم نے ہلکے سے تبسّم کے ساتھ پوچھا۔ "ہاں۔ وہی ہے۔" اکلیش نے یکلخت ذرا ہچکچا کر

جواب دیا۔ وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا۔

"بھائی اکلیش تم کھشتری ہو۔ حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینکنا تمھارا کام ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھا سکتا ہوں۔" گوتم نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔

"گوتم۔" اکلیش نے چراغ میں تیل ڈال کر اسے پھر وسط میں رکھ دیا اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگا۔ "دو تم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑا تو کیا تم لڑنے سے انکار کرو گے؟"

گوتم اکلیش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا۔ یہ سوال وہ مدتوں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو بغیر لڑے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ اسے جو فنونِ جنگ سکھلائے گئے ہیں کیا وہ انہیں استعمال کرے گا؟

"تم سمجھتے ہو پرجا چپ رہے گی۔" کٹی کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا جوگیش وملیشور سے کہہ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" دوسرے نے جوش سے جواب دیا۔ "کوئی دن جاتا ہے — کوئی دن — دیکھ لینا —"

گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو مگدھ کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔

اجات سترو کے پوتے کے بعد مہاپدم نند پاٹلی پتر کے تخت پر قابض ہوا۔ اس کی ماں شودر تھی باپ نائی۔ یہ مہا پدم پتی نند تھا — بے حد و حساب دولت کا مالک — اور اگر سین تھا۔ زبردست فوجوں کا سپہ سالار۔ اس کے بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اس لیے یہ خاندان نو نند کہلایا۔ اس کا آٹھواں بیٹا دھن نند تھا جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے پٹے پڑے تھے اور جس کے لشکر میں بیس ہزار سوار، دو لاکھ پیادے، دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے۔ اور جو محصول بڑھائے جا رہا تھا اور جس کی پرجا بے چین تھی۔

سارے دیش میں برہمنوں اور کھشتریوں کا راج تھا۔ سندھو کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی۔ لیکن مگدھ میں مہا پدم پتی نند کے عہد سے کھشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کا آغاز ہوا تھا۔

شراوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے۔ برہمنوں کا احساس

برتری۔ آریوں کے اس دور کی یادگار تھا جب انھیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی۔ اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کیتھک معاشرہ کاہنوں، جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقوں میں بٹا ہوا تھا اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہرحال کوئی علاج نہ تھا۔

اور گو طالب علم کا فرض تھا کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے لیکن گوتم اور اس کے جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہرحال برداشت نہ کر سکتے تھے۔

پاٹلی پتر کا دھن نند جوا لامکھی کے دھانے پر بیٹھا تھا۔

(۵)

ایک روز طالب علموں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہری شنکر بھی آشرم میں آن موجود ہوا۔ گوتم، جو اس سمے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا، اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"میں اندر آجاؤں ۔۔۔؟" دہلیز پر پہنچ کر شنکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آؤ ۔۔ آؤ ۔۔ کیسے آنا ہوا ۔۔" گوتم نے گلہری کی دم کا موقلم اور رنگوں کی کلھیاں اور سفید چینی پتہ ایک طرف کو سمیٹتے ہوئے ہڑبڑا کر کہا۔

ہری شنکر آتے کے ساتھ ہی چینی پٹے کو غور سے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑو دے کر چٹائی بچھائی۔ بھوج پتر، ریشم اور تانبے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کا جو انبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا۔ دوسرے کونے میں گنتی کے چند برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ کھڑکی کے نزدیک اس کا کمبل بچھا تھا جس پر رات کو وہ سوتا تھا۔ اس کا کشکول چھپر کے ایک بانس میں ٹنگا تھا۔ کٹیا میں اس وقت خاصی بے ترتیبی تھی۔ گوتم کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ ہری شنکر کی سحر انگیز اور پرسکون شخصیت سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ جانے مجھے یہ کیسا بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔

پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جٹ گیا۔

اس نے ٹھنڈے پانی کی گڈوی ہری شنکر کے سامنے رکھ دی۔ پھر برآمدے میں جاکر چولھا روشن کیا اور چاول ابالنے کے لیے چڑھا دیے۔

ہری شنکر متبسم انداز سے اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھتا رہا۔ گوشت کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ چادر کندھے پر ڈال کر باہر جانے کے لیے اٹھا۔

"کہاں جاتے ہو؟" شنکر نے چونک کر دریافت کیا۔

"بستی سے ماس مانگ لاؤں۔ ابھی آیا۔"

"ماس —" ہری شنکر کے خوبصورت چہرے پر کرب کی لہر دوڑ گئی۔

"ارے —" گوتم دفعتاً چپ ہو گیا۔ اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی۔ اسے اپنی بیوقوفی پر سخت غصہ آیا۔ وہ جانتا ہے کہ ہری شنکر بھکشو ہے اور اہنسا کے اس نئے اصول کا قائل۔ پھر اسے شنکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا۔ کیونکہ وہ خود مدتوں سے ماس کھانے کے لیے بے چین ہے لیکن برہمچاریہ کے قوانین کو توڑ نہیں سکتا اور یہ انوکھا بے تکا بھکشو اسے بہت عزیز ہے اور اپنی عزیز ہستی کو اپنی پسندیدہ ترین شے ہی پیش کر کے دل کو خوشی ہوتی ہے۔ اس طور پر اپنی حماقت کا تجزیہ کر کے اسے ذرا اطمینان ہوا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ شے ہے جسے وہ سرجو کے اس پار چھوڑ آیا ہے۔ غالباً وہ دونوں چھوڑ آئے ہیں اور اسے ہری شنکر جانتا ہے۔ اور حسد کا جذبہ اس کے دل میں امنڈا اور اس کے چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔

پھر وہ ہری شنکر سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ اتنے دنوں کہاں رہا؟ کہاں کہاں گیا؟ کیا کیا سوچا؟ کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغلہ تھا۔

اس کے بعد اس نے شنکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے۔

"تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو؟" شنکر نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں —!" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"براہمن — ایک بات بتلاؤ —"

"ہوں —"

"خواہشیں تم کو بہت ستاتی ہیں —؟"

"یعنی"
"مثلاً یہی۔ ماس کی خواہش۔"
"پتا نہیں"
"تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے؟"
"آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔ مگر کس طرح کی قربانی۔ جان کی ــــ یا روح کی ــ؟"
"جو بھی شے تمہارے تصرف میں آئے گی وہ گویا اپنے وجود کی قربانی تمہیں دے گی۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"تم خوب سمجھتے ہو۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اگر ـ" گوتم نے گھبرا کر بات ٹالنا چاہی۔ "اگر میرے پس منظر میں خون ہے۔ میرے چاروں طرف خون ہے۔ میں اتنے سارے خون کا کفارہ کس طرح ادا کروں گا ــ؟"

ہری شنکر خاموش رہا۔ پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شکاریوں کے بالوں میں سجے ہوئے پر ہوا میں لہراتے تھے۔ ندی کے اس پار کھشتری امیر زادے اپنے باغوں میں تیر اندازی سیکھنے میں مصروف تھے۔ زندگی جاری تھی۔

"مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتلاؤ ـ"

"تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے۔ میری زندگی سے علیحدہ ہے۔ میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا۔"

گوتم نے دھیرے سے کونے میں جا کر ایک تاڑ کا صاف پتہ اٹھایا۔ "مجھ سے اس کے متعلق باتیں کرو۔ میں لکھوں گا۔ وہ ـ" اس نے قلم نکالا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"میں اپنی کتاب کا دوسرا باب لکھوں گا۔"

"لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا ــ؟"

"سارے میں تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے جس میں ہم اور تم پتوں کی طرح ڈول رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری مجھ پر ہے یا نہیں ہے ـ؟ بتاؤ ــ

یں کیا لکھوں ــ" گوتم نے پوچھا۔

"وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب خواب کی طرح گزر رہا ہے ــ گزر جائے گا ــ" ہری شنکر نے جواب دیا۔

"گزر جائے گا یا گزرتا رہے گا ــ؟" گوتم نے پوچھا۔

"یہ تمھارا اپنا مسئلہ ہے۔"

"مجھے اہنسا کے متعلق بتاؤ ــ"

"برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو ــ؟" ہری شنکر نے ہنس کر پوچھا

گوتم بھی ہنسا۔ "ہاں بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا؟" اس نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا۔

جانوروں کو مارنا ہزاروں برس سے برہمنوں کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ جب یہ آریہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا۔ اسی وجہ سے گنگا اور جمنا کے اتر ویدی علاقے میں آن کر بسنے کے بعد بھی ان کی معرفت اور ان کے فلسفے کے ارتقاء میں جانوروں کے خون بہانے کا بڑا دخل رہا۔ ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں تھی۔ خود تخلیقِ کائنات، مابعد الطبیعات کے نقطۂ نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی۔ سام وید کے اصولوں کے مطابق قربان گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی اور کائنات کی کلیت اور اس کے بقاء کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ چکرورتی راجہ کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی۔

کھیتوں کے اس پار الاؤ روشن کیے جا رہے تھے۔ بہت دور گاؤں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی۔ بھاٹ جنگ عظیم کی داستان سنا رہا تھا۔ شام کے مکمل سناٹے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کٹیا سے آ ٹکرائی، پھر خاموشی چھا گئی۔ کبھی کبھی مجمع تحسین و توصیف کے نعرے بلند کرتا۔ پھر ان سب پر بھاٹ کی آواز غالب آ جاتی۔ مردنگ زور زور سے بجائی جا رہی تھی۔ اس کی مدھم سی گونج کے ساتھ گوتم کا دل دھڑک اٹھتا۔ اس کے بعد ہوا تھمتی تو پھر خاموشی چھا جاتی۔

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا۔

یہ سناٹے مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں۔ الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں ــ گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور ہری شنکر کو دیکھتا رہا۔

قربانی کا تصور۔ لڑائی کا فلسفہ ۔۔۔ جنگ اور امن کا مسئلہ۔ یہاں برہمن تلوار لیے گھومتے تھے اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے۔ ورن اور جاتی کی تفریق ابھی شدید نہیں تھی۔ نیتی شاستر، ویدوں اور اتہاس پُرانوں کی تعلیم برہمن اور کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی۔

ویدوں کے عہد میں ہتھی کرت اگنی ۔۔۔ راستے تیار کرنے والی مقدس آتش ۔۔۔ کی عبادت گھنے جنگلوں میں پگڈنڈیاں بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی۔ پورب میں گوتم نیلمبر کے سفید فام ہم قوموں نے ناگاؤں کو اپنی تہذیب کے دامن میں سمیٹا۔ پچھم میں سندھو کے کنارے بسے ہوئے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا۔ ہری یو پیا کا نگر میدانِ کارزار میں تبدیل ہو گیا جہاں اندر کے زرہ بکتر میں ملبوس ۔۔۔ سپاہی لڑے اور فتح یاب ہوئے۔ سندھو کا شہر ۔۔۔ جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے، ماتھے پر تلک لگائے، گلے میں سیاہ پوتھ پہنے، کندن کے رنگ والی سہاگنیں شیو، درگا، دیپ لکشمی اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتارتیں۔ یہ لوگ، جنھوں نے اپنے تمدن کو راجستھان، سوراشٹر اور پچھمی اتر پردیش تک پھیلایا تھا، ایک روز شمال مغرب کے اونچے پہاڑوں کے اس پار ۔۔۔ کسی انجانے دیش سے۔ گویا اندر مہاراج کا سبک رفتار جنگی رتھ آیا اور ان سب کو روندتا ہوا نکل گیا۔ برہم ورت پہنچ کر یہ سنہرے رتھ رُکے اور ان لوگوں نے اندر پرستھ آباد کیا اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی۔

اب تہذیب کے مرکز اندر پرستھ اور یادو خاندان کی راجدھانی سے ہٹ کر مشرق تک آچکے تھے۔ یہ ایودھیا اور شراوستی اور راجگیر کے عروج کا زمانہ تھا۔ مگدھ اور اتر کوشل کے انتہائی مہذب باشندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانتے تھے۔

گوتم نیلمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پُر تھی۔ ان میں سے بہت سے نام اب روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے، جس طرح بھارت کی اونچی چوٹیوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے۔

گوتم کو ماضی سے ڈر لگتا تھا۔ کیا ضرورت تھی، کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ تسلسل قائم تھا ۔۔۔ جاری و ساری ۔۔۔ اور کب تک ایسا رہے گا؟ ڈگ وجے شری رام چندر کے عہد سے دواپار شروع ہوا تھا، جس کا اختتام جنگِ عظیم پر ہوا مہابھارت کے بعد۔ سری کرشن کے عالمِ موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی یگ شروع ہو گیا۔ جو اب تک باقی تھا۔

اس کالی یگ میں کیا ہوگا۔؟

پرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں جن میں کائنات کی مادے سے تخلیق کا بیان تھا اور خداؤں اور فلسفیوں کے قصے اور شاہی خاندانوں کے نسب نامے۔ پراکرت کی تاریخوں پر ان

قصوں کی بنیاد تھی جو صدیوں سے درباروں اور چوپالوں میں داستان گو سناتے آرہے تھے۔ ان پُرانوں میں چالیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے جو وشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کیے جاتے تھے۔ پرانوں کے مطابق ارجن کے پوتے کے وقت سے لے کر، جس کے دربار میں پہلی بار جنگ نامہ مہابھارت سنایا گیا تھا، مہا پدم نند کے عہد تک ایک ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا۔ ارجن سے لے کر اودے تک چوبیس پشتیں گزر چکی تھیں۔ اودے کے دورِ حکومت میں شاکیہ مُنی پیدا ہوئے۔

گوتم نیلمبر نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا جو بڑی دلچسپی سے پیتل کی ایک تختی پڑھنے میں مصروف تھا۔ کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔ گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔

اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہوگا کہ کون کس سے برتر ہے، کس نے کس پر فتح پائی، کون کورو ہے کون پانڈو؟

جنگ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کوروکشیتر میں لڑی گئی تھی اور ہستناپور کے ان بہادروں کے قصے، جنھوں نے دروپدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندرپرستھ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا، گانے والے دنیا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے ــــــــ سورماؤں کا تذکرہ رگ وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھلائی دیتی تھی۔ بادلوں کی گرج۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ عظیم معرکے۔ دلاور سورما۔ نورانی رشی۔ آسمانی سنگیت۔ پری وش لڑکیاں۔ شکنتلا۔ دمینتی۔ کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا۔ یہ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہوں گی۔ انھی جگہوں پر چلتی پھرتی ہوں گی۔ یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سا لگتا کہ ایک وقت تھا کہ نربدا اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔ دمینتی برار کی راجکماری تھی۔ سیتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی گنگا کے اتر میں گنڈک ندی کے کنارے کنارے آباد تھا۔ پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا اور یہ وقت، جس میں وہ زندہ تھا، وہ خود، گوتم نیلمبر برہمن، ہری شنکر بھکشو، جو کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا اور ڈیوڑھیا کی چق پیک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم — یہ سب کے سب ایک آن میں ماضی کے

دھندلے، ناقابلِ یقین، غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے جن کی کائنات کے وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ بھیم۔ دریودھن۔ کرشن۔ ارجن۔

اگر مجھے کسی جنگ میں شامل ہونا پڑ گیا تو کیا میں لڑوں گا ــــ؟ اس نے چوروں کی طرح ہری شنکر کو دیکھا۔ اکلیش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ چھڑ جائے گی۔ "تم لڑو گے؟" اس نے یکلخت باآوازِ بلند سوال کیا۔

"ہم محض اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں۔" ہری شنکر نے جواب دیا۔

"لیکن کیا تم لڑو گے ــ؟" گوتم نے ضد سے دہرایا۔

"ہر انسان سے اس کے افعال ضرورت یا حادثے یا اس کی فطرت کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ خود مختار نہیں ہے۔ ذمہ داری کے کوئی معنی نہیں۔" ہری شنکر تختیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا۔

دفعتاً دریا پر بہت سی روشنیاں جھلملا اٹھیں۔

"کسی کی بارات جا رہی ہے۔" گوتم نے اظہارِ خیال کیا۔

"ہُوں۔"

"یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کا رخ کیا ہو۔"

"چلو باہر چلیں۔ اندھیرے میں میرا دم گھبراتا ہے۔" ہری شنکر نے یک بیک وحشت زدہ ہو کر کہا۔

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آ گئے۔ بارشوں کا زمانہ ــــ ختم ہو چکا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی۔ چوپال کی طرف سے بھاٹ کی گانے کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی۔

گوتم خاموشی سے شنکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر ٹھٹھک کر اس نے اداسی سے کہا: "تم خود پرست ہو ہری شنکر۔ تم کو دوسروں کی پرواہ نہیں۔ اپنے ذہن کے بل پر اپنے آپ کو ارہت کے درجے پر پہنچا دینا کون بڑی بات ہے۔ تم کو اس سے کیا غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔"

"مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔" ہری شنکر نے مختصراً جواب دیا۔

"آؤ ادھر چل کر دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔"

گوتم چپ ہوگیا۔ وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے۔

"تم بھیشم کا قصہ سنو گے؟" مجمعے کے قریب پہنچ کر گوتم نے ذرا غیر یقینی انداز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"کیا حرج ہے۔" اسے جواب ملا۔

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعظیماً ان کے لیے جگہ خالی کردی۔ بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنا رہا تھا۔ گوتم نے اسے پہچان لیا۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پرنام کیا اور خود بھی قصہ سننے میں مصروف ہوگیا۔

یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح گاتے بجاتے اور ان داستانوں پر سر دھنتے چلے آ رہے تھے۔ رگ وید کے زمانے میں اندر اور دوسرے خداؤں کی تقدیس کے لیے الاپے جاتے۔ بادشاہوں کے اشومیدھ (گھوڑے کی قربانی) منعقد کروانے والے فرمانروا کے قصیدے پڑھے جاتے: "اس نے ایسے ایسے دان دیے۔ ایسی ایسی لڑائیاں لڑیں۔ ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں۔" اور کاہن ہوتر اسے کہتا: قصے کا آغاز کرو۔ قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اوپر اٹھاؤ۔ شام پڑے بربط نواز اتر مندر راگ کی دھن میں رزمیہ گیت چھیڑتے۔

عہد عتیق میں ارجن، واسو دیو اور دوسرے بہادروں کے درباروں میں اسی طرح وینا، مردنگ اور شنکھ کی سنگیت میں یہ نغمے الاپے گئے تھے۔

یہ سلسلہ ہے ۔۔۔

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا۔ بعد میں درباری شاعری نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔ اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم ہو رہی تھیں اور شاعر، جو پہلے درباروں سے وابستہ تھے، اب گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے۔ رسمی اور باضابطہ مذہب کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ خالص رزمیہ شاعری میں مذہبی عنصر شامل ہو رہا تھا۔ پروہتوں نے مہابھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا۔ کھشتری بھاٹ کی جگہ برہمن داستان گو نے حاصل کر لی تھی۔ تاریخ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ تاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لبادہ اوڑھ چکے تھے۔

اب داستان گو کاشی کے راجہ کی تینوں بیٹیوں کی کہانی بیان کر رہا تھا جن کو بھیشم عین اُن

کے سوئمبر کے وقت لے اڑے تھے۔ کچھ دیر بعد ارجن کا قصہ شروع ہوا۔ گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ ہری شنکر ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا۔

یہ ارجن بھی خوب شے تھے۔ گوتم نے سوچا۔ سب سے پہلے انھوں نے دروپدی سے بیاہ رچایا۔ جب بارہ برس کی بن باس انھیں ملی تو وہ سری کرشن کی بہن سبھدرا کو بھگا لے گئے۔ جلاوطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چترانگدا سے شادی کر لی۔ ان سب کے علاوہ بھائی ارجن نے الوپی کو بر چایا وہ الگ۔ گوتم کو ہنسی آگئی۔ وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا۔

اس وقت تک دونوں فریق کوروکشیتر کے میدان میں آمنے سامنے پہنچ چکے تھے۔ رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے سے جنگ کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ بہادر سورماؤں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اصل موضوع تھا۔ شہرت حاصل کرنا سورما کا مقصدِ حیات تھا اور اپنی شجاعت پر نازاں ہونا اس کے لیے جائز۔ اس کے حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کا ہم پایہ ہو۔ بادشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت انسانوں سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ جس وقت گوتم سبھا سے اٹھ کر باہر جانے لگا اس سمے ارجن للکار کر کرن سے اس کا شجرۂ نسب دریافت کر رہا تھا۔

مہابھارت کے یہ سارے کردار جنگجو ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھے۔ یہ روایتیں نہیں تھیں تاریخی شخصیتیں تھیں۔ حتیٰ کہ نیم اوہام کردار بھی صحیح تھے جن کی دیوی لکشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی اور جن کی جٹاؤں سے گنگا بہتی تھی —— کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعرا کے زورِ تخیل کا بڑا قائل تھا اور دیومالا بہرحال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی اور روایت کا جال بن لینا ذہن کے لیے بہرحال آسان ترین بات ہے۔ گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرنے ہی آئے ہیں۔ اور شنی اگر اپسرا تھی تو کیا وہ لڑکی جو ایودھیا کے گھاٹ پر بیٹھی تھی کوئی بگلا کوی اسے اپسرا نہیں سمجھے گا تو اور کیا سمجھے گا۔ کیا وہ اس روپہلے پانی کے کنارے بیٹھی جل پری نہیں معلوم ہو رہی تھی؟

سڑک پر آ کر تاروں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا۔ بھاٹ کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ بھیم۔ ارجن۔ کرن۔ بھیم۔

جگمگاتے ہوئے بجرے دریا کو پار کر چکے تھے اور دور سے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ "یہ کسی کی بارات ہے؟" — اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا۔

"نہیں تو۔ راجن ایودھیا سے آئے ہیں۔" راہگیر نے جواب دیا۔

گوتم نے چونک کر شنکر کو آواز دی۔ پھر پلٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن شنکر حسبِ معمول

غائب ہو چکا تھا اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں، جو چوپال کے باہر جمع تھی، شنکر کا پتا چلانا لاحاصل تھا۔

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

وسط شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلائی پڑیں۔ وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا۔ سنہرے اور سبز اور گلابی مکانوں پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ ایک عورت لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے چھاگل بجاتی قریب سے گزر گئی۔ تاڑی خانوں میں ہڑبونگ مچ رہا تھا۔ دکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بازار کی سڑک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیرزادے اور بانکے زرتار کپڑے پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس ہجوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا اچنبھا سا ہوا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا۔ جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت پتوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس عمارت کے سامنے جھیل تھی۔ جھیل میں ایک اکیلی ناؤ جس کا ملاح مسافروں کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا سو چکا تھا۔

اس عمارت میں سوسال ادھر شاکیہ مُنی آ کر رہے تھے۔ اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے۔ صرف سوسال ادھر۔

گوتم کا جی چاہا وہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے۔ مگر قریب جانے کے بجائے وہ پھر آدھے راستے سے لوٹ آیا اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

آزادی نہیں ہے۔ آزادی نہیں ہے۔ کھلی فضاؤں میں، سرساگر کی لہروں میں، ذہن کی وسعت میں — آزادی کہیں نہیں ہے۔ میں بندھا ہوا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکوں گا۔

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ — ناموں کا تسلسل — زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے۔

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا جہاں اکلیش اور دوسرے طالب علم جمع ہو چکے تھے۔

(۶)

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کو دیکھا۔ "یہ ہے — یہ ہے۔" انھوں

نے کہا۔ "یہ نہیں ہے — یہ نہیں ہے۔"

"ہاں۔" گوتم نے جواب دیا۔

"قید کی حالت میں آنند مایا سب سے بڑی مسرت ہے جو جیو حاصل کر سکتا ہے۔" گرو نے کہا۔

"آنند مایا سب سے بڑی مسرت ہے۔" گوتم نے دہرایا۔

"مقید روح کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے۔ وہ جسے بار بار جنم لینا ہے۔"

"میرے پرکھ —" بھاٹ کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی۔

"اور روح دھوئیں اور رات اور اماوس کی اندھیری تاریکیوں میں سے گزرتی ہے۔ وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا۔ وقت سے تم نہیں بچ سکتے اور اپنی اصلی حالت کو پاکر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی۔"

گرو نے مزید کہا: "وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں، کوئی منطق، کوئی طاقت۔ وقت پر تمہارا قابو نہیں رہ سکتا۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے۔"

"لیکن آنکھیں کہاں ہیں —؟" گوتم نے سوال کیا۔ "پراکرتی اندھی ہے اور پرش لنگڑا راہی جو اندھی پراکرتی کے کندھے پر سوار ہے۔"

"پراکرتی اندھی ہے اور بے حس۔" گرو نے جواب دیا۔ "پرش اسے دیکھتا ہے تو شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور داخلی اور ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقاء ہوتا ہے اور ادراک اور خیال کی تخلیق۔ پراکرتی ابدی ہے۔ ہمہ وقت مصروف عمل۔ جب تک پرش کی نظروں میں رہے ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہے۔ بے حس مادہ ذہن کی جوت سے روشن ہو جاتا ہے۔ ذہن میں بڑی طاقت ہے۔"

"ذہن میں بڑا خطرہ ہے۔" اکلیش نے کہا۔ "ویدانت میں لکھا ہے گیان نیکی اور بدی سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ خیر و شر مایا میں شامل ہیں اور گیان مایا سے نجات دلاتا ہے — میں گیان سے عاجز آ چکا ہوں۔"

گرو نے کہا: "ادراک انانیت کے بغیر کام نہیں کر سکتا لہٰذا دنیا کو خارجی اور داخلی میں تقسیم کرنا مجبوری ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ باقی دوسری چیزیں۔ برہما ایک ہے۔ جیو آتمائیں بہت سی ہیں۔ جو کچھ ہے وہ اس کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے حیات کی وجہ نہیں ہیں۔ پراکرتی رقاصہ ہے۔ پرش اسے

دیکھ رہا ہے۔ جب وہ اس کی طرف سے آنکھیں ہٹالیتا ہے تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی کیونکہ دوسرے پرش اسے دیکھ رہے ہیں۔ بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کردیتی ہے۔ پرش باہر اندھیری رات میں آکر آزاد ہوجاتا ہے۔"

"لیکن دکھ کون سہتا ہے؟ — پرش یا اس کی پراکرتی —" گوتم نے سوال کیا۔

"دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے۔ مقید زندگی کا احساس بذاتِ خود تکلیف ہے۔" گرو نے جواب دیا۔

"ویدانت والے کہتے ہیں کہ پرش ایک ہے۔ ایکم ست۔" اکلیش نے پوچھا۔

"ہاں اور کپل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا — تو اگر ایک انسان خوش ہوتا تو سارے انسان خوش ہوتے۔ ایک رنجیدہ ہوتا سب کے سب رنجیدہ ہوجاتے لیکن انسان اپنے اعمال، اپنی نسل اور اپنی زندگی کے ادوار اور وسان آشرم کے لحاظ سے مختلف ہیں۔" گرو نے کہا۔

"بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا ہے کہ پراکرتی کے گُن اعمال پر ہر طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں۔" اکلیش نے کہا۔

"اور شاکیہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں۔" گوتم نے دل میں سوچا۔

"پراکرتی کے گُن تین ہیں: نیکی، شدت اور تاریکی۔" گرو نے کہا۔

گوتم آہستہ سے اٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا اور دوبارہ ندی کی سمت چل دیا۔ کچھ دیر قبل جس طرح مباحث کی پاٹ وار آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا اب گرو اور اکلیش کی مدھم آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ ست کاریہ وار۔ اودیا۔ مایا۔ شکتی۔ پراکرتی۔ پراکرتی کے گن۔

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے خود کو ٹھنڈی گھاس پر گرا دیا۔

اپنشد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں۔ ماں ماں نہیں۔ دنیا دنیا نہیں۔ دیوتا دیوتا نہیں۔ چور چور نہیں۔ قاتل قاتل نہیں۔ اس کو نیکی و بدی کی فکر نہیں کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے۔

گوتم نیلمبر اب چوبیس سال کا ہوچکا تھا۔ اتنی مدت میں پہلے وہ سوفسطائی بنا۔ پھر اس نے شو کی پوجا کی۔ ہری کا بھگوت بنا۔ کپل کے نظریوں پر اس نے بسیط شرحیں لکھیں۔ اس نے اپنے ہمنام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا جس نے براہمنوں کے مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے

مسئلے پر سوچ بچار کیا تھا۔ ہری شنکر سے ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دلچسپی پیدا ہو چلی تھی لیکن اب تک وہ اس دیس کی ازلی اور ابدی سوچنے اور کھوجنے والی روح تھی جو کبھی اور کسی جگہ مطمئن نہ ہوتی تھی، جو برابر اس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح جانیں؟

وہ مدتوں سے اسی کھوج میں تھا۔

ہم کس طرح جانیں۔ یہ سب کیا ہے۔

وہ سہما ہوا گھاس پر لیٹا رہا۔ پچھلے پہر کی مدھم چاندنی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بہت سے گوتم جو بول رہے تھے، گا رہے تھے، لکھ رہے تھے، قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے، اداس سے، اچنبھے میں تھے۔ اسے اور زیادہ ڈر لگا۔ گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا جو چراغ کی روشنی میں اسے گھور رہی تھیں اور بالوں کی سفید جٹائیں اس کے کندھوں پر بکھری تھیں۔ اکلیش کا مسکراتا چہرہ۔ بازار کے لوگوں کی شکلیں نکیلی مونچھوں والے ناگرک۔ پرسکون چہروں والے بھکشو۔ چندھی آنکھوں والے پہاڑی۔ ان سب میں اسے اپنا آپ نظر آیا اور اسے اور زیادہ ڈر لگا۔ وہ آج کل اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گربھ گرہ میں چھپ جائے اور اندر سے کنڈی چڑھا لے۔ گربھ گرہ کے خیال پر اسے چنڈی کی بھیانک مورتی یاد آئی جس نے اسے سرجو کے کنارے ڈرایا تھا۔

یہ ساری دنیا مل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی؟ سب اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے۔ اس لشکر میں وہ گھاٹ والی لڑکی شامل تھی۔ ہری شنکر شامل تھا۔ گرو پر شوتم اور سارے پرانے اور نئے حکماء شامل تھے۔ خدا کا تصور شامل تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو ماسوا سے عاری کرنا چاہا۔ اس نے سوچا، کاش وہ کم از کم یوگا ہی کا ماہر ہوتا۔ کاش ایک لطیف سا خلا اس کے دماغ میں کہیں سے آ کر بھر جاتا۔ آخر اس کا کیا قصور ہے؟ اس نے تو ہمیشہ جاننے کی کوشش کی ہے۔

اسے وقت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سرک کے بیٹھ گیا۔ تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا جیسے وہ زمان و مکاں سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی

اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا۔ شکست خوردہ۔ بشاش۔ پر امید۔ رنجیدہ۔ انسان جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے۔ کائنات کا اوّلین ذی ہوش جسے یہ ساری چاندنی، سارے پھول، ساری ندیاں، سارا حسن دے دیا گیا ہے۔ اوّلیں روشنی کا زمانہ۔ اور برہما کا محل سنسان پڑا ہے۔ اس میں محض نور ہے۔ نور کی دنیا سے ایک ہستی آن گری ہے جو پرتش ہے اور اکیلا ہے۔

(اس اوّلین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اور نظر ڈالی اور اس نے دیکھا کہ دور دور تک بستیاں جگمگا اٹھی ہیں اور کھیتوں میں سرسوں لہلاتی ہے اور اودگاتری برہمن ست تانتو ساز کے سو تار چھیڑ کر سام وید کے گیت گا رہے ہیں اور اندورم جھم برس رہی ہے۔ باغوں کا نوجوان خدا اِندر لڑکیوں کی چنریاں اپنی پھوار سے بھگوئے ڈالتا ہے۔ سنہرے بالوں والے نوجوان آریہ سورما میدان میں رتھ دوڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان ہیں۔ یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاؤں کے پرستار نوجوانوں کا عہد ہے۔ شجاعت کا دور۔ طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے۔ یہ بے خوف نڈر انسان عناصر سے، ظلم سے، موت سے لڑتے ہیں۔ سوم رس پی کو رقص کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں۔ انھوں نے پھولوں کے نگر آباد کیے ہیں۔ مٹی کے فصیلوں والے پُور بنائے ہیں۔ لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں ———— پتھر کے قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ جمنا کی وادی میں گائیں چر رہی ہیں۔ رنگین پگڑیاں باندھے، بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے، مرگ نینی لڑکیاں پشپ کرما کے لیے پھول چن رہی ہیں۔ ہمالیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے۔ سبزہ زاروں میں دیویکا اور الکھ نندا اور بھاگرتی ندیاں گنگناتی ہیں۔ سریو اور ورنادتی کوشل دیس کو سیراب کر رہی ہیں اتر میں گیہوں کے کھیتوں کی گبھ اور وتستا اور ویاس آبیاری کرتے ہیں۔ جنوب میں نہاندی بہتی ہے۔

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے۔

دریا کی لہریں چاندنی میں رواں ہیں۔ گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اس نے تصور کیا:

وہ اس سمے دو ہزار سال قبل کی دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔ وہ اس خنک، آرام دہ، پیاری زمین پر بیٹھا ہے۔ یہ زمین اس کی زمین ہے۔ اسے اس زمین سے عشق ہے۔ صدیوں سے وہ اس زمین کو سینچ رہا ہے۔ اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں۔ دلفریب شہر بسائے ہیں۔ اس زمین پر اس نے محبت کی ہے۔

وہ سنہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے سنہرے رتھ پر دھرتی کو روندتا مغرب سے مشرق کی

طرف آیا تھا۔ اندر کی کمان اس کی معیت میں، پاربتی اس کے ساتھ ساتھ ناچتی آرہی ہیں۔ برہما کی بی بی سرسوتی نے اپنی بطخ پر سے جھک کر اس کے کان میں کہا ہے، علم تیرا ہے۔ گنیش نے سونڈ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

تخیل میں کتنی طاقت ہے — جس نے عناصر اور چرندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں۔ پرتھوی اور ورونا، اندھیرا آسمان اور اگنی اور اندر — عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اوّلیں مجسم تشکیلیں ہیں۔ ان کے ذریعے تسبیب کے قانون کو مزین کیا جارہا ہے۔ یہ دنیا کے اوّلیں فلسفی ہیں۔ فلسطین کی پہاڑیاں خاموش پڑی ہیں، اسرائیل کے نغمہ نواز ابھی پیدا نہیں ہوئے مگر ان شاعروں کی آواز برہم ورت پر جھکے ستاروں سے جاکر ٹکرا رہی ہے۔ یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں اور خدا کے بیٹوں کی للکار۔ انھوں نے فطرت کے اس عظیم انسانی ناٹک کو اتنے بہت سے حصوں میں منقسم کردیا ہے۔ ان کو کھوج لگی ہے، یہ سب کیوں ہے؟ اس کا مصنف کون ہے؟ اداکار کون؟ تماشائی کون؟ مترا روزِ روشن کو سامنے لاتا ہے۔ ہم سب کا دوست ورونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے۔ سوریہ روشنی کا خزانہ ہے۔ اوشا صبح کی کنواری۔ وایو ہوائیں چلاتا ہے۔ ماروت طوفان کے فرشتے ہیں۔ پُش دیوتا سڑکوں اور گلّوں کا نگہبان ہے۔ رودر آسمانوں کا چنگھاڑتا ہوا بیل ہے۔ عالمِ بالا کا سرخ سؤر —

اور ورونا — ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی۔ گوتم نے گھاس پر لیٹے لیٹے پہچانا۔ یہ اس کی اپنی آواز تھی جو دو ہزار سال قبل بلند ہوئی۔ وہ اونی شال لپیٹے، کانوں میں کرن شوبھا اور گلے میں نہرے رکھا پہنے ایک اونچی چٹان پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرمنڈل تھا۔ اس نے پکار کر کہا — کیونکہ اندھیرے آسمان کے نیچے وہ اس سمے تنہا کھڑا تھا:

اد ورونا — ہم نے اپنے رفیق، اپنے بھائی، اپنے دوست، اپنے ہمسائے یا کسی اجنبی کا دل دکھایا ہے تو تُو ہماری اس خطا کو درگزر کر۔

اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو —

اد ورونا اس کی سزا نہ دے۔

اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا:

میں، جو بیوقوف ہوں اور جاہل،

میں نے چاہا کہ دیوتاؤں کے چھپے ہوئے گھر کا پتا چلاؤں۔

میں نے منیوں سے پوچھا۔

وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا۔
کہیں یہ وہی خدائے واحد تو نہیں؟
پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟
وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا۔
وہ کون جنگل تھا، کون درخت، جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی ـــ؟
وہ کون تھا جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے گیا ـــ؟
یَم ـــ دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا چلایا ـــ اسے بھی جواب معلوم نہیں۔
پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا:
وہ طاقتور ترین دنیا کا باپ ہے۔
وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے۔
اس کے قہر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں۔
پھر اس نے پوچھا:
موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون چیز ہے جو انسان سے اس کے موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے؟ راجہ پرکرت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو ہر شے پر قادر ہے لیکن ہر شے سے علٰحدہ ہے؟

موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی:
وسیع مہربان دھرتی ـــ ماں ـــ اسے اپنی گود میں جگہ دے۔
نوجوان لڑکی، جو اُون کی طرح ملائم ہے،
تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی۔
دھرتی ـــ اپنے آپ کو دھیرے دھیرے جھکولے دے۔
اسے اپنے بوجھ سے نہ دبا۔
اسے آرام کرنے دے۔
اسے اس طرح چھپا لے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اوڑھا لیتی ہے۔
شمشانوں میں روشنی ہو رہی ہے۔

اگنی اس کو جلانا نہیں۔ اس کی کھال، اس کے جسم کو بھون کے نہ رکھ دینا۔
اسے کھا لینے کے بعد سے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا۔
جب یہ اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا تب خداؤں کی مرضی پوری ہوگی۔
اور ایسا ہو کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں۔ اس کی سانس ہوا میں تحلیل
ہو یا آسمان پر جائے یا زمین پر رہے جیسا اس کا مقدر ہو۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں پودوں کی
شکل میں پھر سے نمودار ہوں۔

(انسان بہت کمزور نکلا۔ جو اپنی ساری دھوم دھام، ساری شان و شوکت، سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے۔ شاندار شہر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ دریا غائب ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں۔ باغوں میں بسنت منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا۔)

ہر شے فانی ہے۔ صرف ستوپ باقی بچتے ہیں۔
مسرت بیکار ہے۔ دل کی لگن بیکار ہے۔ اب میں کسے پکاروں؟ — کس کی مناجات کروں؟
اندر کی مناجات کرو۔ رگ وید کے شاعروں نے کہا۔
اندر کی مناجات کرو۔ آوازِ بازگشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں گونجی۔
اندر کی مناجات کرو۔ انھوں نے دہرایا۔ اگر وہ واقعی موجود ہے۔
اندر کا کوئی وجود نہیں۔ دوسرے شاعر نے سوال کیا۔
اسے دیکھا کس نے ہے — ؟ میں کس کو پوجوں؟ اور اندر نے گرج کر گھنگھور گھٹاؤں میں
برس کر جواب دیا؛

میں ادھر ہوں — او منتی — مجھے دیکھ۔
میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں۔
نظامِ کائنات نے مجھے عظیم تر بنایا ہے۔
پھر انھوں نے کہا، او پہاڑوں پر رہنے والے رودر —
اپنے تیر — قہرناک تیروں سے
کسی انسان کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا۔
کیونکہ موت خوفناک ہے۔

(لیکن موسیقی موت کو ختم کرے گی - موسیقی کی وسعت، اس کی گہرائی میں موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے - موت دراصل بہت حقیر ہے - موسیقی خدا ہے -)

رِگ وید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا - اس دریا کی سطح پر روشنی کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا ہوگئے -

اس اوّلین موسیقار کے ہاتھ میں وینا تھی - انہوں نے سات سُروں کی سرگم تخلیق کرلی تھی - سرگم کا ایک ایک سُر وینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا -

اب سارے تار اکٹھے ہوکر ایک آواز پیدا کر رہے ہیں:

وِشو دیو — سارے خدا ایک ہیں — اگنی، اوشا، ورونا، سوما، گندھرو — ساری طاقتیں ایک وشو بھونانی ہیں -

تدایکم — خدا ایک ہے - مضراب کی ایک جھنکار سے فضا مرتعش ہوگئی -

مگر میں کس کی عبادت کروں —

کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں —

اور شاعر نے خود ہی جواب دیا:

وشوکرما - وشو دیو مہان اسی -

تو سب کا خالق ہے - خدائے بزرگ و برتر - پرجاپتی

کون کھمبا تھا - کون سہارا

کس طرح ایسا ہوا کہ وشواکرمن نے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تانا -

وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں -

اور منہ — اور بازو — اور پاؤں -

جو اپنے دو بازوؤں اور پروں کی دھونکنی سے دنیا کو گھڑتا ہے -

سب سے پہلے نور پیدا ہوا - وہ سارے وجود کا خدا تھا -

اس نے آسمان اور زمین بنائے -

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟

وہ جو زندگی اور طاقت بخشتا ہے -

ابدیت اور فنا جس کی پرچھائیاں ہیں -

میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟
وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے۔
وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیدائش کی۔
جس نے جگمگاتے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا۔
وہ جو ایکا دیوا ہے۔ اور پران اور سکمبا (سہارا)"
قصہ مختصر یہ کہ وہ برہما ہے۔

خدائے واحد۔ جو نہ مرد ہے —— نہ عورت۔ اس کی کوئی جنس نہیں۔ کوئی ثانی نہیں۔ نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے۔ ایکا دیوا ——

برہما — جو بڑھتا ہے۔ جو باہر لاتا ہے اور پھیلاتا ہے۔ جو دنیا کی تخلیق کا مادی سبب ہے لیکن خود غیر مادی ہے اور دنیا جو اس نے تخلیق کی بذات خود غیر حقیقی ہے۔

محض اوم اصل حقیقت ہے۔ خلا، روشنی اور آواز۔

لفظ —— جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے۔ برہسپتی —— جو پھیلتا ہے۔ برہسپتی کی حیثیت سے برہما خدائے نطق ہے۔

لفظ جو شروع میں تھا اور خدا تھا۔ (مدتوں بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے۔ یونان میں لوگوس کے مسئلے کی ترویج ہوگی۔ عہد نامۂ قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہوگی۔)

ویدوں کی تقدیس مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔
کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔

اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے۔ زبان نے ایک حمد میں کہا:
میں وایو اور ردرا اور وشودیو کے ساتھ گھومتی ہوں ——
میں مترا، ورونا اور اگنی کی مددگار ہوں۔
میں ملکہ ہوں دولت جمع کرتی ہوں۔ میں جاننے والی ہوں۔
ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہیے۔
بغیر جانے انسان مجھ ہی پر بھروسہ کرتا ہے
میں جسے پسند کروں اسے برہما، رشی اور اگنی بنا دیتی ہوں۔

میں ردر کی کمان موڑتی ہوں تاکہ وہ جو برہما سے متنفر ہے اسے ختم کیا جا سکے۔
میں جنگیں کرواتی ہوں۔ میں ہوا کی مانند چاروں کھونٹ پھیلتی ہوں۔
شبد برہما۔

برہما جو بذاتِ خود ذہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ لطیف، بادل کی چھایا سے زیادہ ہلکا۔ جو اس کائنات کا حامل ہے، جو اپنے کو تقسیم کرتا ہے تاکہ دوسرے پیدا ہوں۔

وہ دوسرا میں خود ہوں۔ آتما ــــ جو زبان اور ذہن اور سانس کا دوسرا نام ہے۔ جو خود اپنی گواہ آپ ہے اور جو روحِ کائنات ــــ پرماتما ــــ بھی ہے۔

اب برہما اور آتما کا مجرد تصور وحدتِ وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر رہا ہے۔
پرجاپتی کے تخیل نے واحدانیت کا بیج بو دیا ہے۔

"شروع میں پانی تھا جس پر پرجاپتی ہوا کی طرح منڈلایا اور کائنات کی تخلیق کی۔"
(فلسطین کا فلسفی بعد کہنے والا تھا ــــــــ شروع میں پانی تھا جس پر خدا کی روح دھوئیں کی طرح منڈلاتی تھی ــ)

ان شاعروں کے تخیل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ان کے لاشعور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں، مدھم سرخ سورج اور وسیع سبزہ زار تھے۔ کھلی فضائیں۔ موسم کی تبدیلیاں۔ پھولوں کے رنگ۔ بسنت رت کی زردی۔ سرسوں اور کپاس اور ٹیسو اور ہر سنگھار۔ اور ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مور کی "مینہ آؤ"، "مینہ آؤ" کی صدائیں اور جب درخت جامن، فالسے اور کرندوں سے لد جاتے ہیں اور خزاں۔ جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور سردیاں۔ جب چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیانوں کے اوپر ہیمنت کا چاند دھند میں تیرتا ہے۔ یہ موسموں کی راگ مالا انھوں نے اس وینا کے تاروں میں قید کر لی ہے۔ برہما اور شکتی کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے۔ برہما راگ ہے۔ سرسوتی راگنی۔ پانچ سُر مہا دیو نے تخلیق کیے ہیں۔ کھرج اور پنچم پاروتی نے بنائے ہیں۔ فضائے بسیط تونبرو، نارد منی اور چتر سین کی موسیقی سے گونج اٹھی ہے۔ یہ عناصر کی موسیقی ہے جسے متشکل کر لیا گیا ہے۔

نٹ راج کا ڈمرو، آکاش تت سمادھ کا منظر ندا جس میں ساری آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ردر آندھیوں کا خدا اپنی پرشکوہ وینا چھیڑ رہا ہے۔

جمنا کے کنارے مہا وشنو بانسری پر نغمۂ حیات بجا رہے ہیں۔ گوپیاں، آفاقی طاقتیں، اس کی

دھن پر رقصاں ہیں۔

کائنات ان گنت سازوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ راگ تخلیق ہو رہے ہیں جن کے پردیپ سے آواز کی دنیا جھلملا اٹھی ہے۔ فضائے بسیط میں بھیرو، مالکونس، ہنڈول، میگھ، دیپک، سری کے دیو گرج رہے ہیں۔ اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہواؤں پر پھیلاتی ہیں۔ جنگل کے پرندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں۔ ان کی آواز، ان کے رنگ اور ان کی چال کو رقص و نغمہ کے تخیّل میں محیط کر لیا گیا ہے۔ مور کھرج میں جھنکارتا ہے۔ پپیہا رکھب میں اپنی رٹ لگاتا ہے۔ بکری گندھار میں ممیاتی ہے۔ کلنگ مدھم میں پکارتا ہے۔ کوئل کی کوک میں پنچم کا سر ہے۔ دیوت گھوڑے کا ہنہنانا ہے۔ نکھاد ہاتھی کی چنگھاڑ ہے۔

تان پورے پر سُر چھڑ گیا۔ تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی ہے، گیت کے دوران میں موجود رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گونجتی رہتی ہے۔ سُر جو ذاتِ مطلق ہے۔ جو ہمیشہ سے تھا۔ ہے۔ اور رہے گا۔

سنگیت کلا کے فن میں فلسفے، رنگ و نور، خیال اور جذبات کا دھارا اکٹھا بہہ رہا ہے۔

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دنیا پھیلی ہوئی ہے آسمان سے الوہی پانی برستا ہے اور الوہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا ہے۔ آسمان کی روشنی کا سمندر اوشا کے اجالے کے ساتھ ساتھ صبح کے راگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کہرے پر سنہری دیبی سرسوتی تیرتی ہے۔ سرسوتی جو تخلیق کرنے والی ماں کا تصور ہے۔ جو راگنی ہے، علم ہے۔ جو زندگی کا مقصد ہے۔ علم سے آزادی ملتی ہے۔ علم سارے وجود کی بنیاد ہے۔ گیان میں نجات ہے۔ (سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر واپس لوٹ آیا جہاں وہ اس سمے موجود تھا۔) قید اس لیے ہوتی ہے، اس نے گھاس پر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا، کہ خودی اپنے آپ کو اپنے ذہن سے علاحدہ کر لیتی ہے اور لہٰذا دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہے۔

یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے۔

یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں — اس نے سوچا۔

یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤں گا۔

لیکن کوئی پرواہ نہیں۔

سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں۔ صحیح عمل اصل چیز ہے۔

وہ گھاس کی پتیوں کو توڑ توڑ کر اکٹھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ دور درختوں کے جھرمٹ میں کسی یوگی کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔

پتا نہیں بیچارہ اس وحشت اور ویرانے میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہوگا۔ گوتم کو ایک لمحے کے لیے بڑا اچنبھا ہوا۔

وہ ان شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا۔ (ذہن کی جوت کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ انسانی دماغ دیو مالا کی تخلیق مدتیں ہوئیں کر کے ختم کر چکا تھا۔ خیال کے صنم خانے آباد ہو کر نئے پرانے بھی ہو گئے۔ دماغ اب دقیق مسئلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا۔ اصل چیز فلسفہ تھا اور مابعد الطبیعات۔ سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادیِ افکار اور مذہبی رواداری۔ ایک ہی کنبے کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی پرستش کرتے اور متضاد نظریوں میں یقین رکھتے۔ مادہ پرست، ثنویت کے قائل، ملحد۔ بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے، جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی، ذرہ برابر ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ مگر ان سب نے علمِ معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی۔ حسی ادراک، استنباط اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی۔

ملحد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزرا تھا۔ چونکہ ادراک، استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا کپل نے بڑی دلیری سے ایشور کی بجائے ان ایشوروں پر زیادہ توجہ دی تھی۔ منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کے بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام ذرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا۔ گو اس قدر روادار تھا کہ عوام کے دیوتاؤں شیو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے وہ موجود ہی ہوں۔ لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیوی خدا تھے۔ اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا۔ ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکاں میں مقید ایسی نہیں جو بالآخر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو۔

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا۔ سیدھا سادہ ملحد تھا۔ برہما کے بجائے اس نے پراکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا تھا۔ پراکرتی یا فطرت، جو کارن کاریہ نظریے کی بنیاد تھی۔ پراکرتی اولین کارن ہے۔ ذہن، خودی، حواسِ خمسہ اور عناصرِ اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقا اس میں مشتق ہے اور

پرش، جو خالص روح ہے، جو نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ اور پراکرتی سے الگ کھڑا ہے۔ پرش ابدی شخصی شاہد ہے۔ اور اس کے اور پراکرتی کے ملاپ سے دنیا ظہور میں آتی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری طاقت کوئی نہیں ہے اور ان دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل مسرت اور مطلقیت پیدا ہوتی ہے۔ کپل کا کہنا تھا کہ ارتقا، محض اتفاقاً نہیں ہوا۔ موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت رہی ہو گی۔ کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے۔

ویدانت والے موحد خداپرست جو ایک برہما کو قادرِ مطلق جانتے تھے کاریہ کارن بھید کے مسئلے پر کپل سے متفق نہیں تھے۔ ان کے نزدیک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے۔ کیونکہ ہر شے برہما تھی تت توم اسی — تو — وہ — ہے — جیو آتما۔ بندہ — دراصل — وہ — ہے — تو ہی خدا ہے۔

لیکن ہر شے برہما ہے تو یہ دوئی کاہے کے لیے —؟ کپل کے ملحد ساتھیوں نے پوچھا۔

یہ دوئی دراصل مایا کا فریب ہے۔ مایا پراکرتی کا — انھوں نے جواب دیا۔ مادہ پرست کپل کی "فطرت" کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا۔ انھوں نے ادراک پر الہام کو ترجیح دی۔ ادراک اور استنباط محض عالمِ موجودات ہی کے لیے سند سمجھے جا سکتے تھے۔ اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے؟ تجربے متنوع کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو — نام روپ بھی ہے۔ اس کی مایا، شکتی اور پراکرتی دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن اصل ذاتِ خداوندی نام روپ اور مایا سے بلندتر اور بے نیاز ہے۔ گیانی جن کے لیے ساری دنیا سراب کے مانند ہے۔ اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے۔ ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آکر مشروط، عملی، خالق اور شخصی بن جاتا ہے۔ دنیا کی تخلیق بھی اودیا اور انادی اودیا کی وجہ سے ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ یا شکتی کے ذریعے ہوئی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہو گیا بڑھا نہیں۔ برہما صفات سے متاثر نہیں، جس طرح ہماری اپنی مشروطیت ہماری اصل روح کو متاثر نہیں کرتی۔ جس طرح صفات زدہ برہما ہمیں تخلیق کرتا ہے اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے۔ مایا کی دوسرا تھیوری نرگن برہما سگن بن جاتا ہے۔

نا — نا — برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں — وہ یہ نہیں ہے — وہ یہ بھی نہیں ہے۔ ویدانت میں لکھا تھا — وہ ست بھی ہے اور است بھی۔ وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی۔ عظیم ترین وجود اور عدم وجود، یوں کہ جن چیزوں کو دنیا وجود سمجھتی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ برہما شخصی ہے۔ اس کی خارجی صفات نہیں۔ اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سکتا ہے، جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے۔ ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہو سکتا ہے جو خود ہمارا اپنا احساس

ہے۔ مکتی سے ایشور — مظہری خدا آپ سے آپ غائب ہو سکتا ہے۔

یہ حکماء بجائے خود بدعتی تھے، کیونکہ فلسفی تھے۔ ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے جھکے۔ گو سند کو بڑی آسانی سے منظور یا نامنظور کیا جا سکتا تھا۔ خود کپل کا ایسا منطقی بھی ویدوں کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے۔

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں۔ محض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے اور ابدالاباد تک رہے گا۔ چند کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں۔ اننا نتکوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر محدود۔ اس کے ساتھ ہی دنیا محدود تھی نہ غیر محدود۔ سیاد وادیوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ خود کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے۔ دوسری دنیا ہے یا نہیں۔ حادثہ ہے یا نہیں۔ جزا و سزا ہے یا نہیں۔ حیات بعد الممات ہے یا نہیں۔

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں خود یاد تھا کہ کچھ عرصے قبل وہ نہیں تھے۔ اور اب ہیں۔

صدیاں گزرتی گئیں۔ ذہن اپنشدوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا۔ رفتہ رفتہ خدا جو فلسفے کا ایک مسئلہ تھا شخصی بنا —

تاکہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو۔ ردر ایک ہے۔ ایک اپنشد میں کہا گیا۔ جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اودیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مابعد الطبیعات کے کالسن نے اوتار کا روپ دھارا۔ اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا۔ بے جنس برہما مرد بنا۔

وشنو — جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔

نارائن — جو خود مجھ میں ہے۔

ورندابن سے بانسری کی تان بلند ہوئی اور گنگا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی۔ اننگ رنگ ساگرم۔

مدھو سودن — جو محبت کا اتھاہ سمندر ہے۔ گردھر گوپالا — کرشنا — کرشنا — کرشنا —

گوتم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور ندی پر برستے سناٹے کو دھیان سے سننے لگا۔

اور کرشنا نے کہا: "او ارجن میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا۔ او کنتی کے بیٹے میں پانی کا سواد ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کا اجتماعی شعور ہوں۔ او کنتی کے بیٹے۔ میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور رحم دلی ہوں۔ میں گائتری منتر ہوں۔ میں اچھوں کی اچھائی ہوں۔ او ارجن میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

اور کرشنا نے کہا: "مجھے چاہو۔ مجھ سے محبت کرو۔ میں تمہارا سکھا ہوں۔ تمہارا ساتھی۔ تمہارا محبوب۔ میں محبت کا سمندر ہوں۔ اننگ رنگ ساگرم۔"

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہو گئی۔ پھر ویشالی کے مہاویر نے کہا: "خداوندِ عالم کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا ابدی ہے اور اپنے وجود میں قائم۔ اور مادے اور خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے۔ صرف یہی ایک حقیقت ہے۔"

اور شاکیہ منی نے کہا: "خدا ہو یا نہ ہو۔ حقیقت محض یہ ہے کہ دکھ موجود ہیں۔ باسٹھ فلسفے اور دنیا کے باسٹھ گتی ہیں۔ محبت بے کار ہے۔ فلسفہ بیکار ہے۔ سب تماموہ ہے۔ سب مایا ہے۔ سب دھوکا ہے۔ شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود۔ ہر شے، خلا، غیر حقیقی ہے۔ پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟ کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی؟ کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہر شے اپنا لمحاتی وجود خود ہے اور شاکیہ منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں، حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ہر شے تکلیف ہے۔ سروم دکھم دکھم۔ ہر شے فانی ہے۔ جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ روح لازوال نہیں۔ محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں۔ روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے۔ انسان اس طرح دفعتاً بجھ جاتا ہے۔ جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے۔ صرف واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم ہے اور رہے گا۔"

پانی کی نقرئی لہریں کنارے تک آ آ کر لوٹتی رہیں۔ گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹا لیں اور ندی کو دیکھا جو بڑے سکون سے رواں تھی۔

میں دکھ سہنا چاہتا ہوں۔ میں کمزور بننا چاہتا ہوں۔ میں اپنی حماقتوں کا نظارہ خود کروں گا۔ میں تکلیفیں اٹھاؤں گا۔

دل و دماغ کے رنج اور آزمائشیں۔ میں مکتی نہیں چاہتا۔ میں مکتی بالکل نہیں چاہتا۔ رحم بہت بڑی

چیز ہے شاکیہ منی لیکن ممکن ہے مجھے خود تم پر ہی ترس آتا ہو۔ سوال یہ بھی ہے مقدس شہزادے کہ کون کس پر ترس کھائے گا۔؟

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ افق پر صبح کا اجالا بکھرنے لگا تھا لیکن دھند کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور پانی میں کود گیا۔

رات وہ کچھ سویا تھا، کچھ جگا تھا۔ رات اس نے بڑی بے چینی سے گزاری تھی۔ پانی سے باہر نکل کر آشرم کی طرف جانے کے بجائے اس نے گھنے جنگل کا رخ کیا اور ساحل کی ریت پر ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔

(۷)

ترائی کا راستہ، جو شراوستی سے اتر کی طرف جاتا تھا، اس میں دونوں طرف بیہڑ تھے اور اونچے سرکنڈے اور ڈھاک کے جنگل۔ اور رنگ برنگے پھولوں والی جھاڑیوں میں لمبی دموں اور جھلاتے پروں والے پرندے سیٹیاں بجاتے تھے اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے پتوں میں چھپ جاتے تھے۔ دریا اس پھولوں کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا۔ اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا جہاں شاہی بجرا رات کو کنارے پر آن کر لگتا تھا۔

ایودھیا اور اتر کوشل کے علاقے کے حکمراں راجن اور ان کا دربار صبح سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے مگر راستہ تلاش کرنے والوں نے اطلاع دی تھی کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع بارش شروع ہو گئی ہے۔ بجرے سے اتر کر شاہی قافلہ ہاتھیوں، پالکیوں، رتھوں اور بہلیوں پر سوار ہو رہا تھا۔ جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ لیا اور گرو پروشوتم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر ہوا کے جھنڈیں خیمے لگ گئے۔

آناً فاناً جنگل میں منگل ہو گیا۔ باغ، جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور مرغابیوں اور موروں کی عملداری تھی اور جہاں کبھی کبھار اکا دکا طالب علم مراقبے میں غرق کسی پگڈنڈی پر سے گزرتا نظر آ جاتا تھا، وہاں پل کی پل میں میلہ ایسا لگ گیا۔ شراوستی کے سنار اور بزاز اپنی اپنی دکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے اٹھا لائے۔ پھول والوں نے تازہ کلیوں کے گجروں کے انبار لگا دیے۔ بھاٹوں نے

اپنا ڈیرا جمایا اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے۔ بنجاروں کی ٹولیاں، طوطے، مینائیں، پالتو بندر اور موتی مونگے خچروں اور بیلوں پر لاد کر اس امید میں آکر دور کھڑی ہوگئیں کہ شاید کوئی راجکماری کوئی طوطا خرید لے۔ کئی مصوّر اور سنگتراش اپنا اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے۔ نٹ اور بازیگر اپنے کرتب دکھلانے لگے۔ رات کو شعلوں اور الاؤ کی روشنی سے جنگل کی چڑیاں جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں۔

شاہی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں۔ اندھیرا پڑے ندی میں جاکر تیرتیں۔ کبھی دن میں تیر کمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں ورنہ پھر خیموں کے باہر یا درختوں کے نیچے بیٹھ کر گپیں ہانکتیں۔

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا۔ وہ بنجاروں سے ان کے مونگے موتی، بزازوں سے ان کے چینی ریشم اور پشمینے، سناروں سے ان کے گہنے اور مصوّروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھی۔ کسی سائل کو لوٹانا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ دکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی تھیں کہ کہیں ان کا دل ٹوٹ نہ جائے۔ وہ لوگوں سے ان کی بیوقوفی کی باتیں سنتی رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموماً کس قدر گھر رہے ہیں۔ لوگ اس سے اپنی اپنی کہانیاں سناتے تھے۔ ہر انسان اس سے ہمدردی کا خواہاں تھا، کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گنی ہے۔ بڑی نیک دل ہے۔ بڑی فیاض ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ دنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور تھیں اور اسے ہنسی آتی تھی۔

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا جی اس مسلسل سیر و شکار سے گھبرا گیا۔ اس نے نرملا کو ساتھ لیا اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ سامنے آم کا گھنا جھرمٹ تھا۔ یہاں بڑا سکون تھا — اور خنکی۔ آسمان پر جھٹپٹے کے قرمزی رنگ بکھر گئے تھے اور باغ میں رہٹ چل رہا تھا۔

"آؤ ادھر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آرہی ہے۔"

نرملا نے کان لگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا۔

"چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں۔" چمپک نے کہا۔

وہ پتوں کو روندتی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں۔ درختوں کی شاخوں میں سے دور کسی آشرم کے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔

"یہ کون جگہ ہے۔" چمپک نے کدم کی ایک شاخ پر ہاتھ رکھ کر ٹھٹھکتے ہوئے کہا۔

"یہ سامنے کون لڑکے ہیں۔" نرملا نے بے ساختہ سوال کیا۔

ہر جگہ ہر بربھاری لباس والے کو دیکھ کر اسے اپنا بھائی یاد آجاتا تھا۔

(۸)

گوتم نیلمبر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیاسا ندی کے کنارے کنارے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ رات کے وقت وہ گھٹنوں ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ پھر ریت پر ببول کے کانٹے بچھا کر ان پر سویا۔

ایک دن اس نے سارا چیونٹیوں کو آٹا کھلانے میں صرف کیا جو وہ ملّاحوں سے مانگ لایا تھا۔ پھر اُس نے آنکھ بند کر کے منتر پڑھے۔

لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھنجلایا کہ اس نے پھر واپسی کی ٹھان لی۔

شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آشرم کو جانے والی سڑک پر چل رہا تھا کہ اسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اکلیش ہنستا ہوا اس کی سمت آرہا تھا۔

"بھائی گوتم۔ تم تین دن سے کہاں غائب تھے۔ سارے میں تمھاری ڈھنڈیا مچی ہے۔"

"میں تو یہیں تھا۔ تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو۔؟" گوتم نے سکون سے پوچھا۔

"وہی جو تم کر رہے ہو۔" اکلیش نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"میں تو بھگوان کی لیلا دیکھ رہا ہوں۔"

"میرا بھی ان دنوں یہی مشغلہ ہے۔"

"آشرم میں سب خیریت ہے۔" گوتم نے یونہی بات جاری رکھنے کے لیے پوچھا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شنکر ٹھیک کہتا تھا۔ الفاظ بیکار ہیں۔

"ہاں۔ تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو — وہاں تو یہ خبر اڑ گئی ہے کہ تم بن باس کے لیے اندھیرے جنگلوں میں چلے گئے، اب کبھی نہ لوٹو گے۔"

"مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" گوتم نے دفعتاً کہا، "چلو سامنے پڑاؤ ہے۔ وہاں سے چل کر دکھشنا لے لیں۔"

"میں دیکھتا ہوں کہ تم کسی اور چکر میں ادھر آئے تھے۔"

"کیسا چکر ـــ ؟" گوتم نے سادگی سے پوچھا۔ وہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔

"گرو دیو معلوم کر کے بہت خوش ہوں گے کہ چیلا اتنا سعادت مند نکلا۔" اکلیش نے پھر خوشدلی سے کہا۔

"گرو کو خوش تو ہونا چاہیے۔ تین دن تین رات میں نے بھگوان کی لیلا کا نظارہ کیا ہے۔" گوتم نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بھگوان کی لیلا کی ایک جھلک تو میں نے بھی کل دیکھی۔ تیر کمان لیے ایک ہرن کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر فوراً درخت پر چڑھ گئی۔"

گوتم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اکلیش کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اداسی سے اکلیش کی بشاش شکل دیکھتا رہا۔

املتاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈنڈی پر ان کراں کے چاروں اور گر گئے۔

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا رکھی تھی۔ سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلملا رہا تھا۔

بن دیوی۔ بن دیوی۔ دور جھرمٹ میں کوئی بھجن گاتا ہوا جا رہا تھا۔ بن دیوی۔ تم دور سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو۔

کبھی ہمارے گاؤں میں آؤ۔

کیا تمہیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے۔ ؟

گوتم اور اکلیش ہوا کی مدھم خوشبو حلق میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے۔

ـــ جب گیئوں کے ڈکراتے کا جھینگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں اس سمے بن دیوی ـــ

ہرے کنجوں میں رقصاں ہوتی ہے ـــ

طالب علم بھجن گاتا ہوا جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔

بن دیوی ـــ گوتم نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ پھر اس کی خوبصورت آواز شام کی نیم تاریکی میں بلند ہوتی گئی۔

بن دیوی — کبھی اس کی جھلک دکھلائی پڑ جاتی ہے۔
جیسے بہت دور گائیں چر رہی ہوں۔
یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو۔
رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے
جیسے کہیں دور بیل گاڑیاں گزرتی ہوں۔
جیسے کوئی اپنی گئیّوں کو پکارے۔
جیسے درخت گرے
یا بہت دور کوئی چپکے چپکے رو رہا ہو۔
بن دیوی — جو جنگلی پھل پھول کھا کر جیتی ہے، جو جہاں جی چاہے ٹھہر کر آرام کرتی ہے۔
جو مہکتی ہے۔ جو سارے جنگل کی ماں ہے۔

گوتم اور اکلیش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک ٹولی آبادی کی اور جا رہی تھی۔ آج زراعت کی دیوی سیتا اور کھیتوں کے خدا کھشیتر پتی کی عبادت کا تہوار تھا۔ گاؤں میں بڑی چہل پہل تھی۔

بالآخر گوتم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹھک گیا۔

"ایک طرف دیویاں ہیں۔ دوسری طرف اپسرائیں اور درختوں کی پریاں۔ دونوں وقت ملتے ان شاخوں کے سائے میں کھڑے نہ ہونا۔" اکلیش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو ورغلا کے لے جاتی ہیں۔ دیکھنا کسی اور پاٹلی پتر کی بنیاد یہیں نہ پڑ جائے —!"

"ارے۔ یہ سامنے کون کھڑا ہے۔" گوتم نے یکلخت ہڑبڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"کون —؟" اکلیش نے کہا۔ "مہابھارت کے کوی نے پوچھا ہے، تو کون ہے جو کدم کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے؟ دیوتا ہے؟ یا یکشی یا اپسرا —؟ درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں بھائی گوتم —"

"کیسے درخت —؟"

"گوتم — تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔" اکلیش نے دفعتاً

سنجیدہ ہو کر جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک شاخ کی اوٹ میں چلا گیا۔

گوتم نے چونک کر دوبارہ سامنے دیکھا۔

کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی۔

(۹)

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا۔ وہ نرملا سے باتیں کرتی دوسری پگڈنڈی پر مڑ گئی۔

اکلیش ایک پتھر پر بیٹھ کر دھیان میں مصروف ہو چکا تھا۔ "آؤ آشرم چلیں" اس نے ایک آنکھ کھول کر گوتم کو مخاطب کیا۔

انھوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر گوتم رک گیا۔ آشرم میں کچھ کھانے کو ملے گا۔"

"میں دیکھتا ہوں کہ تم بے حد مادہ پرست ہوتے جا رہے ہو۔"

"میں پوچھتا ہوں تمہاری کٹی میں چاول ہوں گے؟"

"نہیں۔ آج صبح سے سب لڑکے سیتا کی پوجا میں لگے ہیں۔ ایک روز اور بھوکے رہ لو۔"

"میں دکھشنا لے کر ابھی آتا ہوں۔"

"اچھا۔" اکلیش چپ ہو گیا۔ "مگر جلدی آنا بھائی گوتم۔"

"بھائی اکلیش ابھی آیا۔"

اکلیش سے پیچھا چھڑا کر وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا جدھر لڑکیاں گئی تھیں۔ جلدی میں کانٹوں پر دوڑنے سے اس کے پاؤں بھی زخمی ہو گئے۔

چمپک پڑاؤ کے نزدیک پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ پتوں پر چلتا کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

اس کے سامنے وہ سرجو کو تیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا جس کی کالی آنکھیں تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ اجودھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا آج کی بھیک

یہیں سے لے لوں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم کہاں پڑھتے ہو؟" چمپک نے پوچھا۔

"ادھر۔ کل پتی گرو پرشوتم کے آشرم میں۔"

"جنگل میں بن دیوی کا بھجن تم ہی گا رہے تھے۔"

"کہہ نہیں سکتا کہ میں کون ہوں اور جو بھجن گا رہا تھا وہ کون ہے۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔۔؟ آؤ کسی روز مجھ سے بحث کرو۔" چمپک نے تبسم کے ساتھ کہا۔

"اس جگ میں مائیتری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے۔" وہ فوراً بحث پر تیار ہو گیا۔

"ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ کے معنی نہیں ہوتے۔ تمہارے مضامین کیا ہیں؟"

"فلسفہ۔ اخلاقیات۔ اور۔" پھر گوتم دفعتاً جھنجھلا کر چپ ہو گیا۔ یہ لڑکی اسے بیوقوف بنا رہی تھی۔

"تم تصویریں بناتے ہو۔؟"

"ہاں۔"

"میں نے سنا ہے کہ گرو پرشوتم کے آشرم کا گوتم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے۔ تمہاری شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہارا ہی نام گوتم نیلمبر ہو سکتا ہے۔ میں ناموں کے اسرار کی بہت قائل ہوں۔ تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو۔؟"

"میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمقوں سے ذکر سنا ہو۔ اور تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"تو غالباً تم بھی میری تصویر بناؤ گے۔ آج صبح یہاں بہت سے چتر کار آئے تھے۔"

"میں پریتما کار نہیں ہوں۔ صرف تخیئل کی بنا پر دل کی آواز سن کر تصویریں بناتا ہوں۔" اس نے ذرا فخر سے کہا۔ "میری قدر وشواکرمن الوہی مصوّر تک کو کرنا پڑے گی جو سب سے بڑا چتر کار ہے۔"

"وشواکرمن۔! تو تم ملحد نہیں ہو۔؟ آج کل تو طالب علم کپل اور شاکیہ منی کے زیادہ قائل ہیں۔"

"مجھے آٹا لا کر دو۔ میرا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔" گوتم نے ذرا بگڑ کر کہا۔ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب وہ اس کے سامنے موجود تھی تو وہ اس سے کھڑا جھگڑ رہا تھا کیونکہ اسے یکلخت یہ احساس ہوا کہ وہ اس کی اپنی چیز تھی۔ اس کے اپنے وجود کا، اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ۔ یہاں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی تکلف، غیریت، ــــــ حجاب کی گنجائش یا ضرورت نہ تھی۔ وہ اسے ازل سے جانتا تھا۔

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم نے اسے پھر ذرا دھیان سے دیکھا۔ یہ لڑکی ہری شنکر کی بہن تھی۔

چمپک خیمے کے اندر جا کر آٹا نکال لائی اور گوتم کے کشکول میں ڈال دیا۔

"اب جاؤ۔ پھر کبھی آنا۔" چمپک نے کہا۔

وہ اسے پرنام کر کے پڑاؤ سے باہر آ گیا۔ اسے اب تک معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں اور راجن کے لاؤ لشکر سے ان کا کیا تعلق ہے۔ خیموں کے آس پاس ان کی طرح کی اور بہت سی لڑکیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں مگر یہ دونوں اس ہجوم میں سب سے علٰحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں۔

"یہ دونوں کون ہیں؟" اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتی رسوئی کے خیمے کی طرف جا رہی تھی۔

بڑھیا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔ "تم تو برہمچاری نظر آتے ہو۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوتی ہے اور دوسری راجکماری نرملا ہے اور یہ دونوں راجن کے ساتھ کپیلا کے لیے جا رہی ہیں، اور تم آئندہ ادھر نہ آنا۔ آج کل بہت سے چور اچکے سنیاسیوں کا بھیس بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں۔"

"کٹنی کہیں کی ــــ چڑیل۔" گوتم نے چپکے سے کہا اور آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن وہ چادر لپیٹ کر پھر پڑاؤ کی سمت چل کھڑا ہوا۔ سارے میں گھوما مگر وہ اسے نظر نہ آئی۔ (راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی مجمع عام میں سامنے نہ آتی تھیں۔) ممکن ہے وہ اندر کسی زربفت کے شامیانے کے نیچے بیٹھی طوطے کو پڑھا رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ طوطے کو پڑھانا امیر زادیوں کا خاص مشغلہ ہے۔ ممکن ہے وہ پالکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر چلی گئی ہو۔ وہ شراوستی کی طرف مڑ گیا جہاں سڑکوں، بازاروں اور جھروکوں میں بہت سے

چہرے نظر آئے جو اک ہی جیسے تھے۔ وہ پھر باغ کی سمت لوٹ آیا۔ شاہی خیمے میں کاتک پورنیما کے تہوار کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ان گنت لڑکیاں پھول سنبھالے، ساز اٹھائے اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ رنگ برنگی ساریاں پہنے ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں۔ ان میں چمپک کون سی ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر سوچا، کیونکہ اب اسے ہلکا سا شبہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں — ان میں سے چمپک کون ہے۔ اس نے ذرا اچنبھے سے دل میں کہا۔

"میں یہ ہوں"، کدم کے درخت کے پیچھے سے کود کر وہ نیچے اتر آئی۔

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

"تم بھی اداس ہو —؟ میں اس اداسی سے اب عاجز آتی جا رہی ہوں۔ کل سے نرملا بھی بہت رنجیدہ ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ ناچو۔"

"میرا خیال تھا تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی تھیں۔"

"فی الحال تو میرا جی ناچنے کو چاہ رہا ہے۔"

"نرمل کیوں رنجیدہ ہے۔"

"اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے۔ کل تمہیں دیکھ کر اسے اپنا دلارا بھائی یاد آ گیا۔"

"آنند نے بھی دنیا تیاگ دی تھی۔ یہ راہیں بہت کٹھن ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"اس کے بھائی کا نام کیا ہے۔؟"

"مہاراجکمار ہری شنکر۔"

"اور اس نے دنیا۔"

"دنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا۔ گدھا کہیں کا۔" چمپک نے گوتم کی بات کاٹی۔

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا۔

"سنا ہے آنند نے اپنی جیتی سندری کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھارتھ گوتم کے ذرا سے کہنے پر۔"

"تو پھر تمہارا مطلب —؟"

"میرا مطلب یہ کہ دنیا میں لاکھوں سندریاں اور ہوں گی اور لاکھوں آنند اور ہری شنکر۔ یہ چکر تو

بہت وسیع ہے چمپک رانی۔"

"تیاگ کا فلسفہ اپنی جگہ پر خود ایک اور چکر نہیں؟"

"اس سندری کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے؟" گوتم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

"اور اگر آنند واپس آجائے؟ — کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی پورا ارہت نہیں بن سکا۔ اس کی راہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں۔ وہ بار بار لوٹ آتا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوا—"

"یہ تو بڑی بری خبر ہے۔" چمپک نے کہا، "کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے۔ اس سے کہنا کیا وہ بھول گیا کہ شاکیہ منی نے مہامتی سے کیا کہا تھا۔؟"

"کیا کہا تھا۔؟" گوتم نے ذرا چڑ کر پوچھا۔

"شاکیہ منی نے کہا تھا: 'اے مہامتی جس طرح ناٹک کے ناچ گانے، وینا بجانے، مصوری اور دوسری کلاؤں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے اسی طرح ارہت بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا' ہمارے مہاراج کمار نے بھی تو تیاگ کو ایک قسم کی کلا سمجھ رکھا ہے۔"

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی جو خیمہ گاہ کے عقب میں تھا۔ دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آرہے تھے جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لوکی کی ہری بیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

"لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ کیا بات ہے؟" چمپک نے سوال کیا۔

اظہار۔ اسے محسوس ہوا وہ اظہار نہیں کر سکتا۔ سارے اظہار کا ایک مقصد ہے جو اظہار سے ماورا ہے۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ "چلو میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاؤں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا۔" اس نے بشاشت سے پوچھا۔

"تم سمجھتی ہو میں بالکل نکما، تخئیل پرست مسخرہ ہوں جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں۔ مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوستی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چترآچاریہ بن چکا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح غصے سے کہا اور پھر چمپک کو دیکھنے لگا کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے ترکی بہ ترکی جواب دے گی، مگر وہ چپ رہی۔

وہ منڈیر پر خاموش بیٹھی رہی کیونکہ اسی طرح آج سے چند سال پہلے ہری نے اس سے کہا تھا: تم مجھے نکما اور تخئیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک روز

تم سنو گی چمپا رانی کہ ایودھیا کا مہاراج کمار بہت بڑا ریاضی داں بن چکا ہے۔

اظہار مقصد سے ماورا ہے۔ ویدانت میں آیا ہے کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دکھلائی پڑتی ہے۔ جس طرح پیاسے ہرن کو ریگستان میں ندیاں نظر آتی ہیں اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو، ہری کو، بہت پریشان کیا تھا۔

مقصد کیا ہے ۔۔ اصل مقصد کیا ہے۔ وہ منڈیر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اگر تمہارا آنند تمہیں کہیں ملے تو اس سے کہہ دینا کہ سندری مرگ ترشنا سے بھی آزاد ہو چکی ہے۔ اسے فکر نہ کرنا چاہیے۔''

''تم ۔۔ یہ خبر صحیح ہے کہ وہیار میں جانے والی ہو ۔۔ ؟''

''شاید ۔۔! کیا حرج ہے ۔ یہ تجربہ بھی کر دیکھنا چاہیے۔ سجاتا رانی نے تو اپنی آنکھیں نکال دی تھیں کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں۔''

''چمپک تمہاری عمر کتنی ہے ۔ ؟''

''کئی سو سال ۔ اتنے سو سال کہ مجھے یاد بھی نہیں رہا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''چند روز ہوئے میں نے بھاٹوں سے بھیشم اور ارجن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا کہ چترانگدا اور الوپی کیسی رہی ہوں گی۔''

''مجھے دیکھ کر تمہیں معلوم ہو گیا ۔۔!؟'' وہ پھر ہنسی ۔ اور اس نے کہا: ''تم تو پریما کا ریک ہو ۔۔!''

''ہاں ۔ لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام وت اور روپ وت کا امتزاج ہے۔ ایک سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے۔''

''لیکن جو شے خالص ماہیت ہے، جس کا ادراک خالی عقل کے ذریعے کیا جاتا ہے، اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا ورنہ تم خود اپنے نظریے کی تردید کر رہے ہو۔''

''خالص ہیئت صرف ماہیت ہے، موزونیت نہیں۔'' گوتم نے جواب دیا۔ ''کسی مادی علامت کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اسے مادی علامت سے مماثل نہیں سمجھا جا سکتا۔''

''آکا شے روپم لکھیا ۔۔!'' چمپک نے ہنس کر کہا۔

''خالص ہیئت،'' گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا، ''وجود کی تشریح کرتی ہے۔ خود اس

کا وجود نہیں ہے۔"

"تم کیا بنانا چاہتے ہو؟"

"میں تم کو بتاؤں گا، ایک دن میں تم کو ضرور بتاؤں گا میں کیا بنانا چاہتا ہوں۔ تم میرے گرو سے نہیں ملو گی — ؟"

"نہیں۔ میں نے ایودھیا میں اپنے استادوں سے اتنا پڑھا کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر اکتا گئے۔ دیکھو نرملا کے کتنے مزے ہیں دن بھر سنگھار پٹار میں مگن رہتی ہے۔ ناچ اور گانا سیکھ ہی چکی ہے۔ پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔"

"نرملا تمھاری بہت دوست ہے — ؟"

"وہ ہماری اور تمھاری مہاراجکماری ہے۔"

"پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے۔"

"اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر بسائے۔" چمپک نے بزرگوں کی طرح کہا۔ "تم بھی تو اپنا برہمچاریہ کا زمانہ ختم کر کے بیاہ ویاہ کر ڈالو گے —"

پیچھے سے چھاگل کی آواز آئی — نرملا بہت سارے سفید پھول ٹوکری میں اٹھائے مالینی بنی پگڈنڈی پر سے آرہی تھی۔ گوتم کو دیکھ کر اس نے ٹوکری منڈیر پر رکھی اور ہاتھ جوڑ دیے۔ گوتم نے بڑے پنڈت بنتے ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے اشیرباد دی اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

"علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو۔" چمپک نے بشاشت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔

(۱۰)

مبارک ہیں وہ جن کو شانتی میسر آچکی ہے — چمپک نے دل میں دہرایا اور اسے گوتم بدھ کا وہ وعظ یاد آگیا جو انہوں نے گیا میں دیا تھا۔ ساری چیزیں دل میں، اے پروہت، آگ لگی ہے۔ آنکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال، اور بصارت، حسیات، وفور شوق، آوازیں، خوشبوئیں، ذہن و دماغ، خیال، جسم، تصورات —— سب دھڑا دھڑ اس آگ میں جل رہے ہیں، اور نفرت اور محبت

اور پیدائش اور بڑھاپے اور موت اور رنج والم اور دکھ اور گریہ وزاری اور مایوسی نے، اے پروہت، یہ الاؤ تیار کیا ہے ــــــ

آشرم کا طالب علم لڑکا واپس جا چکا تھا۔ جنگل پروائی ہوا میں سنسنا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے سے چند بھکونیاں کشکول سنبھالے اپنی جھونپڑیوں کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا، کیونکہ وہ ندی میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔ کیا میں بھی ندی میں داخل ہو سکوں گی۔ چمپک نے اداسی سے سوچا۔ مبارک ہیں وہ۔ اس نے دل میں دہرایا۔ اس نے پلٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی جہاں جشن کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پگڈنڈی پر آ گئی جدھر سے گوتم اپنے آشرم کی اور لوٹا تھا اور جس پر سے گزرتی ہوئی بھگونیاں ندی کے کنارے اپنی جھونپڑیوں کی طرف گئی تھیں۔

چمپک درختوں کی ٹہنیوں کو سامنے سے ہٹاتی راہبی کی طرف روانہ ہو گئی۔ سامنے کچھ فاصلے پر کٹی تھی جس پر ترئی کی بیل پھیلی تھی اور اس میں سے گانے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ یہاں اس نے سُن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ سُمن رہتی ہے جو کوشل دیس کے ایک راجہ کی بہن تھی اور پچاس سال سے سنیاس کی حیثیت سے اس کٹی میں رہتی آئی تھی۔

شراوستی بھگونیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس وقت ان کی ٹولیاں بھیک مانگ کر لوٹ رہی تھیں۔ ان میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ چمپک حیرت اور اچنبھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ انہوں نے کام لوک فتح کر لیا ہے اور برہم لوک میں داخل ہو چکی ہیں۔ کیا میں بھی کام لوک فتح کر سکوں گی ــــ اسے گوتم نیلمبر کی یاد آئی۔ اسے ہری شنکر کا خیال آیا جو برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا۔ ان بھکونیوں نے کام لوک کس طرح تسخیر کیا۔ وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرے۔ وہ جو زرتار بنارسی ساری اور سونے کے زیوروں سے مزین تھی، وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی ــــــ حسیات کی کنیز ؛ جو جب سے اس لڑکے سے باتیں کر کے آئی تھی جی ہی جی میں ایک نامعلوم سی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ وہ، ایسی حقیر بندی، ان اونچی، پوتر دیو بالاؤں سے کیا بات کر سکتی تھی؟

''بہن ـــ ادھر آؤ ـــ وہاں کاہے کھڑی ہو۔'' ان میں سے ایک نے گویا اس کی کشمکش کو بھانپ لیا۔ ''ادھر آؤ۔ ہمارے سنگ بیٹھو۔'' ایک بھکونی نے قریب آ کر بڑی شفقت سے اس سے کہا۔

"میں — میں دیوی سُمن سے مل سکتی ہوں — ؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ بہن سمن تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں۔"

ڈرتے ڈرتے چمپک اس نوجوان بھکونی کے ساتھ کٹی میں داخل ہوئی۔

سامنے سمن بیٹھی تھیں۔ جوشِ عقیدت سے چمپک کا گلا رندھ گیا اور اس کو اپنے جسم میں جھنجھناہٹ ایسی محسوس ہوئی۔ سری کرشن کی پجارن چمپک کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سُمن کے آگے جھک گئی۔

باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر بیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گا رہی تھی۔ یہ گانا راہبہ چِتّا نے راج گِرکی چوٹیوں پر چڑھ کر گایا تھا:

— دگو میں کمزور اور دکھی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے۔

اور میں لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھی ہوں اور میری چادر میرے کاندھے سے ڈھلکی ہے۔

اور میرا کاسہ الٹا ہے۔

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے۔

اور آزادی کی ہوا میرے چاروں اور منڈلاتی ہے۔

بُدھ کی خواہش پوری ہوئی۔"

چمپک کٹی کی دہلیز میں بیٹھی رہی۔ بھکونیاں گا رہی تھیں۔ یکلخت چمپک نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بنارسی ساڑی یہیں پھینک کے اور کیسری دھوتی لپیٹ کر ان سے آن ملے گی۔ ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیوار کھڑی ہے اس کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ کبھی عبور نہیں کر سکتی۔

"مجھے کچھ گوتمی کے بارے میں بتلاؤ — کچھ شاکیہ منی کے بارے میں —" اس نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا۔

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے چمپک کو ڈر سا لگا۔ ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھایا جھلملا رہی تھی اور چمپک کو معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے اور چمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا۔

"مجھے کچھ اپنے سنگھ کے بارے میں بتلاؤ۔" اس نے ہڑبڑا کر دوبارہ کہا۔

سمن اٹھارہ سال کی عمر میں اپنا راج گھر اناتیج کر سنگھ میں شامل ہوئی۔ وہ بیس سال کی تھی جب شاکیہ منی نے مہاپری نروان حاصل کیا۔ ان کو گئے اسی سال ہو چکے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں راجکماری

سمن کے حسن کی شہرت دور دور تک پھیلی تھی۔ اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا بھونس گیروا لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ دنیا تیج کر بھی اسے کیا ملا؟ چمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا۔ اگر میں نے دنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ ملی تو ــــ؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوا۔ سمن، گزرتے ہوئے وقت کی گواہ، شاکیہ منی کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔ جیت دن ویہار کی گندھ کٹی معطر کمرہ جس میں مہاتما بدھ رہتے تھے۔ میں داخل ہو چکی تھی۔ کنڈل کیشی سے مباحثے کر چکی تھی۔ چمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس لمس کے ذریعے وہ شاکیہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا۔

روہنی ندی کے کنارے شاکیہ منی کا وعظ سننے کے بعد ملک کے پانچ سو امرا نے دنیا تیاگ دی تھی۔ ان کی بیبیاں شاکیہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں مہا پجا پتی کے پاس آئیں جنھوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی اور انھوں نے پجا پتی سے کہا کہ ہم بھی ترک علائق کے خواہش مند ہیں۔ شاکیہ منی نے ان کا سنگھ قائم کیا اور شہزادیاں اور گرہستنیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکیاں بھکشونی بننے لگیں۔ ان کے نغموں سے جنگل اور وادیاں گونج اٹھیں۔ وہ گرو کی چیلی بن کر بعد میں خود گرو بنتیں۔ دوسروں کو پڑھاتیں۔ دھرم کا پرچار کرتی تھیں علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں۔ پٹنا، جو پہلے چندر بھاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی اور جس نے اب کے سے شراوستی کے ایک امیر گھر میں جنم لیا اور جس نے جوانی ہی میں ارہت کا درجہ حاصل کیا۔ اور دھیرا اور بھدرا۔ اور ابھی روپ نندا جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ اور بنارس کی دیشیا ادھا کاشی اور اتما جو پہلے جنم میں داسی تھی اور دوسرے جنم میں شراوستی کے ایک سیٹھی کے یہاں پیدا ہوئی اور راجہ بھیم بسار کے پروہت کی لڑکی سوما جو جیت دن کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی تھی اور ــــ مارا (ابلیس) نے ــــ ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا کہ او عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے تو اس میدان کو تسخیر نہیں کر سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ (کیونکہ عورت جو سات آٹھ سال کی عمر سے رسوئی میں چاول ابالنا شروع کرتی ہے اور سارے وقت یہ معلوم کرنے کے لیے کہ چاول گلے ہیں کہ نہیں ڈوئی سے نکال نکال کر اپنی دو انگلیوں سے ان کی گنی دیکھتی ہے۔) پر سوما نے مارا کو مار بھگایا اور ارہت بن گئی۔ اور دیشالی کی طوائف دملا اور ویشالی کے سپہ سالار کی لڑکی سہا جس نے گایا: "میں جسے چیزوں کا کیوں، اور

'کیا'، بہت ستاتا تھا اور گزرے وقتوں کی یاد بہت تنگ کرتی تھی، میں نے خودکشی کی ٹھانی تاکہ پھر سے اس ذلیل دنیا میں زندہ ہوں مگر مجھے داستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی۔'' اور شراوستی کی برہمن زادی کما اور ویشالی کی رقاصہ امباپالی اور بنارس وتی شہر کی سندری تندا اور راج گیر کی گھنگھریالے بالوں والی کنڈل کیشی جو ایک ڈاکو کے عشق میں دل شکستہ ہو کر پہلے جین سنیاسن بنی اور جو سیب کی ٹہنی ہاتھ میں لیے گاؤں گاؤں للکارتی پھرتی تھی کہ کوئی ہے جو آن کر مجھے بحث میں ہرائے اور چندا اور راج گیر کی ملکہ کھیم جو اپنے حسن پر بڑی مغرور تھی اور جس نے بانس کے جھنڈ میں پہلی بار شاکیہ منی کو دیکھا تھا اور خوبصورت امیرزادی انوپم اور مہارانی کھیم کی سہیلی وجے، اور بھارانی۔ آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنا چاہے تھے تو جنھوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں۔

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہوں گی کیونکہ انھوں نے ارہت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ سب ندی میں داخل ہو چکی تھیں اور یہ جتنی بھکشنیں اس وقت موجود تھیں یہ بھی کتنی خوش قسمت تھیں کیونکہ انھوں نے کشش بکش سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔

چمپک نے کٹی کے باہر نظر ڈالی۔ درختوں کے اس پار خیمہ گاہ میں روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں، باہر کوئی اسے آوازیں دے رہا تھا۔

وہ کٹی سے نکلی۔ خوامیں اور ہرکارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

عورتوں کے متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ سو سال قبل یہیں شراوستی میں ایک اہم سوال کیا گیا تھا۔

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آنند۔ جواب ملا تھا۔

لیکن فرض کیجیے وہ نظر ہی آجائیں۔

ان سے بات مت کرنا۔

لیکن اگر وہ خود ہم سے بات کرنے لگیں تو——؟

برابر جاگتے رہنا——

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفعتاً گوتم کو نیند کا زوردار جھونکا آگیا۔ بمشکل کوشش کر کے اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف کتابیں پڑھتا تو عجیب و غریب متضاد نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے میں آتے۔ مہابھارت کی بارہویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن تیرہویں کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کی طبیعت میں اوچھاپن ہے اور یہ کہ اچھے گھرانوں کی خواتین طوائفوں کے بھوسات اور گہنے پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں اور چونکہ سارا شر پیدائش کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے اور عورت پیدا کرنے والی ہے لہذا عورت ہی دنیا کے سارے شر کی ذمے دار ہے اور یہ کہ عورت صرف محبت کی بھوکی ہے اور سخت ناقابل اعتبار۔ لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب کمزوریوں کے باوجود عورت کی عزت کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی وفاداری، شرافت، شرم و حیا کی رشی منی قسمیں کھاتے تھے لیکن شرادستی کی ویشیائیں اور ناٹک میں اداکاری کرنے والی نائکائیں اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوس عورتیں اور وش کنیائیں بھی تو عورتیں تھیں۔

اور اروشی نے اپنے چاہنے والے سے کہا تھا کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاؤ۔!

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی مانند ہوتے ہیں۔

اور دوسری طرف گندھاری تھی جس نے اپنے اندھے منگیتر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور انسویا اس قدر وفا شعار تھیں کہ اپنے پتی کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے گئی تھیں۔ اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی سائے کے سمان ہیں اور منو مہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں۔

لیکن شاکیہ منی نے کہا تھا: عورت بیوقوف ہوتی ہے آنند۔ عورت حاسد ہوتی ہے آنند۔ عورت بدباطن ہوتی ہے آنند۔ عورت سے بچو۔ عورت سے بچو۔

ناری نرتی ہے۔ مجسمہ شر۔

ایک مرتبہ شاکیہ منی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے جو جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا اور راجہ پرسین جیت نے ان کی دعوت کی تھی اور آنند جو کہیں باہر گیا ہوا تھا اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا۔

خوبصورت آنند نے اپنا کشکول اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا۔ اس کے لیے کشتری اور چنڈال سب برابر تھے اور اسے اپنی نیکنامی کا بڑا خیال تھا اور

بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر پناہ کی خندق عبور کی اور شراوستی کے پھاٹک میں داخل ہوا اور بھیک مانگتے مانگتے ایک مشہور رقاصہ کے دروازے پر پہنچا اور رقاصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس نے ایسا جادو ڈالا کہ بے چارہ آنند دکھشنا لینا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔

اور شاہی محل کے ایوانِ ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شاکیہ منی کو علم ہوا کہ آنند بڑی آفت میں مبتلا ہے اور انھوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دستگیری کے لیے روانہ کیا۔

اور شاکیہ منی نے آنند سے کہا: "میں اپنے نروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم سب میرے خاص چیلے — بودھی ستو، مہاستو اور ارہت — مکمل نجات حاصل کرنے کے بجائے آخری کلپوں میں دوبارہ پیدا ہونا منظور کر لو۔ تم طالب علموں، عام آدمیوں، بادشاہوں، امیروں، وزیروں، برہمچاریوں حتیٰ کہ طوائفوں، بیواؤں، بدمعاشوں، چوروں، قصابوں اور ریساطیوں کی صورت میں جنم لو تا کہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گھل مل کر انھیں مکتی کا راستہ دکھلا سکو۔ صرف مرتے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمھیں ورغلائیں گے —

اور اگر کوئی چیلا اپنے پہلے کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کر سکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو مجھ پر بودھی درخت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیان ظاہر ہوئے تھے۔

"آنند ابھی جب تم کو اس لڑکی نے بہکایا یہ محض اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ کئی کلپوں سے تم اس کی کشش میں مبتلا ہو — لیکن وہ پچھلے کلپوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے۔ تم اور وہ دونوں آزاد ہیں —"

آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آنند اسرار جو تم پر منکشف ہوئے وہ سوائے تمھارے اور کون جانے گا؟ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے۔

شاہی خیمہ گاہ کی طرف سے جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دے جاتی تھی۔ چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے عین اوپر آ گیا تھا اور اس کے اجالے میں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے بے انتہا پر سکون نظر آ رہے تھے۔ اِکّا دُکّا چراغ جل رہے تھے۔ باقی طالب علم سو چکے تھے۔ صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا۔

جانے اس سمے راجن کے پڑاؤ پر کیا ہو رہا ہو گا؟ روشنی، موسیقی اور رقص۔ اس نے اپنے

ذہن میں چمپک کے تصور کو انھیں تین چیزوں سے وابستہ کر رکھا تھا۔
روشنی، موسیقی اور رقص۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور کندھے پر چادر اچھی طرح سے لپیٹ کر دبے پاؤں آشرم سے باہر نکلا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہوگیا۔ اس سمے وہ بڑی بھاری چوری کر رہا تھا۔ اور اس چوری پر شدت سے مسرور رہتا۔ اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑکھڑا رہی تھیں۔ ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کر تیزی سے بھاگی۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے وہ دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا جہاں مشعلوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک جانب سنگیت کار لڑکیاں سرمنڈل اور ستارے اور جھانجھ لیے بیٹھی تھیں۔ راج گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور جمع بیٹھے بولنے میں منہمک تھے۔ ایودھیا کے لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کے لیے سارے دیس میں مشہور تھے۔ اس مجمعے میں ہر شخص کلاونت جان پڑتا تھا۔

دفعتاً گوتم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پر پڑی جس نے کل اسے ڈانٹا تھا۔ وہ ذرا گھبرا کے ایک خیمے کی آڑ میں ہوگیا۔ اگر کوئی اسے اس سمے دیکھ لے تو کیا ہو۔ وہ، گوتم نیلمبر، آشرم کا سب سے سعادت مند اور قابل طالب علم، مشہور ریکھک اور چترکار، برہمچاری، اس سمے چوٹوں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیمے کے پیچھے چھپا لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

(۱۱)

ناچ — ناچ — ناچ —

چھایا پتھ، کہکشاں، پر اپسرائیں ناچ رہی تھیں۔ مرگھٹ میں کالی رقصاں ہے۔ دل کے سنہرے ایوانوں میں شبو ناچتا ہے اور گوکل میں نٹور گردھاری۔ کیلاش پر اوما ناچتی ہیں اور یہاں راپتی کے کنارے، مہوا کے جھرمٹ میں، خزاں کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے جسے کوئی کماری چمپک کہتا ہے کوئی چمپارانی کوئی چمپاوتی۔ اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ ہیں۔ اس کی اداسی، اس کی ہنسی، اس کی مسکراہٹ، اس کا دکھ، اس کا ویراگ، اس کی مسرت، اس کی نفرت۔

یہ ایسے بھاؤ اور ایسے رس ہیں جنھیں بھرت منی بھی نہیں سمجھ سکتے۔ کسی شلپ شاستر میں اس ناچ کا ذکر نہیں جو میں نے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی نند کشور، کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی مدراؤں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس ناچ کے قوانین نہیں بنائے۔ یہ بڑا انوکھی راس لیلا ہے۔ یہ بڑا اتم شرنگار رس ہے۔ لڑکیاں سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں۔ سبز طوطے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے اور پراکرتی مایا بن جاتی ہے۔ شو کی تیسری آنکھ کے شعلے نے کام دیو کو جلا کر بھسم کر دیا تھا لیکن کام دیو توانَنگ ہے۔ انسانوں کے دلوں میں موجود ہے۔ شیو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اور وہ اس طرح ناچ رہی ہے مانو پاروتی نے دیبی اوشا کے بجائے اسی کو بھرت ناٹیم کی تعلیم دی تھی۔ رقاص شہزادے ارجن نے آسام کی چترانگدا اور دکھشن کی راجکماری اترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔ وہ جو سفید ساری پہنے کمدی التسو کا تہوار منا رہی ہے اس نے بالوں میں کیسر کے پھول اڑس رکھے ہیں۔ اس کے جوڑے کو رتنا جلی نے ڈھانپا ہوا ہے۔ اس کے گلے میں وجینتی مالا ہے جس کے صدف اور یاقوت، زمرد اور نیلم اور ہیرے چاندنی میں جھلملاتے ہیں۔ اس کے گلے کی کنٹھا ولی اور نشکھر ہار اور سفید موتیوں کی سدہ ایکاولی کی چھوٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اس کے کانوں میں کرن پھول ہیں۔ اس کے کنول ایسے پیروں میں پدپدما جگمگا رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر طلائی سیس پھول سجا ہے۔ وہ سولہ سنگھار کیے اپسرا اشرَدوتی کی طرح خزاں کے چاند تلے ناچتی ہے۔ سارا اشرادوتی سارا ایودھیا سارا کسم پورہ سارا جمبو دیپ ——— کہ کمد پورنما تھی منا رہا ہے اور شیو نے آنکھ کھولی ہے۔ خزاں جو شیو کے جسم کے مانند نقد ہے۔ شیو بھبوت رمائے، ہاتھی کی کھال پہنے لیٹا ہے۔ اس کی جٹاؤں سے گنگا بہہ رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر ہلال جگمگاتا ہے۔ وہ بہت کم کم ہنستا ہے ——— چترماسا گزرنے کے بعد وشنو اپنی گہری نیند سے جگا ہے۔ وشنو جو اننت "لامحدود عقل کا مظہر شیش ناگ" کی پیٹھ پر پڑا سوتا تھا۔ وشنو پیتمبر جو خلا کو نگل چکا ہے، جو ساری کائنات کا زہر ہلاہل پی چکا ہے۔ اننت پر بیٹھا ہوا وہ زمان و مکان کی قیود سے بلند ہے اور وشنو اپنی ڈمرو بجا رہا ہے اور زمان و مکان اس کے ڈمرو کی آواز پر لرز رہے ہیں اور سبزہ زاروں پر چاند کی روشنی برس رہی ہے اور سفید چنور اور سفید ساریاں اور سفید پھول اس سفید روشنی میں جگمگا رہے ہیں۔ وقت نور کی ایک عظیم دھارا میں ڈھل گیا ہے جو خلا میں بہتی جا رہی ہے اور چاندنی فضا میں گھل گئی ہے اور جب دنیا، احساس اور چھونے اور دیکھنے اور تجربہ کرنے کی دنیا، اس قدر دلکش ہے تو اس میں مرگ ترشنا کا کیا دخل؟ یہ سب اصلیت ہے۔ زندگی سب سے بڑی اصلیت ہے۔ تخلیق

سب سے بڑی حقیقت ہے۔ تخلیق عظیم ہے۔ شکتی کی تقدیس کرو جو تخلیق کرتی ہے۔ دیوی کی تقدیس کرو جو ماں ہے۔ ماں ــــ اوما ــــ گوری ــــ لکشمی ــــ جس کا دوسرا نام آشا ہے۔ جس کا دوسرا نام کملا ہے۔ جس کے تصوّر کی تشکیل کنول کے پھولوں نے کی۔ وہ چمپا کے پھول کی طرح معطّر ہے۔ وہ ماں ہے جیسے زمین ماں ہے۔ جیسے ندی ماں ہے۔ ماں الوہی ہے۔ عورت الوہی ہے کیونکہ ماں ہے۔ چمپک الوہی ہے۔ اس کی حمد کرو۔ اس کی عبادت کرو۔ اس کے آگے جھک جاؤ۔ وہ اس خشک زرد گھاس، اس ہری زمین کی دیبی ہے۔ ابدی ماں ــ اور ابدی رفیق۔ میری بہت پرانی ساتھی ہے۔ کیا میں اس کو جانتا نہیں ــــ؟

رگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بی بی وہ ہیں جو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوں۔ کیا کبھی ایسا ہوگا کہ میں اسے وواہ (رتھ) میں بٹھلا کر اپنی دلھن کی طرح اپنے گھر لے جاؤں گا ــــ؟

(۱۲)

مجمع چونک اٹھا۔ ایک نوجوان خیمے کے پیچھے سے نکلا۔ منڈپ میں آکر اس نے جھک کے گھنگرو باندھے اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر اندتا نڈو ناچتا سامنے آگیا۔

مجمع مسحور ہو کر اس کا رقص دیکھتا رہا۔ لگتا تھا جیسے نٹ راج نے اپنا فن اسے خود سکھلایا ہے۔ وہ خود ہی نٹ راج ہے۔

چمپک ناچتے ناچتے رک گئی۔ اس نے رقاص کو اچنبھے سے دیکھا۔

مردنگ زور زور سے بجتی رہی۔ سندھیا تانڈو ناچتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں آگیا۔

اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے۔ اس نے آٹھوں رس دکھلائے۔ یہ وشنو کا شرنگار رس ہے۔ یہ اندر کا ویر رس۔ یہ یم کا کرونا۔ یہ رودر کا رودر رس۔ یہ کال کا بھیانک رس ہے۔ یہ گندھروکا ادبھت رس۔ یہ شانت رس ہے۔ یہ شو کا رقص ہے۔ اس کی ادائوں میں کائنات کا سارا عملِ ارتقا مضمر ہے۔ اس کی زبان سارا اظہار ہے۔ اس کا لباس چاند اور

ستارے ہیں۔ شو جو مجسم تان ہے اور مجسم سنگیت۔ جو آفاقی لے کا مظہر ہے۔

مادرِ کائنات اوما بھاوتی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھلا کر نٹ راج اس کے سامنے ناچتا ہے۔ سرسوتی وینا بجا رہی ہے۔ اندر بانسری۔ برہما جھانجھ بجاتا ہے۔ لکشمی گاتی ہے اور وشنو مردنگم بجا رہا ہے۔ سارے دیوتا اور گندھرو اور سدھ اور ودیا دھر آس پاس کھڑے ہیں۔ یہ شام کا سمے ہے سندھیا کا رقص۔

چمپک اپنی جگہ سے اٹھی اور ناچتی ہوئی اس کے برابر آ گئی۔

ان دونوں نے مل کر اوما تانڈو شروع کر دیا۔ وہ گوری تھی اور شنکر کے ساتھ رقصاں تھی۔

چاندنی کھلے میدانوں پر نغمہ ریز تھی اور چاندی کے رنگ کے بادل ندی پر تیر رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارس پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سو رہے تھے اور کاتک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا۔

مگر وہ رات بھی ختم ہوئی اور تہوار منانے والوں کا ہنگامہ کم ہوا اور ان کے گیتوں اور گھنگروؤں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں اور پو پھٹتے سمے تک شاہی خیمہ گاہ پر خاموشی چھا گئی اور منڈپ میں پھولوں کے چند گجرے اور کلیوں کے انبار بکھرے پڑے رہ گئے۔

(۱۳)

صبح ہوئی۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی۔ تالابوں میں سرخ کنول کھل گئے تھے۔ گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گوالنوں کی رنگین گگریاں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں۔ مہوا کے پیلے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی مدھو کر و شہد کی مکھی، اس کے کانوں میں بھنبھنایا کی اور جب سورج کی تیز کرنیں اس کے پپوٹوں میں گھسیں تو وہ آنکھیں ملتا اٹھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر لیٹا پایا۔ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا۔ وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا۔ اس نے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

چمپک — چمپک — چمپک —

سارے وقت مدھو کر صرف یہی بھنبھناتی رہی تھی۔ وہ اطمینان سے انگڑائی لے کر اٹھا اور دوری

انگڑائی لے کر پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ دفعتاً اس کی نظر ہوا کے جھنڈ پر پڑی جو سنسان پڑا تھا۔ یہ جگہ، جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں، اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک ہرن درخت کے پیچھے سے بھاگا۔ چند گلہریاں بیل کے پھل کترتی رہیں۔ ہرے طوطوں کی ایک ڈار شاخ پر سے اڑ گئی۔ جنگل خاموش پڑا رہا۔ وہ حیران پریشان وہاں بیٹھا تھا۔ پھر اسے رفتہ رفتہ بہت دھندلے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمہ گاہ تھی اور اس میں وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا۔ وہ سب ناچے تھے اور جب وہ ناچتے ناچتے تھک گیا تھا تو راجن نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھالیا تھا اور اس نے راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مدرا پی تھی اور بھنا ہوا ماس کھایا تھا اور زرنگار چھتر کے نیچے اطلسی مسند پر بیٹھا تھا اور اس محفلِ رنگ و بو میں اس کی نظریں برابر چمپک کی متلاشی رہی تھیں لیکن وہ رقص ختم ہوتے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ زنانے خیمے کی طرف چلی گئی تھی اور اس کے انتظار میں وہ پو پھٹنے سے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑاتا ہوا آشرم کی طرف لوٹ رہا تھا اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا اور صبح صبح کوچ کا نقارہ بجا تھا اور خیمے اٹھا دیے گئے تھے اور جب شاہی قافلہ کھیدا کے لیے روانہ ہو رہا تھا اس وقت چمپک نرملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے گزری تھی اور نرملا نے اس سے کہا تھا، کیسا انوکھا برہمن ہے۔ برسوں تم سے چترکاری کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ رات کو نٹ راج کی طرح ناچا اور اس وقت بچوں کی طرح پڑا سوتا ہے۔ جانے سے پہلے آؤ اسے جگا کر پرنام تو کر لیں۔

چمپک چند لمحوں کے لیے گم سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب دیا تھا: نہیں۔ کیونکہ جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آجاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنی منقش پالکی کی سمت چلی گئی تھی۔

اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا۔ اس ایک رات میں وہ دفعتاً بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دل کی کائنات کی سیاحت کی تھی۔ اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا۔ لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیو کے بجائے زندگی کا سارا ہلاہل اس نے خود پی لیا ہو۔ یہ کیسا انوکھا تجربہ تھا! اس کی شرط تو اس نے کپل سے نہیں لگائی تھی اور ہری شنکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے اور شاہی قافلے سے جا ملے۔ راجن کا ایک حقیر کہار بن کر ان

لوگوں کے ساتھ چلے۔ اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے دوسرے کناروں تک پہنچ جائے۔

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی۔ اس نے اسے قریب آ کر جگایا تک نہیں۔

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی آگے چلی گئی اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی۔ اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں ہے، اس کے وجود میں شامل ہے۔ اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو مجھ سے ہر سمے باتیں کرتی رہتی ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ بکواس۔ میں تو اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میں مایا کے فریب میں اچھی طرح مبتلا ہو چکا ہوں۔ وہ مجھ سے الگ ہے بہت دور ہے۔ بھلا میں کہاں اور وہ کہاں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔

بہت اچھا۔ اس نے تالاب کی سیڑھی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ (یہیں اس روز وہ بیٹھی تھی۔) تم اپنے کنڈ فر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو اور زندگی تمہارے بنا بھی گزر سکتی ہے۔

آشرم کے رستے پر چلتے ہوئے اُسے یاد آیا یہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا۔ گرو اسے رخصت کرتے وقت اپنی نصیحت کریں گے۔ وہی الفاظ دہرائیں گے جو ہر فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جاتے تھے۔ سچ بول اور دھرم کر۔ (دھرم ـــ؟) آشرم کے سارے لڑکے پاس کے عمر بھر کے ساتھی، اسے گھاٹ تک پہنچانے جائیں گے۔ فضیلت کی پگڑی باندھ کر وہ آنکھوں میں پہلی بار انجن لگائے گا۔ کانوں میں منی کنڈل پہنے گا۔ کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر اونی کمبل ڈال کر پیروں میں جوتے پہن کر بالوں میں سیپی کے کانٹوں سے بنی کنگھی کاڑھے، چھتری لگائے وہ شان سے شراوستی کی سڑکوں پر نکلے گا۔ ایودھیا اور پاٹلی پتر کے درباروں میں جائے گا۔ وہ پروہت کی مسند پر بیٹھے گا۔ حکومت کے منتری منڈل میں شامل ہو گا۔ جبکہ وہ بیچاری مورکھ لڑکی مگدھ کے کسی اجاڑ، وحشت خیز وہار میں سر گھٹائے بیٹھی شاکیہ منی کے بتلائے ہوئے نروان کے حصول میں جُتی ہو گی۔

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رستے پر نازاں نہیں ہوں ـــ اور خالی مصوری اور سنگتراشی میں کیا رکھا ہے؟ میں ستراَدھر بنوں گا۔ میں قوانین بناؤں گا۔ منو، کپل اور جیمنی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ میں ذہن کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دوں گا۔ علم میرا ہے۔ گنیش کا قلم میرا ہے۔ اگر چمپک میری نہیں ہو سکتی تو کیا اندھیر ہو گیا۔ سرسوتی تو میری ہے۔ وہ مجھے کبھی اس طرح چھوڑ کر نہ جائے گی۔

اور چمپک میں ہی کیا رکھا ہے۔ خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ نرملا کتنی خوبصورت

تھی۔ چمک، اگر غور سے دیکھا جائے تو، تم ایسی حسین بھی نہیں۔

اس کی شکل بھلا کیسی تھی؟ اس نے غصے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر لگائی۔ میں نے کم از کم یہ تو طے ہی کر لیا ہے کہ تمہاری تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل محض ہیولے ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف دھیان گیان سے پہچان سکتا ہے۔

وہ اپنی کٹی میں داخل ہوا۔ پھر باہر نکل آیا اور ادھر ادھر گھوما گھوما پھرا۔ آشرم کے لڑکوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کسی نے اس سے پوچھا، کل رات سے نظر نہیں آئے، کہاں تھے؟ تو اس نے رکھائی سے ان کی بات ٹال دی۔

اکلیش سے اس نے جھوٹ بولا کہ ندی کے کنارے تپسیا کر رہا تھا۔ عمر میں پہلی بار اس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے سندھیا نہیں کی نہ گرو کے درشن کے لیے گیا۔ آشرم کے کنجوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ میں پرہتا کاریک ہوں۔ فن پارے کو زندگی کے سارے رشتوں سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اس نے بار بار دل میں دہرایا لیکن بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ کلاکار تھا اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ تالاب کے کنارے بیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور اس کا سرخ رنگ تیار کیا۔ نیل کی پڑیا مٹی کے کٹورے میں گھولی۔ ہلدی اور کیسر سے زرد اور زعفرانی رنگ تیار کیے۔ دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں ابالیں اور سفید چینی پٹ سامنے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا مگر روپ اور اروپ کی کشمکش نے پھر اس کا موقلم روک لیا۔ میں کیا بناؤں؟ پھر اس نے سوچا، معنی کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اور ان علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی وجہ سے معنی محدود نہیں ہو جاتے۔ تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں جنھوں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا ہے۔ رنگیے نا ددیاتے چترم — آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو سطح پر موجود ہیں۔ جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے حس نے تحریک دی۔ جس کا کوئی مقام نہیں۔ حس تجربہ حس میں موجود ہے۔

اسے یاد آیا، ویدانت والے کہتے ہیں ذات مطلق امورت ہے جس کی کوئی شکل نہیں، جو ادراک

سے باہر ہے۔ وہ تو ذہنی تصور یا خیال بھی نہیں۔ اس لیے ویدانت والوں کے نزدیک فن کا تصور اپار برہما یا کمتر درجے کی علامت سے آگے نہیں بڑھتا۔ برہما الشعور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور اس تصویر کا اصل مخرج روشنی ہے۔ اس کی اصل ہیئت یا سروپ مختلف چہروں کی ہیئت ہے۔ وشوا روپ۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت ہی کے ذریعے دیکھنے والوں تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ سارے چتر کار اور نقاد کم از کم اس بات پر متفق تھے۔ اسی نظریے نے اصنام پرستی کی ترویج شروع کی تھی۔

مگر خیال سے علیحدہ، گوتم نے سوچا، زندہ ہستی تو بذاتِ خود زندگی ہے علامت نہیں۔ اس کی طرف کشش جذبات پر مبنی ہے۔ پھر کلاکار خالص خیال کو کس طرح پیش کرے؟ اس کا رویہ تو غیر جانبدار نہیں رہ پائے گا۔ دھیان — جو کلاکار کا اصل فن ہے — سالم نہیں رہ سکتا۔ خالص ہیئت — شے کا تصور جو خود شے میں ہے — اصل دھیان ہے۔ شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

حقیقت — زندگی سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سی تصویریں بنائیں اور بگاڑ دیں۔ سرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھڑیں اور توڑ ڈالیں۔

آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی: یہ گوتم کچھ باؤلا ہوتا جارہا ہے۔ اسے کیا ہوگیا؟

اکلیش نے غصے سے کہا۔ نہیں گوتم باؤلا نہیں ہوا۔ اس پر ایک استری کی دھن سوار ہے۔ ایسی شرمناک بات آج تک اس آشرم میں کبھی ہوئی تھی — ؟ کلاکار بنتا ہے اور خیال کے بجائے روپ کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

شہر کی چتر شالاؤں میں چہ میگوئیاں ہورہی تھیں۔ گوتم نیلمبر کیا اب ناگرک[1] مصوری کرے گا، سنا ہے اس نے ایودھیا کی کماری چمپک کی تصویر بنائی ہے۔

ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔ چتر کاروں کی منڈلی کے پرمکھ نے اظہار خیال کیا۔ اب وہ پریتما کا ریک نہیں رہا۔

گوتم تصویریں اور مجسمے بناتا رہا۔ اس نے آشرم کی زرد دیواروں پر مٹی اور برادہ اور چونا پھیر کے گہرے رنگوں کے خطوط بنائے۔ اس نے سرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں۔ اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں ان پر زیادہ تر مابعد الطبیعیات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوتے تھے۔ ترشول اور زندگی کا درخت اور زمین کے کنول اور دنیا کے پہیے اور کنول کے سنگھاسن اور آگ کے ستون۔ گوتم نیلمبر کی تختیوں پر گاؤں کے مناظر

---

[1] فیشن ایبل پورٹریٹ پینٹنگ

تھے: عورتیں، بیل، پتے، گائیں، پھولوں کے نمونے، کسان لڑکے۔ ان نقوش میں قوت تھی اور زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے یہ اصل حیات تھی۔ یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی۔

پھر ایک دن اس نے سدرشن یکشنی کا مجسمہ مکمل کر لیا۔ سدرشن یکشنی جو کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔

شہر کے فنکاروں نے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ چتر شالاؤں اور مندروں میں اسے ناپسند کیا گیا عوام، جن میں فن کا ذوق عام تھا، اسے دیکھ کر خاموش رہے۔ نقادوں نے گہری نظروں سے اس کے خطوط کو جانچا۔ لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی۔ سب کو اچنبھا تھا۔

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقے میں اس کے متعلق زوردار بحثیں چھڑ گئیں۔ گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا خود کچھ نہ بولا۔ وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص جمالیاتی تجربہ دراصل کیا چیز ہے؟ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے، روپ اور اروپ، بھاؤ اور ابھاؤ کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو، ان کے اسرار کو پتھر میں مقید کر لے۔ انسان، جیسے وہ ہیں۔ ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔ بجلی کی طرح ہے۔ اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سوپرکاش ہے۔ جس طرح فنکار کا تصور وشواکرمن کے تصور میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خودی میں موجود ہے۔ جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا منظر ہے۔ وشواروپ۔ روپم روپم پرتی روپ۔ جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ وہ ہے جو دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے جو خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے۔ یہی خالص وجود ہے، خالص ادراک اور خالص حیات۔ دل کا نگار خانہ، جہاں ساری تصویریں موجود ہیں، سارے تخیل موجود ہیں، جہاں پہنچ کر ساری شبیہیں ایک ہو جاتی ہیں، جہاں مختلف رنگین شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی رہتی ہے اور ہر شے جو ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے مکمل فن پارہ ہے اور فنکار اور دیکھنے والا دونوں کے لیے یہ ایک ہی مارگ ہے اور سمجھنے والے، ودوان، پربدھ اسے سمجھ سکتے ہیں۔

سدرشن یکشنی کی تخلیق کے ساتھ سنگتراشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا۔ سنگتراش کا فن خالص دنیاوی بنا۔ ان مجسموں میں شدید حقیقت پسندی تھی۔ یہ کدم اور پاٹلی کے درختوں کی پریاں، اندر لوک کی دیو مالائیں دراصل ایودھیا اور شراوستی کی امیر زادیاں تھیں۔ گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں جو دراصل زندگی میں پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں، ساون گاتی تھیں، کھیتوں کی نرائی کرتی تھیں۔

سدرشن یکشنی کمر پر سے بل کھائے انداز میں کھڑی تھی۔ اس کی باہیں گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی۔ اس کا جسم بہت مضبوط اور بہت سڈول تھا۔ یہ خطوط اور حجم کے توازن، شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج تھا۔ اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی اور زندگی کا ور اطمینان کی شدید کیفیت۔ یہاں قید نہیں تھی، بندھن نہیں تھا۔ کلاکار کو بالآخر قید سے آزادی ملی تھی۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا۔

اب سنگتراش راہب نہیں رہا۔ اس نے خوبصورت، تندرست، مسکراتی ہوئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے۔ عورتیں، جو دلآویز کاہلی اور آسائش کے احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں، ان کے چہروں پر افسردگی کہیں نہیں تھی۔ چہرے جو سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے۔ یہ بہت حقیقی بہت اصل بہت واقعاتی دنیا تھی۔ دنیا جو آس پاس، چاروں اور دور دور تک پھیلی تھی اور کلاکار، جس کی شکتی اسے سرسوتی کا چہیتا بناتی تھی، سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا۔

ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگار خانے میں پہنچا۔ وہاں حسبِ معمول اس کے سارے دوستوں اور مخالفوں کا مجمع موجود تھا۔ اس گروہ میں اسے چندلپی کا ر[1] اور پتی ویدک بھی نظر آئے اور اسے ذرا تعجب ہوا۔ یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کٹیا میں جمع ہوا کرتے تھے۔ سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے۔ وہ چپ چاپ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا۔

"تم کو نہیں معلوم" کملیشور نے بالآخر بات شروع کی۔

"کیا۔۔۔؟" گوتم نے پوچھا۔

"تم نے کچھ بھی نہیں سنا۔۔۔؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو؟"

"کیا ہوا؟ بتاؤ تو۔"

باہر کسی نے کنڈی کھڑکھڑائی اور اکلیش داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کے پیر گرد آلود تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ بہت دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔

"بھائیو" اس نے آہستہ سے کہا، "اپنا اپنا سامان سمیٹو اور فوراً یہاں سے بھاگ نکلو۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟" گوتم نے سوال کیا۔

"مگدھ میں لڑائی چھڑ چکی ہے۔ بھائی گوتم، چندرگپت کی فوجیں سارے دیس پر قبضہ کرتی ہوئی

---

[1] رپورٹر

اس طرف آرہی ہیں۔ اب یہاں ہل چل جائیں گے۔ میدانوں میں سبرامنیہ جنگ کے دیوتا نے اپنا رقص شروع کر دیا ہے۔ اب تمہارا وقت ختم ہوا۔ موت جنگ کا نقارہ بجاتی تمہارے تعاقب میں آرہی ہے موت جو روپ اور اروپ، بھاؤ اور ابھاؤ کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے۔" اکلیش تھک کر چٹائی پر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: "راجن کھیدا سے واپس آرہے تھے جب وشنو گپتا کے سپاہیوں نے ان کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ سب کے سب مارے گئے۔"

"سب کے سب؟" گوتم نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ سنا ہے شہزادیاں ندی تیر کے پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر سپاہی ان کے تعاقب میں ہیں۔"

"کیا چمپک بھی ماری گئی ہو گی ۔۔۔؟"

"وہ کون ہے؟" اکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا، "جنگ میں انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں۔" پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں جاتے ہو بھائی اکلیش؟"

"میں لڑنے جا رہا ہوں۔ مگر شاید تم نہیں لڑو گے کیونکہ تم اہنسا کے قائل ہو چکے ہو۔" اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا۔

جنگ ۔۔۔ امن ۔۔۔ خونریزی ۔۔۔ اہنسا ۔۔۔

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اس نے کملیشور کو مخاطب کیا: "مجھے کوئی بتاؤ، تم سب کلاکار اور عالم جو یہاں موجود ہو۔ بتاؤ کس وقت لڑا جائے۔ کس وقت نہیں۔ کوئی ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ ۔۔۔ جیو ہتیا کس سمے جائز ہے کب ناجائز؟" وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ "بھائیو مجھے نندراجہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں وشنو گپتا کو نہیں جانتا۔ چندرگپت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ سب مل کر مجھے اپنی لڑائی میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ مجھے تو ان سب کی جانیں بہت پیاری ہیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اب کیا کروں گا۔" کھڑکی کے پٹ سے سر لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اثنا میں لوگ، جو نگار خانے میں موجود تھے، اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ سنسان پڑا ہے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور زور سے چلانے لگا: "ارے اپنی اپنی مورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ یہ ٹوٹ

جائیں گی۔ بھائیو۔ بھائیو۔"

لیکن دفعتاً نیچے بازار میں شورِ قیامت بلند ہوا۔ شہر پر جنگی رتھوں اور ہاتھیوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ پل کی پل میں سارا بازار رن میں تبدیل ہوگیا۔ ڈھول اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھنکار اور عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی صداؤں کے خوفناک ہنود میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ بازار کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اس کے بیشتر کار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گردنیں اتارنے میں مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا۔ آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نگار خانے کی سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے مرے ہوئے کلیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا، تلوار گھماتا، کیونکہ خود فنونِ جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا۔ اور آخر زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہلِ شہر کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیت ون کی عمارت، چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندھیرے میں مدھم مدھم یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہنستا ہو۔

(۱۴)

وقت گزرتا جارہا ہے۔ دیس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے۔ وہ جو دیس کی چیتراف ریاست کا پہلا سمراٹ ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پریہ درشن نرپ چندر، انسانوں کا چاندر، جمبو‌ دیپ پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شودر ماں کا بیٹا، جسے گڈریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے ٹکشلا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑ اشرفیوں کے خزانوں کے قصے خواب و خیال ہوئے۔

یہ عہدِ جدید ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے۔ اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے۔ اس کا پایۂ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوف زدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستونوں والے چوبی محل میں دور دور کی سلطنتوں کے سفیر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں ملیچھ دوسری زبان بولنے والے غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہے۔ دور پچھم کے دیسوں کی سفید فام لڑکیاں محل میں نرتکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دلھن کی طرح آراستہ ہے۔ وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتھوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سمراٹ کی سواری گزرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شنکھ بجاتے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ چوراہوں پر رقص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ عوام جے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا۔ اب وہ چوری اور بدامنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا، جس کا دوسرا نام چانکیہ ہے، جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے، جس نے مہاپدم نند کو اپنی سیاست سے شکست دی، وہی وشنو گپتا مشیرِ سلطنت ہے۔ (اور شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے۔)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کو ایک مبہم سا احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاتوں اور خاندانوں سے بلند تر ایک اور شے ہے۔ وہ ایک ایسی قوم ہیں جنھوں نے چندر گپت پر یہ درشن کی قیادت میں ایرانیوں اور یونانیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا، ٹکسشلا کا برہمن، اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرائم کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزا و سزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستر والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہیے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفاخانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقات عامہ، امور خارجہ، دفاع، چراگاہوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔

جو برہمن اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں کما سکتے اور ناکام سوداگر، حجام، نجومی، نوکر چاکر، طوائفیں اور کسان، ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے۔ سادھوؤں کے بھیس میں ادھر ادھر گھوم کر جاسوس چندر گپت کے تخت و تاج کی حفاظت میں جٹے ہیں۔ بغاوت کا پتا چلاتے ہیں۔ ویشیاؤں کے گھروں اور قمار خانوں میں جاکر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرائم کی بیخ کنی کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منو نے کہا تھا جہاں سیاہ فام سُرخ آنکھوں والی ڈنڈ مجرموں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی پرجا تنگ نہیں ہوتی۔

یہاں بادشاہ ڈنڈ دھر ہے اور پرجا خوش ہے۔

پاٹلی پتر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مگدھ نام نرتی (پراکرت مگدھ کی عوامی بولی) میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناٹک اور موسیقی کے فنون اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی ہیں۔ کاریگر نئے نئے زیور گھڑ رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور سپیرے گلیوں میں دوتارہ اور بین بجاتے پھر رہے ہیں۔ بہروپیے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

ایک ناٹک منڈلی، جو کاشی سے آئی ہے، نئے نئے تماشے دکھا رہی ہے۔ ان ناٹکوں کا لیکھک پہلی بار پاٹلی پتر آیا ہے لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ بہت بڑا گنی اور کلاونت ہے۔ ایک زمانے میں چتر کار تھا اور مورتیاں بناتا تھا۔ نٹ (رقاص) ہے۔ بہت مزے کا ناچتا ہے۔ ناٹک (ایکٹر) ہے۔ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ برسوں برس اس نے ایودھیا کے گُنی جنوں اور گندھروں کی سنگت میں گزارے ہیں۔ سارے سُر اس کے قابو میں ہیں۔ بڑے بڑے گائیک اس کا لوہا مانتے ہیں۔ پر تب بھی اسے چین نہیں پڑتا۔ سارے دیس میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری توجہ کا مرکز نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ناٹک کی بہت دھوم مچی ہے۔ سارا پاٹلی پتر ناٹک گھر کی اور امنڈا چلا آ رہا ہے۔ خواتین کے رتھوں اور پالکیوں کا تانتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں، امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیٹیاں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیبیاں، سبھی رنگ برنگی ساریاں، زرنگار پٹکے اور سنہری کردھنیاں پہنے آ کر

کرناٹک گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیاہی نوجوان لڑکیاں اس اداکار اور ٹیکنک کو دیکھنے کی بہت مشتاق نظر آتی ہیں۔ انہوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا برائی کے مسئلے کو کلاکار کی شکل و صورت سے گڈ مڈ کر دیتی ہیں۔

سفید پردہ ایک طرف کو سرکایا گیا۔ منقش چوبی رنگ بھومی کا عقبی پردہ کلسوں، پنکھوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی رنگین چوکی سامنے بیٹھی تھی۔ سنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیوی استوتی کی اور ان میں سے ایک لڑکی ٹولی سے باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائیکہ تھی ـــــ اس کی لمبی چوٹی میں موتیا کا گجرا گندھا تھا اور اس کی طلائی گردن میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پردیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اس نے کیسری رنگ کے ریشمیں کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگمگا رہے تھے۔ وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلا میں دیکھتا باوقار انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لمحے تک سب کی طرف نظر ڈال کر اس نے قاعدے کے مطابق نٹی سے اس ناٹک کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے مسحور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹکٹکی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گردنیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالمے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

تماشائی چونک اٹھے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسب معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کو تماشے دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جس طرح رنگ بھومی کے عقبی پردے کے پیچھے ایک اور رنگ بھومی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پاٹلی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری، جو ایوان میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عش عش کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیسی کیسی دنیاؤں کی سیاحت پر نکلا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔ جن چیزوں سے اس نے بچنا چاہا، جن باتوں کو اس نے نظرانداز کرنے کی

کوشش کی محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی محض خلا رہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض کا وجود نہ تھا۔ وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ دنیا قدم قدم پر اپنے ہر روپ میں اس کے سامنے موجود اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوستی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا۔ پانچ انسان — جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔ اسی کی طرح بولتے تھے، گیت گاتے، اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے۔ وہ برہمچاری تھا لیکن برہمچاریہ کے سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجمد کرنے کے لیے اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دنیا میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ بالآخر اس کی اپنی دنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا۔ لیکن جنگ میں لڑتے سمے ”دشمن“ کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہوگئیں۔

شراوستی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے، وہ زخموں سے چور ہے اور اس کے ہاتھ لہولہان ہیں۔ اس نے لیٹے لیٹے بڑی مشکل سے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلایا جو خون میں لت پت تھیں۔

تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں، جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں، خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش وہار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلاکار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی۔ انگلیاں جو رقص کی مدراؤں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار، ساری زندگی کے معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو سینچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تھپک تھپک کر بچے کو سلاتی ہیں — آرتی کے لئے نارنجی پھول چنتی ہیں۔ اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیر گری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھالتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گلا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور لاشوں کو پھلانگتا، گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی، اس کو اپنی گود میں سلائے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل لڑائی میں مارے جا چکے تھے
لڑکھڑاتا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا جہاں ہو کا عالم تھا۔ جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کٹیا خالی تھی۔
وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔ اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو ارغوانی کر دیا۔
ایک نوجوان گوالن نے، جو ادھر سے گزر رہی تھی، اسے سسکتا ہوا دیکھا۔ وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے۔ اسے گائے کا تازہ دودھ لا کر کھلایا۔
اور بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے ہنسی آگئی۔
گوالن اسے اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدان جنگ سے لڑتا مرتا ہوا آرہا ہے اور ہنستا ہے۔
اس کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اس وجہ سے اس نے ازراہ مذاق بھی گوالن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سجاتا ہے یا نند بالا۔
کیونکہ اسے اس سمے ہری شنکر کے الفاظ یاد آچکے تھے۔ "بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہر موڑ پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی کوئی سجاتا۔ اور وہ نزدیک آکر تمہاری خدمت تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔" یہ دوسرا تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکرا پن ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گوالن کے کنگنوں کو چھوا۔ پھر اس کے پلو پر سر رکھ کر سو گیا۔
گوالن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی جہاں وہ کئی دن ــ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہو گئے ــ اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا ہمسایہ گاؤں تھا لیکن اب اجاڑ پڑا تھا۔ گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ گوالن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔ نند بالا، کہ یہی اس گوالن لڑکی کا نام تھا، بہت روئی لیکن وہ ندی پار کر کے بہت دور پہنچ چکا تھا۔
رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔ چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ گوتم گھومتا پھرتا کاشی جا نکلا۔ وہ عالم برہمن تھا۔ سوائے اپنے علم و فن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی۔ لیکن اسے فکر نہیں تھی۔

ودیا تھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکا رہنے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔ اسے یہ دبچاروں کی ایسی زندگی بری نہیں لگی۔ مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا۔

کاشی میں ایک ناٹک گھر کی نائیکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئی۔ اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کر لیا۔

اپنی کٹی ہوئی انگلیوں سے اب وہ تصویریں نہیں بنا سکتا تھا۔ مورتیاں نہیں ڈھال سکتا تھا۔ ناچ نہیں سکتا تھا۔ صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نے ناٹک لکھے تھے۔ فنِ اداکاری کا مطالعہ اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا۔ وہ فلسفی، عالم، چترکار اب نائیک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں۔ ہونٹ سرخ۔ دانت چمکیلے۔ اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہیے۔ اسے فنِ عروض، فنِ خطابت اور فنونِ لطیفہ پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ گوتم میں یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحرِ ذخار تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی رقص اور موسیقی کی مانند الوہی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہما نے اندر کی خواہش پر پانچوں وید کی حیثیت سے ناٹک قائم کیا۔ شیو اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپسراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشواکرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ پر ایک مرتبہ گندھرو اور اپسراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کا مذاق اڑایا جس کی بددعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیو لوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا۔ یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکار کشی لو کہلاتے تھے کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مغنیوں کے بھیس میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچے تھے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

ناٹک کا فن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ انھوں نے اڑتالیس قسم کے نائیک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انھوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اصناف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور توازن تمثیل کے لیے لازمی تھا۔ شدید المیے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تاکہ تماشائیوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم نیلمبر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کر سکتا تھا؟

ناٹیہ، نرتیہ اور نرت کے سام گیت میں اس نے خود کو سمو دیا۔ ایک روز ناٹک گھر کی اس نائیکا نے اس سے کہا، "میں نے سنا ہے تم بہت اچھا ناچتے ہو۔ مجھے بھی سکھلا دو۔"

"تم کو سکھلا دوں۔۔۔؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے؟" گوتم نے چڑ کر کہا، "مجھے تو کچھ نہیں آتا جاتا۔" اس روز اس پر شدید بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: "پتا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انھوں نے تم کو خود ناچتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"کون لوگ۔" وہ پھر گرجا۔

"جانے کون۔ ایودھیا کے کچھ نٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انھوں نے جنگ سے پہلے کسی تہوار میں تمھیں ناچتے دیکھا تھا۔"

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا۔ وہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ اسے اس لڑکی پر ترس آیا۔ وہ اس پر کتنی بری طرح فریفتہ تھی — بے چاری۔ "وہ کون لوگ تھے۔" اس نے پھر کہا۔ "کیا معلوم۔ ناٹک گھر میں دسیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔" لڑکی نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔ "اچھا اب میں گھنگرو باندھتی ہوں۔"

وہ اوما تانڈو کرتی رہی۔ وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگروؤں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی۔ وہ ایک اور حقیقت سے دوچار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لَے ہے۔ آفاق میں لَے ہے اور چدمبرم۔ انسان کا دل۔ جو کائنات کا مرکز ہے، شِو اس میں ناچتا ہے۔ شِو کسی تخیلی خدا کا نام نہیں جو پہاڑوں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے۔ وہ جو تخلیق ہے اور تخریب بھی۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ جو وجود اور عدم وجود، موت و زیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال لَے اور سُر پنہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقا اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔ وشنو جو بقا ہے، رُدر جو خاتمہ ہے۔ مہیشور جس نے روحیں تشکیل کی ہیں۔ سدیشور جو انہیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اسی کے مختلف پہلو ہیں جو ذاتِ مطلق ہے، جو ازلی اور ابدی قائم ہے۔

اس ناچ کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی

تصورات سے انھیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنگار رس وشنو کا ہے۔ اس میں ان کے اوتار نٹور گردھاری ورندابن میں اپنی گوپ لیلا رچاتے ہیں۔ ویررس کڑکتے گرجتے بادلوں کے سنہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترحم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ رُدر غیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں ملبوس مزاح ہے۔ بھیانک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھیانک شیو کے مہاکال روپ کی نیلی علامت ہے۔ ادبھت رس میں حیرت ہے۔

ان کیفیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی اداکاری کی جائے، کیسے رنگ ہوں، کیسے پس منظر، کون کون راگ۔

میگھ، سری، ہنڈول، توڑی، چھایا، للت، شرنگار رس کے، محبت کے راگ ہیں۔

گوری، سوم اور دیوکرتی ویررس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آساوری کرونا کے راگ ہیں۔ تنکر ہاسیا کا نغمہ ہے۔

اداکار رقاص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں، اپنے ہاتھوں، اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پینتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں اور ہر قسم کی چوبیس علٰحدہ علٰحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوچ اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہیں۔ جس طرح گایتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پردیپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتر اس کے سامنے ناچا کی۔ اس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا: یہ مور کی چال ہے، یہ ہرن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کودنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس، چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دو سو پینتالیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات، احساسات، خیالات۔ درخت، پھل، پھول، پرند۔ عہدِ عتیق کے شہنشاہ۔ انسانی رشتے دیوی دیوتا۔ وشنو کے اوتار۔ چتر ورن۔ تاریخی ہستیاں۔ ساتوں سمندر۔ مشہور ندیاں۔ ساتوں طبقاتِ ارضی ساتوں طبقاتِ سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ المیہ اور طربیہ اداکاری کے سارے اتار چڑھاؤ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھرت ناٹیم ہے۔

شیو کا ناچ - بھرت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقاصہ بھرت ناٹیم ناچ رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ چمپک ناچی تھی، جس طرح جب تک تال اور لے اور سُر قائم ہے بھرت ناٹیم ناچا جائے گا۔

مگر میں نٹ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناچ سکوں گا کیونکہ میں اپاہج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی - وہ خود شنکر نہیں تھا۔ وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تخیل کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ تب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اکتا کر اس کے قریب آ بیٹھی اور اداسی سے اس کی شکل دیکھنے لگی - شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی - مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے — ہی کیا یہی کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصے میں میرا ہے - ؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امبیکا تھا۔ یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیر زادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ ریجھی بھی تو کس پر — ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں -

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا - تم جس کو چاہتے ہو تمہاری پروا نہیں کرتا اور جو تم پر جان دیتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں - یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے ہزاروں کر چکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امبیکا میں روپ وتی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنر موجود تھے جو ایک رقاصہ اور اداکار کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے - وہ سنگیت کار تھی - شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجانے کا فن جانتی تھی - ضلع جگت کی استاد تھی - فنِ باغبانی، تیر اندازی اور منطق کی ماہر تھی - اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں - اس کا رنگ خزاں کے پتوں کی مانند پیلا تھا - کستوری کی بکھڑیوں کا غازہ چہرے پر مل کر، کُم کُم اور کاجل سے آراستہ ہو، نفیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی تو چاروں اور تہلکہ مچ جاتا تھا -

پر گوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر ملتفت نہ ہوا - وہ امبیکا کی منڈلی کے ساتھ سارے میں گھومتا - موریہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب گوتم بھی امیر زادوں کے سے ٹھاٹھ سے رہتا - شرابیں پیتا - نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا - امبیکا، اس کی بنجارن، اس کی ان ساری بری عادتوں کے باوجود اس کی پرستش

کیے گئی۔ وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی، اس کے اکل کھرے پن، اس کے غرور اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برابر مسلط تھا، اس کی روح کی گہرائیوں میں تان پورے کے سروں کی طرح گونجتا رہتا تھا۔ چمپک — چمپک — چمپک —

اس نے چمپک کی تلاش میں دور دراز کی یاترائیں کیں۔ شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے بچ گئی ہو۔ شاید کسی پرانے مٹھ و بہار میں دکھائی دے جائے۔ وہ شاکیہ منی کی بھکشنوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا۔ وہ ہر پنگھٹ، ہر بزاز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ چمپک کو تلاش کرتا جہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں۔ مگر وہ کہیں نہ ملی۔

تب اس نے تھک کر اپنی کھوج ختم کر دی اور امبیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف امبیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ امبیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آگیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ امبیکا کو افسوس سے دیکھتا۔ یہ بے چاری میرے لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے، اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھاپا ہے۔ بیوقوف امبیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو سچ مچ اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے بھنورا ایسے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی دنگا کی ملائم ململ اور قیمتی ریشم میں ملبوس اپنے منقش رتھ میں امبیکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلتا تھا۔

آج وہ پاٹلی پتر میں موجود تھا اور حسبِ معمول تمثیل کے دوران میں امبیکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشائی اُسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشائی جو بہروپ کے عاشق ہیں، جو اصل گوتم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

(۱۶)

خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خواب پرست لڑکیوں نے حیرت اور

دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی داب لی۔

انھیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف چمپک بیٹھی تھی۔ اس نے نقرئی پھولوں والی اودے رنگ کی ریشمیں ساری پہن رکھی تھی اور اپنی سہیلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوتم نیلمبر نظر آیا۔ وہ لرز اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دُھند تیرنے لگی اور اس دھندلکے میں گوتم کا چہرہ اس کے سامنے جھلملاتا رہا۔

گوتم نے گرج گرج کر کچھ سناتے ہوئے سامنے دیکھا اور تماشائیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھلائی دی۔ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کر کے وہ مبہوت اسے دیکھتا رہا۔

پھر یکلخت اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

کیونکہ چمپک جو اودی ساری پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی، جو اتنے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آ گئی تھی۔ گوتم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سیندور تھا اور پیروں میں سرخ مہندی اور بچھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشا گاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی۔ وہ ماں تھی۔ اور اب یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ شکنتلا، دمینتی، ساوتری اور سیتا کیسی رہی ہوں گی، کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔

وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگ دی پھر بھی اس کی یاد دل سے نہ ہٹا سکا۔ وہ ہری شنکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی ویراگی رہا گو بظاہر مکمل دنیادار بنا۔ وہ گوتم نیلمبر تھا۔ وہ خود، وہ دکھیاری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مسرتوں ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔

راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پاٹلی پتر لایا گیا۔ ایودھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی چانکیہ مہاراج کے ایک افسر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنجا اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی۔ جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرہ پتنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پردہ گرا تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی ادھر اُدھر دیکھتی سرعت سے باہر چلی گئی۔

(۱۷)

پہلے باب کے خاتمے پر گوتم بھی رنگ بھومی کے پیچھے سنگھار کمرے میں گیا جہاں دوسرے اداکار آ آکر جمع ہو رہے تھے۔

"ایک داسی تم سے ملنا چاہتی ہے۔" امبیکا نے آئینے کے سامنے اپنی مالائیں اتارتے ہوئے مڑ کر اس سے کہا۔

"کون ہے؟" ـــــ گوتم نے پوچھا۔ اُس کی آواز میں سے ساری درشتی، سارا چڑچڑاپن غائب ہو چکا تھا۔ امبیکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کس قدر شانت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔

"پتا نہیں،" امبیکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا۔ "تم خود دیکھ لو۔" اور پھر وہ اپنے ملبوسات اٹھا کر دوسری رقاصاؤں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیڑھیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں۔
نیچے ایک سانولی سی خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس نے کہا: "میری رانی نے تم کو پرنام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔"

وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا: "نہیں۔ اپنی رانی سے کہو، جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آجاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر جاگتے رہتے ہیں۔۔۔ ان سے کہنا، اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی شے میرے راستے میں نہیں آسکتی۔۔۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سمان ہیں۔۔۔؟ اب تم جا سکتی ہو۔"

وہ چھانجھن بجاتی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آگئی۔۔۔ اور اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب آکر کہا: "میری رانی کہتی ہیں تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اگر اب جاگ گئے ہو تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے، انہوں نے کہا ہے کہ تم پتی ورتا کے معنی کیا جانو۔ لیکن ٹھیک ہے، کسی شے کو تمہارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب تم بھی جا سکتے ہو۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشائیوں کے ہجوم میں غائب ہوگئی جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد گوتم تماشائیوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ بھوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے ریشمیں کپڑے اور گہنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈالی کر ننگے پاؤں وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آگیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بھاگا ہو اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار اسے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سراؤں میں تیز روشنی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکتے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفا خانوں میں مریض لیٹے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سرکاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جا رہے تھے۔ دریا کی بندرگاہ پر جہاز بن رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ویشیاؤں کے علاقے میں سے گزرا جہاں

ٹھگوں، جواریوں، مداریوں اور نقلی جادوگروں کے اڈوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آرہے تھے۔

اس وقت سمراٹ اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہاراج کے ساتھ چترنگ کھیل[1] رہے ہوں گے — یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

ایک ویشیا اس کے قریب سے اُسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً یہ بھی دوسری قابل ویش ناریوں کی مانند جاسوسی کے محکمے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہاراج سے کوئی پوچھے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا؟ وہ پھر مسکرایا۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فصیل کے برجوں میں پہرے دار للکار رہے تھے۔ وہ ایک پھاٹک کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھاٹک ہیں۔ کونسا پھاٹک میری منزل کے راستے پر کھلتا ہے —؟

پہرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا۔ وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آگیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندھیرے جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے — ندیوں کے کنارے سادھو تپسیا میں مصروف تھے۔ ون پرستھ، جو گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے، برسات میں بارش میں شرابور رہتے، جاڑوں میں بھیگے کپڑے پہنتے تاکہ جسم کی تکلیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ بھی ایک بار ببول کے کانٹوں پر سویا تھا، پانی میں ایک ٹانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیاس کا دور آتا ہے جب تارک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالباً میرا ابھی یہی دور ہے۔ وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمنا رہتی ہے نہ زندگی کی — وہ چلا گیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مویشی پالنے والوں کے گاؤں — اس کا ٹھکانہ کدھر ہے؟

لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی۔ وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا: زمین[2]

---

[1] شطرنج [2] رگ وید کی ایک حمد

تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لادے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے۔ کون گاؤں، کون جنگل، کون بھائیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں ––– زمین مجھے ٹھکانہ دے۔ مجھے کہیں ٹھکانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پودوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ چھیڑ رہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چنریاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ ––– بڑھتی جاؤ، او جَو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو ––– جَو کی اونچی بالیو۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو۔ وہ سب امر ہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔[1]

اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا ––– جس طرح سیپی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڈنڈی پر آ گیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے۔ وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں مُرلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی معیت میں کھڑا پایا: رُدر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے بادلوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قطرے اس کے خوبصورت اداس چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے ––– اس نے آہستہ آہستہ رُدر کی تقدیس کی:

رتھ بان کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے۔ وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہوا تیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دھند چھائی ہے۔ زمین پر بیج گرے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے برسے گی۔ گرج اور دھاڑ ––– دھاڑ اور گرج –––[2]

---

[1] رگ وید کی ایک حمد [2] رگ وید کی حمد

بیچ بچ۔ پانی کے زوردار چھینٹے اڑاتے رتھ میں اڑتا ہوا، برستا ہوا آ، تاکہ جل اور تھل ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں شنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برہمن اوشا کی حمد الاپ رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی۔ برہمنوں نے کہا۔

ان گنت آنے والی صبحوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صبحوں کے راستے پر چلتی ہوئی اوشا زندہ انسانوں کو اٹھا رہی ہے لیکن وہ جو مر چکا ہے اسے وہ اس کی نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو، جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتتے ہیں، پروہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے — برہمنوں نے کہا۔

دولت مند لڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔

بہادر بیٹے اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد وایو سے بلند تر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداؤں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر — اور ایسا ہو کہ مترا اور ورونا اور سندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں — برہمنوں نے کہا۔

گوتم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا۔

خداؤں کی ماں — جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔

برہمنوں کی آواز اس کے پیچھے دریا پر پھیلتی گئی — وہ مندروں کی قطار کے سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آ گیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگی مٹی پر دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا، شکست خوردہ۔ بشاش۔ پر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا سنہرا شہر تھا، جو بارش کے دھندلکے میں یوں جگمگا رہا تھا مانو سارا کا سارا سونے کا بنا ہوا اور اس میں سے جگر جگر کرتی تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور — اس نے اپنے خدا کو للکار کر مخاطب کیا — اس نے کہا:

خداوندا — تو جو آگ ہے، تو سورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برہما ہے، پانی ہے،

۱؎ ہوا

پرجاپتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نوجوان ہے، تو لڑکی ہے، تُو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لاٹھی ٹیکتا لڑکھڑاتا ہُوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رخ ہر سمت کیے پیدا ہوتا ہے۔

تو گہری نیلی مکھی ہے، تو سُرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے۔ تو طوفانی بادل ہے، تو سارے موسم ہے، تو سمندر ہے۔

— دو پرند، چہیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرا اسے ٹکر ٹکر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اداس، اپنی کم طاقتی پر متحیر۔ لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے اس کا اپنا دکھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو رگ وید کی اس امٹ ہستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا رہتے ہیں رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہُوا — وہ جو اسے جانتے ہیں مطمئن بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا، جو لطیف سے لطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جو شیو، یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔ صرف شیو باقی ہے۔ وہ ابدی روشنی ساوتری کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوئی۔

اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہہ نہیں بن سکتی۔ وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا، ان الفاظ کے ساتھ کوئی تھرتھر کانپتا تیرے نزدیک آتا ہے۔ اور تُو میری حفاظت کر —

وہ دنیا میں تنہا پرندہ ہے۔ وہ آفتاب کی مانند ہے جو سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اسے جان جائے موت پرسے گزر جائے گا۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا، جس طرح تان پورے کے تار جھنجھناتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سرجو بے نیازی سے رواں تھی۔

پھر اُسے لگا جیسے اُسے کوئی دُور سے آواز دے رہا ہے۔ بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بیحد

دھیما ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے سنا لیکن آواز اس کے کانوں تک صاف نہیں آرہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کرکے دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشاک میں ملبوس ایک ہیولےٰ سا ڈول رہا تھا۔

تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) سے پوچھا: "کچھ جانتی ہو، ندی کے اس پار کون رہتا ہے ؟"

"کچھ بھکشو لوگ ہیں۔" لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ "وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔"

"تم اسے جانتی ہو؟"

"میں اسے جان کر کیا کروں گی — ؟" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا ذرا میں اس سے مل آؤں۔"

"ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے ؟ — اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔"

"کیا حرج ہے — ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔"

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پپیہے چلاتے تھے، بھنورے گونج رہے تھے — بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیرنے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کا بھکشو، نارنجی پوشاک میں ملبوس، دیر سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انبساط سے جگمگا اٹھا۔

وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا اب اس نے بھکشو کی آواز سنی:

"بھائی گوتم —"

"ہاں بھائی ہری شنکر — پہنچتا ہوں — ٹھہرے رہو۔" اس نے زیادہ تیزی سے پیرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپیڑے سے وہ کنارے کے بہت قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی ایک

لگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لحظے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر، جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھل پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں۔ پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں کے نیچے، جہاں لہروں کا بھنور ایسا بنا تھا، اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لمحے کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا۔ وہ یہاں آکر کیا کر رہا ہے؟

چمپا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں آتی ہو۔ مگر کشتی میں چند دیہاتی بھجن گاتے اپنی دھن میں مگن ایک سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امر بیل کا ایک پتا توڑا۔ کدم کی ٹہنی پھولوں سے لدی تھی۔ چند پھول ٹپ ٹپ اس کے سر پر آ گرے۔ اس نے پگڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منقش قبضے کو چھوا۔ پھولوں کے اس ہجوم میں تلوار اسے بہت بے تکی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ سے تلوار کمر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

تب پانی میں تیرتی ہوئی چمپا گھاٹ پر آ گئی۔

"ہم تو سمجھے تھے تم کہیں اور مارنے مرنے کے لیے چل دیے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔"

"کہاں۔" لڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

"بہار — اور اس سے بھی آگے۔ بنگال —"

"وہاں جا کر کیا کرو گے۔ یہیں رہو۔"

"وہاں میرے بھائی بند ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمھارے بھائی بند کہیں پہاڑوں میں لوٹ مار مچاتے ہوں گے۔ گور کے دربار میں ان کا کیا کام۔"

"تم میرے بھائی بندوں سے بہت خفا ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ لوٹ مار نہیں مچاتے۔ یہ ترکوں اور افغانوں کا مشغلہ ہے۔ میں عرب ہوں۔ میرا کام فلسفہ دانی ہے اور۔" اس نے ذرا رک کر کہا، "میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے، او بیوقوف لڑکی، شعر کے پرستار ہیں، خون نہیں بہاتے۔"

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ اب وہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔

"ہنستی رہو۔ ایک روز زبردستی اڑا کر لے جاؤں گا۔ پھر بعد میں جو چاہنا کہنا۔"

"ہے ہے۔ ایسا اندھیر نہ کرنا۔ شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے۔ میں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ جونپور میں اگر اس طرح تم گھنٹوں ہم سے باتیں کرتے تو دیکھتے اپنا حشر۔"

"جونپور میں تو میں تم کو قطعی بھگا لے جاتا۔ لے جا کر سید معالی کی حویلی میں بند کر دیتا۔"

"رام رام کیسی باتیں کرتے ہو۔ جونپور میں ہمارا ایسا مہا تما سمان بادشاہ رہتا ہے۔ مجال ہے جو تم ایسی حرکت کرتے۔"

"اجی دیکھے ہیں تمھارے مہا تما سمان بادشاہ۔"

"کیوں۔ ایسے ایسے گیت بناتا ہے۔ جو انسان اتنا بڑا سنگیت کار ہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ ایک روز بھیتن نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کانڑا میں سنایا تھا۔ بھیتن کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔ اسے خیال کہتے ہیں۔"

"اب تم موسیقی پر تقریر کرو۔ اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کانڑا سنا رہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو۔؟"

"تم کو اس سے مطلب۔ کل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔ صوبیدار ہو گے اپنی فوج کے ہو گے مجھ پر کاہے کی دھونس ہے۔"

"میں صوبیدار نہیں ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو جچتا ہے۔"

"قاتل کا پیشہ۔"

"پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔"

"اچھا اب نہیں کہتے۔ مگر ہو تم قاتل ضرور۔ جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کو اس تلوار سے

مارا ہوگا۔ ہائے ہائے۔"

"پھر وہی مرنے کی ایک ٹانگ۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔ سلطان کے کتب خانے کا نگران ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔"

"اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، پستکیں، جنہیں سمجھ دار لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا بائیں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے ان کی کتابیں بنتی ہیں۔ سمجھیں۔"

"جانتی ہوں۔ مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔ یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔"

"چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم ادھر والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی؟ ایک میرا یار ہے اودلے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔" کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدانِ جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ "تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدانِ جنگ میں آتا ہے۔"

"ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی انخانوں کا کام ہے، تم کو پتا لکھتے ہو۔"

وہ جھنجھلا گیا۔ "تم عورتوں سے بحث کون کرے۔" اس نے امر بیل کا ایک پتا اور توڑا۔

"دیکھو،" لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، "جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔"

"وہم۔ وہ کیا چیز ہے۔؟"

"تم کو سمجھانا بیکار ہے۔" وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

کمال الدین نے درختوں کے سائے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

"اچھا چمپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔" وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

"ایودھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟"

قریب سے درویشوں کی ایک ٹولی گزری۔ ان میں سے ایک نوجوان نے چمپا اور کمال کو دیکھا اور

پھر نظریں نیچی کر لیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

"یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔" کمال نے اظہارِ خیال کیا۔

"مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان کا مذاق مت اڑانا۔" چمپا نے یکلخت غصے سے کہا۔ "ایک روز یہی تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"تمہارے بھائی نے تمہیں اچھی خاصی پنڈتائن بنا رکھا ہے۔ میں کسی روز اس سے مناظرہ کروں گا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔" کمال الدین نے جاتے جاتے مڑ کر رکاب میں سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا، "کہ جیسے دو مذہب ہیں نا — ایک تمھارا — ایک میرا —"

"میرا اور تمہارا کوئی الگ الگ مذہب ہے —؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں۔"

"پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں — تو مطلب یہ —" اس نے پھر سمجھانا شروع کیا۔ "کہ دو فریق اپنے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اسے مناظرہ کہتے ہیں۔"

"سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون — وہ تو ستیہ پیر ہے جو سب جھوٹ سچ کا فیصلہ کرتا ہے۔ کہے کبیر اک رام جپو ری۔ ہندو ترک نہ کوئی۔"

"پھر تم نے تقریر شروع کی۔ تم کاشی جا کر اپنے کبیر کی چیلی کیوں نہیں بن جاتیں۔ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔"

"کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے مگر اس سے پہلے تم کو اپنی تلوار اتارنا پڑے گی۔"

"یہی شرط ہے؟"

"بالکل یہی شرط ہے!"

"تم کو تو جونپور کا قاضی ہونا چاہیے تھا — اچھا خدا حافظ —"

وہ دریا کی طرف بڑھا۔ "اس پار وہ ٹوٹے پتھروں کا اونچا ڈھیر ایسا کیا ہے؟"

"وہ — ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں — سینکڑوں ہزاروں برس پرانے —"

"اور اس کے ادھر وہ جھونپڑیاں ایسی ہیں، ان میں کون رہتا ہے؟"

"ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں — بھگت —"

"تب تو تمہارا وقت بہت اچھا کٹتا ہو گا — صوفیوں کی سنگت — مسئلے مسائل، ذکر اذکار — ایک

اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشغلے ہیں۔"
"اور کیا کریں۔ تمہارے جونپور کی شہزادیوں کی طرح محلسرا میں بیٹھ کر شطرنج کھیلا کریں۔"
"بالکل۔ لیکن میری محلسرا میں شطرنج کے علاوہ کتابیں بھی ہیں۔ سینکڑوں۔ اور تم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا۔" وہ دفعتاً جھینپ کر سُرخ ہو گئی۔ کمال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔ "مگر تم عربی بولتی عجیب مسخری لگو گی۔ نہیں بھائی۔ تم چمپاوتی ہی رہو۔ تمہارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے: "تمہارا پڑاؤ یہاں ختم ہوا۔ اب کہاں جاتے ہو۔؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"بہرائچ۔ وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔"

"بارشیں شروع ہونے والی ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

"ہاں۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ خدا حافظ و ناصر بیوقوف لڑکی!"

وہ اسے بیوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اور اس خطاب میں کتنا اتھاہ پیار چھپا تھا۔ وہ آنسو پی کر مسکرائی۔ کمال الدین نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہو گیا۔

لڑکی گھاٹ پر سے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی جس کی کھپریل پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اور جس کے سبز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں۔ برآمدے میں اس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔ اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ دروازے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی پتلی سی لکیر لہراتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ چمپا نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس پُرسکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی اندر چلی گئی۔

(۱۸)

بہرائچ کی چھوٹی سی آبادی میں پیلے رنگ کے پکے مکان ادھر اُدھر بکھرے تھے۔ خاک آلود راستوں

پرسے بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اداسی کی بے رنگ، بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سُنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوستی کہتے تھے۔ اس کے سوم ونشی بادشاہ بڑے جاہ و جلال والے تھے اور نجومیوں نے شراوستی کے سوہل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے جب اتر سے دیو زاد بلند و بالا ترک آ کر تمھارا خاتمہ کر دیں گے اور غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود غازی نے سوہل دیو کا خاتمہ کر دیا اور دلی میں قطب الدین ایبک آیا اور اس کے سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مگدھ اور بنگال کے سارے بت پرست بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوستی اور نالندہ اور وکرم شلا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے پوتھی پترے وہیں چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے، یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی اور نکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکیہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتار بنا دیے گئے تھے اور مہایان بدھ مت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور سارا بنگالہ اور سارا بہار تانترک منتروں اور وجر تارا کے بھجنوں کی سریلی آوازوں سے گونج رہا تھا اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی پچھلی دو صدیوں میں بالے میاں کے روپ میں کوشل دیس کے سواسیوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پر گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات نکلتی۔

یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آرہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گو نالندہ اور وکرم شلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوستی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب و غریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب و غریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الٰہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو بیدالنغی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العابدین اور گوڑ کے علاؤالدین حسین شاہ کی طرح جونپور کا حسین شرقی بھی انہی سنکی لوگوں میں سے تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے

ان پوتھی پتروں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

حسین شرقی کو جب بھی دلّی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہرائچ کے کسی مٹھ میں ڈیڑھ دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تانبے پتر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمنصور کمال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

کمال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ اسے تقریباً یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چمپا وتی کہلاتی تھی۔

اپنے دقیانوسی فلسفوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق، جن کی تلاش میں کمال ان کے پاس گیا تھا، سرجو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اس چکر کا نام انھوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا۔ وہ لوگ دن رات نرگن رام، نرگن رام جپو رے بھائی کی رٹ لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں کمال الدین شنکر اچاریہ اور رولبھ اور رامانند کے ناموں سے آشنا ہوا۔ اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن کمال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ مؤرخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مبہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت اور پالی اور پراکرت اور اردھ مگدھی میں لکھی ہوئی ان بے تکی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا گو وہ جلد از جلد جونپور واپس پہنچنا چاہتا تھا جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظمیں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اس نے بہت سی چاندنی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں بیٹھ کر جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک برہمن زادی مل جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی، اس سے الٹی سیدھی بحثیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جونپور کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپا وتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نئی سی چیز تھی۔ ناجیہ اور اُم رباب اور شہزادی سلیمہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔

مرد ہمیشہ تنوع پسند کرتا ہے۔

پرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شنکراچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراوستی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بستی سہیٹ میٹ کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الو بولتے تھے اور رات میں چمگادڑیں اپنے پر پھیلاتی تھیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پتھروں اور شہتیروں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں کبھی شاندار بازار رہا ہوگا اور اونچی اونچی حویلیاں بنی ہوں گی۔ وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان، جن کی دیواروں میں آتشدان تھے ، کوٹھڑیاں، غسل خانے، آنگنوں میں بنے ہوئے کنوئیں اور تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل میں جھروکے تھے — وسط میں آنگن کے گرداگرد جو برآمدہ تھا اس کے ستون ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے اختتام پر ہاتھی کے سر ترشے ہوئے تھے۔

یہ جانے کس کا مکان رہا ہوگا، کمال نے سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے سامنے کی شکستہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پُراسرار، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کمال کو ایک پھریری سی آئی۔ اس نے ہمت کر کے حلق صاف کیا اور بولا: "اے بھائی — جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں —"

"راجا کا —" دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا لطیفہ اس نے سنا ہے۔ "ارے راجا کا مکنوا اتنا چھوٹا —؟ راجا کے محلوا پر تو ہل چل گئین۔ ای تو ہجاران برس پُرانی حویلی ہوئے — پرکھن سے سنے ہن ای ماکو وُ باہمن پروہت رہت رہے۔ ان کا لرکوا جو بڑا ودوان رہا —"

"اس لڑکے کا نام جانتے ہو —؟"

"ہم کا جانی — ہم پنچ نام ناہیں یاد رکھت ہن۔ نام مٹ جات ہیں۔ کھالی کھدائے کا نام امر ہوے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنا گٹھا سنبھال آگے بڑھ گیا۔

کمال کو بڑی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے!

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا: "کھنڈروں میں جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے —؟"

اس نے بھی کمال کو بڑی پراسرار نظروں سے دیکھا گویا یہ غیر ملکی عالم کیسا فضول سوال کر رہا ہے۔
"یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ، اشوک پریہ درشن، سمدر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کار رہتے تھے اور سنگتراش اور ریکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔"
"لاحول ولاقوۃ۔" کمال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ناممکن ہے۔ ان تانبے پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ وہ گھوم پھر کر اسی کھنڈر میں واپس گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔
یکلخت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستانا شروع کر دیا۔

(19)

کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا۔ اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ بائیس سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور و فکر کیا تھا۔ وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندلس کے ابن رشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہل سیف کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تغلق آباد پہنچا۔
دنیا عجیب ہنگاموں کے دور سے گزر رہی تھی بلکہ کمال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پہ کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی نسطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں

نے سارا کا سارا بچھا کر رکھ دیا۔ بنو اُمیّہ کا دمشق، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمٰن کا اشبیلیہ۔ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچتی تھیں۔ اس قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا ایتھنز، جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہوئیں۔ صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپائدار ہے۔ دُنیا فانی ہے۔ دُنیا قابلِ نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑبڑ پھیلاتے تھے۔ ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پردازی ان کی گھٹی میں پڑی تھی ——————

—————— —————— اب سلجوقی ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جہانبانوں کو نت نئے ملک تسخیر کرنے سے ہی کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوانیوں میں اپنا سر کھپاتے۔ اور بہر حال وہ بھی راسخ العقیدہ کٹر سُنّی مسلمان تھے، عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنونِ لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوّری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری مغرب میں مسلمان ہوئے مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو ترک شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس حملے سے ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستانِ پارینہ میں شامل ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھرا اجڑا اور نالندہ، قنوج اور اجین۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنھوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے۔ کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا!

اور اسی خونریز دور میں جنوب کے پُرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نَے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور مہابلی پورم

کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

انتشار اور بدامنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نئے ملک کی طرف آ چکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسخیر کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستھان، دکن اور گجرات، سندھ اور پنجاب میں نئے دیار آباد کیے۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔

دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قرطبہ کی مسجد میں عیسےٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تموچن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کو تہس نہس کر کے سمرقند واپس جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جونپور شیرازِ ہند کہلا رہا تھا۔

اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستر سال گزرے تھے۔ صاحبقراں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی۔ انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں۔ گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہلِ علم آ کر جونپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالمنصور کمال الدین نے بھی دلی میں چند روز ٹھہرنے کے بعد جونپور آ کر دم لیا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جونپور، کاشی، الودھیا اور بہرائچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان اس سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جو بت پرستوں کے طریقے سے رہتے سہتے تھے۔ پشمینہ پوشوں اور جوگیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھومتے تھے۔ ان کی عورتیں عبائیں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگین چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بڑی حیا تھی۔

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدانِ جنگ میں کٹتی تھی یا محفلِ چنگ و رباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابنِ رشد دونوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی

شورشوں اور بدامنیوں کے باوجود، کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ ناامید نہیں تھا۔ وہ ہر شے کو استعجاب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آکر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی۔ ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا اس نے اس کو بہت مسحور رکھا۔ شیراز اور بدخشاں کے لالہ زار، کاشغر، سمرقند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چینی گلابوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں ترچھی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی لڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریائے جیحون کا ساحل اور سنہرے بالوں والے ترکمانوں کی خیمہ گاہیں۔ شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیستانیوں، ترکوں، چینیوں اور ایرانیوں نے مل جل کر سنگتراشی کی ایک نئی دنیا آباد کی تھی۔ اور پھر ہند کے جنوب میں سمندر کے سرسبز کنارے اور آندھرا دیس، اور کیرالا، تامل ناڈو اور کورومنڈل کی ہری گھاٹیاں اور سلطنتِ وجے نگر کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنگنوں میں تاڑ کے درختوں کے پیچھے بادامی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیرے کی لونگیں پہنے بھرت ناٹیم ناچتی تھیں۔

خداوندا! کیسے کیسے لوگ تھے، کیسی کیسی قومیں! دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابلِ قدر چیز تھی۔

ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہرحال اس کا وطن نہیں تھا۔

اور گو اس کے بہت سے حصوں پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں لیکن بہرحال یہ مجموعی طور پر دارالحرب تھا کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زبردست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دارالحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی سرجو بھلا دجلے کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون میسر نہیں جو کسی نخلستان میں چشمے کے کنارے کھجور کے تلے بیٹھ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گو آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا۔ اس نے کھنڈر کے ستون سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جونپور واپس جا کر سلطان سے معذرت چاہے گا اور دمشق لوٹ جائے گا۔ دمشق؟ اسے یکلخت یہ نام بھی بے حد اجنبی سا لگا۔ وہ دمشق جا کر کیا کرے گا؟ نیشاپور میں اس کا کیا رکھا ہے؟ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ؟ یہ

سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور کس قدر بے تکے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو لنگوچا سر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ماسا الاپتا بستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور قبطیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنتِ روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی، اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامحدود پہاڑی سلسلے۔ وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں سُنا تھا کہ جوگی ہوا میں اڑتے تھے اور جہاں کامروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادو ٹونے ہوتے تھے اور جہاں گورکھ ناتھ کے چیلوں کے گورکھ دھندے عقل کو چکرا دیتے تھے۔

لیکن ابوریحان البیرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کمال نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں۔ اور کتنی عجیب بات تھی کہ فلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے تکے ملک میں لا ڈالا تھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جواہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگمگاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دیس کی حسین مہ جبیں عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے اُس نے یہاں کی عجیب مدہوش کُن موسیقی سنی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے تذکرہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد شراب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا، اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمال نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سمرقند اور قاہرہ کے بازاروں میں بکنے والی کنیزیں، مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کی ہوئی لڑکیاں، سلاطین کی حرم سراؤں میں مقید مہ جبینیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جائداد تھی۔ اس کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، کوئی تمنائیں، کوئی زندگی۔

مگر بہر حال خداوند تعالیٰ کی یہ مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی۔ مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیائیں تھیں جن میں پہنچ کر عورت کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ذہن کی دنیا، روح کی دنیا۔ گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک کمال اسے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تجربے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی کیونکہ دراصل یہ محض اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے، وقتاً فوقتاً ان سے محبت کرتا رہے۔ اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبہ کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام تھا کہ گڑیا کی طرح سجی بنی بیٹھی رہے ۔ کمال جس زبان میں شاعری کرتا تھا اس کی روایت تھی کہ شجاع سورما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا دلآویز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سُرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں بیٹھی ہے۔ جھروکے کے نیچے سورما شاعر رباب بجا بجا کر اسے اپنے خطرناک عشق کے نغمے سنا رہا ہے۔ یہ نغمے جو چاندنی راتوں میں وادیوں اور پہاڑی راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور البس کے اس پار تک پھیل چکی تھی ـــ سورما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا اسے اس ستون پر سے اتار دیتا تھا۔

اس اجنبی بے تکے ملک میں آن کر اس نے خُدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا: وہ تو خود ہاتھ میں رباب لیے محبت کے نغمے الاپ رہی تھی، رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی۔ لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بننے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے آگ کے شعلوں میں بھی کود جاتی تھی۔ اس کی وفا شعاری کی قسمیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

کمال چپ چاپ کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا۔ اسے وہ سارے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے اٹودھیا میں چمپا نے اسے سنائے تھے۔ یہ نغمے بھجن کہلاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھگتی کا ان میں تذکرہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہلے کبھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جونپور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سیکھی تھیں۔ اسے اپنے ہفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے فلسفۂ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی، اس پرائے دیس میں، مرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سایوں کو دیکھا کیا۔

(۲۰)

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیما کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی کرنوں نے سنگِ سُرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بیحد مدھم کر دیا تھا۔ یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنول اور کائنات کا پہیا اور کنول کا سنگھاسن، اور آگ کا ستون ہے۔ جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا۔ معنی کیا ہوتے ہیں؟ کمال حیرت سے ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ باہر سوئے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سناٹا منڈلا رہا تھا۔

اور پھر اس سناٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگا جیسے تاریک ویران گلی میں سے بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل پہنے اور دوشالے اوڑھے اجنبی انسان بیٹھے اسے جھانک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہنستے تھے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں، دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و نابود کر دیے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چندر گپت سری چندر کھڑا تھا۔ انسانوں کا چاند۔ ہند کا سمراٹ۔ مگر وہ یہاں کہاں سے آیا؟ کمال نے لاحول پڑھی۔ وہ تو عیسٰے کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بخت نے آخر دنوں میں جین سنیاسی بن کر اپنے آپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا۔ مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا۔

پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا اور بندر کی طرح کود کر اس کے سامنے آگیا اور مخاطب کیا ——— دیکھو میرا نام اشوک ہے۔ اشوک پریہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مرا تو صرف ڈیڑھ آنولے کا مالک تھا۔ اس نے مٹھی کھول کے آدھا آنولہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے بعد ان پلید روحوں کی یلغار شروع ہوگئی۔ وہ رتھوں پر سے اتر اتر کر سارے میں پھیل گئے۔ بندروں کی طرح شہتیروں سے لٹک گئے۔ ستونوں پر جا چڑھے۔ آنگن کے خشک حوض میں قلابازیاں کھانے

گئے۔ ان سب نے مل کر باریک آواز میں کووں کی طرح کائیں کائیں شروع کر دی۔ وہ سب کمال کے چاروں طرف ناچ ناچ کر ایک ساتھ چلا رہے تھے:

میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔

میں ٹکسشلا کا وشنو گپتا ہوں۔ میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔

میں راجہ بھوج ہوں۔

میں محض گنگو اتیلی ہوں۔

اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں۔ میں کالی داس ہوں۔

میں قنوج کا راج شیکھر ہوں۔

مجھے بھبوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کبج میں رہتا تھا۔ میں نے "مالتی مادھو" لکھا تھا۔

میں بھرتری ہری ہوں۔ میں نے کہا تھا نا کہ دنیا محض ایک رنگ بھومی ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔

تم نٹ ہو۔ میں نٹ ہوں۔ ہم سب نٹ ہیں۔

مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شودرک[1] صحن سے باہر چلا گیا۔

پھر چھن چھن کرتی بہت سی پچھل پائیاں ایک قطار میں آن کر کھڑی ہو گئیں اور اٹھلانے لگیں۔

ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت کرتے تھے۔

میں شہزادی راجیشری ہوں۔ میں نے اپنی بحثوں سے چین کے عالموں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

میں کمار دیوی ہوں۔

میرا نام پربھاوتی تھا۔ ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟

میرا نام ہرش نے رتنا ولی رکھا تھا۔ بے چارہ ہرش ــــ

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم اڑسے اب تک مراقبے میں محو تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ہم سری پرتھوی ولبھ کہلاتے تھے ــــ اس نے مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔ ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو مچھ ترکوں نے آ کر ٹھکانے لگا دیا ــ ٹھکانے لگا دیا ــ ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تلواروں کی جھنکار گونجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سر کٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چندیلے راجپوت ہیں۔ ہم بگھیلے ہیں۔ ہم پرمار سورما ہیں۔ ہم راٹھور ہیں۔ ہم چوہان ہیں۔ ہم آبھا ہیں۔ ہم اوعل ہیں۔

---

[1] ڈرامہ "مٹی کی گاڑی" کا مصنف

سب نے ایک ٹانگ پر کود کود کر ناچنا شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آلہا اودل گا رہے تھے۔ اس قدر غل مچا کہ ابوالمنصور کمال الدین کا دماغ چکرا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اُفق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوے کے باغ میں چند کسان آلہا اودل گاتے ہل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔

یہ بہرائچ تھا اور وہ بت پرستوں کے زمانے کے ایک کھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا باہر ایک ستون سے بندھا ہنہنا رہا تھا اور بارش جھکی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لاحول پڑھی اور انگڑائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

(۲۱)

دن بھر پنڈتوں کے ساتھ تانبے پتروں پر سر کھپانے کے بعد کمال مٹھ کے باہر گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سویرے وہ ایودھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معاً بارش کا قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اُفق پر گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر اُٹھی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ مینڈک ٹرائیں گے جل تھل ایک ہو گا۔ کمال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر پٹکا کھولا اور کچے فرش پر لیٹ گیا۔ پھر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ مدتوں بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب کمال کو لگاتار تین چار مہینے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ شرقی سلاطین کی دتی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ کمال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معرکے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی۔ پھر شہزادہ حسین نے جونپور کا سلطان بن کر خود دتی پر چڑھائی کر دی۔ ان معرکوں میں کمال سلطان کے ساتھ کالپی اور اٹاوے اور سنبھل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اس نے بدایوں، کویل، مارہرہ، شمس آباد اور برن کی خاک چھانی۔

برکھا شروع ہو چکی تھی۔ ندیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ بہرائچ کے پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پچھم میں سرجو رواں تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دیش سے نکل

کرآئی تھیں اور کس بے پروائی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ یہ سامنے والی سرجو، جو بت پرستوں کی نظروں میں بڑی متقدس تھی، (یہ دریاؤں کا مقدس ہونا کمال کی سمجھ میں نہ آیا!) اسی طرح گاتی گنگناتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگھرا کے کنارے ایودھیا آباد تھا جہاں چمپاوتی رہتی تھی اور بارش ہو رہی تھی اور اس وقت وہ اسی سرجو ندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھولتی اور ساون گاتی ہوگی کیونکہ کمال کو اچانک خیال آیا کہ لو ساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر۔ ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اپنے مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل ویساکھ تھی۔ سارے میں بسنت رُت چھائی تھی۔ پھر جیٹھ اور اساڑھ کا مہینہ آیا جب مہوا کے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور بیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے۔ پھر بھادوں آئے گا۔ پھر کوار اور کاتک جب اداس چاندنی خنک زرد رنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اس نے پگڑی سر کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی اور معاً جمنا بجنے کی آواز اس کے کان میں آئی اس نے کاہلی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھونی رمانے میں مشغول تھا۔ کمال کی موجودگی کی اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اپنی کھڑ بڑ میں لگا رہا۔ کمال اٹھ بیٹھا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں اور گلہریوں کو، ان پیر واہوں کو، جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگا لے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پرسکون، کتنی آرام دہ تھی۔ وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لیے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آرہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس کے بھیدی تھے۔ وہ ان سے علیحدہ کب تھا؟ "جے رام جی کی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سن کر اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔

سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "جے رام جی کی" اس نے جواب دیا۔ "کہو سپاہی۔ کہاں سے آنا ہوا۔"

"میں — سپاہی نہیں ہوں۔"

"سلطان کے آدمی تو ہو۔"

"ہاں — مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔"

"اچھا۔" سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چمٹا اٹھا کر رام نام کا ورد شروع کر دیا۔ گویا کمال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔

"بابا۔ تم یہیں رہتے ہو؟" کمال نے پھر بات شروع کی۔

"نہیں۔ ہم تو جونپور کے رہنے والے ہیں۔"

"ارے!" کمال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا، "تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔"

دوسرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبۂ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ مگر جونپور اس کا وطن کہاں تھا؟ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا۔۔۔ اسے سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔

"نرگن رام ۔۔۔ نرگن رام جپو رے بھائی۔" سادھو آنکھ بند کیے یکسانیت کے ساتھ ترا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کمال کو خود ہی مخاطب کیا: "آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جھنڈے لے کر راپڑ سے ادھر آئے ہیں۔"

"اچھا۔"

"وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان میں اور دِلّی والے میں پھر ٹھن گئی ۔۔۔ اب کی دفعہ ہمارا سلطان بچتا نظر نہیں آتا۔ مقابلہ بڑا کٹھن ہے ۔۔۔ نرگن رام ۔۔۔ نرگن رام۔" اس نے پھر ترانا شروع کر دیا۔

کمال چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ ۔۔۔ بابا پھر سے بتانا۔"

جھونپڑی میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔ کمال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برستی بارش میں باہر نکلا اور سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرائے کے برآمدے میں اودے سنگھ راٹھور اس کا منتظر تھا۔

"تم ۔۔۔ تم یہاں کہاں ۔۔۔" کمال نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا، "تم تو گوالیر میں تھے۔"

"میں گوالیر ہی سے آ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو ۔۔۔۔ عالم پناہ نے تمہاری کھوج میں مجھے بھیجا ہے۔"

"مجھے کھوجنے اتنی دور آئے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔"

"عالم پناہ بھی یہیں بہرائچ میں موجود ہیں اس وقت ۔۔۔" اودے سنگھ نے کہا، "تم یہاں گیان دھیان میں لگے ہو، ادھر دنیا بدل چکی ہے ۔۔۔ سلطان بہلول نے تمہارے مالک پر راپڑی میں حملہ کر دیا۔ آگے

یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں۔" وہ بڑے اطمینان سے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ "جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمنا جی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لیے گوالیر آیا۔ ہمارے راجا نے اسے کمک پہنچائی۔ میں اس کی فوج لے کر کالپی کی اور بڑھا۔ گھمسان کا رن پڑا۔" اودے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنانا شروع کیا۔ پھر وہ جھک کر تنکے سے برآمدے کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر کمال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا۔ "یہ دیکھو۔ ادھر بہلول کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ بیچ میں جمنا میّا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ۔ سمے بیتتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ تر لوک چند سلطان بہلول کو ندی پار کروا دیتا ہے۔" پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ "تر لوک چند کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"بکسر کا حاکم ہے۔ بکسر گئے ہو؟"

"نہیں۔" کمال جھلا گیا۔ "اصل واقعہ بیان کرو۔"

"ہوتا کیا۔ دلّی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں۔ ہم جونپور کی طرف لوٹے۔ وہاں بھی دلّی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جونپور کو خدا حافظ کہہ کر بہرائچ آ گئے۔ تمہارا جونپور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت اُلّو بولتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "عالم پناہ نے کہا تھا تم کئی مہینے سے یہاں ہو۔ صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھ کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا۔"

کمال نے تلوار کمر سے باندھی اور اودے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔

اُدھر جدھر جیت وان تھا۔

(۲۲)

بہرائچ سے وہ لوگ قنوج گئے جو کالندی اور گنگا کے سنگم پر آباد تھا۔ وہاں بھی انھیں بہلول لودھی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین مٹھ کا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار — یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہرا بھرا، خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں نالندہ کے دار العلوم کے کھنڈر دل میں عجیب دہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابو المنصور کمال الدین سلطان

حسین کے دوسرے وفادار امرا اور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جونپور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔

جونپور میں اب دلّی کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنتِ شرقیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شیرازِ ہند اجڑ چکا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین، قاضی شہاب الدین جونپوری کا جانشین، مورّخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا ترکیبیں سوچا کرتا۔ دلّی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے؟

اب سلطان بہلول مر چکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شاندار بیٹا سکندر ہند کا بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہما دتی تھا، جو شرعِ محمدی کا بڑا پابند تھا، جو اپنے باپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔
بہار کے ان پناہ گزینوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بساطِ جنگ پر ایک بار پھر پانسہ پھینکا۔
کیونکہ لڑنا مرنا، ہار جیت ہی مردوں کے مشاغل ہیں۔
سلطان حسین اپنی جوڑ توڑ کے ذریعے کئی بار جونپور میں باربک شاہ کے خلاف بغاوت کروا چکا تھا۔ اب کی مرتبہ اس نے جوکا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ کمال اس کا سفیرِ خاص تھا۔ دن رات وہ اپنے شیام کرن گھوڑے پر سوار ادھر سے ادھر سازشیں کرواتا تھا۔
ایک رات منزلیں مارتا وہ جوکا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز دی۔ جوکا اس وقت اندر پوجا میں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چراغ ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔
"کون ہو تم؟" اس نے شک سے پوچھا۔ باربک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلّی کے تخت پر بیٹھا تھا پرجا اپنی جان کی خیر مناتی تھی۔
"میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔"
"کون سے سلطان کے پاس سے؟"
"تمہارا سلطان! حسین شاہ سے۔"
"آجاؤ — اندر آجاؤ بھائی۔" نوجوان کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ چراغ کی روشنی میں کمال نے اسے دیکھا۔ وہ اسی کا ہم عمر رہا ہوگا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: "میرا نام ہری شنکر ہے۔ میں جوکا کا بیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔" وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوانی کی مورتی کے آگے مدھم سا دیا جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوانی کی مورتی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اُسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دیس، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔

"اچھا سنو۔" اُس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا، "تمھارے پاس کتنے ہاتھی ہیں؟ کدھر سے حملہ کرو گے؟"

دوسرے لمحے وہ دونوں نہایت تندہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے۔ ان میں سے ایک ہندو تھا دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدرِ مشترک صرف ایک شے تھی ــــ دودھاری خون آشام تلوار اور ایک دوسرے فریق کو ختم کر دینا ان کا واحد مقصدِ حیات تھا۔

چند روز بعد انھوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سلطان سکندر ان کی سرزنش کے لیے جونپور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور سنگیت کار بادشاہ، جس کی آدھی عمر راگ تخلیق کرنے کے بجائے میدانِ کارزار میں لڑتے بھڑتے کٹی، ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب کمال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اس نے اس قدر خونریزی دیکھی تھی۔ اس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ اس نے اتنی بے بس عورتوں کو روتے دیکھا تھا۔ اس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمامے ان کی گردنوں میں رسیوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پا پیادہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ، جو عالم، شاعر اور اہلِ قلم تھے، اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا، لیکن کتابیں بے کار تھیں، علم فضول تھا، فلسفے بے معنی تھے کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوندا! ــــ انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دلچسپی تھی اب اتنی ہی نفرت ہو گئی۔ اس نے سلاطین کے نسب ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فراموش کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگی قیدی کی حیثیت سے اب دلی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا چکی ہوگی۔ اس کے دوست اودے سنگھ راٹھور نے اسے غیرت دلائی ــــ:

"کیسے بے شرم ہو۔ تمھاری شہزادی دلی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ اسے چھڑا کر لاؤ۔ جا کر سلطان سکندر کو قتل کر دو یا مجھے اجازت دو میں اس کا کام تمام کر دوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں یا کمال

یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سا راستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رُخ کیا۔ کمال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جونپور کے شکست خوردہ بادشاہ کو اپنے یہاں پناہ دی جس کے سارے پرانے ساتھی بچھڑ چکے تھے، جس کا کتب خانہ تباہ ہو گیا تھا۔ خالی طنبورہ اب جس کا رفیق تھا۔ طنبورہ اس سے کبھی دغا نہیں کرے گا۔

اب میری روح کو کاہے کی تلاش ہے؟ گوڑ کے شاہی باغات میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے کمال خود سے سوال کرتا۔ بنگالے کی لڑکیاں بے حد دلکش تھیں۔ یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دلنواز تھی۔ اسے جونپور کی شاہزادی یاد نہیں آئی، اسے چمپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا وجود اس دہشت ناک خلا میں ڈول رہا تھا جہاں محض عمیق سناٹا ہوتا ہے۔

اس سناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی — میں جب تک اس چکر میں رہوں گا مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں گے۔ انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑیے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے گا —؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس سناٹے میں بہت سے بھنور پیدا کر دیے۔ میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اس نے سر پر چوٹی رکھی ہے اور گائے کو پوجتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام تمام کر دے گا کیونکہ میرے سر پر چوٹی نہیں ہے —؟

خوبصورت شیو پوری کی اس لیے مجھے اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہیے کیونکہ وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں سجی ہیں۔ لیکن وہ مورتیاں میرا کیا بگاڑتی ہیں؟

اگر ان مورتیوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا —؟

اسلام کیا ہے —؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچنے کے لیے اس نے شراب میں پناہ لی۔ اس نے ملک کے سارے خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں — خوبصورت مضبوط جسموں والی مراٹھنیں۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت کندنی تھی۔ بیجاپور کی خوش آواز طوائفیں۔ بنگالے کی جادوگرنیاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور باتوں میں ٹونا۔ جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر بیٹھ کر آسام کی سمت اڑ جاتی تھیں، اور

بندرابن کی شوخ و شنگ گجریاں، متھرا کی اہیرنیں، پورب کی سانولی سلونی کمارنیں۔ قنوج کے باغوں کی وہ مالنیں، جس نے اسے ایک بار بیلے کے گجرے بنا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے۔ وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوا لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی ہچکیاں سنائی دیں۔ اس نے لکھنوتی کی پاتروں کو ناچتے دیکھا مگر حسین رقاصاؤں کے بجائے اسے مردہ عورتیں دانت نکوستی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں، عجیب و غریب گیتوں کے بول، مردہ زبانوں کے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے۔ وہ اس اندرونی شورش سے عاجز آ گیا۔ سناٹا اس قدر پر شور ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ، جو ہفت زبان تھا، اس نے کوشش کی کہ ساری بولیاں، سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر اذیت دہ شے تھی!

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا۔ ہیرا جنم امول تھا۔ وہ جھنجھلا کر کسی دوسری رقاصہ کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا: گن کری چھبرو۔ مدھو مادھوی سناؤ ۔۔ للتا راگ الاپو۔ وہ طنبورہ اٹھاتی، وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مغنیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے۔ سانس نقارہ کوچ کا۔ سانس نقارہ کوچ کا۔ باجت ہے دن رین۔ دن رین ۔۔۔ دن رین۔ آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چہل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا جہاں ہر طرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالابوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں برٹیل اور مولسری کی چھاؤں میں ویشنو بھاری اور پجارنیں رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وقتوں کے ونگا پتی اور گوڑ یشور۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ۔ بادشاہوں کے سنسان محل نظر آئے جن میں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقاصاؤں کے مجسمے دیکھے۔ ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے مور پنکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاوا کے شلیندر دربار میں رامائن کا سنگیت ناٹک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سین بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں کے سائے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا مانجھا کا بیٹا بیٹھا کھانس رہا تھا۔ برابر کے کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا۔ سامنے نہا تند اور دریا بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور تھوڑا سا مدھم ہوا۔ اس بانی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہوتا شروع ہوا جو مدتیں گزریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا: آج کال کے بیچ میں جنگل ہو گا باس۔ اُور رے اُور رے ہل چلیں گے، ڈھور

چریں گے گھاس ۔ ڈھور چریں گے گھاس ۔ ڈھور چریں گے ________

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرقی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب انسانی ہوتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا۔ گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ لنگر اٹھایا گیا۔ ملاح بشاش آوازوں میں گا رہے تھے۔ کمال ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ جہاز پریاگ جا رہا تھا۔ پریاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم گنگا بہت دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ایک سرے پر اتھاہ سمندر تھا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ دن گزرتے گئے۔ کشتی گنگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دلہن کا سرخ ڈولا لے کر کشتی میں سوار ہوئے۔ دولہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دلہن لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے تھی۔ اس کے پیروں میں چاندی کے بچھوے تھے اور اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ چپکو پچکو رو رہی تھی۔ براتی ہلڑ مچا رہے تھے۔

کمال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

”سنو چمپا وتی مجھ سے بیاہ کرو۔“

”ہوں۔“

”ہوں کیا ــــ میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ۔ عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا۔“

”رام رام۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمہارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جونپور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لو گے۔!“

”اب بھی وقت ہے چمپا رانی۔ دیکھنا کسی دن کسی سڑ گھٹے پنڈے کے پلے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔ کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے۔؟“

”میں تو تمہارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مر کے تو دیکھو!“

"سنو چمپا۔ سچ مچ۔ مجھ سے بیاہ کر لو۔"

"کاہے اپنی ذات بگاڑتے ہو۔ تم سید زادے ٹھہرے۔"

"تم بھی برہمن ہو۔ اور ویسے تمھاری ذات اور اونچی ہو جائے گی۔ سیدانی کہلاؤ گی! مجھ سے بیاہ کر لو نا بھئی۔"

"مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔"

وہ یہ سن کر چکرا گیا۔ "وہ کیسے ۔ میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے۔ یعنی کہ ــــ میں ــــ تم ــــ میرا مطلب ہے کہ ۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے ۔" وہ ہنستی رہی۔ "ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں۔ یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!" وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو۔ ہمارا تمھارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔"

"جنم جنم کا ساتھ۔ کیا خرافات ہے۔" کمال نے جھنا کر کہا، "پھر تم نے جادو گری کی باتیں شروع کیں۔"

"اس میں جادو کیا ہے؟" چمپا نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود سے پسند نہیں کر سکتی۔ ہم نے تمہیں چُنا ہے اور ہم تمھارے آگے جھکتے ہیں۔"

"کیا کفر بکتی ہو۔ میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔"

"ہو تو سہی۔ دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے ۔" وہ پھر زور سے ہنسی۔

اور پھر اس نے کہا تھا: "اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہو نا۔"

"کرتا کیوں نہیں ہوں۔"

"تو پھر اتنی گھبراہٹ کاہے کی۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہ ــ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔" اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر غائب ہو گئی۔

یہ ایودھیا کا کنج نہیں تھا، گنگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھماری گا رہے تھے اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دُلھن رو رہی تھی۔ دلھن، جو گوری رنگت کی دُبلی پتلی بہاری لڑکی تھی، جانے کس دیس کو جاتی تھی، کس زندگی کی طرف، کس موت کی طرف اس کا رُخ تھا۔ جہاز مونگیر پہنچا۔ براتی اس کا ڈولا لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاٹ کے ہجوم میں سُرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگر اٹھایا۔ گنگا کے دونوں طرف سرسبز کھیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاٹ پر بہت سے مسافر اترے، بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیر زادے تھے۔ ایک جوگیوں کا گروہ تھا۔ ایک نارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا۔

پٹنے کے امیر زادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کاٹھیاواڑ کے دو تاجر، جو اپنا سامان لے کر دلّی جا رہے تھے، اپنے بہی کھاتے میں لگے تھے۔ جوگی رام دھن میں منہمک تھے۔ کمال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جوگیوں میں سے ایک کمال کے قریب سے گزرا۔ وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

''بھائی، تم مسلمان ہو ــ'' کمال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''انسان ہوں''۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

''میں ــ میں بھی انسان ہوں ــ'' کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

''کیا چاہتے ہو۔''

''یہ پتا نہیں ــ''

''اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام ـــ ادھر جا کر بیٹھو۔'' اس نے امیر زادوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا تھا۔

''تم کہاں جاتے ہو۔''

''کاشی ــ''

''وہاں کیا ہے ــ؟''

''وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے۔ وہاں مسرت ملتی ہے۔ وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ ــ وہ، جو گرو ہے میرا۔ لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوا دی اور اس کو نہ جانا۔'' وہ ٹھٹھک گیا۔ ''تم جونپور کے کمال الدین ہو نا ــ''

کمال مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سلطان سکندر کا سپہ سالار تھا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا۔ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا

چکارہ، جسے وہ بائیں ہاتھ سے بجا رہا تھا، فرش پر رکھ کر وہ کمال کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم کو اور بتاؤں۔ جب تم گوڑ کے دربار میں رنگ رلیاں منا رہے تھے وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روتی پھرتی تھی لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔"

کمال کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ جوگی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا؟

"میں اپنی فوج لے کر ایودھیا سے گزرا تھا۔ راپڑی میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں اس کا بھائی مارا گیا۔ وہی جو چتر ویدی پنڈت تھا اور وہ جنگلوں میں روتی پھرتی تھی۔ ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آ گئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آؤ گے۔ مجھے سپاہی دیکھ کر تمہارا پتا پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اسے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا۔ پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔"

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "دنیا بہت بڑی ہے۔" جوگی کہہ رہا تھا۔ "تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے۔ وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں۔ اگر بچھڑ جائیں تو ان کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا مطلب جانتے ہو۔؟" اتنا کہہ کر جوگی نے پھر اپنا چکارہ اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔ شاہی بجرے۔ تجارتی جہاز۔ مچھیروں کی ڈونگیاں۔ ان کے بادبان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کر یوں پھڑپھڑاتے گویا بے شمار راج ہنس مانسرور کی سمت اڑنے کے لیے پر تولتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جوگیوں کے سمرن۔ فقیروں کے ذکر۔ ویشنو پجاریوں کے بھجن۔ تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ گجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے۔ بنارس کا ریشم۔ دکن کے ہیرے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم۔ تبت اور کشمیر کے بھکشو۔ عرب سیاح۔ ایران کے نقاش۔ جاوا کے رقاص۔ ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا۔ زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

"خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے۔ بھائی مجھے شانتی چاہیے۔" کمال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت۔ آج جیسا کہ پورنما تھی۔ آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی گنگا کے اس پار، ترائی کی ایک بستی میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویسا کھ پورنما کے روز انھیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس

کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

"مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔" کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ "خیال — خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذاتِ مطلق ہے جو سناٹا ہے۔" اس نے گہری آواز میں کہا۔

"مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" کمال نے کہا۔

"شونیتا — سناٹا — شونیتا — جو ذاتِ مطلق ہے۔ جو سفر کا تسور ہے۔"

"مجھے اس تصور سے دہشت ہوتی ہے۔" کمال نے کہا۔ "— اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔" اس نے مہایان مذہب کے بھکشو کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ ساحل پر چاندنی رات میں وسنت کے دیوتا کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ کمال گھاٹ پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رخ کرے۔ دفعتاً اسے وایشنو بیراگیوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اتری تھی۔ وہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا۔ اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ قریب جولاہوں کی بستی تھی —— معطر ہوائیں درختوں میں امنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہرا نظر آ رہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ بھنوروں کی ایسی کالی بامنیں ہری گھاس پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔ چاروں اور گھن بیل اور روپ منجری اور سدرشن اور مالتی کھلی تھی

گلے میں تلسی مالائیں پہنے وشنو جوگنیں کٹھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتال بجاتی تھیں۔ گلابی آنکھوں والے طوطے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ مرلی بجاتے، کمنڈل ہاتھ میں لیے جوگی اپنی یاتراؤں پر جا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیتر بول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس بیلی مہک رہی تھی۔ ہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سُر بلند

ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جنگل اور سامن کی ان صداؤں کو سنتا رہا۔

تب اس کو معلوم ہوا وہ سناٹے میں تھا۔ یہ سناٹے کے مختلف پرتو تھے۔ وہ عالمِ حیرت میں تھا۔ یہ سناٹا ذاتِ مطلق تھا۔ بھکشو کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

پھر اس نے غور سے سنا۔ مہوے کے جھنڈ میں ویشنو پجارنیں جو گیت گا رہی تھیں اس کے الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے جے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ دھیان سے سنا۔ پجارنیں گا رہی تھیں۔

صندل کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لا رہی ہے۔ جہاں الائچی کی جھاڑیوں سے چرائی ہوئی خوشبو پھیلی ہے، جہاں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

'ان کنجوں سے یہ پروائی آ رہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے۔ اور اس مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

'کیتکی کی کلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں۔ بیائل کے شگوفوں پر بھونرے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوائیں جھوم رہی ہے اور ریشمی موگرے۔ اور اس سمے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں تنہائی بڑی کھلتی ہے۔

'جیسے گرم ہونٹ بند آنکھوں کو چھو لیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی کیریوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پرسکون جمنا کے کنارے رقصاں ہے، موسمِ گل میں وہ تو تنہا نہیں ہے۔

'وہ گوپیوں کے ساتھ ناچ ناچ کر یونہی اپنا سمے گنوا دے گا جب کہ رادھا اس کی منتظر ہے؟'

پجارنوں نے گیت کا دوسرا انترہ اٹھایا۔

'جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئل کی آواز سن کر اپنے دیس کی ندی کنارے آموں پر گنگناتے بھونروں کی یاد آ جائے اس طرح یک بیک اسے رادھا کا خیال آیا۔

'اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خودرو پھولوں سے سجائے، اپنے سرخ ہونٹوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین۔ وہ گوپیوں کے ساتھ رقصاں ہے،'

کمال کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سنتا رہا۔

پجارنوں نے گایا۔

'کوئل کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔

'ان مسرتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔

'ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جا سکیں۔
'ان محنتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔
'اور مسرتوں کے باوجود
مسرت میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب بہیم ہے۔'

کمال اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کی آواز، جے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور جے دیو نے کہا تھا: میں منتظر ہوں۔ محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

ہری اور گوریا چڑیوں کی سنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار راستوں پر ادھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ اور تب دفعتاً درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلملاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے۔ سامنے دوسرے کنارے پر شیو پوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ بج رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں عبادت کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لاتعداد سیڑھیوں پر لوگ نہا رہے تھے۔ کاشی — ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا۔ اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جولاہوں کی بستی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک اہیر نے اُسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا: "بھیا، لگت ہے تم بہوت دور سے آئے رہے ہو۔ تمرے پیرن ما ماٹی لاگی ہے۔"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔"

"آؤ — بیٹھو۔ ستو کھاؤ۔" اہیر نے کہا اور اسے ایک سائبان میں لے گیا۔ "کپڑوں سے تو بڑے دھنوان دکھلائی پڑت ہو۔ اس اپرنج میں کاہے پھرت ہو۔ سلطان کے ملئی ہو؟"

"میں کسی سلطان کا ملئی نہیں ہوں۔"

"لو آرام سے بیٹھو۔ یہاں چھاؤں ہے۔" وہ جوتے اتار کر سائبان میں بیٹھ گیا۔ اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنا باغ تھا جس میں وہ دن بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوے کے جھنڈ میں سے اب بھی وشنو مغنیوں کے گانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف دوپہری کھلی تھی۔ لو بھئی چھپا دی۔ اُس نے دل میں کہا، تمہاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ میں اپنی تلوار تا پھینکوں

تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلو گی۔ میں نے اپنی تلوار دریا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔

لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک ٹولی گزری۔ بہت سے سنیاسی کنڈل پہنے، ترسول ہاتھ میں لیے گھاٹ کی سمت جا رہے تھے۔ جولاہوں، اہیروں اور مفلسوں کا ایک ہجوم کھڑتالیں سنبھالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

چمپا نے کہا تھا، ان لوگوں کا مذاق نہ اڑانا۔ یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی تمہارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سائبان سے نکلا اور اس ہجوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مرشد کے پاس جا رہے تھے۔ وہ جو لہرتارا تالاب میں سے نکلا تھا۔ وہ اسی جگہ پر رہتا تھا جہاں مولسری کے پیڑ تھے اور جہاں رس بیلی لٹکتی تھی۔

(۲۳)

میاں کبیر صبح کے وقت کرگھے پر بیٹھ کر کپڑا بنتے، کپڑوں کا گھٹڑ بنا کر پیٹھ پر لادتے، بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولسری کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنبھالے جاتے۔ کھڑتالیں بجتیں۔ بھجن گائے جاتے۔ یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسی دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت دانت نکوسے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے میں میاں کبیر کی شہرت پھیل گئی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں۔ دور دراز کے خطوں سے لوگ ان کی اور کھنچے آتے تھے۔

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناؤں کو اور سلطان سکندر کو، جو بڑا کٹر مسلمان تھا، یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے؟ سارا دیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے

اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اجمیر کے معین الدین اور ایٹے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور گجرات کے نرسنگھ مہتا اور بنگال کے بیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے ودیاپتی اور مہاراشٹر کا درزی نام دیو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے مادھو اور ولبھ۔ اور بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر کمال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی، اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی۔ اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے۔ یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔ اونچی ذاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور کمال، جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، اس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ اہیر، جس نے چوپال میں بٹھلا کر ستو حاضر کیا تھا، اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی سوکھی روٹی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب ہے؟ یہ کسان، جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو بہلا رہا ہے۔ اسے کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔ ان "ترکوں" سے پہلے جب پرتھوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکان ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب کمال نے سوچا — کہ گو مذہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے لیکن محبت ظاہری مذہب سے برتر شے ہے۔

محبت اصل شے ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آ کر کبیر کے قدموں میں بیٹھ رہے تھے۔ کمال ان سب کی باتیں شوق سے سنتا، ان کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کوچین کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا۔ وہ کبیر کا نام سن کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازو لڑائی میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک ہی ہاتھ سے رام دھن

پرکھڑتال بجاتا تھا۔ اسے دیکھ کر کمال کو احساس ہوا کہ وہ جنگوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لیے یہاں بھاگ آیا ہے مگر باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

"بھائی تمھاری جان کس نے لینی چاہی تھی" کمال نے اس سے پوچھا۔

"فرنگیوں نے۔"

"فرنگی۔؟"

"ہاں۔ عیسائی۔ بہت دور پچھم سے آئے ہیں۔۔۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

——— اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کٹے مرتے تھے۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی پھر عود کر آئی۔ وہ کھسک کر مالابار کے برہمن کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔ صلیبی جنگوں کے سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

"پرتگال۔ کوئی دیس ہے۔"

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔ دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔

پرتگال اندلس کے پاس تھا۔ اندلس۔۔۔ اس کے دل پر ایک برچھی سی لگی۔ چنانچہ وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ کمال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرتگالیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو۔ ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

"انھوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں۔ مندروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔" اندھا برہمن کہتا رہا، "گوا کے ایک ایک مسلمان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لیے بچ گیا۔"

نوجوان برہمن۔۔۔ جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یہ کالی کٹ کے راجہ کی بحریہ کا افسر تھا اور راجہ کے امیر البحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرتگالیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں ان کی بارود کی نظر کر کے اور ایک بازو کٹا کر یہاں پہنچا تھا۔ کمال کو سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کا روپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

"ہماری ہار ہوئی یا جیت۔" کمال نے آہستہ سے سوال کیا۔

"ہم نے ترکی کے راجہ سے مدد مانگی تھی۔ ترکی کا جنگی بیڑا مصر دیس سے ہماری سہائتا کے لیے

آیا مگر پرتگالی بڑے زبردست ہیں۔" اس نے اپنی بے نور آنکھیں بند کر لیں اور دوتارہ بجانے میں مصروف ہو گیا۔ اب شام ہو رہی تھی اور لوگ کیرتن کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کمال اٹھا اور کوچین کے اس اندھے کا ہاتھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جونپور کا ابوالمنصور کمال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی، جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے پنچ گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

(۲۴)

لیکن بہت سے بنیادی سوال، سوچنے والے ذہن کے لیے، ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا: سنو بھائی سادھو۔ ہری سے پریم کرو۔ تمہارے دکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔ دکھ ستیہ — دکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تانترک سدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی۔ لیکن ہری کون تھا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس سوال پر ایتھنز میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں۔ ہزاروں برس قبل اسی گنگا کے کنارے کپل نے اور جینی نے اور شہزادہ سدھارتھ نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سو سال گزرے مہاندی کے اس پار کیرالا میں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا۔ اُس کا نام شنکر اچاریہ تھا۔ کمال نے عہدِ عتیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کر کے سوچا: نوفلاطونیوں کی عقل فاعل پُرش ہے جو عقلِ حیوانی پراکرتی، پر اثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے —؟ طریقت اور مارگ دونوں رحیم تک پہنچنے میں جو رام ہے —؟

گوتم سدھارتھ کے سفر سے راستے پر صدیوں تلک مسافروں کے قافلے گزر کیے جنھوں نے دُنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنارس اور سانچی اور امراوتی اور اجنتا اور باغ کے نگارستان سجا ڈالے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر ہری کی بھگتی کا چرچا ہوا۔ کیدار ناتھ سے لے کر دوار کا تک شیو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے۔ شاکیہ منی کا راستہ ونایان مذہب اور تانترک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی وشنو کے اوتار بن کر انہی مندروں میں براجنے لگے۔ نارنجی لباس والے وہ بھکشو جو موروں کے نشان والے بادشاہ چندرگپت نری چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں میں نمودار ہوئے تھے ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کہلاتے تھے اور بنگال

اور بہار کے معبدوں میں جادو ٹونے کرتے تھے۔ مہایان مذہب کا مہا سکھ کا تصوّر خرافات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کہ ہر بڑا آدرش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے۔

لیکن آدرش کیا شے ہے؟

یکلخت کمال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھینچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے جس طرح اُس نے آس پاس کی درگاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے برہمن طالب علموں کو چھیوں فلسفوں کے مسائل کی میں میخ نکالتے سنا تھا۔

قرب و جوار کے گاوؤں میں بنارس اور جھوسی اور نگہر میں اسے بے شمار فقرا ملے جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوّف کی باتیں سُنیں۔ قصبوں اور شہروں میں عظیم الشان مدرسے تھے جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمامے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پالکی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اسے بغداد کی یاد آجاتی۔ نیم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوتھی پتروں سے سر کھپا رہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں کبیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا ضدی خود پسند عرب، اس نے تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نئے معرکے سر کرنے کے لیے اپنے برق رفتار رہوار پر بیٹھا بیٹھا پر شور ندیوں میں کود پڑتا تھا، اسی طرح اب اس نے اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روحیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا بادبان اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جہاز کے تختوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا تھا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتھاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا —— بہت سوں کا خیال تھا کہ انھوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انھوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلائے ان کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی۔ ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے؟ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا؟ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا تصوّر؟ محبت؟ ویراگ میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گو کبیر نے اس سے کہا تھا: "مم کاشی

کے پانڈے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جولاہا ہوں تم تو میرا گیان بوجھو۔" مگر اس نے اس بات کی سُنی ان سنی کر دی۔ اور ان تاریک مٹھوں اور پراسرار معبدوں کو اُس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ عود و لوبان کا دبیز دھواں۔ دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بُت۔ مندروں کے اندھیرے پختہ آنگن۔ پیچ در پیچ گلیاں اور چبوترے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک مورتی کی جھلک اسے نظر آ جاتی۔ منتروں کا جاپ۔ پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار۔ بیلوں اور گایوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیڑھیوں پر جمع پجاریوں کی بھنبھناہٹ۔ گھنٹوں کی آواز۔ کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الٰہیات کے مسائل بھی ان ہی تنگ و تاریک ان گنت برجیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ، گنجلک اور ناقابلِ فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت ناز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الٰہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور مابعد الطبیعات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موند کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے؟ ہری کون ہے؟ یا رام یا رحیم؟ وہ خدا کو کس نام سے پوجے؟ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے؟ دنیا بھر میں اہلِ بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے اسلام، اس کے ایمان میں خلل آ چکا تھا۔

اس نے ایک روز چپکے سے کبیر کے کُنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زبردست جٹا دھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دُور دُور شہرہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لیے نہیں آیا ہے۔ وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا۔ اسے اپنے غیر اہم ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ اور وہ کہاں سے شروع کرے؟ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے۔ ملک اتنا وسیع تھا۔ وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دکھن اور مہا گجرات اور تامل ناڈ کی بھی خبر نہیں تھی۔ وہاں کے علماء، وہاں کے گیت کار، وہاں کی خانقاہوں اور فقیہوں کا اسے رتّی بھر بھی پتا نہ تھا۔

وہ کون سے مدرسۂ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت۔ تینوں راستے اس

کے سامنے کھلے تھے ۔ وہ کس پر پہلے چلنا شروع کرے ؟

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا مذکور تھا ۔ مہابھارت میں کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی ۔ ویدک خداؤں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے براجمان رہے تھے ۔

اس کرم مارگ کے متعلق اس نے پڑھا کہ یہ علت و معلول کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے ۔

دوسرا راستہ علم کا تھا ۔ ویدک عہد کے بعد کے حکماء نے طے کیا تھا کہ محض عمل سے نجات ممکن نہیں ۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے ؟ یہ جاننا چاہیے ۔ یہ کھوج لگانے کا راستہ بہت طویل تھا ۔ اپنشدوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس سے علت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے ۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم دیا تھا ۔ منطق کے اصول وضع کیے گئے ۔ کپل نے کہا ۔ پرش اور پراکرتی ، روح اور مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں ۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے ۔ روح خالص شعور ہے مگر وہ تبدیل نہیں ہوتی ۔ اس کی موجودگی کی وجہ سے مادہ حرکت میں آتا ہے ۔ روح کائنات سے علیحدہ ہے ۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے ۔ کیونکہ ذہن ، شخصیت ، خودی روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں گھل مل جاتی ہے اور اس کی مکتی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے ۔ مادے میں مبتلا رہنے کا نتیجہ دکھ ہے ۔ اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد ہو سکتی ہے ۔ کپل دہریہ تھا ۔ اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقاء خدائی کارنامہ نہیں بلکہ مادے کی فطرت تھی ۔

پھر کمال نے پتن جلی کے یوگ ستر پڑھے ۔ اس کا ایشور خالق کائنات نہیں بلکہ روحِ ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی ۔ ویدانت والے وحدت الوجود کے قائل تھے ۔

عہدِ عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفۂ علم میں اس نے وجود اور عدم موجود ، بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں ۔ گوتم نے ادراک ، منطق اور استنباط کے ذریعے چیزوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلاء میں سے پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات ، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی ۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیاء کا کوئی نہ

کوئی سبب ضرور رہا ہوگا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے لامحدود ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہٰذا مرکب اشیاء کا سبب کوئی ذہین محرک ہے۔ ورنہ مرکب جوہر کے مادی اسباب یعنی ذروں میں وہ ضابطہ و تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان کے نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہین محرک کو مادی اسباب کا براہِ راست علم ہوگا اور نتائج کی کارفرمائی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہٰذا برہمن قانون ساز گوتم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا مسبب الاسباب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑایا۔ یہ مسئلہ بھی سامی نظریہ کائنات سے یکسر جداگانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روزِ قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہوگی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لیے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہٰذا چھونے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا: "زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقاء اور انشکال اور ہیئتوں کے پُرپیچ نمود اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔"

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلاء تھا اور اس میں کائنات کا ظہور ہوا۔ یہ وحی اور الہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آزاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شے حقیقی نہیں تھی۔ پنج راتریوں کا عقیدہ تھا کہ وشنو ذاتِ حقیقی ہے اور لکشمی بحیثیت کریا شکتی مشیتِ ایزدی اور بحیثیت بھوت شکتی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسۂ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے ——؟

ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شنکر اچاریہ کے مطالعے میں پھر سے جُٹ گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آچکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور

وادیِ سوات اور مکران اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ مہیشور کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام دیش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنٹھ شیو کی آستی اتاری جا رہی تھی جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہا بھیرو، آفاق کا خوفناک جوگی، جو اپنے ہاتھوں میں برہما کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرو بجاتا، تین ڈگ بھر کے تینوں دنیاؤں کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مہا کال ——— برہما وشنو مہیش کا تیسرا، تباہ کُن روپ ——— شیو نٹ راج ———

مدھیہ پردیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں اب شیو مہاراج کی عمل داری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفرناموں میں اس عجیب و غریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداؤں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کُودتی پھاندتی پھر رہی تھی۔ خوفناک عفریت نما دس ہاتھ والی سیاہ فام ڈائنیں۔ پریوں کی ایسی نرم و نازک دیبیاں۔ چاند اور سورج، آگ اور بادل۔ ہاتھی کی شکل والا اور بندر کی شکل والا۔ ناگ اور بچھوے اور تیرتھ اور میلے اور یاترائیں اور تہواروں کا غل غپاڑہ اور خونی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹونے ٹوٹکے کا ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمندر پار کمبوج دیش اور یاوا اور سماٹرا میں نئی برہمن شہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو کی ڈمرو سارے میں گونج رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا جو آٹھویں صدی عیسوی میں ملابار کے ساحل پر الو ندی کے کنارے شوگرو برہمن کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اپنشدوں اور گیتا اور برہم سُتر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طرازیوں سے بے نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور مذہب کا پرچار کرتا پھرا اور بتیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر ——— شنکر اچاریہ!! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی وحدانیت تھی۔ خدا۔ جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا ——— نرگن ——— اور دنیا جو مایا تھی۔

لیکن جس طرح دنیائیں دو طرح کی تھیں ——— ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی، اسی طرح علم دو طرح کے تھے ——— اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام، جو شنکر اچاریہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

——— نیتی ——— نیتی ——— یہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے ——— یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا ———

اُپنشدوں میں لکھا تھا۔ شنکراچاریہ نے اس کی تشریح کی — نیتی نیتی کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذاتِ حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے۔ اور ست، وجود، چت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ ست چت اور آنند برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔ علم برہما کا جوہر ہے۔ ساگن برہما یا ایشور زندہ خدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے۔ وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی۔ شنکراچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی مادھواچاریہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری ہستی مادی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا: برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے — برہم مایا ہے۔

کمال پنڈتوں سے برہم سُتر کی تفسیر پڑھتا رہا۔ شنکراچاریہ نے کہا تھا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر کمال خود گرتا پڑتا افتاں و خیزاں چلا آ رہا تھا۔ تیسرا راستہ ابھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزما دیکھے۔

مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے مسئلے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتّر کے بہتّر فرقے بزعمِ خود صحیح راستے پر تھے۔ صوفی اور درویش آپنے اپنے حلقے پھیلائے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آہیں بھر رہے تھے۔ اس نے معتزلیوں سے مباحثے کیے جو مذہب کو عقل سے پہچاننے کے مدعی تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بلایا جن کا فلسفہ حلول کا فلسفہ اہلِ ہنود کے فلسفوں سے ملتا جلتا تھا۔

ملامتیوں کے قصے بھی اس نے سُن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصورِ شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مراقبے اور سمادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دُور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پہاڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بُلایا۔ انھوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے — نور — نور — جو نور نہیں اس کا وجود نہیں۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور کمال کے ذکر کی گونج اس نے ان کنجوں میں سُنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فریدالدین عطارؒ اور ہجویریؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور بہاءالدین زکریاؒ اور جلال الدین سرخپوشؒ

اور معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ملک تھا اور کون بدقسمت ہوگا جو اس ملک میں آکر بھی وہ نہ پا سکے جس کی اسے تلاش تھی۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شنکر اچاریہ کے پہلے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سنتوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے ۔۔؟ دل میں شبہے رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے ؟

ایک رات وہ گھٹنوں بیٹھا مٹھ کے دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے۔ وہ اندر نہ جا سکتا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت اجنبی لگے۔ سارے جونپور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے۔ وہ ان سے علٰحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اس کی بات ہی نہ سنتا تھا۔ وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاحبو مہربان ـــــ صاحبو مہربان ـــ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

رات کی ہوا میں خنکی آچلی تھی۔ قریب سیڑھیوں پر چند پہاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الاپ رہے تھے ـــ صاحبو مہربان ـــ صاحبو مہربان ـــ صاحبو ـــ

اس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کمال الدین ـــ اس نے اپنے آپ سے کہا ـــ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمھیں واپس بلا رہا ہے۔ وہ جو بہت مہربان ہے۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لیے۔ لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔ اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو۔ ہاں ـ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔

اس نے دوبارہ گھاٹ کا رُخ کیا اور گنگا عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انھیں فضاؤں میں سانس لیتا آیا تھا۔ جہاں ڈھاک کے جنگلوں سے ہرنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گورکھ ناتھ کے جوگی شیر کی کھالیں اوڑھے کانوں میں کنڈل ڈالے سینگی اور نرسنگھے بجاتے جسم پر بھبوت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے۔ جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی انوکھی فضائیں تھیں جہاں نو قسم کے ناتھ اور چوراسی قسم کے سدھ پہاڑوں کی گپھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے پھیلائے بیٹھے تھے اور کپالک اور کالا مکھ بدن پر راکھ ملے، کھوپڑیوں کے ہار پہنے، کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پرم ہنس اور یوگی ندیوں کے کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور منجیرے کی صدائیں۔ بسنت رُت آتی تو سارے

میں زرد اور دھانی رنگ پھیل جاتے۔ گریکھم رُت میں درختوں سے مہوہ ٹپکتا اور آم کے درخت بور سے لدجاتے۔ رنگیلی برکھا رُت میں چُندریاں ہوا میں لہراتیں۔ لاوُنیاں گائی جاتیں۔ لڑکیاں پکوان پکاتیں۔

بھادوں کے مہینے میں گنگا مائی کا جوش اور غُصّہ دیکھنے والا ہوتا۔ شرد کے موسم میں پیلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پردیسی شوہروں کی یاد میں برہا الاپتیں، چرخہ کاتتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

ہیمنت رُت آتی۔ اگہن اور پُوس کی سرد ہوائیں چلاتیں۔ الاؤ جلتے۔ آلھا اودل گایا جاتا۔ ماگھ اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ چنے اور ارہر کے پودوں پر اوس کے قطرے جگمگاتے۔ کسانوں کے جھونپڑوں سے چکّی کی گھر گھر کی صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔

یہ سب تھا مگر چمپا نہیں تھی۔ اسے کون زمین نگل گئی؟ کون آسمان کھا گیا؟ کون چِتا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی؟ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا؟

یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکھشا بندھن اور بھیّا دوج اور جنم اشٹمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیلا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی۔ وہ سارے میں مارا مارا پھرا۔ ایک دو بار وہ ایودھیا گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر انھیں سبزہ زاروں، سرجو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں پر گزار دے۔

چمپا کی یاد اب ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، انتریامی ایسا خدا ہے جو دلوں کے اندر رہتا ہے۔ وہ باپ ہے، شوہر ہے، ماں ہے، دوست ہے۔ رادھا کے لیے کرشن ہے۔ کرشن کے لیے رادھا ہے۔ اس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا فاصلہ تو بہت سے طے کرتے ہیں مگر چمپا ان گنت اندھیروں میں میرے لیے اجالا کرتی جاتی ہے۔ جب وہ ساون کی راتوں میں لڑکیوں کے گیت سنتا تو دنیا بالکل ایک نئی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندھیری رات میں نکل کھڑی ہوتی۔ برہا کی رات فراق تھی۔ جوگن، گوری، سہاگن، خدا کا بندہ تھا۔ پتی، پیا، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و عجم کی شاعری کی تصوراتی کائنات سے جو اس کا رشتہ اب تک رہا تھا وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ان الفاظ، ان سروں،

مدھم رنگوں سے قائم کیا۔

خدا ساقی نہیں تھا۔ خدا یتیم تھا۔ ہری۔ شیام۔ کنہیا اور رام — موہے رام سے کوئی ملا دے۔ موہے رام سے۔ کوئی کہے وہ بسے اودھ میں کوئی کہے بندرابن میں — کوئی کہے وہ بسے اودھ میں —

وہ مہینوں یونہی ادھر ادھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ لاابالی سیلانی آدمی ہے بغداد لوٹ گیا ہوگا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟ وہ تو گنگا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا۔ جب وہ لوٹ کر آیا اسے جولاہوں کی بستی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گرو اسے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں مبتلا ہو۔ لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ "تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے۔ پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے۔" انھوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔

کمال وہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور کرگھے کی آواز سننے لگا۔ ہنس کہیں نہ جائے۔ ہنس کہیں نہ جائے۔ وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا۔ پچھلی پریت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے سمجھایا تھا۔ وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے گنگا کے جلو میں جمنا جی بہتی ہیں۔ اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح تھی جیسے سنگم کے ساتھ سرسوتی جو ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعقیدہ جولاہا عوام کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگا میں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جولاہا "جل تھل رامکت ہیں رگھوناتھ" کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا۔

دلی کا سلطان بڑا دیالو اور دین دار مسلمان تھا۔ اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لیے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

(۲۵)

میاں کبیر بنارس سے جلاوطن ہوئے۔ شوپوری کا جنگل اجڑ گیا جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدرشن کے پھول کھلے تھے۔ میاں کبیر کا کرگھا سنسان پڑا تھا۔ ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ کمال، ان کی چھوٹی

سی بجی، بستی کی گلیوں میں روتی پھرتی تھی۔ کاشی نوسیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کمال نے ایک بار پھر اپنا رختِ سفر باندھا اور گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔ اس کے ایک سرے پر یہاں سے سینکڑوں میل دور گور تھا جہاں وہ آج سے کئی سال اُدھر اپنے سلطان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پٹنہ پہنچا۔ پٹنے میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی گوڑ سے بھاگ کر بہار آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلاوطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا تھا۔ وہ جنگوں میں لڑا بھڑا، جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور ختم ہو گیا۔

لیکن حسینی پیا، جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ تھا، سُر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سُر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب کمال نے نئی نئی دنیاؤں کی سیر شروع کی۔ نغمہ جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نغمۂ حق جسے کبیر انہد ناد کہتا تھا۔ باجت انہد ڈھول رے۔ تجھے ہری ملیں گے تجھے ہری ملیں گے۔ تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ جے دیو اور ودیاپتی اور چنڈی داس کے بھجن۔ ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت۔ کوچہ گرد فقیروں کے لحن۔ اس دنیا میں جنموں اور نسب نمودوں اور فوجوں کی یلغار، سیاسی تلاطموں، جلاوطنی اور موت کا کھٹکا نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اترا جس کا نام اس کو معلوم نہ تھا۔ یہاں پان کی بیلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے پھول کھلے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی۔ اس نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ بادل گانے والوں کی ٹولیاں اک تارہ بجاتی گلی گلی گھومتیں۔ داستان گو گا گا کر روپ کتھائیں سناتے۔ ماہی اور سپیرے اور ہاتھی پکڑنے والے بر سے گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی محبت میں ہر انسان سرشار تھا۔ نئے راگ الاپتا پھرتا تھا۔ اس سحر انگیز سرزمین کے باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ کمال ان کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی لہروں پر اپنی ناؤ کھیتا وہ چاٹگام کی پہاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یاتریوں کے ساتھ وہ سیتا کنڈ گیا جہاں اونچی پہاڑی پر، جس کے دونوں طرف

گہرے کھڈ تھے اور جن میں باگھ گھومتے تھے، سیتا مہارانی کا مندر تھا۔ پہاڑی کے گھنے پرخطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھ تھے اور پہاڑی کے دامن میں سنگِ سرخ کے تالاب کے کنارے کنارے معبد بنے تھے اور بڑ کے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چاٹگام کا علاقہ دلفریب تھا۔ بل کھاتے تندرو عظیم دریا، خطرناک بن۔ خوشبودار پھل اور پھل۔ سرسبز پہاڑی راستے۔ بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دکھلائی دیے۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو کا گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گا رہے تھے۔ اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی نعت کمال نے آج تک نہ سنی تھی۔ وہ دلچسپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی سنگت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا ولی اللہ بن گیا تھا۔

اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے — کیرتن منڈلی نے گایا۔
تو اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمو نمو ہے عبداللہ اور آمنہ
جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیا کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں۔
جے ہو اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے
جے ہو پورب سے نکلتے سورج کی
اب میں وندرابن کے سامنے جھکتا ہوں۔
بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام
جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی
جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سکھماندی کی
نوپاڑا کی مسجد کو میرا پرنام
کیونکہ وہ بڑا پیر ایک بار ان خطوں سے گزرا تھا
اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام

جے ہو — جے ہو — جے ہو —

کمال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب و غریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا۔ اب وہ بغداد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔ مذہب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور پس منظر سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلتی ہیں۔ کمال گاتا رہا۔ جے ہو سجے ہو سجے ہو۔

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا۔ یہ بنگالی زبان تھی جو اودھ اور بہار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں سوچتا، اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربارِ جونپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ گو وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شرقی اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بہرحال باقی تھی۔ لیکن دنیا تو اب مدتیں ہوئیں جونپور کے ابو المنصور کمال الدین کو بھول چکی تھی۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان، جس کے سر کے بال کنپٹیوں پر سے تھوڑے تھوڑے سفید ہو چلے ہیں اور جو چمپک درخت کے نیچے بیٹھا ایک باؤل سے کنچن مالا کی کہانی سن رہا ہے۔ یا اک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بانی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لیے بنگالی زبان میں کوئی لوک کہانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے، یہ کون ہے؟

گاؤں کے اور باؤل گانے والوں سے گیتی کتھائیں سنتے سنتے اس سرزمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے۔ پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاری یہاں موتی رو لیتے تھے۔ جب پدما اور بھاگیرتی اور مدھومتی پر میور پنکھی جہازوں کے بجرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں میٹھی چترنی نائیکاں مدھر مدھر ہنستی تھیں۔ جگمگاتے محلوں میں رہنے والی ملکہ مینامتی۔ زرنگار چتر ڈولوں کے سُرخ پردوں سے جھانکتی دلھنیں۔ وہ سب کہاں گئیں؟ وہ شان و شوکت کا زمانہ کیسے ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور چاندی اور موتی رولتا تھا وہ سب کیا ہوا؟ اب تو سین بادشاہوں کے محلوں میں بھی الو بولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دیبی تارا اور درگا بھوانی اور وشنو کے پجاری دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں۔ کمال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا۔ وہ — مؤرخ، محقق، سیاستدان، سپاہی،

صوفی، کبیر کا چیلا—اب گیت کار بن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کرلی۔ اس لڑکی کا نام شنیلا تھا۔ وہ ذات کی شودر تھی۔ ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گاگر لے کر آئی تھی کمال اس کے لمبے بالوں اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہوگیا۔ یہ عمر اور ذہنی پختگی عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن روح اور دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے۔ ایسا سکون جس میں پُرخطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کرکے حاصل ہوگیا۔ گویا یہی اس کی منزل تھی۔ جونپور کی شہزادی ایک بہت دُھندلا سا خواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ایودھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے اس تہہ خانے میں موجود تھی جس کے دروازے مقفل کرکے اس کی کنجی اس نے خود ندی میں پھینک دی۔

کیونکہ یاد زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔

شنیلا اب اس کی بیوی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحت ہے۔ اس نے شنیلا کا نام آمنہ بی بی رکھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بانس کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔

گزر اوقات کے لیے وہ کھیتی کرتا۔ اس کے کھیت میں دھان بوئے تھے اور اس کے جھونپڑے کے سامنے چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سنگھاڑے تھے اور کنول کے پھول اور جس میں رو پہلے پروں والی بطخیں تیرتی تھیں۔ جب آسمان پر اندر کی کمان نکلتی اور جوہی کے پھولوں پر بھونرا گنگناتا وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے برآمدے میں اپنے ساتھی گیت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر آنند لہری بجاتا۔ آمنہ اپنے لوچدار جسم پر تیز جامنی یا تیز سبز رنگ کی ساری لپیٹے پیتل کا گھڑا کمر پر سنبھالے تالاب کی اور جاتی نظر آتی۔

دن گزرتے گئے۔ دُکھی بنگال نے، جس کے سلاطین ہمیشہ آپس میں کٹتے مرتے رہتے تھے، اب چند دنوں سے چین کا سانس لیا تھا۔ گوڑ کے تخت پر سید السادات علاء الدین ابوالمظفر حسین شاہ براجمان تھا۔ وسط ایشیا کے شہر ترمذ سے آئے ہوئے خاندان کا یہ غریب سیّد، جو سلطان ابن سلطان نہیں تھا اور جس کی شرافت اور قابلیت کی بنا پر عوام نے اسے خود منتخب کرکے اپنا بادشاہ بنایا تھا، اس کے عہد میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ قتل و غارت کے بازار سرد ہوچکے تھے۔ ایک نئی زبان کو پروان چڑھایا جارہا تھا۔ بنگال کا یہ عظیم ترین مسلمان بادشاہ جس کے دور میں ودیاپتی ٹھاکر اور مہاپربھو چیتن سری کرشن کے عشق کے سریلے نغمے الاپ رہے تھے۔ راج محل کی پہاڑیوں سے پتھر بہا بہا کر گوڑ لائے جارہے تھے اور نئی نئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جارہی تھیں۔ دربار میں علمی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔

کئی برس بیت گئے۔ کمال کے بچے جوان ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے لڑکوں کے نام جمال اور جلال رکھے تھے۔ اس کی لڑکی کا نام سکینہ بی بی تھا۔ وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے ماہرِ تعمیرات تھے اور گوڑ اور سنار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منت مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میرِ عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی سبز اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پچی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیسی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال اور سین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہو گئیں۔ یہ بنگالی طرزِ تعمیر تھا۔ کمال کی لڑکی کی شادی بردوان کے مرشدزادوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے اسی نالا بن کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نغمے لکھتا اور گاتا۔ اس کے بیٹے گوڑ سے اپنے گاؤں واپس آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سنایا کرتے۔ لیکن یہ خبریں اب اسے بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور کمال الدین، جو پچاس سال ادھر عراق سے ہند آیا تھا، کوئی دوسرا انسان تھا۔ یہ کوئی مختلف انسان تھا جو بالوں کی لٹیں اور داڑھی بڑھائے چارخانہ تہمد باندھے ہاتھ میں یک تارہ لیے ویشنو نغمہ الاپ رہا تھا۔

ابوالمنصور کمال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا۔ چنانچہ جب دور بحیثیم دلّی میں ایک بار پھر سلطنت بدلی اور سلطان ابراہیم ہارا اور ترچھی آنکھوں والا منگول ظہیر الدین جیتا اور دنیا کا بوجھ سہارنے والی گائے نے اپنا سینگ تبدیل کیا تو اپنے بڑے لڑکے جمال سے یہ سارے سنسنی خیز واقعات سن کر اس نے ذرا سی بھی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس کے بیٹے جلال نے اس سے کہا کہ وہ مغلوں کے لیے عمارتیں بنانے دلّی جا رہا ہے تب بھی وہ خاموش رہا۔ اس نے ساری دنیا گھوم کر اپنی منزل تلاش کی تھی۔ اب دنیا اس کے بیٹوں کے سامنے پھیلی تھی۔ وہ بھی اپنی منزلیں خود تلاش کریں گے۔

مگر اب امن کے دن ختم ہونے والے تھے۔ بنگالے پر سید علاء الدین حسین شاہ کے بیٹے ناصر الدین نصرت شاہ کی حکومت تھی۔ مغلوں سے ہارنے کے بعد دلّی کے افغان، جو کل حکمرانی کرتے تھے، آج پناہ گزینوں کی حیثیت سے گوڑ اور لکھنوتی کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرتبہ جونپور کے حکمران انہی افغانوں سے مار کھا کے یہاں پناہ لینے آئے تھے۔ یہ افغان کمال

کو ہر جگہ ملتے اور گوڑ کے بازاروں میں راستہ چلتے چلتے لوگوں کو روک کر انہیں اپنی گزشتہ عظمت اور جاہ و جلال کے قصے سناتے۔ گوڑ کی گلیوں ہی میں کمال نے ایک روز ایک پرتگالی دیکھا جو اکڑتا ہوا ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔ کمال اپنی لاٹھی کے سہارے کھڑا اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے برسوں پہلے کا وہ اندھا برہمن یاد آیا جو ان سے ہارنے کے بعد کوچین سے کاشی آیا تھا۔ اس وقت پرتگالیوں کا جہازی بیڑا چاٹگام کی بندرگاہ میں موجود تھا اور وہ لوگ گوڑ میں بھی دندنا رہے تھے۔

وقت تیزی سے نکلتا گیا۔ گوڑ کے سیاسی حالات بگڑنا شروع ہوئے۔ اب وہاں ناصر الدین کا بھائی غیاث الدین راج گدی پر بیٹھا تھا۔

ایک روز کمال نے خبر سنی کہ بہار کے شیر خان نے غیاث الدین سے بنگالے کا تخت چھین لیا۔ پھر معلوم ہوا کہ دلی کے شہنشاہ ہمایوں اور شیر خاں میں گھمسان کا رن پڑا۔ اور ایک روز چند باولوں نے آکر کمال کو بتایا کہ مغل بادشاہ دھوم مچاتا گوڑ میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کے نام کا سکہ ٹکسال میں گھڑا جا رہا ہے۔ دور دراز ترکستان سے آئے ہوئے تاتاری پر بنگال نے ایسا جادو کر دیا کہ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا ہے۔ یہ سب خبریں کمال کو بڑی عجیب بچپنے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہتیں بدلتی ہیں تو جگہوں اور انسانوں کے نام بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ انسان اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کا کس قدر شوقین ہے؛ ہرے بھرے بنگال کی بدامنی بڑھتی گئی۔ شیر خان پھر گرجتا ہوا آیا اور دلی کے مغل کو واپس دلی بھگا کر دوبارہ بنگال پر قابض ہو گیا۔ ملک سہما ہوا تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اسی لڑائی میں جمال گوڑ کی گلیوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک رات شیر خان کے سپاہیوں نے اس گاؤں کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں کمال کی جھونپڑی تھی۔ سپاہی لوٹ مار مچاتے اس کے گھر تک آن پہنچے۔ باہر نکلو۔ وہ چلا رہے تھے۔ تم سب سے بڑے فسادی ہو۔ تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ تمہارے بیٹے دلی جا کر مغلوں سے مل گئے ہیں۔ تم غدار ہو۔ تم کو تو ہم جان سے مار دیں گے۔ تم کو گوڑ لے جا کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ ارے وہ گیت بنانے والا ابوالمنصور یہیں رہتا ہے نا۔ باہر نکل او بڈھے۔ اندر کس سازش میں لگا ہے۔ کمال کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چراغ اٹھا کر دروازے تک آیا اور حیرت سے سپاہیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ غل مچاتے اس کی اور بڑھے۔ کمال مضبوطی سے دروازے کی چوکھٹ تھام کر ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ وہ بہت بوڑھا پھونس ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر وہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کے پاس اپنی مدافعت کے لیے تلوار بھی نہیں تھی۔ وہ گوڑ لے جایا جائے گا؟ اس نے کس کا قصور کیا ہے؟ اسے افغانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا

جائے۔ یہ اس کا ملک ہے۔ اس کا وطن! یہاں اس کے بچّے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بی بی کی قبر ہے۔ یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں۔ اُس نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں۔ وہ یہیں رہے گا۔ اسے غدّار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دارالحرب نہیں ہے دارالسلام ہے۔ اس لمحے اسے انکشاف ہوا دارالحرب اور دارالسلام میں کوئی فرق نہیں۔ صرف رویے کا فرق ہے۔ لڑائیاں دو مذہبوں کے درمیان نہیں ہوتیں دو سیاسی طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سہسرام کا شیر خاں اور دلّی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دارالسلام بھی دارالحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڈ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے زور سے کمال کو دھکا دے کر گرایا اور ہڑبونگ مچاتے آگے بڑھ گئے۔

کمال اپنے گھر کی دہلیز پر اوندھے مُنہ گرا۔ اس کے مُنہ سے خون کی ندی بہہ گئی اور چند گھنٹے تک سسکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔

ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے۔ پرانا نظام بدل چکا ہے۔ گوڑ اور لکھنوتی اور پٹنہ اب خواب و خیال ہوئے۔ ترکوں کی دلّی کا بھی خاتمہ ہوا۔ دلّی اب مغلوں کی ہے۔

لیکن وہ کسان موجود ہے۔ وہ جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بو رہا ہے۔ وہ جو بیلوں کی جوڑی ہنکاتا میگھنا کے کنارے کنارے جا رہا ہے۔ وہ بھاگرتی کی سطح پر کشتی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے۔ وہ مرشدوں اور بھگتوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور معرفتی نغمے الاپ رہا ہے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ وہ تو اپنے چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تند رو موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ نوکا پدما کی لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں بھیانک ناکے مُنہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر پدما کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملّاح کی کشتی بڑے مزے سے عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت اور خطروں سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی "بیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے۔۔؟" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"نہیں، یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشاں مت ہو" پیٹر نے جواب دیا۔ "مگر ذرا اس کالے سور سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا الاپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔"

"سو رہا ہے کیا بوڑھا کتا۔" سیرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

"یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ جب تک ہنٹر نہ لگاؤ ان میں چستی نہیں آتی" پیٹر نے کہا۔ سیرل نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی۔

"او آدمی۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"ابوالمنصور۔ صاحب۔"

"ابوالمنصور۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ۔ سمجھے۔"

"جی صاحب۔" وہ پھر پتوار پر جھک گیا۔ نوکا چلا کیا۔ کنارے پر دونوں طرف ناریل اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ دور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سیرل نے نوکے کی چھت کے اندر جھانکا جہاں ابوالمنصور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جا نماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا۔ یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو پدما کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ سیرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھلایا ہے۔ اس عجیب و غریب ملک میں جسے "بنگال" کہتے ہیں۔ جسے "انڈیا" کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک بڑا شمپان گزر گیا۔ چاند بہت دور بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

(۲۶)

جب سیرل ہاورڈ ایشلے۔ نے کوینز کالج کیمبرج سے بی۔ اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس

سال کی تھی۔ اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کرکے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آکر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔ یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہوکر دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ یہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا۔ وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاونڈ کا نفع ہوا۔ نیٹو کس قدر بیوقوف ہوتے ہیں۔ ان کے امرا کتنے دولت مند ہیں۔ کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اگر عقل سے کام لیا تو چار روز میں وہاں سونے کے محل کھڑے کر لوگے۔ کیا کہا۔؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو۔ ڈرامے لکھا کروگے؟ وکالت بڑا نوبل پیشہ ہے۔؟ تمھارا دماغ خراب ہے۔ چند روز بعد پیٹر اسے سٹی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ڈائرکٹر تھا۔

سرل کو کلکتے میں ملازمت مل گئی۔ ایک روز وہ ٹل بری سے ایک انڈیامین پر بیٹھا اور ڈوور کی سفید چٹانیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ انگلستان چھوڑ رہا ہے۔ انگلستان جہاں کینٹ میں اس کا قصبہ ہے اور جہاں کیم بہتا ہے اور جہاں گولڈ اسمتھ اور کوپر اور گرے اور برک نے جنم لیا تھا۔ جہاں ہوگارتھ اور گینز برو اور رینالڈز نے تصویریں بنائی تھیں۔ ٹرنر کے سورج کی روشنی میں ڈوبے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے اور لندن کی گلیوں میں سودا بیچنے والیوں کی آوازیں اور قصباتی گرجا گھروں کے گھنٹوں کی صدائیں اور بلند و بالا جارجین محلات میں سے بلند ہونے والی چیمبر موسیقی مدھم ہوئی۔ انگلستان جہاں سکون تھا اور مکمل حسن۔ بنگال اور کینیڈا اور جنوبی امریکہ سے آئی ہوئی دولت نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔ نت نئے فیشن ایجاد ہو رہے تھے۔ اونچے اونچے قصر تعمیر کیے جا رہے تھے۔ باغات سجائے گئے تھے۔ غریب امیر ہو چکے تھے۔ امیر ہیرے موتی رولتے تھے۔ ہر طرف صرف ایک چرچا تھا۔ دولت ـــ دولت ـــ سرل جو ادب کا اسکالر تھا، جسے دولت سے غرض نہیں تھی، وہ بھی اسی دھن میں جا رہا تھا۔ وہ مفلس طالب علم بنگال پہنچ کر امیر ہو جائے گا۔ لندن میں اس کا بھی ایک محل ہوگا۔ یا کون جانے شاید وہ کسی وحشی ہندوستانی سردار سے جنگ کرتا ہوا مارا جائے اور مدراس یا میسور میں اس کی گمنام قبر بنے۔

اس نے ایک پھیری لی اور ڈیک سے ہٹ آیا۔ سمندر بہت بھیانک تھا۔ دنیا میں اس وقت کیا کیا

ہو رہا تھا اور وہ دراصل خود کتنا حقیر تھا۔ اس جہاز پر کیسے کیسے لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنائیں لیے اس اندھیرے میں ایک منزل کی سمت رواں تھے۔ ان سب کا حشر کیا ہوگا؟ کمپنی کے تاجر، کلکتہ کونسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے، اور اس کا چیف جسٹس، اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاہی لڑکیاں جو حسبِ معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کہ وہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی، جہاز کا کپتان، حیدر علی کے معرکے کے قصے سنا رہا تھا، پٹنے اور ڈھاکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر مدیرا پیتے۔ کوئنز کالج کیمبرج کے خاموش کونوں سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں کے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہوتا گیا۔ راس امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاہی اعلیٰ خاندان لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا۔ مگر وہ سرل کی صورت پر ریجھ گئی۔ پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے ملی حالات کا پتا لگایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور لڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس ازابیلا نے شورے کے ایک موٹے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دُنیا بدلتی جا رہی تھی۔ وہ سکون، جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا، زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا۔ نئے نئے کارخانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے وطن کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول۔ بہاریں۔ پیرس۔ ہائے پیرس۔ وائے — سرل نے ایک گہری سانس لی۔ پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔ انقلاب —؟

روسو۔ والٹیر — آزادی —؟

امریکہ کی جنگِ آزادی —؟

جہاز اب مڈغاسکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق تھا۔ حبشی غلاموں کا وطن۔ اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔ چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلا چلا کر اسے پکار رہے تھے۔ او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سواگت کے لیے ساری تیاریاں کر رکھی ہیں۔ انجیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ

اور آ کر ہماری کھال اتار لو۔ کانپور اور ڈھاکے کے پرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا: سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

"یہ سراج الدولہ کون تھا؟" سرل نے پیٹر جیکسن سے پوچھا۔

"سراج الدولہ ——" پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی۔ "میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔ میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں۔ بڑا سخت بیہودہ تھا۔ ظالم، مکار۔ مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔ مثلاً اودھ کا موجودہ نواب۔"

"وہ کون ہے؟"

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں۔ پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا: ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سُرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہرحال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظِ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ "نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فلانا اور ڈھمکا مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔" پیٹر نے بات ختم کی۔

سامنے بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔

ہندوستان ——!!

جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آ گئے۔ ڈیڑھ سو سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کسٹم افسر یورپینوں کا ناطقہ بند کر دیا کرتے تھے مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آ کر ان کو چاروں

طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسباب اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی پالکی پیٹر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تھی۔ سرل اس کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر مالابار ہل کی طرف چلا۔

سڑک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مرہٹی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریت پر چل رہی تھیں۔ مالابار ہل پر پھول کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کی کھپریل کی چھتوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں کھلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پیٹر اور سرل کا میزبان پھاٹک تک ان کا استقبال کرنے کے لیے آیا۔ پھر انہوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی۔ گوانیز خانساماں جو اپنے آپ کو پرتگالی کہتا تھا لپک لپک کر مہمانوں کی خاطریں کرتا رہا۔ پھر بے ہنگم سا سایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحبِ خانہ کے بچوں کی کھلائی تھی۔

میری پہلی یوریشین لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کونے میں حبشی غلام لڑکا لیا جب اس کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرے غلاموں کے ساتھ مڈغاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہر حال یہ مشرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اردشیر، صاحبِ خانہ کے پارسی کو چیین نے جھک کر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا: "کس طرف؟"

"بہ چرچ گیٹ چلو۔" پھر میزبان نے سرل سے کہا، "نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمہارے شاندار کلکتے کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں تم جا رہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔" اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سرسبز قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگا رہی تھیں۔ دور کولابا کے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گھما گھمی تھی۔ اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فرفر انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بھانت بھانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے پوچھا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور رکلیان اور ناسک کا حسن اور سرسبز پہاڑی راستے جن پر نیلا کہرہ چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ مہا گجرات ویلش کے سبزہ زار دل پر ہیوست بسا ہوا تھا۔ سورت — مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس

کی آبادی لندن اور پیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں رنگین چنریاں اوڑھے لڑکیاں لکشمی کے آگے دیے جلانے کے بعد گربا ناچتی تھیں۔

بمبئی لوٹ کر آنے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدراس اور کلکتے لے جائے۔ پیٹر جیکسن فی الحال یہیں ٹھہر رہا تھا۔ اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی نئی دنیائیں اس کی نظروں کے سامنے جھلملا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ برہمنوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ سنہرا شہر گوا ولندیزوں کا سرنگاپٹم جس کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمحے کے لیے ایمسٹرڈیم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یورپ — یورپ — یورپ — کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چیری میں کئی فرانسیسی جہاز پر آئے۔ وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے۔ ان میں تین راہبات تھیں۔ اور ایک سوربون کا طالب علم — وہ فوراً سرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی کندھے اچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں یونیورسٹی کی اور انقلاب کی باتیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد۔ وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتی میں بیٹھ گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدانِ رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہو گا۔ ہر طرف خونریزی تھی۔ اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں۔ یورپ میں نپولین نے اودھم مچا رکھی تھی۔ سارا یورپ جل رہا ہے اور کئی مرتبہ اور جلے گا اور اس ہنگامے میں کیمبرج اور سوربون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی طرح کھو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ، سرل ایشلے، خلیج بنگال کے پانیوں پر محوِ سفر ہے اور ہر طرف موت دانت نکوسے کھڑی ہے۔ سامنے میسور ہیں اور مرہٹے۔ شمال میں چڑھی ہوئی داڑھیوں اور گھیردار شلواروں والے افغان اور سکھ تلواریں چمکا رہے ہیں اور چارلس کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلّی میں دکھ ہے۔ فیض آباد میں دکھ ہے۔ مرشد آباد میں دکھ ہے۔ یہ سب سرل کو نہیں معلوم۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلّی میں شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چندا بائی کا رقص دیکھنے کے بعد استاد تان رس خان سے خیال چندر کونس بلمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدراس نظر آیا۔ فورٹ سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں ملیح پر سکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ دو باشوں نے اسے

گھیر لیا۔ سب مُصر تھے کہ وہ انہیں کو اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں دوستوں نے مدراس کے گورنر اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لیے جو تعارفی خطوط دے دیے تھے ان کو جیب میں ٹٹولنے کے بعد ذرا گھبراہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترا۔ یہاں پیٹر جیکسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود تھا۔

مدراس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والاجاہ نواب ارکاٹ کا محل دیکھا۔ مندروں اور قلعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی دکانوں پر نظر ڈالی۔ ایک روز وہ ٹہلتا ٹہلتا یوریشین آبادی کی سمت نکل گیا۔

یہاں اسے ایک مکان کی سیڑھیوں پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ دوغلی نسل کی حسین لڑکی۔ وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ ایک سیاہ فام عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چاول بیننے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آ گئے۔ پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یوریشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ "اندر آؤ گے؟" ایک بچے نے پوچھا۔ وہ سب متحیر تھے کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آن نکلا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاسٹ سسٹم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انہوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں بٹا ہوا تھا۔ سرل نے کیمبرج میں رہ کر اٹھارویں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پرچار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوت لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یوریشین وائٹ ٹاؤن کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی اسے دوبارہ نظر آئی۔ وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یوریشین لڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیر زادیوں سے کہیں زیادہ دلکش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولکا ناچتی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مرہٹہ اور گجراتی اور مالاباری عورتوں کی ایسی تھیں۔ سیاہ، اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی۔ اسے یہ لڑکی بے حد اچھی لگی۔ "ذرا بات سننا۔" اس نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر اسے جا لیا۔ "تم یہیں رہتی ہو؟" اس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"ہاں۔ تم نے ابھی میرا مکان دیکھا تو ہے۔ تم کلکتے سے آئے ہو۔؟"

"نہیں کلکتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا۔ یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔"

"بہت سفر کرتے ہو۔"

"ہاں۔ اور ابھی بہت سفر کرنا ہے۔ تم یہاں کب سے رہتی ہو؟"

"ہمیشہ سے۔"

"ہمیشہ سے۔"

"مگر تم تو عیسائی ہو۔"

"ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے؟" پھر وہ ذرا ٹھٹکی۔ "میرا دادا انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا۔ میری ماں ہندوستانی ہے۔"

وہ گڑبڑا گیا۔ ہیرجیکس نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ پورپین قوم سے میل جول بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر کالی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو سیاہ فام بنا دیا۔ "تمہارا باپ زندہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟" سرل نے پوچھا۔

"وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر۔ تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دکان کرتا ہے۔"

"آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔" سرل نے ہمت کر کے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی ذرا جھجکی اور پھر سر پر اپنا سیاہ جالی کا رومال ٹھیک کر کے بنچ کی طرف بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی۔ یہ راستہ گرجے کو جاتا تھا۔ اس کی کلائیوں میں سبک سی تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔

"تم کیتھولک ہو؟" سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے تھے۔

"ہاں۔"

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفعتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا:

"تم۔۔۔ تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔ میرے ساتھ کلکتے چلو۔"

لڑکی نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں۔"

"میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا۔ تم کیتھولک نہیں ہو۔ اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور۔۔۔ اور آج کے بعد شاید تم مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔ تمہاری طرح کے بہت سے سیاح مدراس آتے ہیں۔" اس نے اداسی سے درخت کا پتا توڑا۔

سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ "سنو،" اس نے

بڑے جذبے سے کہا۔ "سنو۔" مگر وہ پھر بڑبڑا گیا۔ اُس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

"مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔"

"ماریا ٹیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔"

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کے بجائے چپکے سے یوریشین ٹاؤن بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی۔ وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا مگر وہ بیوقوف لڑکی خالص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا دیوتا تصور کرنے لگی تھی۔ جب وہ اسے خدا حافظ کہنے گرجے کے باغ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنبھالے اس کے ہمراہ کلکتے چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ اندازِ بیان اور ڈرامے کی صلاحیت بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ وہ جلدی ہی اسے بلوا بھیجے گا۔ اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈونچر کے بعد سرل پھر اپنی منزلِ مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں وسعت میں داخل ہوتے ہوتے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہو کر جہاز نے لنگر ڈالا اور پائلٹ کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ مسافر عرشے پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پائلٹ کے ساتھ جہاز فلشا روانہ ہوا۔ وہاں مسافر اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے تھے۔ سرل اس ہنگامے میں کسی کو نہ جانتا تھا۔ وہ جلدی سے کود کر ایک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ مانجھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شور و غل سے نکل کر کشتی پرسکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔ آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گرجنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں مچھروں نے بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔ سرل نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور کلکتے کا تصور کرنا چاہا جہاں وہ بالآخر اب پہنچنے والا تھا۔ محلات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔ بنگالے کا سحر انگیز چاندپانی

کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ مانجھی اپنی زبان میں گا رہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

پھر منظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ کشتی گارڈن ریچ پہنچ رہی تھی۔ ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے پر کلکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ کلکتہ، جو اب دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا، بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔ گھاٹ پر بنگالی بنیے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آئے ہوئے تھے۔ جن نوواردوں کے دوست یہاں موجود نہ تھے اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر پرتگالی مسافر خانوں کا رُخ کر رہے تھے۔ گھاٹ کے اس رنگا رنگ مجمعے سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پالکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پالکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیسیوں کے چندر نگر تک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارات تھیں۔ شاندار گورنمنٹ ہاؤس جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے براجتا تھا اور اب جہاں سرجان شور فورٹ ولیم کا گورنر جنرل بننے والا تھا۔ پھر رائیٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا دفتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بلیک ٹاؤن تھا جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمنی، یوریشین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر کلاسیکل طرز کی عالی شان عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہال۔ پیل پائے والے برآمدے۔ چوڑے زینے۔ جھلملیوں والے دروازے اور اونچے دریچے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امرا کے گارڈن ہاؤس تھے جن کے باغیچوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوٹھیوں کے عقب میں شاگرد پیشے تھے جہاں مرغیاں اور بطخیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واٹر للی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیٹل ہو چکا ہوں اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں۔ میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جو فراٹے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں مفصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں۔ میں نے ایک مسلمان منشی نوکر رکھا ہے جس کا نام ابوالمکارم ہے۔ وہ مجھے فارسی اور بنگالی

پڑھاتا ہے اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں سل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سُرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقّہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار ۔ پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علٰحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے بلا شرکتِ غیرے مالک و مختار تھا۔ وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اُس نے اکثر کیا۔ وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشقِ سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جاکر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جاکر سو رہتا تھا۔

صبح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ جھلملیوں سے چھن چھن کر اندر آنے لگتی تو سرل اپنی مسہری سے اُٹھتا۔ اس کے سرکار اور چپراسی کاغذات لے کر فرشی سلام کرتے بیڈ روم میں داخل ہوتے۔ حجام اس کا خط بناتا۔ وگ سر پر جمانے کے بعد واسکٹ پہنتا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا جہاں وہ چائے پیتا جاتا اور پیچوان کے کش لگاتا۔ کاروبار اور سرکاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صبح صبح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبانہ کھڑے رہتے۔ سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سدا جلوس پالکی کی طرف بڑھتا اور پالکی اس کے دفتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آکر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا۔ اس کے بعد لباس تبدیل کرکے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لیے نکل جاتا۔ سوشل کالز کرتا۔ کورس میں ہوا خوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسائش کے ساتھ اس کا بنک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا گورنر

جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر مفصل میں یا لکھنؤ ریذیڈنسی بھیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال رومز میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیاہی امیرزادیاں اکثر سوچتیں وہ کون خوش قسمت لڑکی ہوگی جس سے امیر اور ہینڈسم سرل ایشلے بیاہ کرے گا۔

مگر لیڈی پمیلا یا لیڈی سنتھیا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایشلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور عامیانہ حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر سبھی دولت مند انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز "نوابین" کا عام دستور تھا۔

یعنی سرل ایشلے نے بھی ایک نیٹو عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز "نوابوں" کا انگلستان میں خوب مذاق اڑایا جاتا۔ وہاں کا جاگیردار طبقہ ان کو اپنے ہم پلّہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سٹی میں معمولی تاجر یا کلرک تھے۔ اور نودولتیے تاجر سے پشتینی زمیندار کی ہمیشہ سے ٹھنی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف لیلوی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالاسور اور ہگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنؤ، بنارس، گوالیر اور دلّی کے درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ۔ کلکٹر، جو بنگال، بہار اور اُڑیسہ کے ضلعوں میں تعینات تھے۔ فوجی افسر جنہوں نے اودھ میں چھاؤنیاں چھائی تھیں۔ فوجی ایڈونچررز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اونچے بنے دندنا رہے تھے۔ یہ سب اب سرل کے ساتھی تھے۔ سرل ان کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے لکشمی نے ہندوستانیوں سے روٹھ کر فرنگی کا گھر دیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں ہُن برس رہا تھا۔ شہر کی چورنگی میں ان کے ٹاؤن ہاؤس تھے۔ شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انھوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریذیڈنسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑپتی ہو چکے تھے۔ نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آدرش تھا۔ حرم، حقہ، شعروشاعری، ناچ رنگ، مرغ بازی —— یہی مشاغل ان فرنگیوں کے تھے۔ ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں سمجھوتہ کرکے ایک انتہائی مہذب فضا کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوانی ملنے کے بعد انگریز سوداگر بنگال میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی مکمل مل چکا تھا۔ پلاسی

کے بعد کمپنی کا نیکر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کہلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو ادب میں دلچسپی لیتا تھا اور حرم میں دس دس دیسی عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیلا کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔

سیاہ لمبے بالوں اور نشیلی آنکھوں والی شنیلا ڈھاکے کے قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا اس سے تہذیب تمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیلا دیبی کا باپ اسی طرح فاقے کر رہا تھا بلکہ اب اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ شنیلا کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال ودھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتے کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلوا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی لڑکا ہی سا تھا مگر کلکتے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیلو پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ پایا۔ سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ گو کلکتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفا رہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنا لیتا۔ شنیلا کا بھائی اپنی مفلسی سے تنگ آ کر سوچ رہا تھا کہ سیرام پور جا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی۔ مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیاہ کی فکر کریں گے۔ مگر اسی روز سرل صاحب کے سرکار نے آ کر اس سے کہا: "صاحب نے تمہیں یاد کیا ہے۔" اور اس کے اگلے دن شنیلا سرل صاحب کی کوٹھی پر پہنچا دی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو افلاس سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقدار بن جاتی ہیں۔ یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔ نسلی تعصب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا۔ بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی بیٹی شہزادی فیض النساء اور کمبے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادیاں انگریزوں سے ہوئی تھیں۔ کلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیلا سے بیاہ نہیں کیا۔ مگر شنیلا ناخوش نہیں تھی۔ وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زنان خانے میں براجتی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں

کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیلا کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ مدراس یا کلکتے کے یتیم خانے میں داخل کر دیے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح کلرکی کریں گے۔ یا کسی رجمنٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کریں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زادی کی آیا بننا پڑے گا یا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست ٹریجڈی کا حامل ہے۔ تب اسے خوبصورت ماریا ٹھیریزا یاد آئی جسے وہ ہڑاس میں ایسے کمینے پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پرتگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی۔ پھر فرنچ اور ولندیزیوں نے آکر اچھوتوں کو عیسائی کیا۔ جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پرتگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصب نہیں تھا۔ ان کی آمد سے اس طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابلِ رحم لوگ تھے۔ بے چارے 'کرانی' جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آئی۔ تو کیا اسے لیڈی سنتھیا سے شادی کر لینا چاہیے۔ پھر شنیلا اپنی رسیلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑبڑا جاتا اور پالکی میں بیٹھ کر کورس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پبلک بریکفاسٹ، ہیسٹنگز اسٹریٹ اور رعلی پور کے کانسرٹ اور رقص، گارڈن ریچ کے جشن اور تقریبات۔ پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ، چاٹگام، مرشد آباد، چوبیس پرگنہ، مونگیر۔ سارا بنگال اور سارا بہار اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبی راستے اس کے لیے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور قسمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھالیشری اور بہری منگل اور کرنافلی اور مدھومتی اور شوبشری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی باربرداری کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤ واڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اُس نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی: "ابو المنصور اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ!" اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کس قدر سخت جان لوگ ہیں۔ اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں

میں اتنے طوفان آتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جیے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اب رات کے نو بج رہے تھے۔ اسے آج ہی رات کو راجہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ہیک دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آ رہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ اس نے پیٹر سے پوچھا۔ پیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ سرل نے لالٹین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۷۹۸ء۔ سرل یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم توڑ چکی تھی۔ اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرز دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور کمال الدین جو دن بھر نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ایشلے کو نوکے میں بٹھلا کر اس پار لیے جا رہا تھا اور چاند پدما کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آ چکی تھی اور انناس اور کیلے کے جھنڈ میں گیدڑ بول رہے تھے۔

کیونکہ رات بہت ہولناک تھی۔

(۲۷)

کنارے پر آ کر رادھے چرن نے لالٹین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر جھکایا۔ دور افق پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی۔ انھوں نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کر دھیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈ کے نیچے ان کا اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے میں ایک ہیبت ناک سناٹا طاری تھا جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی طرف سے ساز دل

کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سنا تھا وہاں پٹنے اور لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کو لاٹ صاحب نے خلعت عطا کی تھی۔ اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کلکتے سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔ چوپال میں عجب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

"کچھ بات کرو دادا۔" پرمود نے چلم کی راکھ کریدتے ہوئے اداس آواز میں رادھے چرن سے کہا۔ رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریالے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ نرائن[۱] ماتھے پر صندل کا ٹیکا لگائے ہاتھ میں بانسری لیے نارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھناتے پدما کے کنارے کنارے جاتے نظر آجاتے ہیں۔ اگر مجھے کبھی ستیہ نرائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں — تو میں ان سے کیا پوچھوں —؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کیے۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھنانے کی آواز نے سناٹے کو توڑا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسبِ معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑی کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ستیہ نرائن کے بھکاری ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دیبی لکشمی کے بھجن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں۔ یہ ان کو اچھے شگونوں کی باتیں بتاتے، سانپ کے کاٹے کا اپنے منتروں سے علاج کرتے۔ ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انھوں نے شیلا کے لیے کہا تھا، جب وہ دکھشنا دینے باہر آئی تھی، کہ یہ بیٹی پدمنی ہے۔ پھر انھوں نے پدمنی کی ساری نشانیاں شیلا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پدمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چراغ جلاتی ہے۔ اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے۔ انھوں نے بشارت دی تھی۔

۱۔ گوڑ کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جو بنگال کے مسلمانوں کے لیے ستیہ پیر اور ہندوؤں کے لیے وشنو کا اوتار ستیہ نرائن بن گیا۔

ان کی آواز سن کر شنیلا کی ماں دہلیز پر آئی۔ اس کے مٹکے خالی پڑے تھے۔ فقیروں کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ ستیہ پیر اور مانک پیر اور لکشمی اور چنڈی ان سب دیوی دیوتاؤں کی قوم پر اُسے بڑا غصّہ آیا۔ یہ سب دھوکے باز ہیں۔ سارے دیوی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ وہ حسبِ معمول ستیلا اور چنڈی اور شیو کا جاپ کیا کیے: "شنیلا کہاں ہے؟" بالآخر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کلکتے۔" رادھے چرن کی بی بی نے کہا۔

"وہاں کیا کر رہی ہے؟"

"اس کا۔ اس کا بیاہ ہو گیا۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ شنیلا کو پردے سے نکلنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیر باد دی۔ "میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا سبھاگن لکشمی ہے۔ پدمنی۔ ہمارا داماد کیا کرتا ہے —؟"

"کلکتے میں کام کرتا ہے۔"

"اچھا۔" فقیروں نے اطمینان سے مزید دعائیں دیں اور واپس مڑنے لگے۔ اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لیے کچھ نہیں۔ ان کو اس قحط سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جب سنا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی کلکتے کی سڑکیں فاقے سے مرتے ہوئے انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئی تھیں۔ مگر اب کلکتے کی سڑکیں دُور دُور تک پھیل چکی تھیں۔ اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

"ٹھہرو۔" شنیلا کی ماں نے کہا۔ "میں نے پرفلا کو ہاٹ بھیجا تھا۔ شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔"

مگر فقیر دعاؤں کی بوچھار کرتے اُداس قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلا کی ماں اپنے بھانجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا۔ اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا۔ چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمباکو اور چاول اور نمک اور برتنے کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ دریاؤں پر ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی تھیں مگر بازار میں قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں: "او جیت دادا تم بھی ڈھاکے سے آرہے ہو؟" پرمودر نے پوچھا۔ "ہاں۔"

میں بھی اور ولیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا۔ سارے کرگھے ٹوٹ گئے۔ اب ہم بھی ہل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتنے دیں گے؟" اوجیت نے کہا۔

"پتا نہیں۔" پرمودر نے اکتا کر جواب دیا۔ وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آگیا تھا مگر اس کا دماغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق دیہات کا رُخ کر رہے تھے۔ زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جہاں پیداوار کم تھی، لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار نوجوان لڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

"دادا تمہاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا؟" اشوتوش نے سوال کیا۔

"کیا؟" رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"یہی سب۔ مہنگائی — اور کال — دنگا فساد؟"

لمبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل کریدکر لڑکوں کو دھندلی آنکھوں سے دیکھا کیے۔ یہ دونوں بکسر میں لڑے تھے۔ گاؤں ان پرانے وقتوں کے بڈھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گن گاتے تھے اور روتے تھے۔

"وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری عورتوں کو پردے سے نکلنا پڑے گا۔ ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔ مہابھارت میں لکھا ہے۔" بوڑھے پھونس دھن گوپال مزمدار نے کہنا شروع کیا۔

"ارے مہابھارت کو چھوڑو دادا۔" پرفلا نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔ بات بے بات، سراج الدولہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ یہ دھن گوپال دادا ابھی ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔ پرفلا نے ان کو بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ "کیا گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔" اس نے کہا۔ "کلکتے چلو۔ جہاں شیام والے گئے ہیں (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گودام میں ملازمت کر رہا تھا) اور لاٹ صاحب کی چاکری کرو۔ سراج کے زمانے لد گئے دادا۔"

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے۔ یہ لڑکا پرفلا بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آگئی؟ ان کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفا کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا۔ مغلوں کی سرکار کا نظم ونسق سنبھالتا تھا اور باقی وقت پوجا پاٹ میں

لگا رہتا تھا۔ مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنیوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا یہ نیا سرمایہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دست راست تھا۔ اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

"لاٹ صاحب کی چاکری۔" دمن گوپال نے کھانسنے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا۔ اس کی داڑھی لالٹین کی روشنی میں ہلتی ہوئی مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ وہ خود بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ "لاٹ صاحب۔" اس نے دہرایا۔ "اس سے ہمیں مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی دلّی میں موجود ہے۔ وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کر دے گا۔"

"تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا۔" پر فلا قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو۔ تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کر دی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔" پر فلا کھی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پر فلا پر نظر ڈالی۔ ان لڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا۔ یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقہ زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوسِ ہند کہلاتا تھا۔ اُس وقت اس دیس میں پرائے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے۔ یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا ڈھاکے کا انگریز کلکٹر یہاں آیا تو اس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بدانتظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بدانتظامی نہیں تھی۔ میں کایستھ ہوں۔ میرے پرکھے صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔ تم۔۔" اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو کلکٹر کے چپراسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلمبند

کیا تھا۔" بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں۔ دراصل اسے ایک ملک کہنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست بگریبان رہتے ہیں۔ یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔"

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وِگ کا پاؤڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ مولسٹور داد اینچے کا پتے نوکے کو کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کرلیں — علی وردی نے مرتے وقت نوجوان سراج سے کہا تھا: فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور ان کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخرے کر دیے ہیں۔ ان کی طاقت زبردست ہے۔ ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چوبیس سالہ سراج مرشد آباد میں تھا۔ فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقے سے جو سامان آتا انگریز اس پر زبردست محصول لگا رہے تھے۔ کلکتے کی تسخیر کے بعد بھی سراج نے انگریزوں کے عہدناموں پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔ رادھے چرن کا باپ ان سب معرکوں میں سراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہگلی میں قتل و غارت مچایا تو سراج نے لکھا: تم نے میری پرجا کو تاراج کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو۔ اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمھاری ساری مراعات واپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے۔ تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ سراج نے لکھا: مرہٹے، جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے، اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی قسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمرل واٹسن نے جواب دیا تھا: "میں ایسی آگ تمھارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا۔ میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ —— " یکایک مشعلوں کی روشنی سے اُفق جگمگا اٹھا۔ بوڑھی گنگا کی موجیں جھلملا رہی تھیں۔ صاحب کی کشتی گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ راجہ گریش چندر رائے اور ان کے حواری موالی گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چرن نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا اور اس روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ چادر لپیٹ کر آہستہ سے اُٹھے اور اپنے نیم تاریک مکان کی طرف مڑ گئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کر ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ راجہ صاحب

کے پیادے رات کی دعوت کے لیے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی سمت آرہے تھے۔

(۲۸)

پچیس سال گزر گئے۔

ڈھاکے کے کارخانوں میں اُلّو بول رہے تھے۔ سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جاچکی تھی۔ اب باضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کو لندن سے عظیم تر دکھلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ کلکتہ گنجان شہر بن چکا تھا۔ اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سرل ہاورڈ ایشلے کی عظیم الشان عمارات کھڑی تھیں۔ سرل ہاورڈ ایشلے، پچاس سالہ، دنیا دار، کامیاب، جہاندیدہ، پُرانا پاپی، گھاگ، جان کمپنی کا اہم ستون، نئی اردو نثر کا مربی اور سرپرست، اودھ کے بادشاہ کا لنگوٹیا یار، اس نے اپنے شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حسبِ معمول ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اس کے فزیشن نے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے۔ محنت کم کرے۔ غم کم کھائے۔ شراب اس سے بھی کم پیے۔ روز باقاعدہ ہوا خوری کرے۔ ورنہ مر جائے گا۔ فزیشین کی ان نصیحتوں پر اسے ہنسی آتی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔ گھٹیا، کامیاب، دولت مند، اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر تک پہنچتا ہے تو اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ سارے گورنروں، اعلیٰ حکام اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے یہی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شاندار محل پر نظر ڈالی جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملازمین کی پلٹن کام میں مصروف تھی۔ خداوندا ۔۔۔ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا؟ پھر اس نے چند اہل کاروں کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے۔ اپنے کلرک کے ذریعے چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کے پاس بھجوانے تھے۔ بنگال کے حالات مخدوش تھے۔ اضلاع

کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند باغی زمینداروں کی سرکردگی میں سر اٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلاتے پھر رہے تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ کے بادشاہ کے پاس ان کا غذات کا پہنچنا ضروری تھا۔ اُسے مفسدوں کا سر کچلنے کے لیے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے۔ اور موسمِ گرما کے عروج پر جب آم میں بور آ رہے تھے وہاں کرنل کلائیو، سراج سے لڑا تھا)۔ ندیا — گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آگئیں۔ ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی۔ ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ ساری دنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سنانے کے لیے تُلی بیٹھی تھی۔ اپنا افسانہ وہ کس کو سنائے گا؟

خط پر دستخط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لیے تیار ہوا۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے۔ سامنے سڑک پر چند کالے مرگھنے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سرل کو ایک پھریری سی آئی اور اس نے جھک کر ایک سوگوار سے پوچھا: "کس کی ارتھی لیے جاتے ہو؟"

"ڈھاکیشوری کے رادھے چرن بابو ۔"

سرل چونکا۔ رادھے چرن تو تسنیلا کے باپ کا نام تھا۔

تسنیلا کون تھی —؟

دنیا میں ہزاروں رادھے چرن ہوں گے اور اُس نے تسنیلا کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سُنا تھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آجایا کرتا تھا اور کافی خبطی اور بد دماغ بوڑھا تھا۔

سرل ٹوپی اتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ارتھی والوں نے بڑی حیرت سے اُس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جو زندہ بنگالیوں کے ساتھ جوتے لات سے بات کرتا تھا مرے ہوئے بنگالی کی یہ تکریم کیوں کر رہا تھا؟

بے چارے رادھے چرن بابو۔ کاش تم چند لمحوں کے لیے زندہ ہو کر اپنی یہ عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول، ہری بول کی آوازیں مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا: "صاحب کدھر جائیے گا؟"

سرل پھر بوچے میں جا بیٹھا — "جہاں پیا ہو چلو ۔"

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا۔ اُس نے دنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پرکھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے۔ کس طرح مرتے تھے۔ یہ گورکھ دھندا کیوں تھا؟ گہری ندیا اگم جل زور بہت بے دھار۔ کھیوٹ سے پہلے تو جو اترا چاہو پار۔ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی۔ مگر روح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا۔ کسی دور، کسی حال میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اُس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا۔۔؟ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا: یہ پُر رونق خوبصورت شہر، اس کی دولت، اس کی آبادی، سب اس کے قدموں میں بکھری تھی۔ اسے چاروں طرف کے انسان اپنا مُنہ چڑاتے نظر آئے۔ چوراہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لیے بوجھ زمین پر رکھا۔ سامنے ایک پرتگالی شراب خانہ تھا۔ ہگلی کے برطانوی اور اطالوی ملّاح دروازے پر ہلڑ کر رہے تھے۔ اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جالی کا رومال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھورتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

"ٹھہرو۔ یہیں رکو۔" سِرل نے چلا کر کہاروں سے کہا۔ انھوں نے بوجھ دوبارہ زمین پر دھر دیا۔ سِرل کود کر اس عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو کلکتے کے اس گھٹیا یورپین شراب خانے میں گھستا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بجھی بجھی آنکھوں والا یوریشین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سِرل کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اس کی زبان ہکلا گئی۔ "سر۔ سر" اس کے آگے اس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سِرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ لان کے مالک کس قدر پراسرار لگتے تھے۔ ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی۔ یہ آوارہ گردوں، چوروں، اچکوں، بدمعاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اداس دُنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز میں بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اتری۔ نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب دو برطانوی ملّاح غل مچاتے اندر آ چکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یوریشین لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سِرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ "کدھر جاتے ہو سِرل

صاحب۔" اس عورت نے، جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا، یکلخت اس کے سامنے آکر دروازے میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزا سے کہا۔ اس کے کانوں کے بُندے جھلکورے کھا رہے تھے اور وہ خاصی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ "سرل صاحب۔ اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ۔ تم نے مجھے کلکتے بلایا تھا۔ میں پچیس سال سے تمھاری منتظر ہوں۔ میں اسے چار سال کا گود میں اٹھا کر یہاں لائی تھی مگر تمھارے چوبدار نے مجھے آج تک تمھاری کوٹھی میں گھسنے ہی نہیں دیا۔ میں کیا کرتی۔ تم نے تو میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو۔ اس طرح گزرتی ہیں۔

"سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لیے روپیوں کا بندوبست کر دو۔ سنا ہے نیٹو عورتوں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمھاری ہم قوم ہوں۔"

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا ابھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں کلکتہ کرانیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی۔ اگر کسی طرح ان کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سوسائٹی میں مشتہر ہو گا۔ ولایت تک بات پہنچے گی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا: "صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے۔ چلیے۔"

پھر لوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

"حضور گھر چلیے گا؟" کہاروں نے پوچھا۔

گھر؟ — اس کا گھر کہاں تھا۔ "نہیں باغ والے بنگلے چلو۔" اس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

لوچہ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی — اور جلدی۔ اس نے کہاروں کو ڈانٹا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا۔ یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے

رفقائے کار، فورٹ ولیم کالج کے منشی اور مختار، ایشیاٹک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعراء اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چمپا بائی — یہ سب مل کر اس کی روح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔

اس کی روح کے غم کیا تھے؟ — عورتیں —؟

ہرگز نہیں۔ عورتوں کے مسئلے نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنفِ لطیف کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں، ناکامیاں، رومان، ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں، یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر "عورتیں" لکھا ہے۔ سِرل ایشلے، جس نے شاعر کی نظروں سے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا۔ اس کی روح کا دکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔ اس ملک سے، جس نے اپنی ساری جمع پونجی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے، جنھوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدراس کی ماریا ٹیریزا، ڈھاکہ کیشوری کی شنیلا۔ اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھاور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دنیا سے سب کچھ حاصل کر لیا لیکن اس کے بدلے میں دنیا کو کچھ دیا نہیں۔ یہ بڑی بدنصیبی کی بات تھی۔ اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈتا لیکن دنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بنک آف انگلینڈ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرمایہ اور زیادہ تجارت۔ حکومت۔ اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے کارٹیج ہاؤس میں پہنچ کر اس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی۔ کچھ دیر سویا۔ پھر حقے کے کش لگانے کے بعد دوبارہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اور انصاف اور قانون کے تقاضے بھی تھے جو ذاتی دکھوں پر حسبِ معمول حاوی ہو گئے۔ فرض اسے پکار رہا تھا کہ ندیا کے ضلعے میں جا کر باغی کسانوں کی سرزنش کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں۔ گو دل کی ویرانی کہتی تھی: لکھنؤ چلو۔ وہاں دربار کی رنگینیوں میں سارے غم دھل جائیں گے —

کوٹ پہن کر وہ پھر بوچے پر سوار ہوا اور چورنگی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا دفتر تھا۔

(۲۹)

نوجوان بنگالی کلرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ گھنگھریالے بال

اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف مٹیالے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر برآمدے میں ایک دبلا پتلا لڑکا اونگھتا جاتا تھا اور پنکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پنکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

"گڈ آفٹر نون سر۔" نوجوان نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

"گڈ آفٹر نون — تمہارا کیا نام ہے؟"

"گوتم نیلمبر دت — سر۔"

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں کل ہی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے دفتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔"

"کب سے کام کر رہے ہو؟ ابھی تو لڑکے ہی سے معلوم ہوتے ہو۔" سرل نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس کا نیٹو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس کو بہت کھلا کرتا تھا کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا کارنوالس نے پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انھیں کسی حالت میں بھی نیٹو لوگوں سے برابری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہسٹن بہادر۔ وارن ہیسٹنگز۔ کے زمانے خواب و خیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیٹو کے درمیان سماجی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی مگر سرل اولڈ سکول کا 'نواب' تھا اسی طرح شاعروں سے ملتا۔ مجرے سنتا۔ اودھ ریذیڈنسی میں رہ کر اس پر ہندوستانیت کا رنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا۔ اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس جو غازی پور پہنچ کر ہیضے کا شکار ہو گیا۔ اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بنگالی کلرک پر نظر ڈالی۔ "تم نے کہاں پڑھا ہے؟"

"سنسکرت کالج بنارس اور یہاں"، اس نے جواب دیا، "کلکتہ کالج میں ایف۔ اے۔ تک پڑھا ہے۔ اب بی۔ اے۔ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" سرل نے واقعتاً خوش ہو کر کہا۔ "دفتر کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہا کرو۔" پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نیلمبر دت کو پھر بلایا۔

"سفر کرنا پسند ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کبھی شاہِ اودھ کی عملداری میں گئے ہو۔؟"

"میں بنارس سے آگے کبھی نہیں گیا۔"

"اب جاؤ گے۔؟ چند ضروری کاغذات ہیں۔ تمھارے ساتھ مسلح دستہ جائے گا۔ میں خود نہیں جا سکتا کیونکہ مجھے اضلاع کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان باندھو۔ اکلیشن سے کہو جہاز میں تمھارے لیے کیبن کا بندوبست کر دے۔"

"یس سر۔ تھینک یو سر۔" وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے، ان کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

جہاز نے، جو کلکتے سے بنارس جاتا تھا، ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم آ چکا تھا اور مونگیر اور پٹنے تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم نیلمبر سامانِ سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور کھیتی کرتے تھے۔

اس سمے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی۔ وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں، جس کی سیڑھیاں گلی میں اترتی تھیں، چٹائی بچھائے لالٹین جلائے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار ڈکشنری دیکھتا جاتا تھا۔ اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا: "کیا بات ہے ماں۔ ۔؟ کس سے ملنا چاہتی ہو۔؟"

"تم ہی سے۔"

"مجھ سے۔؟"

"ہاں۔ تم سرل صاحب کے کلرک نہیں ہو۔؟"

"ہاں ہوں تو۔"

"میں شیلا ہوں۔"

"شیلا۔ ماں۔؟" اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ "تمھاری کیا سیوا کروں؟"

"میں۔ میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔"

"اچھا۔ ؟" اسے یاد آیا دفتر میں اُسے کسی نے بتایا تھا کہ سرل صاحب کے زنانخانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی جس کو کچھ عرصے سے انھوں نے علٰحدہ کر دیا تھا اور اس کے لیے ایک دوسرا مکان لے رکھا تھا۔

"تم کو صاحب بہت مانتے ہیں۔ میرا ایک کام کرو گے۔ تم لکھنؤ جا رہے ہو نا۔ ؟"

"ہاں - ہاں -"

"تم نے چمپا بائی کا نام سنا ہے ؟"

"چمپا بائی — وہ کون ہے — ؟"

"لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔ صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں روپے خرچتے ہیں۔ میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا۔ بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔ بھاوج اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔" جاؤ اپنے فرنگی کے پاس۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میری ایک لڑکی بھی ہے۔ وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا۔ وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پہچانتی بھی نہیں۔ اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کالی عورت ہے۔"

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک لڑکی بھی ہے۔ "تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے ؟"

"مارگریٹ اجابل۔ پر میں اسے بیلا پکارتی تھی۔"

"تم عیسائی ہو گئی ہو ؟"

"نہیں۔ مگر بیلا ہمارے دھرم کو بہت برا سمجھتی ہے۔ تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے۔ تم لکھنؤ سے آ کر مجھ سے ملو گے نا۔ تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے کیا کہا ؟"

"میں تم سے ضرور ملوں گا ماں۔" گوتم نیلمبر نے کہا۔ پھر وہ اسے پہنچانے کے لیے گلی میں اتر آیا۔ "تمھاری پالکی کدھر ہے ؟"

"میں پیدل آئی تھی۔ تم میری فکر نہ کرو۔" گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلملاتی رہی پھر موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ گوتم نیلمبر برآمدے میں واپس آ کر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

(۳۰)

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہر دن چڑھے کی نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکرمیں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان بیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نخاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محلات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملازمین باسی پھولوں کے گلدستے اور گجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور تنبولنوں نے اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے، دو گھڑی ہنس بول کر، زردہ کھا کر، حقے کے دو کش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیبوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھنگے، حبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار، محلاتِ شاہی کے پہرے پر مستعد کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں۔ ابھی بجروں کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحلِ دریا پر بنی جنی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پاس کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبز رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، انگریزوں کی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں ٹپکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی۔ طعام خانوں کی رونق دوبالا ہوئی۔ بھٹیارنیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لیے نکلے۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹٹیوں کے نیچے چوسر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پاندان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھائی گئیں۔ سہ پہر کی نوبت بجی۔ دن ڈھلنا شروع ہوا۔ دلفریب باغات میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھاڑتے پھرے اور ہرن کلیلیں بھرا کیے۔ چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں اُمنڈ آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آرا ہوئی۔ سارے شہر کو رنگا رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو۔ گندھیوں کی دکانوں کی مہک۔ قنوج کے بیلے اور جونپور کے گلابوں کی خوشبو۔ مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ۔ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو۔ پھر گلی کوچوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے۔ لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آگئے۔ انہوں نے باغوں کا رُخ کیا۔ گلی کوچوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجڑنیں، تیز و طرار تمبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھیلتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور طنبورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنارے بیٹھے ہوئے جوگی ترئی بجاتے تھے۔ نئی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا بھائی میکے سے ڈولی کب بھیجے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ بچیاں پکوان بنا رہی تھیں۔ ہر شخص مسرور تھا۔

لوگو! خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے۔ جانے کتنے دن کا چین تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں ہنس بول لو۔ غنیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل بیٹھے ہیں۔ کل کیا جانے کیا ہو۔ کوئی دم کا را سانس کا باجیت ہے دن رین۔ باقی صرف خدا رہے گا جو کہیں بہت دور بیٹھا اس لیلا کا تماشا کرتا ہے۔ وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا اور بالا نا تھ کے جوگیوں کا۔ اور وہ کسی سمے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے: بس۔ اب ختم کیا جائے۔

اے حقیر اور بے بس اور مضحکہ خیز انسانو! تم سب ایک مکڑی کے غیر مرئی جال میں گرفتار ہو چکے ہو۔ مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو کیونکہ تمہارا جال غیر مرئی ہے۔

کب تک تمہاری یہ مسرت رہے گی۔ بے چارے لوگو! مسرت بڑی عظیم چیز ہے۔ دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جو ان سڑکوں پر چل رہے ہیں، گا رہے ہیں، خوش ہیں، انھوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ با وقار، بانفاست، با وضع، پُرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جو ان باغوں میں جمع ہیں بڑے اہم لوگ ہیں کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے فرانس کی مانند انھوں نے جینے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام یہ صورتیں بڑی اہم ہیں جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ شجاع الدولہ۔ بہو بیگم۔ بینی بہادر۔ ٹکیٹ رائے۔

اور اودھ کے یہ مرنجاں مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔ رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں بھی یہ لوگ زندہ تھے۔ یہ کسان اور جوگی۔ دریا کے کنارے وہ نانگا گوسائیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔ یہ پرامن کسان اپنا ملک بچانے کے لیے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مرہٹوں سے ٹکر لیتے تھے۔ یہ مرنجاں مرنج بلوا ہے اور گوالے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے۔ امن نہیں تھا۔ سندھیا کی فوج نے گنگا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔ الہ آباد میں کلائیو ڈریسنگ ٹیبل پر شاہ عالم کا تخت بنا چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہد نامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے۔ مگر حسبِ معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو ملک سے نکال نہ سکا۔ شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا پگڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں۔ داستان صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فنِ داستان گوئی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ان کا قصہ مضحکہ خیز ہے!

لکھنؤ پریوں کے شہر کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ مانوس گلیاں، سڑکیں، محلے، گنج، کٹرے، باغ، ناکے، بارونق، آباد، بھرے پرے۔ یہ قلعہ مچھی بھون ہے۔ یہ معالی خان کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جاں نثار راجہ جھاؤ لال کا ٹیل ہے۔

ذرا ٹھہرو۔ آصف الدولہ — یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے۔ وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دکاندار صبح کو اپنی دکانیں کھولتے ہیں؟ 'جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ'، جو کہتا تھا" جہاں میں جہاں تک جگہ پائیے، عمارت بناتے چلے جائیے۔" جس نے قحط سالی کے زمانے میں پرجا کو روزی مہیا کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفا کو مٹی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دیالو، سخی داتا، کمان آصف جس نے باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور ہاتھی دانت کے بنگلے بنواڈالے جو غریبوں اور اہلِ کمال کی پرورش اور قدر کے لیے نت نئی تجویزیں دماغ سے اتارتا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا سخی بیٹا آصف — اس کے فرانسیسی جنرل کلاڈ مارٹن کے قلعے کونسٹینشیا کے باغ میں پہاڑ کے سائے

پھول کھلے ہیں۔ فرح بخش کوٹھی کے نیچے سے ندی سبک خرامی سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے دریچوں کے نیچے سے کشتیاں گزر رہی ہیں۔ برسات میں کوٹھی کی نچلی منزلیں تہ آب ہو جاتی ہیں تو جنرل اوپر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں جھاڑ فانوس سجے ہیں۔ پیانو رکھے ہیں۔ ولایتی فرنیچر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر اودھیا اور بنارس کی قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں فضاؤں میں بہاگ اور پیلو اور سوہنی گھل جاتی ہے۔ بیگمات کے محلوں کی چار دیواری میں لے دار اور گلے باز ڈومنیاں سال بھر جشنِ موسیقی مناتی رہتی ہیں۔ چوک کے کمرے اور مضافات کے باغ اور بارہ دریاں باکمال ڈیرے دار طوائفوں کی تانوں سے گونجتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کہار اور مزدور منڈیروں پر بیٹھ کر برہا گاتے ہیں۔ برج کے رہس دھاری راس لیلا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رقاص ایک گھنگرو بجا کر ناچ رہے ہیں اور آس پاس سارے میں موت کا گھنگرو بج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناٹک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں۔ ہندو مسلمانوں۔ کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں۔ ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ، غریب امیر عورت مرد، جو ٹھاکر امام بخش اور لالہ حسین بخش، مرزا مینڈھو اور نواب کن کہلاتے ہیں اور امامن مہری اور مرزا جنگلی اور سکھ بچن لونڈی اور نواب بسنتی بیگم، یہ سب روتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے، بجاتے ہیں، لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوہ ہے۔ آن پر جان دینا۔ شرافت، احسان مندی، وفاداری، نیکی۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی جتنی اچھائیاں اور جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں۔ بتاشے اور کوڑی پر ناچنے والے رقاص، کشمیری بھانڈ، جل ترنگیے، بین کار، باجپئی برہمن، طبلچی، شاعر، مرثیہ گو، داستان گو، کایستھ، فوجی، بانکے، پھینڈ باز، بھگت باز، نقال، بہروپیے، عالم، فاضل، کلاونت۔ یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل رومانی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بنگلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر اودھیا جسے شجاع الدولہ نے دلی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جہاں گلاب باڑی ہے اور گھاگرا کے گھاٹ اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز چھوٹے مغل بھاگ کے بھاگے

پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنارس میں پناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دولاکھ سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ یہ امیر تیمور صاحبقران کی اولاد ہے

اور ایرانی شیعوں کی اولاد اس سمے اودھ پوری میں ڈگ وجے راجندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اس نے اپنی اس زبردست وراثت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لیے ان کی قومی ریاست کے مترادف ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا کیونکہ گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب دونوں جاگیردارانہ اقتدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کی پرجا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں پٹتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو پرجا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں لوٹے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں۔ کیسا الٹا زمانہ ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں برس پہلے شراوستی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔

ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھ مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سرخ نیزے اور جھنڈے اٹھائے ڈفلی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالناتھ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرے کے قریب کا اگن کنڈ بالارکھ کی دھونی کہلاتا ہے۔ درگاہ کی نذر مجاور اور پوجا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں۔ پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدنی کی تقسیم کے متعلق معاہدہ ہے۔ سر ولیم سلیمن کے دوست بشپ ہیبر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت نامے قلمبند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے

لیے جلد از جلد مزید انجیلیں اور مزید بندوقیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لیے بندوقوں سے لدے ہوئے جہاز کلکتے کی اور آ رہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمن کے وزیر اعظم ہیں۔ میتا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے جس نے عہدِ سعادت علی خاں کے دھومی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو محرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔ بانکے مفسدوں کی سرزنش کے لیے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھالتے چلے جائیے کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں۔ ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ وضعداری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابو المظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا دار السلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھار کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غربا دولت مند ہو گئے تھے۔ ان کے حرم سرا میں فرنگی کرنل ایلش کی بیٹی مبارک محل براجتی ہے۔ ان کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا ٹھہرنا۔ کون قاسم علی خاں ـــ بنگالے کا آخری خود مختار نواب۔ وہ سید زادہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلا وطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

یہ شاہ زمن کا دار السلطنت ہے۔ شاہ زمن نے گومتی کے کنارے امام باڑہ نجف اشرف تعمیر کرایا ہے۔ محرم میں اس میں چراغاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے طلسم ہوشربا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ صدائیں لگا رہے ہیں۔ دکانوں میں دنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔ سعادت علی خاں کے عہد کی بنی ہوئی عمارتوں میں قہقہے گونج رہے ہیں۔ ان خوبصورت عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ اتنی خوبصورتی اور نفاست پائدار ہو سکتی ہے!

حسن پائدار نہیں ہوتا۔ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مرتبہ کاشی کے ہرنوں کے باغ میں کہا تھا۔ ہر شے فنا ہے۔ فنا سے بچو۔ دکھ سے بچو۔ سائے سے بچو۔ اور ویدانت میں لکھا ہے کہ مایا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سراب کے پانیوں میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پہن کر ہرن کے سینگوں سے بنی کمان ہاتھ میں لیے باہر نکلے۔ مت بھولو کہ رام چندر کے ایودھیا

اور پرسن جیت کے شراوستی اور چندر گپت کے پاٹلی پتر اور کالی داس کے اجین اور حسین شرقی کے جونپور اور علاء الدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سڑک پر سے ایک سکھپال گزر رہی ہے جس کے گنبد پر سنہری کلس سجا ہے اور شوخ وشنگ مہری جس کا چھٹکا پکڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ کہاروں کی وردیاں سُرخ رنگ کی ہیں اور ان کی سُرخ پگڑیوں پر مخمل کے طلائی نشان بنے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والی لاٹھیاں ہیں۔ راہگیروں کی نظریں اس سکھپال پر جمی ہیں۔ یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھپال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اور حسن اور موت ——

باغوں میں میلے ہو رہے ہیں۔ مرغوں اور بٹیروں اور مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ کے ساتھ بریکفاسٹ کھاتا جاتا ہے اور سامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ دربار میں یکتائے روزگار رقاص پرکاش جی کتھک ناچ رہا ہے۔ شوالوں میں بھوانی کی پوجا ہو رہی ہے۔ آم کے کنجوں میں ملہار اُڑ رہا ہے۔ شمشان گھاٹ پر وہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پھونکے جا رہے ہیں۔ نخاس میں داستان طرازوں نے اپنی محفلیں آراستہ کر رکھی ہیں۔ علماء اور حکماء کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔ بھنگڑ بیٹے سبزی گھوٹنے میں محو ہیں۔ سرسنگھار اور رنجیرے اور پکھاوج کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ قبرستانوں میں قبریں کھودی جا رہی ہیں۔

فنا — فنا — ہر شے فنا ہے۔

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی۔ ہر پہر میں آٹھ گھڑیاں ہیں۔ ہر آٹھویں گھڑی پر گجر بجتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔

وقت موت ہے۔

(۳۱)

عہدِ آصفی کے بنے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی۔ اس وقت اس کی شکرم شہر کے ناکے میں داخل ہو رہی تھی۔ ناکے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانۂ راہداری دکھلایا۔ بادشاہ اودھ کے سپاہی نے پوچھا: "قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔" اس نے بتایا: "کلکتے سے الٰہ آباد کے بینی گھاٹ تک جہاز پر آیا تھا۔ وہاں سے اسٹیج کوچ اور شکرم پر بیٹھا بارش سے بھیگتا چلا آتا ہوں۔"

"کہاں کا قصد ہے قبلہ؟"

"ریذیڈنسی۔"

سپاہی نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا: "فرنگی سرکار سے جناب کا سلسلہ ہے؟"

"ہاں۔" اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

"ہاں میاں،" رام دین دوسرے سپاہی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا، "خدا کسی نہ کسی وسیلے سے رازق ہوتا ہے، فرنگی کی سرکار ہی سہی۔"

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموقع شعر سنایا اور گوتم نیلمبر کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلمبر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی ٹکسالی اردو اس کے پلّے نہ پڑی۔ یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیٹو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ شکرم آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند اہیر بھوبھل میں بھوری لگا رہے تھے۔ کہار جامن کے نیچے بیٹھے ستو گھول رہے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آم لدے چلے جاتے تھے۔ ایک پیپل کے نیچے کنڈا سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے بھوانی کا مٹھ تھا۔ نیلمبر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی کالی ماں کو پردیس میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔

ریذیڈنسی نواب سعادت علی خاں مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب کمال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔

اس کی آمد کی اطلاع اودھ سرکار کے سررشتہ اخبار کو بھجوادی گئی۔ دوسرا ہرکارہ گولہ گنج میں نواب کمال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالمنصور کمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوبیس سالہ نواب کمّن کا وہ نام تھا جو محض شاہی اور ریذیڈنسی کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریذیڈنٹ کے ساتھ بیٹھے چوسر کھیلتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی۔ کافی بڑا تعلقہ کلیان پور میں تھا۔۔۔۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میر انیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائفیں ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ اب تک متعدد خانہ زاد لونڈیوں سے متمتع کر چکے تھے۔ ان دنوں چمپا جان پر لٹو ہو رہے تھے۔ مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریذیڈنٹ صاحب بھی اس کے رقیب بننے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ چوسر کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ ایک بنگالی بابو کلکتہ گورنمنٹ کے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ بیلی گارد میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلترنگ بج رہی تھی۔ ابھی چمپا آنے والی تھی۔ ریذیڈنٹ کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ایمہرسٹ کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بٹھا دی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی پیغامبر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چمپا کے ناچ میں پڑا تھا مگر برطانوی حکومت کی وفاداری اور فرض کے عظیم تصورات نے چمپا کے خوش آئند ہیولے کو دھندلا دیا۔ ریذیڈنٹ صاحب فوراً بیلی گارد لوٹ گئے۔

"یہاں چمپا بائی کہاں رہتی ہیں؟" دوسرے روز گوتم نیلمبر نے ریذیڈنسی کے ایک منشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زیرِ لب مسکرایا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہلِ دل معلوم پڑتے ہیں۔ بھئی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

"کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جائیے گا؟"

"ہاں۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور با عزت۔ جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ منشی ہری شنکر نے ہرکارے کے ذریعے چمپا کو اطلاع بھجوائی

کہ سرل صاحب کے منشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا: زہے نصیب، ضرور آویں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوا میں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چھڑکاؤ کیا گیا، چوک روشنیوں سے بقعۂ نور بن گیا تب گوتم نیلمبر دت کا ہوادار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مکان کے سامنے جاکر رکا جس کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے تھے اور پھاٹک پر وردی پوش چوبدار کھڑے تھے۔ گوتم جھجکتا ہوا ہوادار پر سے اترا اور دوشالہ کندھوں سے لپیٹتا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماؤ تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کھنچی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آویزاں تھے۔ طاقچوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنچی، جو چوک کے رُخ کھلتی تھی، اس پر گلاب کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برابر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گملے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنچی میں کسی نے مال گنج چھیڑ رکھا تھا۔ چاروں طرف قدِ آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم نیلمبر کو عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کدھر کو جائیں گے؟ یہاں اس معطر کمرے میں کب تک ان کا جماؤ رہے گا؟ یہ لوگ جو شربتی کے چُنے ہوئے انگرکھے اور گلبدن اور مشروع کے کلیوں دار پاجامے اور دوپلی اور بنکے دار ٹوپیاں اور مندیلیں پہنے شالی رومال اوڑھے اطمینان سے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے ان کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں۔ ان میں جوان اور ادھیڑ اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ متین۔ ثقہ۔ سنجیدہ۔ مہذب۔ نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رک رک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو کمار وفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی۔ دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی نکتے پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے

———— نیلمبر دت لمحے بھر کے لیے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا بہترین چوغہ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی مگر اس کی شکل وصورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پردیسی ہے۔ حاضرین محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمن نے، جو صدر نشین تھے، اسے اپنے قریب بلا کر مسند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

"ہمارا بھی کلکتے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاذاللہ بہت جوکھم کا سفر ہے۔" انھوں نے کہا۔ وہ گنگا جمنی گڑگڑی پیتے جاتے تھے اور ان کے خوبصورت چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ مچولی

کھیل رہی تھی۔" بنگال کے زمینداروں کا کیا کہنا۔ بڑے بڑے رفیع الشان رؤسا اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے ۔؟" نواب کمّن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا:

"میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے۔ ملازمت کرتا ہوں۔"

"ملازمت ؟"

اب نیلمبر کو پھر وہی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے نا کے پر سامنا کرنا پڑا تھا۔" میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں۔"

"خوب۔" نواب کمال رضا نے پہلو بدلا۔" تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے ہوں گے۔" کسی اور نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ تھوڑی سی شُد بد ہے۔"

"اچھا بھلا کتنی۔ خط پڑھ لیتے ہیں؟"

نیلمبر دت مسکرایا۔" جی ہاں۔" اب ذرا اس نے آرام کا سانس لیا۔ یہ بڑے نیک طینت اور بھولے لوگ تھے۔ ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ گو یہ عجیب بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا۔

نواب کمّن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنھوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو یورپین رنگ دے دیا تھا۔ گوتم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا۔

اتنی دیر میں ساز ملائے گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نک سک سے درست، چمپئی رنگت، سیاہ بھونرا بال اور سیاہ آنکھیں، ناک میں ہیرے کی لونگ پہنے، اودے گرنٹ کے فرشی پائجامے میں ملبوس گوندنی کی طرح زیوروں سے لدی بڑے ٹھسے سے چلتی ہوئی آکر وسط میں بیٹھ گئی اور بڑے دلفریب انداز میں اس نے جُھک کر نیلمبر دت کو تسلیم کی۔ پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع کی:

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تماشا خدائی۔۔۔۔۔۔

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے۔ گوتم نیلمبر اس کی شکل دیکھنے میں محو تھا۔

کلکتے کا انگریزی داں برہمن کلرک لکھنؤ کے جادو میں گرفتار ہو گیا۔ دن گزرتے گئے۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ بھادوں کا مہینہ آیا۔ اماوس کی راتیں جب چمپا اپنی صحنچی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔ جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لیے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں نے کرشن لیلا کے سوانگ تیار کیے۔ چمپا رادھا بنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہز میجسٹی شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آواز کے شعبدے دکھاتی تھی۔ اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بجرے میں تیرتے دیکھا۔ ہر طرف چمپا تھی۔

وہ شیلا کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے یہاں سے لوٹا آدھی رات کا گجر بج چکا تھا۔ نیچے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کورنش بجالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ چلتے چلتے رک کر اس نے نیلمبر سے کہا تھا: "آپ ہی بنگالے سے آئے ہیں نا۔ پھر بھی آتے رہیے گا۔ ہم غریبوں کو بھول نہ جائیے گا۔" اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالا خانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب کمن اور دوسرے معززین اپنے اپنے ہوا داروں، تام جھانوں، پالکیوں اور بوچوں پر سوار ہو کر اپنی نخلسراؤں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر

اس سمے گوتم نیلمبر حسب معمول جاگتا تھا۔ وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گزارتا تھا۔ راج شاہی میں، جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا، وہ اپنی کوٹھڑی میں دیا جلا کر رات رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ لیمپ کی روشنی میں سنسکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعد الطبیعیات۔ یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتری ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سوچ میں کھو جاتا۔ کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم ہندو لوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا۔ آج پہلی مرتبہ رات کو

ورڈز ورتھ اور شیلے اور کالی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصور نے اپنا تسلط جما لیا۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور کلکتے کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ ابھی تو اسے بی۔ اے۔ کرنا تھا۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جا سکے۔

لکھنؤ کی اس ویشیا سے اس سے مطلب؟ وہ سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کے کناروں نے اسے آواز دی: فینس ادھر ہے خداوند۔ وہ مڑا اور فینس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادوں کے جھالے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ ریذیڈنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا۔ کبھی کاغذات لے کر آغا میر وزیر اعظم کے مکان پر جاتا، کئی بار وہ شاہی محل بھی گیا اور ہز میجسٹی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوتم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کرسی پر بیٹھے تھے اور ریذیڈنٹ جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گزر جاتا۔ رات قیامت بن کر آتی۔

رات — جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوتم نیلمبر دت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی زندگی اور دنیا میں ویشیا کا خیال ہی کراہت انگیز تھا۔ پھر وہ سوچتا: عورت جو دیبی ہے۔ لکشمی۔ گوری۔ اوما۔ جو ماں ہے اور بہن اور بی بی اور بیٹی۔ اسے طوائف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ پھر اسے خیال آیا: کہا جاتا ہے عورت تو محض دکھ سہنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ساری عمر مرد کی ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ پتی ورتا عورتیں۔ بال ودھوائیں۔ یتیم لڑکیاں جن کو ور نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جو ستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دوسروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔

نا استری سوتنترم۔ منو مہاراج نے لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے۔ بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی پچھلی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت، شادی کے موقعے پر اور عبادت کے سمے عورت باہر آ جائے تو قابلِ اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار

پھیل سکتا ہے۔

سُنتے ہیں کہ کسی زمانے میں دیس کی عورتیں باکمال ہوتی تھیں۔ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا۔ اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی میناستی کی جوروپ کتھائیں بچپن میں سنی تھیں ان سب میں بھی پرانے وقتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے۔ لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی۔ یہ عقل میں نہیں آتا۔ نا استری سوتنترم۔

شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آکر بیٹھ جائے۔ تب اس کو عزت بھی ملتی ہے دولت بھی۔ پھر اس کے لیے شعر و شاعری کرنا بھی جائز ہے لکھنا پڑھنا بھی۔ ورنہ علٰحدہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بائی اسی نظام کی پروردہ تھی۔ اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود اس نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جاگیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

منشی ہری شنکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں ندی پار کر کے مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے رمنا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی۔ ایک سنہرا بجرا آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

"رہائی ہے کمپنی بہادر کی!" اس کی کانوں میں ایک نقرئی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بجرے میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہلِ لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں۔ مگر وہ بالکل ہڑبڑا گیا۔ سامنے سے آغا میر کا بجرا آ رہا تھا۔ چند اور مرصّع اور منقش کشتیوں میں امراء و وزراء، "صاحبان عالیشان" یعنی انگریز اور شہر کی نامی طوائفیں رمنا جا رہی تھیں۔ دریا پر مچھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بجروں کا میلہ سا لگا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آگئی۔

"ہماری کشتی میں آ جائیے۔" اس نے کہا۔

"تاکہ آپ ان کو بھی لے ڈوبیے۔" ہری شنکر نے جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں میں ضلع جگت شروع ہو گیا۔ ہنستے بولتے یہ سب گھاٹ پر پہنچے۔ بارہ دری کی طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمبر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے تخیلا دیبی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے

ضمیر کو ہلکا کرے۔ جس وقت چمپا پائنچے اٹھاکر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی گوتم نیلمبر نے اس سے پوچھا:
"تم سرل صاحب کو جانتی ہو؟"

وہ چپ رہی۔

"چمپا بائی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔"

"اچھا جانتے ہیں۔ پھر تم سے کیا؟"

"ان کی بی بی ہے۔ کلکتے میں۔" اسے توقع تھی کہ یہ سن کر چمپا کا رنگ فق ہو جائے گا، عرقِ ندامت اس کی پیشانی پر چمکنے لگے گا مگر وہ اطمینان سے بولی: "اچھا تو پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی بیبیاں ہوتی ہیں۔"

"ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔" نیلمبر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

"سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ تم اپنا مقصد بیان کرو۔"

"تم سرل صاحب سے قطع تعلق کر لو۔ یعنی اب کے سے جب سرل صاحب یہاں آئیں تو ان سے نہ ملنا۔ وہ ریذیڈنٹ بن کر یہاں آنے والے ہیں اگلے مہینے۔"

چمپا ٹھٹھک گئی اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ "آپ عجب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہیے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!"

نیلمبر کو چکر سا آگیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی۔ اس کا جی چاہا وہیں سے الٹے پاؤں واپس چلا جائے مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ سلامت اور اہلِ دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جا کر ایک طرف کو چپکا کھڑا ہو گیا۔

واپسی میں اسے نواب کمن اور ریذیڈنٹ کے ساتھ ساتھ گھاٹ تک آنا پڑا۔ بجرے میں چمپا کا سامنا ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا۔ وہ اسے بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "سنو جی" اس نے دفعتاً کہا۔ "ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے۔ مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ — تم ہمیں بہت زیادہ بھا گئے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سرخ ہو گئی۔ "تم نے سنا۔ ہم — چمپا جس پر ایک عالم جان دیتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں — مغرور آدمی۔"

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملاتے

لگیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ بجرا اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا۔ بدبخت مغرور آدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ نازاں نہ ہونا۔ یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا۔" کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں۔ وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہنس پڑی "ہونق آدمی۔" اس نے پیار سے کہا۔ "بات کرنے کی تم کو تمیز نہیں اور تم پریم عاشق ہوئے ہیں۔ یہ قدرت کا تماشہ دیکھو!" نیلمبر چپ چاپ بجرے پر سے اترا۔ چمپا نے اپنی سکھپال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں آ وگے نا؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا کہہ کر پکاروں؟ پنڈت جی مہاراج۔ ورنہ پانڈے جی پچھتائیں گے۔ دال چنے کی کھائیں گے۔"

—— —— نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی اور ہری شنکر کی پالکی اور کہاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

"ہم سے ملوگے نا؟"

"نہیں۔" نیلمبر نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پالکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا۔ اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے متعدد پیغام آئے۔ اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا ناٹک کھیلا تھا۔ مگر عورت کے چرتر آج تک کون سمجھ پایا ہے۔ یہ لڑکی، بڑے بڑے دھنوان اور سورما جس کے ناز اٹھاتے تھے، اسے میری کون سی ادا بھا گئی۔ منشی ہری شنکر نے فائلوں پر سے سر اٹھا کر اس سے کہا: "بھائی نیلمبر۔ ہمارے کاشی کے کبیر داس کہہ گئے ہیں ؎

چھوٹی موٹی کامنی سب ہیں بِس کی بیل
بیری مارے داؤں سے یہ ماریں ہنس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

"بھگوان نے ناری مہاراجی بہلانے کے لیے تو بنائی ہے۔" ہری شنکر نے پھر کہا۔ نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ناری تو بڑی مقدس چیز ہے۔ اسے تم دل کا بہلاوا سمجھتے ہو۔" اس نے کہا۔

"ارے میاں"، ہری شنکر نے حقے کا کش لگا کر ہنس کے جواب دیا "ہم نے اس کوچے میں بڑے بڑے جٹا دھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

نیلمبر اٹھ کر باہر آ گیا اور ریذیڈنسی کے باغ میں بلا مقصد ٹہلنے لگا۔ مالی مولسری کی چھاؤں میں چلم پیتے تھے اور شاگرد پیشے میں کہاروں کی محفل میں کھسر پھسر چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے برآمدے میں منڈیاؤں چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں وحشت ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اتنے میں اسے ٹیلے کی ڈھلان پر زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھے جمنا مہری اوپر چڑھتی نظر آئی۔ جمنا مہری جو چمپا کی پیغامبر تھی۔ وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لیے تیار ہوا۔

جب وہ تانگے کی طرف جا رہا تھا۔ یکایک اس نے گاڑی بان سے پوچھا: "یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔"

"نخاس ــ خداوند۔"

"ادھر گاڑی موڑ لو۔"

"بہت خوب ــ خداوند۔"

شکرم چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا منجی میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"تم آ گئے۔"

"نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"دو گھڑی رک جاؤ۔ دودھ کھاؤ گے۔ شربت منگواؤں؟" اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا۔ "برہمن کی دکان سے جل پان منگوا دوں؟"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"میں ــ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ۔"

وہ دروازے میں ٹھٹھکا رہا۔

"ہمارے شہر کا دستور ہے دعا دیتے وقت کہتے ہیں: سوا غم حسینؑ کے خدا کوئی غم نہ دے۔ یہ دعا بھی تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؑ کا غم بھی نہیں جانتے۔ تم تو جانتے ہی نہیں غم کہتے کسے ہیں۔"

"شنو۔ چمپا۔" نیلمبر نے دھیرے سے کہا۔ "تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے۔ بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی۔ کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمھارا کیا ساتھ ہے۔"

"ہاں میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا۔ تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔"

"سنو۔" اس نے چمپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی۔ "تم کو میں اس لیے پسند ہوں کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمھارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔"

"کیا تمھارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔" اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آ گئی۔ "ہوتی کیوں نہیں مگر تمھاری جیسی نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"اللہ کس قدر طنطنہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے راجہ جھاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔" چمپا نے ہنسنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف بخشانے چڑھائے گئے۔ فانوس جگمگائے۔ قندیلیں جلیں۔ نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ تختِ رواں پر ناچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مراتب کی قطار میں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کودتے چل رہے تھے۔ دوسرے تختِ رواں پر سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی بج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالا خانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی۔ اس روشنی میں چمپا کا کامدانی کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈومنیاں سوہا گاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آ کر بارات دیکھنے لگی۔ "جانے کس سہاگن کی بارات ہے۔" اس نے کہا۔ نیلمبر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اس کی مانگ میں سیندور ہوگا۔ پیروں میں مہندی۔ ناک میں سہاگ کی نتھ۔" اس نے آہستہ سے اپنی مانگ کو چھوا جس میں افشاں چنی تھی لیکن جو سیندور سے عاری تھی۔ اب یہ پھر ناٹک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

"آدمی اس قدر کا کٹھور ہوتا ہے۔" چمپا نے کہا۔

"ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ الزام رکھتے آئے ہیں۔ یہ تکرار بھی فضول ہے۔"

"تم ابھی جا رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"صبح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دور نکل چکے ہو گے۔"

"ہاں۔"

"یہ دوہا سنا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے۔"

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لیے ایک سمت کو رواں تھا۔ گلیوں میں سنڈے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلماقنیاں، حبشنیں، ہجڑے، نگنیاں، چوتے والیاں، قصباتی پاتریں چھن چھن کرتی ٹولیاں بنائے باغ کی طرف جا رہی تھیں۔ بانکے اپنی تلواریں چمکا رہے تھے۔ مدکیسا چیڑ سے، ابعنگر ٹہیے چنڈو خانوں میں جمع تھے۔ ہر طرف غل مچا تھا۔ دنیا کس قدر رنگا رنگ جگہ تھی۔ اسی دنیا کو بھر تری ہری نے رنگ ہجوم کہا تھا۔

اس رنگ ہجوم پر ایک بے معنی ناٹک یہ بھی کھیلا جا رہا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی شکرم نیچے منتظر کھڑی تھی۔

بھاگو میاں۔ بھاگو میاں سے جلدی۔ کلکتے کا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ کلکتے چلو۔ تمھارا ٹھکانہ وہیں ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمھارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا بقچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اترا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا اور سیدھا شکرم میں پہنچ کر دم لیا۔

گاڑی کے پہیوں نے سڑک کے پختہ فرش پر شور مچانا شروع کیا۔ بارات کا ہنگامہ ابھی باقی تھا۔

بھیڑ میں سے نکلتی شکرم آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی۔ تو عمر کو جبان 'ہٹیے گا مہربان' ، 'ذرا بچ کے قبلہ' کی ہانک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا۔ اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف اونچی گوتھک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنول جلتے تھے۔ سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں۔

یہ راستہ نسبتاً سنسان تھا۔ وہ تک کے پر پہنچ گئے۔ جامن کے نیچے چند بیراگی بیٹھے تھے جنھوں نے پراسرار آنکھوں سے نیلمبر کو دیکھا۔ ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمبر نے پہلے روز تاکا تھا۔ اسے بھوانی کے مٹھ کے سامنے عود سلگ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے مورتی کو غور سے دیکھا۔ ماتا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا۔ اب وہ شکرگزار ہوا کہ ماتا نے اسے اپنے جوگ

مایا کے روپ کے بھی درشن کرا دیے۔ ماں، میں نے تمھاری یہ لیلا بھی دیکھ لی۔ اب واپس جاتا ہوں۔ اپنی شکتی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ایک جوگی، جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی، اس سے گویا ہوا: "بڑی جلدی واپس جاتے ہو۔"

"سراب کے ساحل پر تا خیر کرنا عقلمندی نہیں۔ یہ تمھارا شہر سراب کا شہر ہے۔"

نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دور مچھی بھون میں چوتھے پہر کا گجر بجا۔

بیراگی نے اسے دھیان سے دیکھا، "سراب کی حقیقت اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آجاتی بچہ۔"

"بابا" نیلمبر نے رک کر کہا، "جوگ مایا نے اپنے دسوں ہاتھوں سے مجھے اپنی اور کھینچنا چاہا۔ لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں۔"

"ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے۔ ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر سمے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا۔" پھر اس نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

"دیکھو، اس میں کتنی خوشبو ہے۔ اس مٹی کو لے جاؤ۔ کٹک میں جوگ مایا کا مندر ہے۔ اس میں چڑھا دینا۔"

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس و پیش کیا۔ یہ گورکھ ناتھ کا جوگی پھر اپنے گورکھ دھندے دکھا رہا تھا۔

"لے لو — یہ لکھنؤ کی مٹی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا جادو یہ ہے کہ چھٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔"

جوگی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

"بابا — تم بیراگی کیوں بن گئے؟" نیلمبر نے پوچھا۔

"تم — تم مجھے جانتے ہو —؟" جوگی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں — میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔"

"ہاں، جاننا بہت مشکل ہے، اور جاننے والے کو کون جانے گا۔" جوگی نے کہا اور آنکھیں

۱۔ جوگ مایا: درگا کا ایک روپ۔ Goddess of illusion

بند کر لیں۔

نیلمبر نے اپنشد میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ بیراگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبۂ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔

"بابا۔ میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو؟"

"کیوں۔ کیا تمہارا بھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔"

"ارے۔ نہیں تو۔"

"کیوں جی۔ فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو۔؟"

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جوگی کے لہجے میں انتہا حقارت تھی۔

"میں۔ میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا" اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" جوگی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل سچ۔"

"اچھا تو سنو۔ میں راجہ بینی بہادر کا بیٹا ہوں۔ راجہ بینی بہادر کا نام سنا ہے؟۔ وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جنابِ عالی (نواب اودھ) اور عالیجاہ (نوابِ بنگال) کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبانِ عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر باپ اور بنارس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر۔ گوسائیں ہمت بہادر کے ناگے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے۔ دنا دن سمرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی باڑھ اور تلنگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا۔ ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو۔ جنابِ عالی نے للکار للکار کر سراسیمگی سے کہا۔ تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو۔ مگر ہماری فوج۔ درگاوتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے۔ ہندوستان پر قیامت گزر گئی۔" وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے رکا۔ جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر یہ سرخی اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "تمہاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ اس قوم میں سے اتفاق جاتا رہا۔ عالیجاہ اور جنابِ عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شقے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دلّی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے خط کتابت کرنے پر

آمادہ ہیں۔ یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میرا باپ جنابِ عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا۔ دشمنوں کے بہکائے میں آ کر جنابِ عالی نے اس کو نمک حرام تصور فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔"

"ارے ۔" نیلمبر کے مُنہ سے نکلا۔

"جنابِ عالی نے منڈیادن چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا: "راجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔" انھوں نے عرض کی۔" غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔" فرمایا: "آج کا شکار بہت عجیب و غریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔" وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے۔ بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دامِ گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دونوں آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقہ ضبطِ سرکار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں، اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے۔ میں صرف اس مرگ چھالا کا مالک ہوں۔"

جوگی خاموش ہو گیا۔

نیلمبر مبہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جوگی نے آگ میں ایک لکڑا اور ڈال دیا اور اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگا: "سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے۔ تم اس کی حقیقت کو کیا جانو! تم اسی چکر میں شامل ہو اور رہو گے۔ مجھے سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی، بادشاہ کے عتاب، کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر سکتا ہے، سوائے میرے خود کے۔ جاؤ۔ اب تم کو دیر ہوتی ہے۔ کٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح کی بھول بھلیاں اور غلام گردشیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سکتا۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو۔ مگر تم غلطی پر ہو۔ جاؤ۔"

نیلمبر اٹھا۔ جُھک کر اس نے جوگی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکرم میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سیتا پور جانے والی سڑک کی طرف موڑ لیں۔

مغاپل کے نزدیک شکرم رُک گئی۔ گاڑی بان نیچے اترا۔ سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اُتر کر ایک راہ گیر کو کوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دیتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاون چھاؤنی تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی اسپتال۔

گورا راہگیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"سالے۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں ہم ہی پر غراتے ہیں۔" گاڑی بان نے، جس کا نام گنگادین تھا، غصے سے کہا۔ "شاہ جمن کے وقت میں یہ اندھیر؟" وہ بڑبڑاتا رہا۔ گوتم نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ ٹکیٹ رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ گنگادین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ ریذیڈنسی کے سپاہی اور ہرکاروں کو دیکھ کر، جو نیلمبر کے ساتھ شکرم سے اترے تھے، دھرم شالہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ کلکتے جا رہے ہیں۔ انگریزی جانت ہیں۔ ان سے پوچھو ہمری مال گجاری میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی۔ سنا ہے نئے قانون لندن میں بنے ہیں۔ یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ ان کو بے چارے کو کیا معلوم۔ کیوں نہیں بنگال اور اودھ میں ایکئے قانون لاگو ہوت ہیں۔ اے بابو صاحب۔ مال گجاری میں کمی کروائیے، ہمری تو کمریں ٹوٹ گئیں۔ آنگن کے پختہ فرش پر نیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا۔ یہ سب آس پاس کے دیہات کے کسان تھے جو اپنے اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا پھونس قصباتی زمیندار لاٹھی ٹیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ "کون جات ہو؟" اس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"برہمن۔"

بوڑھے نے نیلمبر کے پیر چھوئے۔ "ٹھاکر میرے گاؤں چلے چلو تو ہمری سیوا کروں۔ میرا مکان ہیاں سے کوس بھر ہے۔"

"مجھے صبح سویرے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمھاری کرنی چاہیے۔ میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔" نیلمبر نے کہا۔ اس کا دل بھر آیا۔ یہ لوگ سب کے سب کتنے معصوم کتنے بھولے تھے اسے دکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا ہے۔

"ٹھاکر۔" بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "اپنی انگریجی سرکار سے کہو ہم پر زیادہ جلم نہ توڑے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"لکھنؤ سے آتے ہو نا۔؟"

"ہاں۔"

"ہواں ہمرے بادشاہ کے درشن کیے؟"

"ہاں۔"

"ہمرے بادشاہ کو کمپنی بہادر نے روپئے کے لیے تنگ کر رکھا ہے۔"

"پتا نہیں۔"

"ٹھاکر — تم کو معلوم ہے۔" اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے بولنا شروع کیا۔ "کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا — تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جنابِ عالی سے —"

اے لیجیے۔ یہ پھر بکسر اور جنابِ عالی کا قصہ شروع ہو گیا۔ بوڑھے نے نیلمبر کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔

"تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہو گی لیکن یہ گھاؤ ہمرے دلوں پر لگے ہیں۔ اور یہ گھاؤ تازہ ہیں۔ ہمرا دیس کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جنابِ عالی سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے۔ اب منڈیاؤں میں عالم دیکھو۔ آصف الدولہ بیکنٹھ باشی نے کلکتے لکھا: 'انگریزی فوج سارے ملک کی آمدنی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجڑ گئے۔ فرنگی افسر خود کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟' مل اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے — ٹھاکر ہم بہت دکھی لوگ ہیں۔ جب مرہٹوں نے حملہ کیا ہمرے سپاہی یا حسینؑ، یا حسینؑ کہہ کر روتے جاتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی۔ مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ نیلمبر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لو دیکھتا رہا۔ دوسرے حلقے میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ملک کی بگڑی بنا دی تھی۔ مگر شاہِ زمن بچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ ان کے بس میں کچھ نہیں"۔ وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لَو ہوا میں جھلملایا کی۔ نیلمبر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا۔ جو گی، جس نے اپنے باپ بینی بہادر کا قصہ اسے سنایا، اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت

نہیں تھی۔ وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفا نہ تھا جس نے اس کے باپ کو اندھا کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا مایا جال ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا۔ اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے۔ ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسنِ انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پُر کر دیا اور یہ سب لوگ، اودھ کے یہ سارے باشندے، جن سے نیلمبر ملا، فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

(۳۲)

کلکتے واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دنیا میں کھو گیا۔ دفتر، کتابیں، انگریزی اور بنگالی اخبار، لیکچر۔ وہ شنیلا سے ملنے دھرم تلہ گیا مگر وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی، اسے سانپ نے کاٹا اور وہ مر گئی۔ سیرل صاحب مستقل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سیتل پاٹی نکالی اور لیمپ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا۔

مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا — اس کے باغ میں لیچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجمع لگتا تھا۔ اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ مذہب کے متعلق اس کے ذہن میں جو الجھنیں تھیں ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاٹ نہ جاتا، گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں؟ کیا رام موہن بابو صحیح راستے پر ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اُس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کر لے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استعفےٰ دے کر وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا۔ اسی کالج میں شہر کے ایک رئیس پرنس دوار کا ناتھ ٹیگور کا لڑکا دیوندر ناتھ بھی پڑھتا تھا۔ وہ دونوں کلاس کے بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ خدا اور روح کی کھوج لگاتے۔ دیوندر ناتھ

میں ساری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو نیلمبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر ان کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی گفتگو سنتے یا موحدانہ بھجن گاتے۔ یا نیلمبر دیویندر ناتھ سے حافظ کی غزلیں سنتا۔

جس سال نیلمبر دت نے بی۔ اے۔ کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا۔ جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سر سِرل ہاورڈ ایشلے کا فالج گر جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی میم صاحبہ، لیڈی ایشلے، جن سے انھوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی مع اپنے دو سالہ لڑکے کے دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سرل کو بہار کے ایک اداس اور اجنبی ڈاک بنگلے میں موت آئی۔ وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹ اتار کر آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ اسی وقت ہر کارے نے اسے اس کی بدمزاج، مغرور اور خاصی بدصورت بیوی کا خط لا کر دیا تھا جس میں اس نے دارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ ننھا سرل اب بہت شیطان ہو گیا ہے۔ آج اس نے ایک قلی کو اپنی ننھی سی چھڑی سے خوب پیٹا۔ خط پڑھنے کے بعد سرل نے اخباروں کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اس نے اپنے چوبدار کو آواز دینا چاہی مگر اس کی زبان میں لکنت آ چکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ختم ہو گیا۔

کلکتے کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے۔ اس کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں ان کا مفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔ اپنی عمر کے چالیس سال اس نے بنگال میں گزارے تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔ کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں۔ اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

لیڈی ایشلے، جو مدراس کے چیف جسٹس کی بہن تھی اور شراب بہت پیتی تھی، اپنے لڑکے سرل کو لے کر سارے سازو سامان کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔ سر سرل مرتے وقت لاکھوں کروڑوں کا آدمی تھا۔ اس کا روپیہ سٹی میں بھی لگا تھا اور کلکتے میں بھی۔ بڑے ہو کر اس کے بیٹے سرل ایڈمن ڈیرک ایشلے نے اپنے باپ کے کمائے ہوئے روپے سے زبردست کاروبار شروع کیا جس کی شاخیں جنوبی امریکہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت برطانیہ اب ساری دنیا پر چھا چکی تھی۔ برما میں ٹین کی کانیں تھیں۔ ملایا میں ربر کے جنگلات۔ چین میں افیم کی تجارت۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا۔ سارا مشرق اب مرحوم لارڈ ڈلہوزی کے بیٹے لارڈ فریڈرک ایڈون ایشلے کا تھا۔

(۳۴)

ایک دن پروفیسر گوتم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اتر کر اپنے مکان کی برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ مٹیا برج والے نواب صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ بڑی دیر آپ کی راہ دیکھا کیے۔ ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ نیلمبر الٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آ کر جلدی سے چاروں اور دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جامدانی کا انگرکھا پہنے جریب ٹیکتا سڑک کے کنارے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جا لیا۔

"اخاہ میاں نیلمبر صاحب" بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ "ہمارا خیال تھا آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔"

"کیوں نواب صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یوں بھی برس گزر جاتے ہیں ملنا نہیں ہو پاتا۔ اب آئیے چل کر دو گھڑی اندر بیٹھیے۔ میری نواسی سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے۔ آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔" نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

"اچھا میاں" نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم کو دیکھ لیا۔ تمہارے بچوں کو دیکھ لوں۔ پھر جانے زندہ لوٹنا نصیب ہو نہ ہو۔"

"کیوں۔ کہاں کا قصد ہے۔ لکھنؤ۔۔؟"

"کربلائے معلےٰ جا رہا ہوں۔ خدا وہیں یہ مٹی عزیز کرے۔ یہاں اب کیا رکھا ہے۔" ان کی آواز بھرّا گئی اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے شہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ ملازم چائے لے کر آیا۔ ڈرائنگ روم ہمعصر وکٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر ان گنت تصویریں تھیں۔ مناظر اور فوٹو گراف۔ موتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔ فرن اور پام کے پودے پیتل کے گملوں میں رکھے تھے۔ برابر کے کمرے میں پیانو بج رہا تھا۔

پیانو کی آواز یکلخت نیلمبر دت کو بڑی اداس معلوم ہوئی۔ انھوں نے آواز دی: "نیلما بیٹی، باجہ بند کرو اور یہاں آؤ۔ دیکھو تمہارے میٹا برج والے چاچا آئے ہیں۔"

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی۔ اس نے جھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

"یہ میری نواسی ہے نواب صاحب۔ اسکول ہی میں رہتی ہے۔"

وہ دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کر کے گود میں بچہ کھلانے کے بجائے اسکول میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجاتی تھی۔

نواب کمن نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ کلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگمگا اٹھی تھیں۔ شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ نیلمبر دت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دونوں کے پاس مشترکہ موضوعِ گفتگو کوئی نہیں تھا سوائے ماضی کے۔ مگر ماضی کی یاد کو نیلمبر دت کہاں تک گھسیٹ سکتے تھے۔ ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمن کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضعداری نبھانے کے لیے دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ جب لکھنؤ اجڑا اور کلکتے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی آباد ہوئی مٹیا برج میں دوسرا لکھنؤ بسایا گیا۔ اس وقت نواب کمن نے، جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آ گئے تھے، نیلمبر دت کو ملاقات کے لیے بلوایا۔ وہ اس سمے کلکتے کا مشہور اخبار نویس بن چکا تھا۔ اس نے اب تک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہمو سماج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلمبر ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا۔ جب راجہ سریندر موہن ٹیگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار کلکتے میں جمع ہونا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلمبر نے نواب کمن کو یاد رکھا اور نئی سنگیت کی محفلوں میں مدعو کرتا رہا۔

اب کمروں میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جس میں مینڈک ٹرّاتے تھے مکان کی بالائی منزل پر نیلمبر جابو کے بیٹے منورنجن دت کے یونیورسٹی کے ساتھی اور آرٹ اسکول کے لڑکے ایک انگریزی ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ کلکتے کے بنگالی تھیٹروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے۔ منورنجن کے دوست مائیکل مدھو سودن نے ایک نیا ڈرامہ لکھا تھا۔ اس کے وہ سب اس کی پریکٹس میں جٹے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ کیمبل میڈیکل اسکول کا ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہارمونیم بجا رہا تھا۔

منورنجن تورو دتا کی نئی انگریزی نظم پڑھ رہا تھا۔ ہارمونیم کے سُر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا۔ دوسرا عہد۔ یہ ۱۸۷۱ء تھا۔ دنیا بوڑھی ہو چکی تھی۔ نواب کمال رضا کی دنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے مگر ان کی دنیا اب جوان ہو رہی تھی۔ یکلخت نواب کمن کو احساس ہوا کہ اس نئی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائنگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مضحکہ خیز نظر آئے۔

"نواب صاحب! منور بخش لکھنؤ کے کیننگ کالج میں قانون کا لیکچرار ہو کر جا رہا ہے" گوتم نیلمبر دت کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ چونک پڑے۔ "اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ ہے" انھوں نے بڑبڑا کر کہا۔ "جائیں، سدھاریں۔ ان کو امام ضامن کی ضامنی میں ـــــ دیا۔" پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر مٹیا برج لوٹ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں ٹہلتے رہے۔ انھوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی۔ مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل۔ قانون کے رسالے۔ کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قرار دادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انھوں نے پا لیا تھا۔

مسائل کا حل انھوں نے پا لیا تھا؟ نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی۔ باہر سڑکوں پر لیمپ مدھم مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ دفعتاً عروس البلاد کلکتہ ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا۔ وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کیلے اور بام کے پتے ساکن کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتا دم ٹانگوں میں سمیٹے سو رہا تھا۔ اگر ان کو آواگون میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتا کسی کی دکھی روح ہے۔ وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ اوپر منور بخش کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپبل میڈیکل اسکول کا لڑکا ابھی تک دریچے میں بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہارمونیم کے پردوں پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ منور بخش کے کمرے سے جو زینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھا کوئی تورولتا کی نئی انگریزی نظم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چاند اب دت ہاؤس کے عین اوپر آ چکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تورولتا کی نظم پر سر دھن رہا تھا:

محبت اور روشنی اور نغمے کو تمھاری تلاش ہے

روشنی قرمزی آسمانوں پر موجود ہے
نغمے لارک گا رہا ہے
محبت میرے دل میں ہے
ایک دوسرے سے جُدا
ہم فطرت کے مقصد کو کھو رہے ہیں
اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لیے ہم کیوں کوشاں ہیں
میری محبت تمھاری روح کے لیے تخلیق کی گئی ہے
تمھارا حُسن میری آنکھوں کے لیے
اب جاگ اُٹھو
میں منتظر ہوں اور روتی ہوں
تم کہاں ہو
اس دھرتی پر ایک بے آسرا،
بیمار، بدصورت اور حقیر
بچّے کی طرح میں پیدا ہوئی
پیدائشی بدقسمت لڑکی —
ہر ایک نے مجھے ٹھکرا دیا ہے
پھر میرے ہونٹوں سے ایک نالہ بلند ہُوا:
خدایا —!!
اور خدا نے جواب دیا:
گائے جا — بے چاری لڑکی — گائے جا۔

نیلمبر دت مبہوت اس نظم کو سنتے رہے۔ انھوں نے آواز پہچانی۔ یہ ان کے بیٹے کی آواز تھی منورنجن — اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی کے فلسفے اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے، جو اگلے ہفتے کیننگ کالج کا پروفیسر ہو کر پردیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔ مبارک ہیں وہ لوگ، انھوں نے اپنے آپ سے کہا، جو محبت کر سکے۔ خواہ اس میں انھیں ناکامی ہی ہوئی ہو۔ پھر انھوں نے چاند کو دیکھا جو تیرتا تیرتا دت ہاؤس کے عین

مقابل میں آچکا تھا۔ اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔ چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں۔ وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابوالمنصور کمال رضا بہادر جب گارڈن ریچ پہنچے، جہاں میٹابرج میں ان کا مکان تھا، تو اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ان کو خیال آیا: کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے۔ انسان مر جاتا ہے۔ پھر کبھی اس دنیا کو نہیں دیکھ پاتا۔ جیسے شاہِ زمن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی۔ ان سب کو مرتے نواب کمّن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ لوگ، جو اودھ پوری کے راجہ تھے، یہ سب موت آئی تو پٹ سے ختم ہو گئے۔ اور بے چارے سلطانِ عالم واجد علی۔ پڑوس کی رادھا منزل میں اندر سبھا منعقد کروا کے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں۔ ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تختِ شاہی ہو یا غریب الوطنی، انتہائی مسرت ہو یا شدید رنج و غم، موت اگر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے۔ جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوتا ہوگا۔ فشارِ قبر اور منکر نکیر اور ——— اور ——— یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمّن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔ انھوں نے تکیے پر سے سر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو آواز دینا چاہی۔ انھوں نے علیؑ اور حسینؑ اور عباس علمدار کو پکارا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ انھوں نے پلنگ سے اٹھنا چاہا مگر پیچھے کو گر گئے۔ کیونکہ کربلائے معلّیٰ کا سفر کرنے کے بجائے نواب کمال رضا سفرِ آخرت اختیار کر چکے تھے۔

(۴۳)

نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطانِ عالم تک نو حکمرانوں نے اودھ پوری پر راج کیا۔ سلطانِ عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔ صفدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، جو دلّی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شاندار سلطنت تھی، جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چہار دہم سے زیادہ جاہ و جلال والے تھے۔ سلیمن صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا اس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دیپ مالا چشم زدن میں بجھ گئی۔ ہیولاک

جیتا۔ سلطانِ عالم ارا۔ لکھنؤ کی اندر اپوری اجڑ گئی۔ نوٹنکی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں سبز پری کا ناچ، عیش باغ کے میلے، محرّم اور رام لیلا کے ہنگامے۔ دلکشا محل اب سنسان پڑا ہے۔ ویلی گارد کو توپوں نے اڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دکانیں ہیں۔ امین آباد میں کالج اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تار جھنجھناتے ہیں۔ ایودھیا کے رام چندر کی گدی ٹوٹ چکی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمر عیار کا طلسم تھا۔ آخری ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیو لوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفیسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ریل گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی اور وہ فٹن پر بیٹھ کر باہر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ آج سے اڑتالیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے۔ وہ شاہی کا لکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کا لکھنؤ ہے۔ یہاں دھومی بیگ کوتوال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے جو سعادت علی خاں کی نور بخش کوٹھی میں براجتا ہے۔ بیچارے سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب بینکس ہاؤس کہلاتی ہے، اس میں کمشنر رہتا ہے۔ قیصر باغ میں کیننگ کالج ہے جس میں کلکتہ کا منورنجن دت قانون پر لیکچر دیتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاس چوک، مصاحب خاں کی سرائے، پاٹا نالہ، چوپٹیاں، چوکھی، گولہ گنج، بارود خانہ، سعادت گنج، ڈالی گنج، حسین گنج۔ ساری جگہیں وہی ہیں۔ مکان، انسان مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے۔ غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو پھانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیا جب سے ہرریس سدھارے اب ان کے لیے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ یہ اودھ پوری ہے۔ یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن باس ملا تھا۔

فٹن اسٹیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پر انگوچھا لپیٹ کر نیلمبر دت کو دیکھا۔ "بابو صاحب، پیچھے سائیس بیٹھا ہے، اسے اوپر بلا لوں۔ بڑھؤ ہے گر کر مر جائے گا۔"

"ہاں۔ بلا لو۔" انھوں نے جواب دیا۔ پیچھے سے ایک بوڑھا کود کر کوچ بکس پر آ گیا۔ فٹن پھر روانہ ہوئی۔

"بابو صاحب کلکتے سے تشریف لا رہے ہیں۔"

"ہاں۔"

"ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں۔ یہاں اب جی نہیں لگتا۔" نوجوان نے کہا۔

"کو ہے۔" بوڑھے سائیس نے نوجوان کے کان کے قریب مُنہ لے جاکر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"کلکتے کے بابو۔" نوجوان نے، جس کا نام شمبھو تھا، چلا کر کہا۔

"کلکتہ۔۔؟" بوڑھے نے، جس کا نام گنگا دین تھا اور جو اُونچا سنتا تھا، غیر یقینی انداز میں دہرایا اور پھر مڑ کر دھندلی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

"ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آیا؟" شمبھو نے کہا۔

"بابو صاحب۔" گنگا دین نے مڑ کر بڑی لجاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ "ہمکا بھی کلکتے پٹھائے دیو۔"

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا: "بابو صاحب تمہری بولی نہیں سمجھتے۔ اردو میں اپنا مطلب بیان کرو۔"

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا: "کھداوند، ہم کو کلکتے پٹھا دیجیے۔ سوہاں ہمرے بادشاہ رہت ہیں۔"

نوجوان ہنس پڑا۔ "حضور بابا کی بات پر دھیان مت دیجیے۔ یہ جو مسافر ریل سے اترتا ہے اسی سے یہی بات کہتے ہیں۔ میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچا دو۔ پوچھو، ہمرے بادشاہ خود جو کلکتے میں ہیں، اوپر سے یہ بھی پہنچ جائیں۔ جیسے بس ان ہی کی کسر ہے۔"

نیلمبر دت خاموش رہے۔ فٹن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"سرکار۔ پہلے بھی لکھنؤ تشریف لائے ہیں۔" نوجوان نے پوچھا۔

"ہیں؟" نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا، "ہاں۔"

"کب۔۔؟"

"بہت زمانہ گزرا جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے وقت میں۔"

"بابا۔" کوچوان نے پھر چلا کر بوڑھے سائیس کے کان میں کہا، "بابو صاحب تمہرے گاجی الدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔"

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا: "بابا کہا کرت ہیں کہ گاجی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔ اس سے پہلے شکرم ہانکتے تھے مگر کہتے ہیں کہ محل میں پہنچ کر انھوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔ سارے بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر نوکری کی ہے۔ سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔"

"خداوند،" گنگا دین نے کہا، "سلطانِ عالم کو آپ نے دیکھا ہے؟ کیسے ہیں؟ خیریت سے ہیں؟" پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔ مدتوں وہ محض عقل کے پجاری رہے تھے۔ اب آن کر انھوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔ فٹن اب امین آباد کے چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا: "ارے سامنے سے ہٹتی نہیں بوڑھیا۔ کاہے اپنی جان کی لاگو ہوت ہے۔" اس نے باگیں کھینچ کر فٹن روک لی۔ ایک ضعیفہ دلائی میں لپٹی ہوئی سامنے آ گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا کر میکانکی انداز میں اپنے فقرے دہرانے شروع کر دیے: جنابِ امیرؑ کا صدقہ۔ خدا تمھیں سوا غمِ حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فٹن کے کشنوں سے ٹیک لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے: لکھنؤ کیا بوڑھوں کا شہر ہے؟ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جو باقی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جمِ غفیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شامِ اودھ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیرنی اسی طرح آنکھیں بند کیے کھڑی دہراتی رہی: خدا سوا غمِ حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک ٹکا۔ خالی ایک ٹکا۔

نیلمبر دت چونک پڑے۔

یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی۔ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے قہقہے لگائے تھے۔

انھوں نے ہڑبڑا کر عینک درست کی اور فٹن سے باہر جھانکا مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیرنی کھڑی تھی جس نے اودے رنگ کی بوسیدہ دلائی اوڑھ رکھی تھی۔

"اسے کچھ مت دیجیے گا خداوند" شمبھو نے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مؤدبانہ انداز میں کہا، "اسے کوکین کی لت ہے۔ جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے نیک بخت۔"

نیلمبر دت نے اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر فقیرنی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید براق دھوتی پہنے اگر ئی شال میں لپٹا ٹانگ پر ٹانگ رکھے فٹن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا ——

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لمحے کے لیے اسے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ کیسا دیالو رئیس ہے جو ٹکا مانگو تو چاندی کا روپیہ دیتا ہے۔ سکّے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دہرانا شروع کر دیا: سرکار، غریب پرور —— آپ کو پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں غدر کی ماری ہوں۔ بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ اب کوئی دو روٹی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو —— شمبھو نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ فٹن آگے بڑھ گئی۔ شمبھو، جس کی دنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، ہنس کر کہنے لگا:

"بڑھیا کی باتیں۔ دروجے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ یہ گردی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ مل گیا ہے جس سے سنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یوں طرّم جنگ تھا، فلانا تھا، ڈھمکا تھا۔ بابا ہی کو دیکھ لیجیے، بابو صاحب، اگر دِتی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔ اب سائیسی کرتے ہیں۔" وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہارِ خیال کرتا ہوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا۔

چمپا نے روپے کو شام کے اندھیرے میں کئی بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی جہاں ایک زمین دوز دکان میں کوکس فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگر وپے اور مدکچے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

اندھیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ جس وقت فٹن امین آباد کے چوراہے سے آگے بڑھی نیلمبر دت نے ایک بار پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ چمپا سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر اَن گنت جھریاں تھیں۔ اس کی دُلائی میں جابجا پیوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر گوکھرو اور بنت ٹکی رہ گئی تھی جس کے تار نکلے ہوئے تھے۔

انھوں نے فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشالی کی امباپالی کو دیکھ لیا تھا۔

گومتی کے اس پار شاہِ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو منورنجن دت نے اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ فٹن موتی محل کے پل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے والی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔

اس رات جب منورنجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں لیمپ گل کر دیے گئے تب نیلمبر دت برآمدے میں آ گئے، جس کی سیڑھیاں ندی میں اترتی تھیں، بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیگ چلی تھی لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے پھل پریاں رقصاں تھیں۔ سامنے کچھ دور پر پل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چنڈی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سرخ آنکھوں والے بندر سو رہے تھے۔ یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے، لنگڑاتے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہانِ اودھ۔ سعادت علی خاں اور جان بیلی۔ نصیر الدین حیدر اور ان کا یورپین حجام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سر ہاورڈ ایلنلے اور شیلا۔ لارڈ میکالے اور بشپ ہیبر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا۔ جب زندہ تھے۔ اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے۔ مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دنیا کا عروج و زوال گوتم نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون سا تماشہ دیکھنا باقی تھا۔ ندی رواں تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سو رہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت رواں تھا۔ وقت پتھر میں منجمد تھا۔ مرگھٹ میں شعلے بلند ہو رہے تھے۔ آج کی رات جانے کون کون مرا ہوگا۔

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مرگھٹ — یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور کالی — جو ذہن اور گویائی سے

ماورا۔ ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ — جو سونیا کو پوران ختاتی ہے۔ پوران — جو روشنی اور سکون ہے۔

کالی — جس کا لباس سماوی ہے۔ وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔

مرگھٹ میں کالی، شیو کے سپید جسم پر کھڑی ہے۔

شیو — جو سپید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے۔ اور مایا اور خود پرستی کے عنصر تموں کو تباہ کرتا ہے۔ وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماورا ہے۔ کالی اُس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

شیو — جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھوئیں میں کالی رقصاں ہے۔ وہ کالی ہے۔ تارا۔ دھوم وتی۔ وہ شانت رس کا ناچ ناچ رہی ہے اور کائنات جے جے کے نعرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کو ستی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا، انھوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صبح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انھوں نے جاکر مہری کو جگایا جو ایک طرف کو فرش پر چٹائی بچھائے سو رہی تھی۔ "چاء کا پانی رکھ دیو۔ چھٹکی کا اسکول آج چھ بجے سے لگیہے۔" مہری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بالوں کا جوڑا لپیٹتی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگمگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھے گی۔ بڑے صاحب اور بھتین صاحب کے شیو کا پانی پیالیوں میں لگائے گی۔ پھر چاء کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دور پکّی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چرخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوجا کے لیے ٹھاکر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھاکر دوارہ دوسری منزل پر مشرق کے رُخ کی برجی میں تھا۔ کمرے میں حبس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھلا تو اندر کے اندھیرے میں گوپی ناتھ ٹھاکر حسب معمول اپنی خالی خالی آنکھوں سے سامنے خلا

میں دیکھتے نظر آئے۔ ان کی کیسری پوشاک پر جھوٹا گوٹا لگا تھا اور ان کے مکٹ میں مور کا ایک ہی پر تھا جو ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بانسری اٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں کھڑے تھے۔ ساکت۔ منجمد۔ لاتعلق۔ ان کے چہرے پر بڑی بھیانک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری برجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

پرانی وضع کی مسہریاں اور تخت چاروں طرف بچھے تھے۔ تلسی کا منقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سر منڈے سنت کی تصویر آویزاں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری برجی، جو چھتر منزل کے رخ پر تھی، اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا۔ وہ مزے سے ہلکی دُلائی تانے کھڑکی کے قریب سو رہا تھا۔ قریب ٹیبل فین گھوں گھوں کر رہا تھا۔ برجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں۔ پلنگ کے نزدیک والی میز پر دیوانِ غالب رکھا تھا، اور کبیر کی گرنتھاولی اور ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پائنیر اور لیڈر کے پرچے اور انگریزی کے ادبی رسالے جو کلکتے اور بمبئی سے نکلتے تھے۔ اور وشوا بھارتی میگزین۔ دیواروں پر نند لال بوس اور ابنندرناتھ ٹیگور اور خستگیر اور ایل ایم سین اور روی ورما کے واٹر کلرز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیبی تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پر ٹائیاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنسے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نینی جیل سے باہر نکل رہے تھے۔ ایک تصویر کملا نہرو کی تھی۔ آٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم میں آویزاں تھے ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء۔ آل انڈیا مباحثوں میں جو ٹرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ۔ یونین کے عہدیداروں کی تصویریں ہسٹری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر سدھانت، ڈاکٹر راؤ، مسٹر سی۔ جی۔ رائے۔ ایک کونے میں آتش دان کے اوپر ایک گروپ تھا جو اب بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ اس تصویر پر ۱۸۹۶ء لکھا تھا۔ یہ گروپ بھی کیننگ کالج کا تھا۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانۂ طالب علمی کی تھی۔ اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی ٹوپی اور بند کالر کا کوٹ پہنے بڑی مستعدی سے فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین ڈاکٹر منورنجن دت مرحوم

کے پیچھے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر دت کی ٹیگور کی ایسی یہ لمبی سفید داڑھی تھی (یہ دوسری بات ہے کہ ہر داڑھی والا بنگالی ٹیگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر داڑھی والا انگریز کنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھے کیمرے کو بہت گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں اَن گنت تصویریں آویزاں تھیں۔ کانگریس کے اجلاس، میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنے، مہاراشٹر، گوالیار اور الور کے استاد لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھے بیٹھے تھے۔ یہ چیمبر اوف پرنسز کے گروپ۔ نچلی منزل میں ڈرائنگ روم کے آتشدان کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دقیانوسی بوڑھا سبز گوٹ کا جامہ اور چنا ہوا پاجامہ پہنے، سر پر مندیل اوڑھے منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز مصوّر نے بنائی تھی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا: "رائے زادہ بخشی مہتاب چند۔" چند تصویریں پرانے وقتوں کی دلہنوں کی تھیں اور ایسی بیبیاں جو اونچی ساڑھیاں باندھے، انگریزی جوتے پہنے، ایک ہاتھ میز پر ٹکائے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی موٹی کتابیں یا گلدان رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین برجیاں تھیں۔ تیسری برجی میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ستار رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سورج بخش صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناچ سیکھتی تھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لیے مرکزِ کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکینوں کے لیے مرکزِ کائنات ہوتا ہے۔)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں۔ دلہنوں کے ڈولے آئے۔ براتیں چڑھیں۔ بیٹیاں وداع ہوئیں۔ بڑے بڑے تہوار منائے گئے۔ رام نومی اور جنم اشٹمی اور دیوالی اور شوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے۔ لڑائیاں جھگڑے ہوئے۔ لوگ ہنسے اور روئے۔ ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہوگے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے۔ کبھی کبھی لہریں اسے بہا لے جاتی ہیں۔ پھر اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقربِ خاص اور اودھ کے وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی۔ اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں براجمان تھے جو اوسط درجے

کے بیرسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں۔ تینوں ابھی طالب علم تھے۔

بیرسٹر صاحب کا سارا وقت کانگریس کے چکر میں نکل جاتا یا وہ بیٹھ کر زمانہ نگار میں اردو شاعری پر مضمون لکھتے۔ پھر پریکٹس کی طرف توجہ کون دے۔ مگر گھر کی زمینداری تھی اس لیے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کے جہیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کیمبرج بھیجنے کی سوچ میں تھے۔

جہاں انھوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سمے وہ برساتی کے اوپر جو کھلی چھت تھی اس پر مچھردانی لگائے پڑے سوتے تھے۔ بی بی کی کھٹر پٹر کی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک بُری عادت تھی کہ صبح صبح اپنی کھڑاؤں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں۔ کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں۔ کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں۔ کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ اس کے بعد وہ پوجا کرنے بیٹھ جاتی تھیں اور زور زور سے رامائن پڑھتی تھیں۔

بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھندلکا چھایا تھا۔ مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد اودے رنگ کے کہرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناٹا تھا۔ پُل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ ترلوچن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی۔ بستر لپیٹے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ "اٹھو بٹیا جلدی کرو۔ تمھرا اسکول آج سے سبیرے کا ہوئے گوا ـــــ" جمنا مہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے اُس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ پانچ بج گئے۔ ارے رام رے۔ آج سے اسکول کھل رہا تھا۔ وہ پلنگ پر سے کود کر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہلی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی ـــ کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔ جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج والج کی چنداں پرواہ نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

برجی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی ہیچیل گھسیٹتا افیمچیوں کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس ٹک کر کاہلی سے ندی کو دیکھنے لگا، جدھر پُل تھا۔ اُس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تولیہ کاندھے پر ڈال کر لیے مہری آواز میں گاتا غسل خانے میں گھس گیا۔

"اسکول میں اپنی گوئیاں سے کہہ دینا شام کو آکر بڑکی کے لنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں۔" گھر کی بی بی نے ٹھاکر دوارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلکا نیلا ٹونک پہنے، جس کی بیلٹ سرخ رنگ کی تھی، کتابیں اٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ نیچے برساتی میں لامارٹنیئر کی بس نے ہارن بجایا۔ "اچھا۔ اچھا۔ کہہ دوں گی۔" اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پوربی تھیں۔ شادی ہو کر لکھنؤ آئے ان کو پچیس سال گزر چکے تھے مگر اپنے لب و لہجے پر انھوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سسرال کی ٹکسالی اردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ بڑی بیٹی کو بڑکی کہتی تھیں، چھوٹی کو چھٹکی۔ جیٹھ بڑکئو کہلاتے تھے، سال جستاری۔ میاں منجھو۔ بیرسٹر صاحب ان کو بمبئی، کلکتہ، کشمیر سب جگہ گھما لائے تھے۔ ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جو ان کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی لڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا۔ نیچے باغ کی سڑک پر اسکول کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ ساری انگریز لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ہاتھ ہلایا: "ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کالج سے لوٹ کر۔"

"اچھا۔" بڑی لڑکی نے جواب دیا۔

بس پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد لڑکا سیٹی بجاتا نیچے اترا۔ برساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بڑے اسٹائل سے سائیکل کے ہینڈل میں اٹکائی اور بے فکری سے پیڈل چلاتا کچی سڑک پر آکر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنگِ سرخ کی برجیاں دور دھندلکے میں نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکل آیا۔ سب دنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں، دکانیں، کالج، سرکاری دفاتر، اخبار کے پریس، ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر، کارخانے، جیل۔ خلقت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی۔ روشنیاں جگمگائیں۔ بازار، محلّے، کوٹھیاں، سینما ہاؤس، کلب، بال روم، ٹکسرائیں۔ جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پیر چار پانچ نوعمر لڑکیاں برآمدے کے جنگلے پر بیٹھی اس طرح ہنستی تھیں جیسے ریچ سے تالا ٹھنسا ہیں۔

شاید وہ رنج سے ناآشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں چراغ جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

(۳۵)

سورج جس سمے جامنوں کے پیچھے پہنچتا تب فن میرس کالج سے لوٹ کر اپنی نپی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آجاتی تھی۔ یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا تھا۔ ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ کہلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچے راستے جاتے تھے۔ ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی بوٹ کلب، آرٹ اسکول اور ندوۃ العلماء کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا کچا راستہ کاٹھ کے پل کی سمت ——۔ یہاں سے ندی کے کنارے کنارے چاند باغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔ یہ علاقہ ٹرانس گومتی سول لائنز اور حیدر آباد کہلاتا تھا۔ یہاں بے شمار نئے سمنٹ کے مکان تھے۔ بم بہادر شاہ کا دو منزلہ محل، چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشاط گنج کی بستی تھی۔ راستے بھاری لال روڈ، جس کا ایک سرا یونیورسٹی روڈ پر تھا، بل کھاتی اس علاقے سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابلا تھوبرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پُرسکون علاقہ تھا۔ کبھی کبھار کوئی موٹر نکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکا یا لڑکی۔ مضافات یا ڈالی گنج کی طرف جانے والے اِکّے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرلز کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنّے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہ نگر اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ۔ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور ریڈ پیپر مل جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چڑیا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنارسی باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا۔ جس کے پیچھے غازی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لامارٹینئر کالج اور لامارٹینئر روڈ ہرے بھرے نکنجوں سے نکلتی دلکشا پیلس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے وسیع سرسبز چھاؤنی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا اور امیر الدولہ پارک۔ اور شہر۔ اور جھاؤ لال کا پل اور پھر سڑکیں تھیں اور چوک کی طرف جاتی تھیں جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال، شاہ مینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ، مچھی بھون اور امام باڑہ حسین آباد۔ وہیں اکبری دروازہ تھا اور گول دروازہ۔ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوٹھی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے کنارے موتی محل میں امپیریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا۔ یہ بڑا وضعدار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں۔ نو دولتیے پن کا اظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمبھیرتا اور ٹھیراؤ کے ساتھ گزرنا سیکھا تھا۔

اس اطمینان اور آسائش کے ساتھ فٹن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچتی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سائیکلوں کا ہجوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فٹن بائیں ہاتھ والی کچی سڑک پر اتر آتی جہاں راستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے وقتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔

گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ "وہ بٹیا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلیے گا۔۔؟" وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سنا رہی ہوں۔ (طلعت نے کہا) داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا۔ کون کردار زیادہ اہم ہیں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ کلائمیکس کہاں تھی۔ ہیروئن کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہونا چاہیے تھا۔ ہیرو کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی کمال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کر وہ یہ سب طے کرے گا۔ کمال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا۔ پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ "ہاں چلیں گے۔" میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فٹن آہستہ آہستہ کچی سڑک پر رواں رہتی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ مکمل ابدی سناٹا۔ اسی راستے پر بہت آگے جا کر شمشان گھاٹ تھا۔ ندی کے پانی میں موتی محل کی روپہلی عمارت کے سائے لرزاں رہتے اور چھتر منزل کا سنہرا گنبد اور نجف اشرف کا امام باڑہ۔ ندی ان عمارتوں کی سیڑھیوں کے نیچے مؤدبانہ انداز میں بہتی رہتی۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی موجیں گہری سبز دکھلائی پڑتیں۔ کبھی کبھی اس ہریالی میں

سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی نکل جاتی۔ رنگ سرخ کے شاندار موتی محل برج کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیاں بھی پانی میں اترتی تھیں۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور اپنی تین، ہشت گوشہ برجیوں کی مناسبت سے سنگھاڑے والی کوٹھی کہلاتی تھی۔ یہ برجیاں کائی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کائی اور ندی کا پانی اور آسمان، درختوں اور گھاس کا سبزہ، یہ سب مل کر ایک معلوم ہوتا۔ جاڑوں میں یہاں ہلکے پیلے رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ گرد آلود درختوں کے پیچھے سے سورج نکلتا اور اس کی زرد لکیریں سائے میں تیرتی پھرتیں۔ جن میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو رنگ برنگے ذرے اڑتے نظر آتے۔ چاند باغ جاتے ہوئے اوور کوٹوں میں ناکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی صنوبر کے جھنڈ کی اور بڑھتیں اور گھاس پر شبنم کے بڑے بڑے قطرے پیروں میں آکر ادھر ادھر لڑھک جاتے۔ جاڑوں میں شام کو سورج بہت جلد غروب ہو جاتا۔ چنانچہ فٹن بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھ سات بجے پل پر آ جاتی۔

"بٹیا۔ نرملا بٹیا کے یہاں نہیں چلیے گا۔؟" گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے بیٹھے کمالی سے پوچھتا۔

اور پھر فٹن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو جاتی۔

"یہ لو بھئی تمہارا آمد نامہ دے گئے ہیں۔" لاج برساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔

بھئی یعنی شنکر سریواستوا یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔

نرملا برجی میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔ "اے۔ ذرا آکر جب تال تو بجا دینا۔" وہ برجی کے کسی دروازے میں سے منہ نکال کر کہتی۔

ان کی اماں ٹھاکر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسری برجی میں سے آواز دیتیں:

"اری باؤلیو۔ پہلے کھانا تو بھکر لیو۔"

نرملا کی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی۔

"اب یہ بتلاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا؟"

میرس کالج کی سیاست شروع ہو جاتی۔ لاج وہاں سے ففتھ ایئر پاس کر چکی تھی اور اب بی۔ اے۔ کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

"راجکماری شو پوری لاہور جا رہی ہیں۔"

"لاہور۔؟ ارے باپ رے باپ۔"

لاہور بہت دور تھا۔ بالکل دوسرا کرہ کیسے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے راجکماری سنگاپور جارہی ہیں۔

"اوہ۔" گھنگرو باندھے باہر آکر نرملا اظہارِ خیال کرتی۔ پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی لیکن پچھلے سال جب وہ بیمار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سریواستوا، جو نابینا تھے اور میرس کالج کے اسٹاف پر تھے، شام کو آکر اسے ایک گھنٹہ ریاض کرادیتے تھے اور شمبھو مہاراج کے گھرانے کے ایک کتھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لامارٹینیر میں نرملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینئر کیمبرج کریں گے۔

"کتنی عجیب بات ۔۔ یعنی ہم میں سے ایک لاہور جارہا ہے۔ ارے واہ" ۔۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی انوکھی جگہیں دیکھوں۔" اس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

"پنجاب ہے نا۔ وہاں ان کی ایک یونیورسٹی بھی ہے۔ اس میں وہ ہونے والا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندرجیت کی شادی میں شرکت کرنے جارہی ہیں۔"

اندرجیت کور دہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دنوں کے لیے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھٹکنڈے یونیورسٹی۔ باقی یہ جو انورسٹی یعنی کیننگ کالج تھا، جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے یہ، تو ایک قسم کا اندرلوک تھا جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرے پر سے سر اٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے: ایک دو تین چار پانچ ۔۔۔ پورے پانچ سال بعد ہم اس اندرلوک میں پہنچ سکیں گے۔ ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

"بڑے آغا صاحب نے آج گائتری نگم کو پھر ڈانٹ پلائی۔"

"تھیوری کی کلاس کے لیے لیلا دیدی آئی تھیں؟"

"سنا ہے اب کے سے مقرر کے ایکسٹرنل ایگزامنر ونائک راؤ پٹوردھن ہوں گے۔"

"ارے ہائے ۔۔ وہ بڑے سخت آدمی ہیں ۔۔ دائیوا میں انھوں نے میرا بھٹہ کر دیا تھا،" لاج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔بی۔بی۔ایس۔ کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بیچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا۔ اور بھٹکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیلا، راجکماری، یہ سب لڑکیاں اب اسٹاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈیو اسٹیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے — کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لیے ریڈیو اسٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی۔ پھر نیاز فتحپوری کے داماد مُہدر نیازی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارچنا لہری تھی۔ اور بہت سی بنگالی لڑکیاں۔ سورج بخش سری واستوا تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر۔ الیاس خاں اور جانے کون کون — ایک سے ایک کا لاکار پڑا تھا۔

"پر راجکماری ہم سب سے الگ اتنی دور جا کر بور نہیں ہو جائیں گی —؟" نرملا نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

"جب بھیّن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے کے لیے کراچی گئے تھے تو ہمیں سنگ لے گئے تھے — یاد ہے —؟ لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے —" لاج کہتی۔

"مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے۔" میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی۔ مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ "تم کو کیا پتا اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔" لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر جھم جھم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، زندگی کے پیش منظر کا جو دھندلا سا اٹکل پچّو خاکہ ہمارے ذہنوں میں تھا وہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچتا رہتا۔ شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے)، دور سنگِ سرخ کا پل، بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھاڑے والی کوٹھی کی مخروط کائی آلود سیڑھیاں — جغرافیے کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے — اس کے آگے کیا ہے — اور کیا کیا ہوتا ہے —

"اپّی بڑا ہو کر کہاں جائیں گی؟" اکثر نرملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر بیٹھتی۔

"وہیں جائیں گی جہاں بھیّا صاحب لے جائیں گے — اور کہاں جائیں گی۔" میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

"بھیا صاحب کہاں جائیں گے ۔"

"کیا معلوم ۔" میں سٹ پٹا جاتی ۔

(اب کمال اپنے کونے میں سے اُٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے ٹک گیا۔ گویا طلعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اُس نے گویا کیو لے کر کہنا شروع کیا) :

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے ۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا۔ وہ میرے ہیرو تھے۔ میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لیے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی ٹائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتاجی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا۔ پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے کی طرف کوئی نہ جائے۔ وہ عموماً لان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، سیمل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ "ہمارے یہاں"، "ان کے یہاں" سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب چچا ابا کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو سوئٹزرلینڈ سے واپس بلا لیا گیا۔ بھیا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں الموڑے پہنچے تھے۔ ابا میاں ان دنوں الموڑے میں تعینات تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے سوئس اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے مفلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے روتے روتے سوج گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انھوں نے مجھے اور اپی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ طلعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ الائچی کے درخت پر چڑھی ہوم ورک کر رہی تھی۔

الائچی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ پہلو کے برآمدے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنومین بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلاً ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ممی ان پر عاشق تھیں۔ ان کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جپتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آکر رہا کرتے تھے۔ بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اسی بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب لا مارٹینئر کالج میں داخل کر دیے گئے جو ڈیڑھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارٹن فرانسیسی کے روپے سے یورپین لڑکوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں؟ میں کہانی سنانے بیٹھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی توطے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا ہے تم سمجھ دار ہو، خود ہی تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوائیر ہوتے ہیں۔ اگر تم قدامت پسند تماشائی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی جھنجھلاہٹ ہوگی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین مین چارلس بوائیر تھے۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و لہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا۔ جب وہ 'ت' اور 'د' کے تلفظ کے ساتھ رک رک کر انگریزی بولتے تو مت پوچھو کہ کس طرح ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

رہیں امی۔ تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن

لوگوں کے لیے پکوان بناتیں یا پُل اوور بنتیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مشغلے میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں۔ اپّی لا مارٹینیر گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں جو نجف اشرف کے قریب ندی کے دوسرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر خورشید منزل کی اونچی عمارت، جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشید زادی کے لیے بنوائی تھی، اس کے چاروں اور خندق تھی اور یوروپین وضع کے کنگورے۔ سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپی رہتی۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اونچے کنگورے اور برجیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکیپ مصوّر کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے۔ اکثر جب بنارسی باغ جاتے ہوئے پُل سے اُتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپّی مجھے قلعے کے کسی دریچے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابلِ بیان سکون رچا تھا۔

بھیّا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سڑکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لا مارٹینیر کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے ٹہلتے یا کبھی کبھی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ان کی طبیعت میں جو دھیما پن، جو کھوئی کھوئی اداسی تھی اس نے ان کو اور زیادہ رومینٹک بنا دیا تھا۔

دیکھیے، میں عرض کروں، مجھے اس لفظ رومینٹک سے دلی نفرت ہے۔ یہ کوئی میں خواتین کے رسالے کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاندنی رات اور گلاب کے شگوفوں اور والٹس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیرو اچھا خاصا ہسپانوی بُل فائٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے اور بحیثیت قصّہ گو میری بدقسمتی کہ بھیّا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لا مارٹینیر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں ہنستے تھے۔

سینئر کیمبرج کے بعد بھیّا صاحب انٹرمیڈیٹ کے لیے کالون تعلقدارز کالج میں آ گئے جو ہمارا خاندانی کالج تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کئی پشتوں سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیّا صاحب دوسرے ڈیکیڈنٹ رئیس زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستار بجاتے۔ سال بھر بعد وہ سڑک عبور کر کے کیننگ کالج

میں داخل ہو گئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورندابن کے کنہیا بنے رہے۔

اپّی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپّی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں، یہ اپّی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج وتی سریواستو اپّی کی سب سے پیاری گوئیاں تھیں۔ یہ میرے چہیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں، پر اکثر ایسا ہوا کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چپ ہو جاتی۔ اپّی بے پروائی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شنکر بے وقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کر دیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی کی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لیے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چمپا باجی کے پس منظر سے ہمیں واقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا باجی مڈل کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لا کر رہے تھے اس وقت چمپا باجی نے بنارس سے آ کر ازابلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔

یہ سن انیس سو اکتالیس عیسوی تھا۔

اپّی لا مارٹینیر اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج آ چکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی مجلس، سوسائٹی کے ڈرائنگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

جس سال اپّی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپّی کی شادی کی بات ٹوٹی۔

اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی کے وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر سے گزرنے والی کہارنیں، وہ بوڑھیا جو سرخ لہنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی۔ جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی

غیر ضروری جزویات سے احتراز۔ یہی سب تو فنِ افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے۔ اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں، کمیونی کیٹ نہیں کر سکتا۔ طلعت شاید ایسا کر سکے۔

بہر حال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھیے۔ یہ سینیٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اونچی شہ نشین میں بیٹھا ہوں اور ریڈیو کے لیے کانووکیشن کی کومنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کواڈرینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں ملبوس مخلوق اِدھر اُدھر چل پھر رہی ہے۔ سرسبز گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور لالہ کے تختے۔ سنگِ سرخ کی عمارات کے سائے ساریوں اور سیاہ چغوں اور فیکلٹی کے زرتار منقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سنسناہٹ میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیّا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستے کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے کواڈرینگل کی طرف جا رہے ہیں جدھر ایٹ ہوم کے لیے سفید میزیں بچھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر یکلخت نیو تھیٹرز کا نیا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے:

"یہ کون بیچ کے وقت کیسی آواز۔" پہاڑی سانیال کی آواز سارے میں گونجتی جا رہی ہے —

پہاڑی سانیال بادامی ریشمیں کرتا پہنے، دھوتی کا لمبا پلو ہاتھ میں سنبھالے میرس کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی بنگالی لڑکے سے باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کا پرا اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغادری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہوگا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوچھیے مسٹر ہری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ ہلو — میری آواز آ رہی ہے — ہلو —

ہلو — ہاں —

(ہری شنکر نے، جو لیمپ کے پیچھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا، جواب دیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اسٹیج کے باہر سے اس کی آواز مائیک پر گونجتی ہوئی آ رہی ہو۔ وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔)

ہلو۔ ہلو۔ میں، ہری شنکر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں ہری شنکر سریواستوا، کمال کا ہمزاد۔ لاج اور نرملا کا اکلوتا بڑا بھائی۔ چمپا باجی کا رفیق۔ میرا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں؟ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں؟ یہ بڑا کھپلا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں۔ گلاب، لالہ، سویٹ پی۔ درختوں کی ہری اور نارنجی پتیاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جھلملا رہی ہیں۔ اپی گاؤن پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں۔ بھیا صاحب اور چمپا باجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ کیننگ کالج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالین بچھے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں۔ اب مجمع کم ہو گا۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویریں کھنچواتے حضرت گنج جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے۔ پھر ان فوٹوؤں کے گروپ فریم کر کے دیواروں سے لٹکا دیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور ان کے کاغذ پیلے پڑ جاتے ہیں۔

کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں۔ اس کی بہن تہمینہ سے، جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی لاج اور نرملا سے۔ لیکن میرا اور کمال کا اپی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ "اللہ، ہری شنکر ہمارے لیے بانٹا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلوا تے لانا۔" "ارے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہمری ساری کب تک رنگ کر دیں گے؟" "اے جناب! حضرت گنج جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری واڈسکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا۔"

"خدا کے لیے اپی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی،" میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا۔ "اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے۔ وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔"

"اے بھیّن۔ میرس کالج جاکر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا کہ نیشنل ورک کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں ـــ" لاج کھڑکی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

"لاحول ولاقوۃ" غصّے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیلوں کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈبو دوں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آکر نیشنل ورک کے رسالوں اور سینما کے ٹکٹوں کی فرمائش کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر ٹکاکر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

"میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شنکر میاں، ٹیگور لائبریری تک جاکر ـــ" اپی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"بھیّن، آج شام کو پکچر نہیں دکھلاؤ گے ـــ" لاج اپی کی شہ پاکر بولتی۔

"چپ رہ چڑیل" میں غرّاتا۔

"اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چار دن کے لیے شہر میں مہمان ہے۔" اپی بڑی رقّت خیز آواز میں کہتیں۔

"اور کیا۔ کر لو کمینہ پن ـــ" لاج حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی۔

"ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاؤس لے جاکر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری لاج اور اپی ہیں ـــ"

"یہ چمپا باجی ـــ ان کا کیا ذکر ہے ـــ" میں بڑبڑاکر کہتا اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زنّاٹے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپی اور کمال کی چھوٹی بہن طلعت میرس کالج سے لوٹتے میں میرے گھر میں رک جاتیں۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے فٹن کو اپنی کوٹھی کی طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سنّاٹا طاری ہوتا اور اداسی۔ اور موسم کے سارے پھولوں کی مہک۔ ندی کے پانی کی پُرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی اور جانے کاہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔ میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔ اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی تھی۔

جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹتے تو صبح صبح ہلکے خنک دھندلکے میں سندیلے کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا تھا۔ (کمال نے کہنا شروع کیا:) "یہاں لڈو ہوتے ہیں۔"

شنکر نے خیال ظاہر کیا۔ عین اسی وقت "لڈو سندیلے والے" کی صدا سنائی دی۔ سرخ بجری والے پلیٹ فارم پر نستعلیق قصباتی شرفا، انگرکھے، دوپلی ٹوپیاں، سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے، اجلی دھوتیاں پہنے، دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹہلتے تھے۔ پلیٹ فارم کے کنارے چند پالکیاں رکھی تھیں۔

سفید پھولوں سے گھرا ہوا اسٹیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔ باریک سرخ کاغذ میں لپٹی ہانڈیوں میں رکھے ہوئے لڈو بیچنے والوں کی صدائیں۔ دور سرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہوکر پھکو پھکو روتی اسٹیشن کے پھاٹک کی طرف جارہی تھی۔ اس کے آگے آگے تین چار دیہاتی چل رہے تھے۔ دولھا نے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اوپر کی برتھ پر سے شنکر نے آواز لگائی:

"میں ذرا بھیرو کا ریاض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم برا نہ مانو۔"

"میاں تم کو کون منع کرسکتا ہے۔ تم بھیرو چھوڑو۔"

"آ — آ — رے — رے — دھاپا — گا — او ہو — ہو — جاگو — جاگو — ارے بھائی جاگو موہن —" اس نے دہاڑنا شروع کیا۔

"لاحول ولا۔ کس قدر اپلی منٹری بھیرو — یہ والا بھجن تو فرسٹ ایئر میں سکھلایا جاتا ہے۔" میں نے کروٹ بدل لی۔ "اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لڈو کھانا چاہتا ہوں۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"ارے میاں — ارے بھائی — جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔ تم خود کسی دن مجھ سے یہی چیز درت میں سننا۔ ارے بھائی —" میں نے آدھی بات شنکر سے کہنے کے بعد پھر لڈو والے کو آواز دی۔

"کیسے مہربان —" لڈو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

"جاگو — ہی ہی — ارے کیا مرکیاں لیتا ہے بس۔" شنکر چنگھاڑ رہا تھا۔

"ذرا دماغ پر زور ڈالو اور تصور کرو کہ برابر والے ڈبے سے ایک مدھر تان بلند ہو — گوال بال سب گیئن پرراوت —"

اس نے انترہ اٹھایا۔

"تمہرے درس کو بھو کے مٹھارے۔" میں نے غصے کے ساتھ گرج کر آواز ملائی۔ "میاں شنکر یہ باتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔ تم نے کانن کا وہ نیا فلم دیکھا ہے۔ "جوانی کی ریت" کہ:

موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ رے"

"کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزاپور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔"

"کیوں گپ مارتا ہے بے ۔۔۔ مرزاپور میں جھینک رہے تھے ۔۔۔ تم مجھے نہ بھیجو وہاں جھینکنے کے لئے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"چلا جا بھائی اللہ تو ہی چلا جا ۔ اور میری جان بخشی کر۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہانکتا ہے نامعقول۔ خود ہی خود بردکھوے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ میں ساری چھٹیاں اکیلا مسوری میں بور ہوتا رہا اور بری شنکر سرپوا ستوا سے کر مرزاپور میں بیٹھے بکریاں الاپ رہے تھے۔ اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کہ فوراً لوٹو۔ کیلان پور سے اپی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کرائسس درپیش تھا۔ اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیا نے بیاہ کے لیے ہاں کر دی تھی۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ بھیا نے ہاں کی تو لڑکی ندارد۔ اطلاع ملی کہ اپی نے انکار کر دیا ہے۔ اب گھر پر ہائی کمانڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ شنکر بھی مرزاپور سے لوٹ آیا تھا اور لاج کے میاں سے ملنے کے لیے دلی پہنچا ہوا تھا۔ میں نے مسوری سے اس کو تار دیا۔ مراد آباد کے اسٹیشن پر وہ مجھ سے آن ملا۔

"بھیا کی شادی کا کیا ہوگا۔"

"پتا نہیں۔ لاج، نرمل سے پوچھنا کوئی لونڈیا ہے ان کی نظر میں۔ یہ اس قدر لڑکیاں دنیا بھر میں بھری ہوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔"

"چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہوں گی۔ کیلاش ہوسٹل ہی میں رہیں گی نا۔" شنکر نے یکلخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"پتا نہیں ۔" میں چپ ہو گیا۔ "لاؤ ایک بیڑی دیو۔" میں نے کچھ دیر بعد خالص پکے ولوں کے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اوپر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آ رہے تھے۔ عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھان متی کا پٹارا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

"چمپا باجی اس میں ایک ڈسٹرب کرنے والے عنصر کی حیثیت سے آ شامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی بجز ایک سندیلے کے لڈو کے۔ میں نے شنکر سے کہا: "لڈو پھینکو نہ۔"

"سماپت ہوئے۔" اس نے اطمینان سے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ "کیا چمپا باجی نے منگوائے تھے۔؟"

"وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھیا صاحب ہوں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔" شنکر نے عقلمندی سے کہا۔ "تم بھیا صاحب نہیں ہو۔ میں کمال رضا نہیں ہوں۔ آپی چمپا باجی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے۔"

"یہ فرمانت کا ریکٹ مت چلاؤ سویرے سویرے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا۔ لڈو لو۔"

"تمہاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مرجاپور میں۔" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں آں۔ ہوئی تھیں۔" اس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ "مگر خاطریں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال۔"

یہ شنکر کا باقاعدہ کریر بنتا جا رہا تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں بردکھوے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ٹھاٹھ تھے بھائی کے۔

"اب تو لاج کو بدا کر کے بندہ چین کی بنسی بجائے گا۔" اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

"کمینے۔ بہن کو بدا کرتے سے بجائے اس کے کہ روؤ، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لونڈیوں میں گھومنے کی۔ یہ تمہارا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارے کا سارا۔ اس ہیرا دتی پانڈے کا کیا ہوا۔"

"اور میں تم سے سوال کر سکتا ہوں کہ لاہور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ الہ آباد میں جو تھی شوبیلا بہادری — اور —"

"میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح۔"

"اور کلکتے میں جو ہے وہ — کیا نام ہے اس کا — مدھر لیکھا موجو مودورا" — شنکر

نے ہونٹوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لہجے میں کہا۔

"جبھی تو لاج اور پائی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چپڑ قناتی ہیں۔"

میں نے اعتراف کیا۔

شنکر دفعتہً بڑا اداس ہو گیا۔ "دیکھو بہنیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور وہ بدا ہو جاتی ہیں۔"

ہاں۔ میں چپ ہو گیا۔

لاج نے مجھ سے کہا تھا۔ "کمال بھیّا: چمپا باجی ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دکھی ہوں گے۔" لاج میں یہ چھٹا حس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ لڑکیوں کی تھاہ کون پا سکتا ہے بھلا۔

"شنکر۔"

"ہاں یار۔"

"ہفتے کے روز۔ ریڈیو پر یونیورسٹی کا پروگرام ہے۔"

"ہوا پور ریڈیو رسٹی کا کانووکیشن۔"

"ہاں یار۔"

"تزئین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں۔"

"اسکرپٹ چمپا باجی کے پاس ہے۔ چلے جانا کیلاش ہوسٹل۔ کیا رکھا ہے۔"

جو بات میں ختم کرنا چاہتا تھا شنکر معاً اسی نقطے پر پہنچ گیا۔

"ہاں۔ نہیں۔ پتا نہیں۔"

یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔

ہاں۔ نہیں۔ پتا نہیں۔

ضرور جاؤں گا کیلاش ہوسٹل۔ واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر۔ وہ میرا کر ہی کیا سکتی ہیں؟ وہ پیلی رنگت والی دبلی پتلی لڑکی۔ متوحش آنکھوں والی۔ یونین میں تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ ابھی تک یہی طے نہیں کر پائیں کہ مسلم لیگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ ہر قسم کی عقل سے معذور۔ ایک ہزار بار سمجھایا ہوائی جہاز ایسے اڑتا ہے، ریڈیو ایسے بجتا ہے، گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے مگر ہر دفعہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ کہ میرے پلّے تمہارا سائنس نہیں پڑتا۔ وہ

کیا ادا ہے۔ جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں — مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے۔ مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار ہے کہ اگر بھولے سے باجی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔ میں بہت معمولی ہوں۔ انھوں نے بھیا سے کہا تھا۔ بھیا کون آئن سٹائن تھے۔ میں کون مارشل فوش ہوں پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرما رہے تھے تو لگتا تھا ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس اوف لارڈز میں بحث کی جا رہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھارھویں صدی کی نثر پر لیکچر دے رہے ہیں۔

اپّی نے ایسا کیوں کیا — میرا مطلب ہے — شادی سے انکار — شنکر نے دفعتاً سوال کیا۔ میں نے غصے سے دانت پیسے۔ میں اس شنکر سریواستوا سے عاجز تھا۔ جو بات میں سوچتا تھا وہ بے تار برقی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی — یا پہلے سے ہوتی تھی — ہمزاد کی طرح کہیں اس سے مفر نہ تھی۔ اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا پرم ہنس بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور ارجن کا درجہ رکھتے تھے۔ اکثر یہ رتبے ادلتے بدلتے رہتے تھے۔ جب سے چمپا باجی نے بنارس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشقِ حقیقی میں مبتلا ہوں۔ نہایت ڈھٹائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا: "چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہے — ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لائق — مگر یہ کہ —"

اور چونکہ اپّی سے بھیا کی منگنی ہو چکی تھی اور اپّی بھیا صاحب کو تمام ہندوستانی لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے دے رہے تھے لہٰذا یہ سچویشن بے انتہا کنجلک ہو گئی تھی اور یہ شنکر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں، اپّی کا اور ان کا کیا مقابلہ۔ پھر اسے بھیا صاحب کے اس چیپ تناتی پن پر سخت غصہ آتا کیونکہ لاج کی مانند اپّی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اوریجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھرکم تصورات لیے بیٹھے تھے۔

"اپّی کیا کریں گی؟ ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جا سکتیں۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے ایک وحشت خیز

خیال آیا — اپی — کیالاج کی طرح میں ان کو وداع نہیں کرسکوں گا۔ اپی کی شادی کس سے ہوگی؟ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہوگی؟ بھیا صاحب کس قدر کمینے، ذلیل انسان ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ اپی ہی نے انکار کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوددار ہیں۔ عزتِ نفس — خودداری — وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے، ہم سب کو بے حد اہم اور زوردار لگتے۔ ان کے الفاظ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ نہ مجھے نہ اپی کو — نہ غالباً چمپا باجی کو —

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مضافات میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس میں آم کے پتوں کی لہک تھی۔ اب میلوں دور تک عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آرہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پٹریاں۔ ریلوے ورکشاپ۔ کنارے کنارے پر پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے سامنے اینگلو انڈین بچے کھیل رہے تھے۔ پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی ہوئی چار باغ جنکشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کی سنگِ سرخ کی راجپوت، مغل طرز کی سینکڑوں فلک بوس برجیوں گنبدوں، میناروں اور شہ نشینوں والی طویل و عریض عمارات کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آگیا تو دل ڈوب سا گیا۔ ہم لکھنؤ پہنچ گئے — میں نے دل میں کہا — گھر آگیا۔ گھر —

پلیٹ فارم کے شفاف سرخی فرش پر لوگ نرم روی سے ادھر ادھر چلتے پھرتے تھے — چیخ پکار بھی لیکن اس شور و شغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں میں آتے تھے وہ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

اسٹیشن کی برساتی میں موٹر داخل ہوئی — جسے قدیر چلا رہے تھے۔

موٹر میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کا رخ کیا۔ شنکر کو سنگھاڑے والی کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل اندھیرا۔ جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد نہ آتا ہو۔ پھر یہ ذہنی بلیک آوٹ ختم ہوا اور کمال نے دوبارہ کہنا شروع کیا):

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے جب میں گھر پہنچا اپی اپنے کمرے میں بیٹھی اکنامکس کے

نوٹس بنا رہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ قدیر کی بی بی بڑی مصروفیت سے پان بنا رہی تھیں۔ میں کوٹھی کے خاموش کمروں میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر میں نے اکتا کر شنکر کو فون کیا۔ معلوم ہوا اسٹیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوسٹل پہنچا۔ وہاں مسز وانچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باجی ابھی نہیں آئی ہیں۔ وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں جھنسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا۔ وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں۔ وہ بھی بڑی مصروفیت سے اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔

دوسری کرسی پر بھیا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجیے، وہ تو یہاں موجود تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اٹھے اور "ہلو کمال، مسوری سے لوٹ آئے" کہتے ہوئے برساتی کی طرف بڑھے جدھر ان کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرے لمحے وہ پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

آخر میں ایک ڈک چیئر سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"بڑی گھام ہے" چمپا باجی نے بے دھیانی سے درختوں کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا اتنی جلدی اٹھ کر کیوں چلے گئے" میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہوا پور یونیورسٹی کا کانووکیشن — میں نے بیدلی سے دیکھا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے — یا تم — تم ان کے کزن ہو"

"بھیا — یہ اپنا پارٹ لیجیے"

"تمہارے گھر میں —" انھوں نے کاغذات اٹھا کر کہا۔ "میں نے اسے سنا ہے کہ ایک کرائسس آ گئی ہے"

"بھیا — یہ دوسرا اسکرپٹ کملا کو دے دیجیے گا"

"تمہارا ہمزاد ہری شنکر — تم نے اسے کہاں روانہ کر دیا — آیا نہیں تمہارے ساتھ"

"پتا نہیں کہاں ہے اس وقت — دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے"

"تم لوگ — کس قدر ڈریمٹک ہو"۔ چمپا نے کہا۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں۔ جیسے وہ ان کا ماتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آگیا تھا۔

"کہاں گئے ہیں تمہارے بھیا صاحب —"

ویسی — کیا اُداس تھی۔ ہم سب سے خفا تھی۔

اندر ریڈیو سے گیان وتی بھٹناگر کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون۔ اور شدید اضطراب — اور جولائی کی دھوپ۔

(پھر طلعت نے کہنا شروع کیا): فٹن موڑ پر سے اُترتی سڑک کے گڑھوں پر سے گزر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھارٹے والی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ یہ اس سال کی بات ہے جب اپّی کی منگنی ٹوٹی۔

لاج اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے زعفرانی ساری باندھی ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپّی اس کے ساتھ ساتھ برساتی میں آگئیں۔ اپّی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ خالی وہ لڑکیاں، جن کا بیاہ ہو جاتا ہے، یہ زیور پہن سکتی ہیں۔ جب اپّی کا بیاہ ہوگا اور یہ بچھوے پہنیں گی تو ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ساری کا پلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اڑسائے وہ مصروفیت، تمکنت اور گمبھیرتا کے ساتھ ادھر ادھر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔

مگر بیاہ کی تو آج قدیر کی بی بی کہہ رہی تھیں کہ اُنھوں نے منا ہی کر دی ہے —

میں گاڑی سے کود کر اندر بھاگی۔

"اپّی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن سے آکر کمال بھیا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکیلہ کو اتارنے کے لیے بھیسا کنڈ کی طرف سے گزری تو وہاں چمپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا۔"

"کون دونوں —"

"بھیا صاحب اور کمن بھیا — چھتریوں کے پیچھے۔ وہ املتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ماموں کے گھر میں، وہیں۔ ہماری فٹن سڑک پر سے گزرتی دیکھ کر انھوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلایا اور مسکرائیں — بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔" میں نے مستعدی سے ایک سانس

میں سب بتا دیا۔

اپّی اور لاج خاموشی سے روش پر سے گزرتی برساتی کی اور بڑھ گئیں جیسے انھوں نے میری بات ہی نہیں سُنی۔

میں چنبیلی کی جھاڑی پھلانگ کے نرملا کی اور چل دی۔ وہ اور مالتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں بیٹھی تھیں۔

"بھیّا تو مرزاپور اور دلّی گئے تھے نا" مالتی نے پوچھا۔

"ہاں صبح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں۔ اس کمرے میں ڈٹے ہوں گے۔"

"چمپا باجی کو اس روز میں نے گایتری کے گھر پر دیکھا تھا۔ لال ہری لہریے کی ساری پہنے اتنی سندر لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں" مالتی نے کہا۔

"بھیّا تو ہمارے لیے بھی اس قدر پیاری جے پوری چنری لائے تھے کہ بس۔ جب کمال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے۔ تب سے" نرملا نے رعب ڈالا۔

"چنریاں پہننا میں تو چھوڑ چکی ہوں۔ میرا جی اوبھ گیا ہے" مالتی نے لاج اور اپّی کے لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسا سندر لہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لیے۔ سیر بھر تو اس پر گوکھرو ہی ہوگی۔ قوال جنگل کشور کے یہاں سے" نرملا نے اطلاع دی۔

یہ گوکھرو اور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دیوالی، عید، بقر عید۔ اور بس۔ اپّی وغیرہ کے ٹھاٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لیے ایک سے ایک بڑھیا ساڑیاں اور ڈھیلے پائجامے اپنی الماریوں میں سے نکالتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا ٹیونک لادا اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آکر دوسرا کوئی منحوس فراک پہنا اور رات پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اور پیٹرول راشننگ ہوئی تھی منٹی ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موٹر صرف والدین کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ عید، بقر عید اس زبوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنوا دیا جاتا۔ اب اسے لادے، ہاتھوں میں ڈھیروں چھما چھم کرتی بنارس کی نگوں والی چوڑیاں پہنے بیگمات کی طرح کھٹّے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دہاڑتا۔ سُنا ہے آج برجی کی ساری کاجل

کی دکانوں میں ڈاکا پڑ گیا — بھیّا صاحب فرماتے — یہ کاجل کی لکیر کے ایکسٹنشن کا کیا مقصد ہے — اگر ڈھیلا پائجامہ پہننا ہے تو قرینے سے بیٹھو، درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو، نیک بختو۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تیج تہوار کا من یوں فضیحتے میں کٹتا۔ پھر نرملا کی اجار[۱] اور ہمارا ڈھیلا پائجامہ اگلے تہوار کے لیے اٹھا کر رکھ دیے جاتے۔ دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نرملا اور مالتی جب چڑیلوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نرملا نے گہنوں کا قصّہ نکالا۔ اس بھات پر تبصرہ کیا گیا جو دبے ماما لاج کے لیے لانے والے تھے۔ اس میں زمرّد کا جگنو کس قدر خوبصورت تھا۔ ہمارے ممّاں بھی جو بھات لے کر آئیں گے اس میں زمرد کا جگنو ہوگا۔ پھر اپی کو زبردستی سارے گہنے پہننے ہوں گے۔ بھیّا صاحب ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے، جیسے نرملا کی کزن رامیشوری کا دولہا آیا تھا۔ اپی کے چہرے پر وہ سفید سفید بندکیوں والے نقش و نگار کتنے خوبصورت لگیں گے اور افشاں اور سیندور۔ پھر چھاج میں سات قسم کا اناج رکھ کر اس میں دیا جلایا جائے گا اور اپی کے ہاتھوں میں چاندی کا کنگنا باندھا جائے گا اور امام باندی منگل گائے گی اور بھیا صاحب دُولھا بن کر کیسے لگیں گے —

مگر اسی وقت مجھے قدیر کی بی بی کی بات یاد آئی۔ جب میں کالج سے لوٹ کر جامکی میز پر بیٹھی تھی تو قدیر کی بی بی نے مکھن دانی سامنے رکھتے ہوئے بڑے پُراسرار انداز سے مُنہ لٹکا کر کہا تھا۔ — بڑی بٹیا نے بیاہ کے لیے مناہی کرا دی —

"اپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا ساری بنواؤں گی — کارچوبی —" نرملا کہہ رہی تھی۔

پھر دفعتاً طلعت خاموش ہو گئی۔ "دیکھو،" اس نے کمال سے کہا، "میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔"

"میرا ماضی محض میرا ہے۔" کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

"اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔" ہری شنکر کی آواز گونجی۔

"لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدہ بازی

۱۔ ازار۔ یو۔ پی۔ کی غیر شادی شدہ کائستھ لڑکیوں کا پائجامہ جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا۔

نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔" طلعت نے اداسی سے کہا۔" میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔"

"تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا۔" ہری شنکر نے کہا۔

"میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ؟" کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔

"وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔" طلعت نے کہا۔

یہ لوگ، جو لندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے ۱۹۵۴ء میں یہ باتیں کر رہے تھے، ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ موٹریں آ جا رہی تھیں۔ ریڈیو میں سے دی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آ رہی تھی۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۰ء کی جولائی میں سنگھارے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ مہاتما بدھ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ پہاڑوں پر گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ اندھیرا۔ وقت جو سیال تھا۔ وقت جو برف میں منجمد تھا۔

"ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا، "کیونکہ ہم بہت خوفزدہ ہیں۔"

"ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔" طلعت نے کہا۔

"اور اگر تم نیلمبر کا ذکر یہاں نہ کرنا۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔" کمال نے کہا۔

"میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا۔ اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنجینے ہیں تب یہ تینوں مر جائیں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔" ہری شنکر نے کہا۔

(وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی

اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے۔ اور آگے ۔۔۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑیوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

(۳۶)

لکھنؤ۔ ۱۹۴۰ء۔

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں دیے جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ شیڈ پر برساتی پروانے چکر کاٹ رہے تھے۔

لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

سیتل پاٹی پر اودے رنگ کا کم خواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ بڑے اہتمام سے طلعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طلعت بڑی ماہر فن سمجھی جاتی تھی۔ لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ قریب ہی مالتی رائے زادہ بیٹھی تھی۔

پھر جب رات زیادہ ہو گئی تو پیچھے سے گنگا دین نے، جو اب تک حوض کی منڈیر پر بیٹھا جمنا مہری سے باتیں کر رہا تھا، آواز لگائی ۔۔۔ بٹیا اب چلیے ۔۔۔

مالتی کو شہر جانا تھا۔ وہ بارود خانے میں رہتی تھی۔

"بھیتیں آ جائیں تو موٹر سے تم کو پہنچا آئیں گے۔" لاج نے اس سے کہا۔

طلعت ان سب کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتری اور اب نش نے رائے بہاری لال روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد نش ایک بڑی سی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ پلنگ کے قریب ٹیبل فین رکھا تھا۔ صراحیاں گھڑونچی پر دھری تھیں جن پر چنبیلی کے گجرے

لیٹے ہوئے تھے۔ چبوترے کے سرے پر چھت والا راستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باورچی خانے کی طرف جاتا تھا۔ ادھر سے بگھار کی خوشبو آ رہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی بچھی تھی نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جگمگا رہے تھے۔

"کمو۔ گوٹ تراش آئیں ـــ" اماں بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائینچے سمیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اللہ رحم کرے ـــ لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختۂ مشق نہ بناؤ ـــ بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے الّلے تلّلے نہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برابر کر دو تو نئے بنوا دیے جائیں گے۔" کمال نے کتاب پر سے سر اٹھا کر آواز لگائی۔ وہ برآمدے میں در کے قریب ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہا تھا۔ اپّی کھانے کے کمرے میں کچھ سٹر پٹر کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لیے جب وہ باورچی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طلعت نے اُن کو آواز دی ـــ

"اپّی! کل لاج نے تم کو بُلایا ہے۔"

"اچھا۔" وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

"لاج باہر نہیں نکلتی ـــ کیا ابھی سے مائیوں بیٹھ گئی ہے؟" خالہ بیگم نے پوچھا۔

"جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تُک ہے۔" کمال بڑبڑایا۔

"گونا تو اس کا بی۔ اے کے بعد ہوگا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیے۔ نکاح ہو جائے۔ رخصتی اپنے جب دل میں آئے ہوتی رہے گی۔" خالہ بیگم نے کہا۔

اپّی کے بیاہ کا مسئلہ پھر سے چھڑ گیا۔ طلعت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان "گلفشاں" کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی۔ دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں ان کے پھاٹکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقعیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام۔ لوگ۔ خاندان۔ وجود کے تانے بانے۔ جھمیلے۔ گلفشاں کے پھاٹک کے اندر ایک حوض تھا اور سیمنٹ کی ایک نالی، جو ستونوں پر بنی تھی، باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موٹر لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے

کی فرنچ کھڑکی پڑتی تھی جس میں اسٹینڈ پر آفتابہ رکھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فرنچ دریچے میں سے جھانکو تو اندر کھانا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں شیشے کے لمبے لمبے دریچے تھے۔ گول کمرے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھیا صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا جہاں برساتی تھی۔ اس کے آگے موٹر خانے کی طرف سڑک جاتی تھی پھر عقبی حصے میں دالان تھے۔ ان کے بعد شہتوت کے درخت اور اس کے پیچھے سیمنٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کاٹیج کی وضع کا تھا۔ یہاں سرکنڈے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لیے آنگن بنا لیے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھوبیوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گمٹی۔ ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاط گنج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آکر والی بال کے دو کھمبے نصب کر لیے اور ایک شکستہ جالی ان کھمبوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے وہ 'غریب غربا' آکر والی بال کھیلا کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں۔ طلعت پچھلے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم ورک کرتی جاتی۔ عقبی لان کے وسط میں چوڑی سی روش تھی۔ رام اوتار مالی گھٹنوں کھرپی لیے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا۔ کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی گھونس کر آسمان کو دیکھتا رہتا اور طوطوں کو آم کے درخت سے اڑانے کے لیے عجیب و غریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا۔

احاطے کے پیچھے ایک مندر بھی تھا جس کے گھنٹے ٹناٹن بجا کرتے۔ مندر کے کنارے دھوبیوں کے چودھری کا پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازابلا تھوبرن کالج کی عیسائی لڑکیاں دھوبیوں کی بستی میں تبلیغ کے لیے آتیں۔ اور دو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برابر کی کوٹھی میں چکرورتی صاحب تھے جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کا نام اونیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا جو سونے کے بنگالی وضع کے ٹوپ پہنتی تھی جس میں جھالر لگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔

اونیل کالج میں اپنے حسن کے لیے بہت مشہور تھا اور سنا گیا تھا کہ سُجاتا سے اس کا بیاہ

ہو گا۔ سماتا اور رنند بالا دو بہنیں تھیں جن کے باپ یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس داں تھے۔ سماتا گلفشاں سے پڑوسی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور برناتی رہتی تھیں۔ یہ تو ام بہنیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کرشنا پرم ہنس کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کو جسپالز کی کوٹھی تھی جن کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن و ذہانت کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھاٹکوں سے نکل کر ازابلا تھوبرن کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے۔ باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں، مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنیچر، ان کے باغوں کے پودے، ان کی کتابیں لباس — سب چیزیں ایک سی تھیں — ان کے ملازم، ان کے نام، ان کی دلچسپیاں —

طلعت کے یہاں کا خانساماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانساماں تھے۔ اس کا نام حُسینی تھا۔

سارے باورچیوں کے نام حسینی، حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے دھوبی نتھو کہلاتے ہیں۔ سب کو چوان گنگا دین ہیں۔ ساری نوکرانیوں کے نام بلاقن، رسولیا اور حمیدن کی ماں اور منجو النساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدل کہلاتے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں وائلن نواز ادیبا کرٹونی ہوتا ہے سارے بابوں کا نام خان بہادر لقتی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے بابوں کا نام بھی یہی ہوتا ہے، اصلیت والے بابوں کا بھی۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھر اُدھر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طلعت کا ایک پرانا اوور کوٹ دے دیا تھا جس کے کالر پر فر لگی تھی۔ اب فر کا فیشن ختم ہو چکا تھا لہٰذا طلعت اسے کہاں پہنتی۔ اور حسینی صبح صبح باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں سوں سوں کرتا گزرتا اور سودے کے پیسے لینے کے لیے کمرے میں آتا ــــــــــ اب وہ فاختئی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدیر اس پر خوشدلی سے ہنستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔

ہٹ جاؤ راستے سے۔

قدیر موٹر ڈرائیور، جب طلعت چار سال کی تھی، کمال آٹھ سال کا اور بھیا صاحب ابھی سوئٹزرلینڈ میں تھے، تب آن کراں کے یہاں نوکر ہوا تھا۔ قدیر مرزاپور کا رہنے والا تھا اور بے حد دلچسپ۔ اس کی بیوی کا نام قمرالنسا تھا اور بچے کا پھمّن۔ جب طلعت کے بڑے ابا اٹاوے میں تعینات تھے، تو ایک مرتبہ پھمّن کو ضلع کے بے بی شو میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھیے کیا انعام ملا۔ ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساڑی اور ایک جھنجھنا۔ قدیر کے یہاں اس روز عید ہوگی۔ پھر ایک روز قدیر کو کیا سوجھی کہ کیمرہ لوں گا۔ انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بٹیا۔ اے بیگم صاحب — یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو، میاں قدیر تم کیمرہ کیا کرو گے؟ بیگم صاحب، پھوٹو کھینچا کروں گا۔ خدائے سے مجھے پھوٹوگرافی کا بہوتے شوق ہے — پھر قدیر نے اپنی تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سو روپے کا کیمرہ منگوایا اور تین ٹانگوں والا اسٹینڈ اور مور اور محل والے پردے۔ اب دونوں میاں بی بی نے شاگرد پیشے کے آگے سرکنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور گھر بھر کی تصویریں کھینچنی شروع کر دیں۔ ہائی پو۔ اور یہ اور وہ جانے کون کون لوازمات منگوائے گئے۔ انھوں نے امّی اور بھیا صاحب اور طلعت کمال اور سب کی سینکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ تصویروں کے لیے قدیر کا بڑا زوردار تخیل تھا۔ امّی بیٹھی ستار بجا رہی ہیں۔ پیچھے پردے پر مور ناچ رہا ہے۔ محل کے اوپر چاند نکلا ہے۔ حوض پر پریاں کھڑی ہیں۔ امّی قلم ہاتھ میں لیے مفکرانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔ کمال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنبھالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور امّاں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نرملا اور لاج، رادھا اور کرشنا کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرملا کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ سخت ٹیکل والا کرشنا کا پوز۔ ہری شنکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق قدیر کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی من مانی کرتے تھے لہٰذا ان کے موڈلز کو بلا چون و چرا کیے ان کا حکم ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھو رہے ہیں، سکھا رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویریں بنتی تھی۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو نوکروں کے کاٹج سے قدیر کے آہا گانے

کی آواز بلند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں کدیر دہلیز پر اکڑوں بیٹھے پٹرول کا خالی ٹین بجا رہے ہیں۔ کمرن ایک طرف کو بیٹھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا، فوراً پیتل کی پن ڈبیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ کمرن پورب کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانولی، سلونی اور سگھڑ بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور نرملا کی والدہ سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ اکثر سنگھاڑے والی کوٹھی بلوائی جاتیں یا جب مسز رائے زادہ گلفشاں آتیں تو فوراً کمرن کی طلبی ہوتی۔ رنگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باندھے، جس کا پلو سامنے پڑا ہوتا، گھونگٹ نکالے وہ روش پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے چھاگجھن اطلاع دیتے کہ بہن کمرن النسا آن پہنچیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن کمرن کے پاس جو پورے اٹھارہ روپے میں خریدی گئی تھی اور وہ بھی کلکتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی کے زیور پہن کر گھونگٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مہمان بیبیوں کا استقبال کرتیں، ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمرن اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے ضلع کی کسان سبھا میں شامل تھے اور چرخے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پلٹ بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے درپے تھا، گاؤں گاؤں گھومتا تھا، کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہو سکتا تھا؟ اسی لیے جب گلفشاں کے لان پر کمال کے دوست احباب سوشلزم پر لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی بہانے سے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار، ٹھاکر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے تو قدیر کو کلکتے جا کر کلینری کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے لالے پڑے تھے۔ ان دنوں، یعنی سنہ ۳۱ء کے لگ بھگ، کانگریس نے تحریک چلا رکھی تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور زمیندار ایک طرف تھے، کسان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک زمانے میں قالین بھی بُنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی۔ مگر اب جو کچھ لکھنؤ شہر میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا۔ بے اطمینانی

اور انتشار کی اصل وجہ اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تاکہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہوجائے۔

شہر میں رہ کر کرن کو اپنے مرجاپور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔ رام سیتا کی جوڑی ایسی۔

قمرن ابھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ، گونا سب ہوگیا تھا۔ یہ شارد ا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غربا، گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں! بی کرن اب مربھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ تقدیران سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دونوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ویسے بی کرن دوسرے ملازموں کی بیبیوں سے میل جول نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موٹر ڈرائیور کی اہلیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانا پکانے، جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر پھندن کو گود میں لیے کوٹھی میں آجاتیں اور اماں بیگم کے بیڈ روم میں محفل جمتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹی رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی ہی پر آڑی آڑی لیٹی ہیں۔ کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم دراز ہیں۔ پاندان سامنے رکھا ہے۔

”آگئیں تقدیر کی بی بی — آؤ — بیٹھو۔“

قمرن بڑی نزاکت سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھندن کو ایک طرف سلا دیا۔ باجی اماں نے پان بنا کر بڑھایا۔

”کہو بی، آج کیا پکایا تھا؟“ خالہ بیگم پوچھتیں۔

”ارہر کی دال بھات اور منگوچیاں، بیگم صاحب —“

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور گھی کے نرخ پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آجاتی۔ شادی بیاہ کے قصے۔ کنبے کی سیاسیات۔ کس کی شادی کس سے ہورہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر لیٹے لیٹے کجریاں گنگنانا شروع کر دیتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام — تو بی کرن ان کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی پر سنگیت میں گا لیتیں۔

گانے میں میاں تقدیر استاد تھے۔ نوشکی کے گانے، تھیٹر کی غزلیں (ایں فیشن سے پوزیشن سے

کھاؤں مٹن چاپ)، کجریاں، بارہ ماسے، واد رے، ٹھمریاں، برہا، آلہا اودل — ہر چیز کے بادشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

اٹھاؤ نہ کھنجر مڑے گی کلائی
گلا کاٹو تا جک بدن دھیرے دھیرے

اور

شب غم کی آہیں بسر ہو رہی ہیں
مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پیٹرول کے ٹین پر آکر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے جو صرف ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی محفلوں میں پڑھا کرتے — ایک تھا:

عطر غلاب خوشبو لونڈر نے چھین لی
جنتری کی تمام کھبریں کلنڈر نے چھین لی

قدیر کلکتہ پلٹ تھے لہٰذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے کلکتہ دیکھا جانو لندن، پیرس، ساری دنیا دیکھ لی۔ کمال اور طلعت وغیرہ کے بچپن میں وہ اکثر اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے ان کی باتیں گرہ میں باندھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنارس کی ایک تارکول کی سڑک پر قدیر بچوں کو موٹر میں بٹھلائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طلعت نے نہایت مفکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا: "یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی بنتی ہوں گی۔ ہیں نا قدیر —"

"جی ہاں۔ بٹیا —" قدیر نے گلا صاف کر کے اسی مفکرانہ انداز میں پیچھے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا: "ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچی سڑک پر پالش کرنے کا ایک ہی روپیہ خرچ بیٹھتا ہے۔"

"افوہ —" پچھلی سیٹ پر سے حیرت و استعجاب کا کورس ہوا۔

"وہ کیسے قدیر —" طلعت نے پوچھا۔ وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔

"اب یہ دیکھ لیجیے —" قدیر نے بڑی متانت سے جواب دیا، "جیسے ایک ایک روپیہ کر کے سڑک پر بچھاتی چلی جائیے، اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں —" اور وہ کھنکار کر غور و فکر میں ڈوبے موٹر چلاتے رہے۔

ایک بار انھوں نے بتلایا کہ کلکتے میں صاحب لوگوں نے یہ ڈھونڈیا بیٹھی کہ جو ذرا دیر موٹر سے

مُرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام۔ بڑے بڑے دریبر آئے۔ مہاراجہ بڑودہ کا دریبر اور بنگال کے لاٹ صاحب کا دُریبر۔ مُرغی سڑک پر چھوڑی گئی۔ کوئی نہ مار پایا۔"

"تم نے مار دی ہوگی۔" طلعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بٹیا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"انعام کا کیا کیا؟" کمال نے پوچھا۔

"دریبر کی بی بی کے لیے سونے کے بندے بنوا دیے۔"

قمرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں قدیر بھی اسی نام سے مخاطب کرتے۔

تیسرے پہر کو کمال اور اپّی اور طلعت اور بھیّا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے لوٹتے۔ گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں برتن کھنکھناتے۔ چاء کی کشتیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجی جاتیں یا سب اماں بیگم کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ ایک پیالی چاء قمرن کو بنا کر دی جاتی۔ اپّی اور طلعت ان سے کچھ تبادلۂ خیالات کرتیں۔ اتنے میں موٹر برساتی میں داخل ہوتی۔ قدیر، خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے۔ موٹر کی آواز سن کر قمرن گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور بھیّا کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کاٹج کی طرف روانہ ہو جاتیں۔

وہ بے حد وضعدار آدمی تھیں۔ برسوں اودھ میں رہ لیں لیکن اپنی خو بُو نہ چھوڑی۔ ایک مرتبہ سیبنی خانساماں کی بی بی نے ان سے کہا — اے بہنی۔ کبھی کھڑے پائنچے بھی تو پہن کر دیکھو۔ اور قمرن نے ہونٹ بچکا کر جواب دیا تھا — ہم کوئی بٹریاں ہوں — جو ای پہناوا پہنی — لہٰذا بہن قمر النساء اپنی گاڑھے کی سفید دھوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہریوں کی طرح انھوں نے آتی ہوں، جاتی ہوں والی زبان سیکھی جب انھوں نے پہلی مرتبہ لکھنؤ کی لڑکیوں کی گفتگو سنی — بڑی بٹیا اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں — "اللہ آپ کہاں جاتی ہیں حضور، جائے آپ کا دین ایمان۔ یہ اپنی ادائیں تو رکھیے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ ذری میرے دماغ میں بھی خناس ہے۔" — اور کوٹھی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا، مہریاں اور ماما ئیں تک ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں — تو قمرن حیران پریشان کھڑی سنا کیں۔ شاگرد پیشے میں واپس آکر قمرن خوب ہنسیں۔ قدیر جب باہر کے کام نمٹا کر آئے تو ان سے ماجرا بیان کیا۔

۱۔ اس زمانے میں سونا پچیس روپے تولہ تھا۔

شبرن کی بیٹیاں پُتریں ایسی ہوتی ہیں۔ سارا پہناوا بھی پُتریں ایسا ہاٹے۔ تدیران کے اس بھولپن پر ہنست ہنسے اور ان کو دنیا کے حالات سے آگاہ کیا کہ یہ پُتریں کی بولی نہیں، یہ ٹکسالی اور بیگماتی زبان زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی اب اسی طرح بولا کرو: آتی ہوں، جاتی ہوں۔ اب تو خیر ان کو لکھنؤ میں رہتے دس سال ہوتے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی سے ان کی دوستی نہ ہو سکی۔ حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنوا ہونے پر ناز تھا۔ ان کے دادا پردادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے۔ قمرن بے چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قمرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انھوں نے بھی مؤخر الذکر خاتون کا کبھی نوٹس نہ لیا۔ ان کی تو نرملا اور لاج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گوئیاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا ناطہ بڑی چیز ہوتا ہے۔ کہاں رم دیا ذات کی اہیرن، رام اوتار مالی کی بی بی۔ صبح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طلعت کی آپا سوسن کی طرح فلمی گانے گا سکے۔ نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھرسوان پائجامہ پہن کر ٹھمک ٹھمک چلنا اسے آئے۔ مگر وہی ہم وطنی۔ پردیس کی اس اجنبی دنیا میں رم دیا ہی قمرن کا دُکھ سُکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مالی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن کمرن النساء کی ہمجولی تھی تو رم دیا۔ رم دیا گورکھپور کی رہنے والی تھی۔ قمرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ، گونا سب ہو گیا تھا۔ رام اوتار اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قمرن کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتارا سے اکّے پر بٹھلا کر اسٹیشن سے لائے تھے۔ وہ رام بانس کی سُرخ ساری پہنے چکو پیکو روتی اتریں۔ پہلے انھیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبیوں کے لیے موضوعِ گفتگو اور لڑکے بالوں کے لیے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دلہن۔ سب سے آخر میں قمرن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دیس کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مسماۃ ہرقیا مرزاپور ری میں قمرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ لے لیجیے یہ تو بی رم دیا سے سمدھیانے کا رشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قمرن گوئیاں تھیں۔ چھوت چھات کے باوجود آپس میں لین دین بھی رہتا۔ قمرن رم دیا کی ہتھیلی پر چائے کی پتیاں اوپر سے رکھ دیتیں۔ لیو — کوٹھریا ماجائے کے چاء بنا کے پی لیو — اسی طرح پھل پھلاری امرود گنے سنگھاڑے۔ سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی۔ جاڑوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے پچھواڑے پھلواری میں قمرن اور رم دیا کھاٹ پر بیٹھی باتیں کیا کرتیں۔ ساریاں ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں۔ چاول بینے جاتے۔ قمرن رم دیا کو کروشیا سکھلاتیں۔

کبھی کبھی حسینی کی بی بی جو ہی خانم ادھر آنکلتیں اور دیکھتیں کہ دونوں بو بیٹیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پر منگوچیاں سکھا رہی ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کر سوسن یا زمرد سے کہتیں —— دربہر کی بی بی نے بھی کیا اہیرن سے پہناپا گانٹھ رکھا ہے۔

پھر جب پکار فلم نئی نئی آئی اور اس کا ریکارڈ کوٹھی میں پہنچے تو ایک گانا قمرن کو بیحد پسند آیا —— دھوبن کا گانا جس میں مرزاپور کا نام آتا تھا۔ مرجاپور میں اورن ٹھوبلن کاشی بہارو گھاٹ —— قمرن طلعت کے کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں بٹیا وہ دھوبن والا توا پھر بجائیے —— اس کے علاوہ کنگن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا —— ارے رے کبیر سن رے کبیر۔ رتیا کی جورو نے لوٹا بجار۔ اس میں رتیا کی بی بی کے بجائے قمرن، حسینی کی بی بی گاتیں اور بہت خوش ہوتیں۔ جواباً حسینی کی بی بی کسی دوہے میں قمرن کا نام چپکا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلا کرتی۔

گنگادین سائیس ابھی بیچلر تھا لہٰذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کہاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتار تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گورکھپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطریں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا، دو تین برس میں بڑی ہو جائے گی۔ مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنگادین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سرپا استوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیرویں اڑ رہی ہے: دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چاد کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں ملا رہے ہیں۔ طلعت تو باقاعدہ میرس کالج میں داخل تھی لیکن کمال اور راتی سارے کزن لوگ پانچوں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں۔ امام باندی میراسن مع اپنے خاندان کے تقریبوں کے موقعے پر آکر منقول گلفشاں میں بجتی تھی۔ سوسن اور زمرد داورے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جنگل بنا ہوا تھا۔ پھر جب قدیر نے فوٹو گرافی شروع کی تو فی کس ہر طرح کے کیمرے ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہے۔ بلی کتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طرح گرام سدھار کا سلسلہ کچھ عرصے چلا۔ تعلیم بالغاں کی تحریک از ابلا مقوبرن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر لڑکی پر ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم از کم دو ان پڑھ لوگوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کیمپس پر کالج کے ملازموں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو اس

پاس سے غریب غربا، آکر گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیمپ کی روشنی میں الفاظ کی ہجے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یاب کرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیمپ بہت مدھم تھا مگر غریب غربا نہایت ذوق و شوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدیر سخت کند ذہن ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت پیپیر پر تھے، ان خرافات میں کیا پڑتے۔ گنگا دین البتہ انگوچھا سر پر لپیٹتا سب سے پہلے تعلیم بالغاں کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پستک بھنڈار سے ہندی کا قاعدہ خرید لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت پڑھ گیا تھا۔ فر فر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی مڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگا دین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیانوسی تجویزیں سُنی ان سنی کر دیتا۔ اوروں کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرتے ہیں تو ہم کاہے کریں۔ اسے طلعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگا دین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جاں نثار خادم۔ لڑکپن میں وہ سائیس کی حیثیت سے آیا تھا۔ ممّو کے مرنے کے بعد اسے کوچبین کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فٹن سے بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدیر کی شیورلے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

یہ فٹن بڑے ابّا مرحوم کی تھی یعنی بھیّا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھیا صاحب گلفشاں میں رہنے کے لیے آئے اور سارے ساز و سامان کے ساتھ فٹن مع گنگا دین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پٹرول راشننگ شروع ہوئی تو دفعتاً گنگا دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدیر کو طعنے دیا کرتے: چلاؤ نا اپنی موٹریا۔ ہمیں دیکھو۔ ہٹلر کا کھٹکا نہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندناتے ہیں۔

گنگا دین بھیا صاحب کا رفیقِ خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ بہرحال ان کے مرحوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں آیا تھا۔ اکثر بڑے سرکار کو یاد کر کے روتا۔ اپّی اور بھیا صاحب کے بیاہ کے سلسلے میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا کیونکہ گو دنیا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہیے لیکن بھیا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیرے کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور مرنجان مرنج فلسفی قسم کے انسان تھے۔ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی مفصّل سوالات کا صرف جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی نہایت وضعدار آدمی تھے۔ بلّی تک کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آگئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب،

دودھ ابھی انھوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ گئیں۔

(۳۷)

سنہ چالیس کے دسمبر میں طلعت کو جونیئر کیمبرج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونیہ ہوگیا۔ روتے روتے اس نے بُرا حال کرلیا۔ ہمارا ایک سال برباد گیا، ہمارا ایک سال برباد گیا کی رٹ لگائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ کمال اس کے لیے کہیں سے ایک پروجیکٹر اٹھا لایا۔ وہ نوابوں کی طرح تکیے کے سہارے بیٹھ جاتی اور دس سال پہلے کی خاموش فلمیں ملاحظہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتوں کے سائے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ رڈولف ویلینٹینو، ڈگلس فیر بینکس، گلوریا سوان سن۔ وہ دس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلوچنا گھوڑے کی سواری کرتی اور ای بلی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اس کی سہیلیاں ٹہلتی ہوئی آجاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسمارٹ، باوقار اور سنجیدہ لڑکیاں تھیں۔

دن بھر طلعت پلنگ پر لیٹی رہتی یا گنگا دین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اُس نے کمال، ہری شنکر، بھیا صاحب اور ابّی کی بھیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مداوا کس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیمار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا: ”طلعت — اتینت مسور کھ کنیا اسی“ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنسکرت بولی۔

”کیوں۔“

”مت رو ہے سُندری — مت رو۔“

”کیوں نہ روؤں۔“

”اس لیے نہ رو کہ تیرے کلیان کی ہم نے دیو ستھا کرلی ہے — ہم تیرا داخلہ ٹنڑ والے اسکول میں کروا رہے ہیں۔ تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لامارٹینئر کے قدیمی اسٹینڈرڈ میں گھس گھس کرنے کے بجائے آئی۔ ٹی۔ کالج میں دندناتا۔“

”رگھبیر ماما کے اسکول میں —؟“ طلعت نے سانس روک کر پوچھا۔

"ہاں۔" ہری شنکر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دوسرے دروازے سے غائب ہو گیا۔

نرملا کو جب معلوم ہوا کہ طلعت ہائی اسکول کا امتحان دے کر آئی۔ ٹی۔ پہنچنا ہی چاہتی ہے تو اس نے منامنتھ مچا دی۔ لہٰذا لامارٹینیر چھوڑ کر طلعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹیگور والا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔ لال باغ میں بیرو روڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقتوں کا بڑا پھاٹک، برجیاں، شہ نشین، غلام گردشیں اب تک موجود تھیں۔ اس کے آگے بڑا لان تھا۔ عمارت کے گرداگرد چٹائی کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں جن پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ یہ رگھو ماما کا اسکول تھا۔ بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور گنی چُنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔ برابر کے مکان میں رگھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔ یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے۔ پرانے مدرسۂ فکر کے کائستھ۔ لڑکیاں، شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کی سپتریاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور یہاں زیورِ علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں استاد اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناطہ تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضعداریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ موسی، ماما، باجی، آپا، دیدی، بھیا — اسی طرح حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔

بعض لڑکیاں بے حد دلچسپ تھیں، مثلاً حمیدہ بانو جو وسط شہر کی ایک زبردست محلسرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ بینا ماتھر کتھک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے بڑے بڑے کپ اٹھا لاتی تھی۔ مہر آرا ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواص ان کی خاصدان لیے ساتھ ساتھ رہتی اور پیچھے کھڑے ہو کر انھیں پنکھا جھلتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سو پشت سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی، اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جتھہ بندی تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری بچھی تھی۔ اس کے برابر کی برجی میں تنگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھٹی کے گھنٹے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو، جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا، اپنا سر ہلا کر بڑے پُراسرار انداز میں کہتی: "شاہِ زمن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی جہری کو بادشاہ کے آدمیوں نے اسی زینے پر قتل کیا تھا۔"

"کیوں گپ مارتی ہو۔" کسم بحث کرتی، "کون اشرف النساء بیگم۔ وہ جان ہاپکنز والٹرز کی لڑکی؟"

"ہاں وہی۔"

"وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔"

"اپنی ماں سے لڑ کر یہاں چلی آئی تھیں — مجھے معلوم ہے۔"

حمید بانو سے لکھنؤ کی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنؤ کا کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہوگا اور یہ غائب ہو جائے گی۔ طلعت کو یقین تھا کہ بڑی ہو کر حمید بانو، بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

پھر گھنٹہ بجتا اور رگھو ماما کی بی بی اپنے رسوئی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں —— اری لڑکیو — چلو باٹنی پڑھنے — یہ کانتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سان وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ بی بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ ایس۔ سی ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈلسٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسوئی گھر میں جا گھستیں اور رگھو ماما کے لیے کھانا بنانا شروع کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب، جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے، بیمار پڑ گئے۔ رگھو ماما نے نرملا سے کہا: "ذری ہری شنکر سے کہہ دینا آکے اردو فارسی پڑھا جایا کریں۔" چنانچہ اگلے روز ہری شنکر بہت رعب داب سے کھنکھارتے ہوئے کلاس میں آئے اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ بنارس یونیورسٹی کے مولوی مہیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔ لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔ اردو کے گھنٹے میں بسنتی مہری باغ میں آکر لڑکیوں کو مطلع کرتی —:

"بٹیا چلیے — چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔"

لہٰذا ایک ماہ تک جب تک انھوں نے اس جامعہ میں درس دیا یہ افیشیل طور پر مولوی ہری شنکر کہلاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوٹے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ کانتی دیدی بوٹنی پڑھاتی تھیں۔ ان کی خالہ زاد بہن جوگیشوری دیدی سنسکرت کی استاد تھیں۔ مالتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبۂ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اردو فارسی پڑھا ہی رہے تھے۔ حالات قابو سے باہر اس وقت ہوئے جب مس سونا داس

کی شادی لال باغ کے میتھوڈسٹ چرچ کے آرگنسٹ مسٹر جان فضل مسیح سے قرار پائی اور انھوں نے ایک مہینے کی چھٹی لی تو رگھبیر ماما نے طلعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے۔ کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پُرلطف ثابت ہوئی کہ جب مسز فضل مسیح تنگ آستینوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے پہنے واپس آگئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا اور انھوں نے گھڑونچیوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طلعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لیے رگھو ماما کی رسوئی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔ اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں طلعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسیح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طلعت اپنی اکلوتی نیلی کارچوبی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤنڈ گئی کیونکہ اس روز سے پہلے طلعت نے ساری کبھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہوگئی ہے۔

حضرت گنج میں انگریزی دکانوں کے درمیان ایک بڑا سا شاہی کے زمانے کا پھاٹک ہے جس کے اندر وسیع احاطے میں سامنے ہی اودھ کے دسویں حکمران امجد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام باڑہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور نحوست برستی ہے۔ اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں ان میں اب نچلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے باغیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائنگ روم ہیں جن میں کاٹیج پیانو رکھے ہیں اور کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں۔ عیسائی عورتیں نیچے نیچے فراک یا اٹنگی ساریاں پہنے اپنے باغیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کودتا دیکھتی ہیں۔ یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جینز پہن کر ناچتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دور تھا۔

مقبرہ سال بھر اجاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں اس میں چہل پہل ہوتی۔ تب یہاں بڑی زبردست زنانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں۔ امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھریوں اور تہہ خانوں میں عیسائی فقیرنیاں رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جنرل اوٹرم نے لکھنؤ پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنا لیا گیا تھا اور لارڈ کیننگ اس میں

عبادت کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔

یہاں سابق مس مونا داس اور موجودہ مسز فضل مسیح نے اپنے چھوٹے سے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں اپنی طالبات کو چاء پلائی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ، جو وہ راستے میں امین آباد سے خریدتی لائی تھیں، ان کو پیش کیا اور سب نے مل کر انگریزی گیت گائے۔

لا مارٹینیئر کے خالص یوریشین ماحول کے بعد ٹیٹر والا اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ طلعت اور نرملا اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دورنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یوروپین تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اس طبقے میں بچے bilingual پیدا ہوتے تھے۔ انگریز گورنسوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انائیں ان کی پرورش کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دلہنوں کی طرح شرماتی تھیں۔ اکثر ان کی شادیاں ان کی خلافِ مرضی بھی کر دی جاتی تھیں۔ یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن الٹرا موڈرن نہیں بنے تھے۔ اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی قدیم روایات کے بھی بڑی شدّومد سے پابند۔ ظاہری طور پر انھوں نے مغربیت کا رنگ قبول کر لیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دوراہے پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ یہ برطانوی نوآبادیاتی سماج تھا جو جاگیردارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح کا دوغلا ماحول ملایا اور انڈونیزیا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور کلکتہ اور بمبئی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یورپ کی مکمل نقالی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک یہاں چلی تھی۔ اب ہندوستانی موسیقی اور ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی طرزِ معاشرت پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب مغرب زدہ کالے صاحب لوگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی رو کو زیادہ تقویت پہنچائی تھی لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پراچین سنسکرتی اور اسلامی عہدِ زریں کا ذکر کر رہے تھے۔ متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے

تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آرہا تھا کہ ہندوستانیت دراصل ہے کیا چیز؟ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان علیٰحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈانڈے مشرقِ وسطیٰ سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں، مسلمان غیر ملکی ہیں۔ "گلفشاں" کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزا پور کی قمر النسا ر اور رم تویا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو، تمھاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بہرحال طلعت اور نرملا اسی اوپری طبقے کی پروردہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں لا مارٹینیئر سے نکل کر رگھو ماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ لا مارٹینیئر کی یورپین فضاؤں میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکیاں جمع ہوتیں۔ کڑاہی چڑھائی جاتی چٹائیوں پر بیٹھ کر بھیگی ہوئی ساریوں میں پکوان تلا جاتا۔ ڈھولک پر جبے امبے گوری میا گایا جاتا۔ کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے۔ اس خوش باش خاندان میں بیس پچیس ہندو لڑکیاں تھیں، اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اوڑھ کر آتی تھی۔ اس بشاش گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ رگھبیر ماما کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظریے میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسۂ فکر کے کار کُشتہ تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے قمچیاں مار مار کر پڑھایا تھا لہٰذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ موا کر دیتے۔ بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے تھے۔ اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہاتما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔ جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔ کانگریس کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لیے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔ کمال اور ہری شنکر، نرملا اور طلعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لیے آئے۔ تم چلو۔ ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے، بہت دنوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔ کمال نے کہا۔ یہ ان دونوں کا پرانا وطیرہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئی نہیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی سارے ملک کی خاک چھانتے

پھرتے تھے۔ جانے کہاں کہاں جاتے۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہے، حیدرآباد دکن جا رہے ہیں۔ اندرا نہرو نے میٹنگ بلائی ہے، الٰہ آباد کا قصد ہے۔ فلاں دوست کلکتے میں اکیلا بور ہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہو آئیں۔

"بنارس سے کہاں جاؤ گے؟" نرملا نے پوچھا۔

"ارے ہم سنیاسی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو۔ جدھر منہ اٹھایا نکل گئے۔" کمال نے منہ اٹھا کر کہا۔ لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوٹ کیسوں کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ رگھو ماما سفر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

"ایسے بڑے سنیاسی ہی تو ہو۔ بلکہ بھگت کبیر کے۔" نرملا نے ہنس کر کہا۔

"کاشی کی پاٹھ شالاؤں میں بڑی منوہر کنیائیں پڑھتی ہیں۔" ہری شنکر نے آنکھ بند کر کے کہا۔

"شرم کرو بھئی۔" طلعت نے کہا۔ "یہ سامنے تمھاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی ہیں، کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسوسناک باتیں کرتے ہیں۔"

ہری شنکر فوراً پلٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا اور نہایت رعب اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھانے لگا کہ امتحان کے لیے غالب کی کون کون سی غزلیں پڑھے۔

ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۳۸)

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آ کر نیچے نظر ڈالی۔ لُو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سائے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع، بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہو گی، چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئیں۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی اسکول کے امتحان کا کوئی

پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئیں۔ ابھی انھیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ 'بسنت کالج' ۔ یونیورسٹی ۔ گھر ۔ جاڑے ۔ گرمیاں ۔ برسات ۔ پھر جاڑے ۔ بنارس کا شہر ۔ اپنا مکان ۔ محلہ ۔ رشتے دار ۔ کتابیں ۔ وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی تھی، شاعروں کی طرح محسوس کرتی تھی، بچوں کی طرح ہنستی یا رنجیدہ ہوتی تھی۔ کائنات کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے۔ ماں بھی متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیمر نہ تھا، کوئی افسانے نہیں تھے، نہ کوئی روائتیں۔ سیدھے سادے لوگ تھے جس طرح کے سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد وکالت کرتے تھے۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ چمپا کی ننھیال بنارس میں تھی۔ وہیں چمپا کے والد پریکٹس کرتے تھے۔ اوسط درجے کی آمدنی تھی۔ ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں تھا، نہ موٹر کار، نہ فریجڈیر۔ اور وہ لوگ کوٹھی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا سارا جہیز تیار رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ پیغام آ رہے تھے۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ چمپا بی۔ اے۔ پاس کر لے تو اس کا بیاہ کر دیں گے۔ چمپا نے کسی کانونٹ اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں مسوری جا کر رولر اسکیٹنگ کرتی تھی۔ اس کی ننھیال زیادہ خوشحال تھی، گو وہ بھی مڈل کلاس ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ چمپا کے ایک ماموں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے جہاں وزیر حسن روڈ پر ان کی کوٹھی تھی۔ چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے ایک چچا مراد آباد سٹی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور چچا دونوں شرکت کے لیے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بنارس آتے چمپا کے والد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مراد آباد تک کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا، کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقت ور ہیں۔ چمپا کے والد اظہار خیال کرتے۔

"اے واہ ۔ مراد آباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔" چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

"ابھی تم پوربیوں کا کیا ہے ۔ چلو تم کو بھی بلا لیں گے"، ان کے والد حقے کا کش لگا کر مذاقاً جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنیادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں سوز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قسم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہا سبھا کا گڑھ تھا اور ہندی اتھوا ہندوستانی کی تحریک کا صدر مقام۔

اسی بنارس میں پنچ گنگا گھاٹ تھا جہاں کبیر رہتے تھے اور یہیں سارناتھ تھا جہاں شاکیہ منی گوتم نے دھرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شیو پوری تھی۔ شیو۔۔ خدائے مسرت کا شہر۔

چمپا بیسنٹ کالج میں، جو بسنت کالج کہلاتا تھا، سیکنڈ ایر میں تھی۔ اس سال اس نے انٹر کا امتحان دینا تھا اور اب اسے ازابلا تھوبرن کالج جانا تھا کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے لڑکیوں کی سماجی حیثیت یکلخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڈھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ بٹیا تو آئی۔ٹی۔ میں پڑھیں گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلاری کی بٹیاں آئی۔ٹی۔ میں پڑھتی ہیں۔ چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی۔ٹی۔ میں پڑھنے والی لڑکیوں سے آئی۔سی۔ایس۔ لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنؤ میں رہتے تھے اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے۔

چمپا کالج سے لوٹ کر آتی تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر، جو چھت پر تھا، افق تک پھیلے ہوئے شوالوں کے کلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی ناول پڑھتی۔ وہ جین آسٹن پر عاشق تھی اور قرون وسطیٰ پر اور انیسویں صدی کے کیٹس اور روزیٹی وغیرہ پر۔ جب وہ یونیورسٹی لائبریری میں ابنیندر ناتھ ٹیگور اور نند لال بوس کی تصاویر دیکھتی تو اسے بیحد اچھا لگتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رومینٹک روح تھی۔

لیلا بھارگوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی۔ یہاں بھی امتحان کا ماحول ہر طرف طاری تھا گہما گہمی، چہل پہل۔ کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان۔ یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں سب اسی کی دنیا کے باسی تھے۔ مجمعے میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی۔ ہجوم اس کے ساتھ ہے۔ ہجوم اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے۔ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی طالبات، لیکچرار لڑکیاں، مدراسی اور بنگالی بوڑھے پروفیسر، مہاراشٹر کی سائنس داں خواتین، سنسکرت اور فارسی کے عالم فاضل۔ یہ سب جو تیزی سے اور مصروفیت سے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔ علم میں تعصب کس طرح داخل ہوتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا تعصب اور

نفرت اور تنگ نظری، شکوک اور ہٹ دھرمی، ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے اور یہ شور اس کے دل کی اندرونی خاموشی میں مخل ہوتا ہے تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہائی اسکول کا میوزک کا پرچہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انھیں لڑکیوں میں تیز و طرار اور بشاش لڑکیوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ چمپا اور لیلا مسز چنتامنی ویلسکر سے باتیں کرنے میں مصروف رہیں جو ان کی ہسٹری کی استاد تھیں سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ ہندو لڑکے اور لڑکیاں فاؤنٹین پن اور کتابیں سنبھالے آتے، دیوی کے سامنے سر جھکا کر دعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتنے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے نکلنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اچھلتی کودتی سیڑھیوں پر سے اتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک شوردراس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی ان کو بتلا رہی تھیں کہ تھیوری کے پرچے میں انھوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فراک پہنے تھیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتنے میں دو نوجوان لڑکے، جو شکل و صورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے، مجمعے میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگر اسٹیٹ کی ایک کار آن کر رکی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کار دھول اڑاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

لکھنؤ سے آئی ہوئی لڑکیوں میں ایک لیلا بھارگوا کو پہچانتی تھی۔ اس نے قریب آن کر کہا:

"نمستے، لیلا دیدی۔ ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ ضرور آئیے گا۔"

"نمستے بہنا۔ یہ چمپا ہیں۔"

اس نے دوبارہ نمستے کیا۔ "آپ بھی آئیے گا چمپا دیدی۔"

"ضرور۔"

"تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔ تم سب۔ کے ناچ گانے کی اتنی دھوم سنی ہے۔ خالی پارٹی دے رہی ہو۔ تمھارا ناچ نہیں دیکھیں گے ۔۔۔؟" چمپا نے پوچھا۔

"چمپا دیدی کاشی اور لکھنؤ کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں ۔۔۔؟" ایک اور لڑکی نے قریب آکر کہا۔

"اچھا، یہ بات ہے۔" بینا ماتھر نے جواب دیا۔ "تو پھر ہو جائے فیصلہ۔ کہاں کی بھیرویں بہتر ہے، کہاں کا دادرا، کہاں کا کتھک۔ چلیے آئیے میدان میں۔"

"رہی سہی۔"

"رہی۔"

اب ان کے آس پاس لڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔ بنارس کی لڑکیاں لکھنؤ والیوں پر چوٹیں کر رہی تھیں۔ مگر لکھنؤ والوں سے باتوں میں کون جیت سکتا تھا؟ وہیں طے کیا گیا کہ بسنت کالج میں ان لوگوں کو بنارس کا کتھک دکھایا جائے گا مگر اس سے پہلے وہ سب لکھنؤ کی لڑکیوں کے ہوسٹل پر دھاوا کریں گی۔ ان سب خوشدلی کی باتوں کے بعد چمپا اور لیلا پھر تانگے پر بیٹھیں اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

(۳۹)

بنارس پہنچ کر طلعت اور نرملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر ٹھہری تھیں وہ ایسی عجیب و غریب جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمیدہ بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے)۔ یہاں پر یقیناً اس کی ہیروئن رہے گی یا ہیرو اس کی چھت پر سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوگا وغیرہ ـ اور اس جگہ پر ایک ایسی ناقابلِ بیان دنیا آباد ہو گئی تھی جس کی طرح ناقابلِ بیان دنیا وسیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاز پر متضاد رستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگِ سرخ کا سہ منزلہ محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگریس ورکر تھیں اور مستقل یاتراؤں پر جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنگن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیارے، اور کوٹھریاں اور صحنچیاں اور تہ خانے اور شہ نشین اور ان گنت طاق اور طاقچے .... مالکہ مکان نے، جن کو سب پنڈتائن صاحب کہتے تھے، فخریہ بتلایا کہ جب سلطانِ عالم قیدِ فرنگ کے عالم میں لکھنؤ سے کلکتے لے جائے جا رہے تھے تو

مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بصد تکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سُن کر حمیدہ بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈتائن کو سلطانِ عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈتائن سے حمیدہ بانو کی خوب گھٹی۔ وہ خود بھی بزبان ہندی افسانے لکھتی تھی مگر لڑکیوں کی آمد کے تیسرے روز ہی وہ ایک اور یاترا کے لیے جگن ناتھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی کنجیاں بھی لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ اپنی قیمتی بنارسی ساریاں انھوں نے لڑکیوں کو زبردستی تحفے میں دیں۔ صبح سے شام تک اس قدر خاطر داری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں۔ پنڈتائن اگر ایسی عجیب و غریب نہ ہوتیں تو بات نہ بنتی۔ اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہیے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی باراتیں ٹھہری ہوئی ہیں۔ (محل کا نام ــــ ''چندن نواس'' تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں۔ آنگن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جا رہا ہے، کسی شہ نشین میں الٹایٹ کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری ہو رہی ہے۔ موسیقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگنانے کی آوازیں آتیں۔ رگھو ماما ذمے داری کے شدید احساس کے ساتھ ادھر ادھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے پھر بڑو کے کمرے میں لگ گئیں ما جلیئے پڑھیئے۔ کھانے کے لیے دسترخوان بچھتا تو برہمن رسوئیا، جو بے انتہا موٹا تھا ہنکارا بھرتا اندر آتا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسسٹنٹ رسوئیا دہی کی بالٹی اٹھائے ہوتا۔ پیتل کی ایک بڑی سی ڈوئی میں دہی بھر بھر کر چیف رسوئیا لڑکیوں کی پلیٹوں پر بہت بلندی سے دہی ٹپکاتا۔ پھر تھالیوں اور کٹوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔ رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمتی۔ جب امتحان شروع ہوئے تو ہر روز پرچے کرنے جاتے وقت جب لڑکیاں محل کے صدر دروازے سے نکلتیں وہاں کانتی دیدی دہی اور ماش تیل لیے کھڑی ملتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری باری دہی مچھلی کا شگون کرواتیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ میرس کالج کا سیکنڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہرحال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور ممتحن حضرات میں نارائن راؤ ویاس شامل تھے جن کا نام سن کر ہی ڈر کے مارے جان نکلتی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی اداس عمارت کی چھت پر دو کمرے بنے تھے۔ ایک میں نارائن راؤ ویاس بیٹھے تھے۔ لڑکیاں چھت کی منڈیروں کے سائے میں کھڑی

جلدی جلدی مشکل راگوں کو نیچی آوازمیں دہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک ممتحن اس قدر خفا معلوم ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کو کچا چبا جائیں گے۔ کسم سکینہ گھبرا گھبرا کر بتول کے سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈیر پر ایک چیل آنکھیں نیم وا کیے غنودگی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر وہ چیل سارناتھ کی طرف اڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روز کمال اور ہری شنکر آن دھمکے۔ طلعت اور نرملا پرچہ کر کے شامیانے سے باہر نکلیں تو انھوں نے سرسوتی کے مندر کے نیچے دو لڑکیوں کو مسز ویلسکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کے قریب ہی سے کہیں سے کمال اور ہری شنکر نمودار ہوئے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کی بہت پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں لڑکے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے جو طلعت اور کمال کے قرابت دار تھے۔ پھر تیز دھوپ میں دریا پار کر کے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور "پالش کی ہوئی سڑکوں" پر سے گزرتے ہوئے طلعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

"مجھے کمرن کے لیے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔" طلعت نے باوازِ بلند کہا۔

"ابھی تمھاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی؟" کمال نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"نہیں۔ پیسے لاؤ۔"

اب دونوں لڑکوں نے غرّا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

"تمھارا خیال ہے ہم مہاجن ہیں۔ کوٹھی چلتی ہے ہماری؟" کمال نے غصّے سے کہا۔

"ہم تو دو مفلس قلاش برہمچاری ودیارتھی ہیں۔ خود دال بھات پر گزر کرتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔

"لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

"صحیح کہتے ہو۔" ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صاد کیا۔

"اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندر روپ وتی کون ہے جو سرسوتی کے مندر کے سائے میں کھڑی تھی تو بنارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔" کمال نے کہا۔

"کون مہا سندر روپ وتی؟" طلعت اور نرملا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟" کمال نے مایوسی سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ مگر پیسے لاؤ۔"

"اگر تم اس کا پتا چلا دو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"بھئی تمہارے لیے تو لڑکیوں کے پیچھے چلاتے چلاتے ناک میں دم آگیا ہے۔" نرملا نے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھ دار تھی چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رام نگر پہنچے اور دن بھر خس کی ٹٹیوں کے پیچھے بیٹھ کر انھوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے گپیں ہانکیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کمانشی کی بہت سی رئیس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت بشاش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانتی دیدی کی قیادت میں ان کے غول کے غول گلی کوچوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کی دکانوں کے سامنے یہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھ رہیں۔ انھوں نے ان گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔ شام پڑے کشتیوں میں بیٹھ کر جب وہ گنگا کے دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں حمیدہ بانو موقع و محل کی مناسبت سے پاٹ دار آواز میں۔ اے آبِ رودِ گنگا۔ والی نظم شروع کر دیتی۔ سب لڑکیاں مل کر اُسے اٹھاتیں۔ انھوں نے شہر میں جاکر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام "ترانجی" تھا۔ پھر ایک روز بھری دوپہریا میں وہ سب سارناتھ پہنچے۔ جہاں کے ایک معبد کے مرمریں فرش پر دیوٹوں کی روشنی رقصاں تھی اور ایوان میں چھوٹے بڑے سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھارتھ کے رکھے تھے اور ماحول کے تقدس سے مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپٹوں اور ساری کے آنچلوں سے سر ڈھانپ لیے اور سب نے بُدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انتہا پاکیزہ محسوس کیا۔

"یہاں کس قدر سکون ہے۔" طلعت نے کہا۔ وہ سب ہال میں دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

"ہاں آں۔" حمیدہ بانو نے سر ہلایا۔ پھر وہ بڑے پُراسرار طریقے سے مسکرائی۔ گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

"بات یہ ہے۔" اس نے کہا، "کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہاں آکر بیٹھے ہیں اس لیے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا ہے۔" طلعت کو حمیدہ بانو کی یہ حقیقت پسندی بہت کھلی۔

"مگر یہ واقعہ ہے کہ مہاتما بُدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔" طلعت نے سوچ کر کہا۔

"اجی تم کیا جانو یہ باتیں۔" حمیدہ بانو نے بزرگی سے کہا، "دراصل ہم مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔" پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی۔ وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑی رومان پرست تھی مگر اس ذہنی کشمکش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی الفت کس واسطے ہے۔ دیر و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معاً طلعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ پھر رینا ماتھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب لڑکیاں گھیرا باندھے ناچ رہی تھیں اور ان سب میں حمیدہ بانو پیش پیش تھی۔ دو جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیٹرز رجسٹر کھولے بیٹھے تھے ذرا اچنبھے سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سائے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ ازم کی تاریخ پر کمال کو ایک لیکچر دے رہا تھا اور کمال نے قریب کے ایک ستوپ کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا: میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں۔ وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لحظے کے لیے چکر سا آ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنٹ اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علمیت سے بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سرخ ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں ستوپ کھڑے تپ رہے تھے اور ایک راستہ چکر کاٹتا نیچے سے اوپر جاتا تھا اور ستوپ کے چاروں طرف گھوم کر وہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ کمال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب لڑکیاں باہر آ چکی تھیں اور حمیدہ بانو قریب سے کانتی دیبی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی: میں خواب میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں۔ میں نے یہ سرخ ریت والا پیتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے ——

گڈ اولڈ حمیدہ بانو — کمال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور افسانہ نگار بن جائے گی اور روحانیات میں دلچسپی لے گی اور شاید تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔

"حمیدہ بانو — ظہر کا وقت ہے، چلو نماز پڑھ لیں۔" رفیعہ باجی نے ستوپ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے آواز دی اور حمیدہ بانو ہڑبڑا کر سرخ ریت والے راستے پر سے اتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے سستانے کے لیے جا بیٹھی تھیں۔

کمال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوپ اور میوزیم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان سنہرا گھنٹہ دور سے نظر آ رہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر لرزاں تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

"چار بج رہے ہوں گے" رگھبیر ماما نے پھاٹک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ "اب واپس چلنا چاہیے۔"

"چلو لڑکیو" کانتی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنؤ واپس جانے کے دن قریب آئے اور روانگی سے ایک روز قبل چندن نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اسٹیج بنا اور اسے کیلے کے پتوں سے سجایا گیا۔ محل کے وسیع لق و دق اینٹوں کے فرش والے صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور بڑی سی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور اگلے دالان میں جاجم تان کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے پیچھے ساز رکھے تھے اور بینا ماتھر میوزک ڈائرکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریواستوا جلدی جلدی سب باجوں کے سُر ٹھیک کروا رہے تھے۔ باقاعدہ ڈراما کرنے کی کسے فرصت تھی۔ روشمت کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہو گا۔ یہ اس لیے کہ اس میں زیادہ ڈائیلاگ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ سارا کام میرا کے بھجنوں کے ذریعے چل سکتا تھا اور لڑکیاں ایسی ماہرِ فن تھیں کہ اسٹیج پر آکر فی البدیہہ مکالمے ادا کرتی تھیں۔ ساجدہ کو راجا بنایا گیا مگر بار بار اس کی مونچھیں گر پڑتی تھیں۔ کسم اکبر بادشاہ تھی مگر اس کی بے موقع ہنسی نے سارا کام چوپٹ کر دیا۔ گیان وتی بھٹناگر کیونکہ ماہرِ موسیقار تھی اس لیے وہ میرا بنی۔ وہ تو ریڈیو کی اتنی مشہور فن کار تھی اس کے لیے میرا کا پارٹ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سارے وقت وہ تان پورہ ہاتھ میں اٹھائے آنکھ بند کیے اسٹیج پر ادھر سے ادھر چلتی رہی۔ طلعت جنرل رول ادا کر رہی تھی۔ جہاں ایکٹروں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ ایک سین میں وہ اکبرِ اعظم کی وزیر بنی۔ دوسرے میں میرا کی سہیلی۔ تیسرے میں جہاں میرا سے رانا کی شادی ہوتی ہے وہاں جلدی سے اکبرِ اعظم کی مونچھیں مستعار لے کر وہ پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جا کر اڑنگ بڑنگ اوم سواہا کہہ کر اس نے میرا بائی کی شادی کرا دی۔

پھر بہت سی لڑکیاں راس لیلا کے ناچ کے لیے چھن چھن کرتی آئیں۔ انھوں نے دنیا بھر کے زیور پہن رکھے تھے۔ حد یہ کہ رفیعہ باجی جیسی موٹی خاتون بھی ماتھے پر نقرئی بور سجا کر متھرا کی گوالن بنی تھیں۔

حمیدہ بانو نقلی موتیوں اور بینیوں کا مکٹ پہنے بڑے اسٹائل سے بانسری اٹھائے کھڑی رہی۔ نرملا ستار سنبھالے دالان کے پیچھے سے گویا بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی تھیں۔

سامنے آڈینس تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جانے کون کون۔ بسنت کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، لیکچرار اور پروفیسر صاحبان، بہت سے لڑکے۔ ان ہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور لیلا بھارگوا بیٹھی تھیں۔ ہری شنکر اور کمال چاندنی کے فرش پر براجمان تھے۔ رگھو ماما ٹک کر ڈراما دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔

چمپا اور کمال اور ہری شنکر تینوں اس سمے الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشا دیکھا کیے۔

لڑکیاں اس سمے دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف اس اسٹیج پہ موجود تھیں اور بے حد خوش تھیں۔

لڑکیاں سوانگ رچنے کے بے حد شوقین ہوتی ہیں۔ بچپن میں وہ پلنگ کھڑے کر کے ان پر پلنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر کھیلتی ہیں۔ گھروندا سجا کر تصور کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے۔ ہنڈکلیا ان کے نزدیک بڑا اہم دعوتی کھانا ہوتا ہے۔ گڑیاں گڈے ان کے لیے جاندار انسان ہیں۔ جب ذرا بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنا بناؤ سنگھار کر کے کس قدر مسرور ہوتی ہیں۔ باہر جانے سے پہلے گھنٹہ بھر آئینے کے سامنے صرف کریں گی۔ جوتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لیے آفاقی اہمیت کا حامل ہے۔ سجنا، بہروپ بھرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ رادھا اور کرشن کا ناچ ناچتی ہیں تو تصور کرتی ہیں کہ واقعی ورندابن میں موجود ہیں۔ ساری عمر ان کی ایسی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بسا کر وہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پجارن یا کنیز کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔ اوّل دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں جو ان کی رنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ۔ بھائی۔ شوہر۔ خدا۔ بھگوان۔ کرشن۔ بیٹے۔ پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ جب رنگ بھوم کا ڈائریکٹر ان سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو، دل کی ملکہ ہو، دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو، روپ وتی ہو تو یہ بے چاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ گپ۔ بکواس۔ یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں، کتنی ہی ودوان بن جائیں، کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہو، ان کی اوقات وہی رہے گی۔ پجارن۔ کنیز۔

لاحول ولاقوۃ

کمال راس لیلا دیکھتا رہا۔ سامنے گوپیاں اب کرشن کی آرتی اتار رہی تھیں۔ دالان میں نرملا اور بینا ماتھر زور زور سے گاتی رہیں:

'موہن سنا دے میٹھی تان۔ مدھر، رس بھری، رسیلی، پیاری پریم کی تان۔'

واہ۔ کیا بات ہے۔

اری بورکھ لڑکیو تم کو خبر بھی ہے پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا ہنہ۔۔۔ کمال کو کبیر داس کا ایک دوہا یاد آیا۔ اُس نے پہلو بدل کر سگریٹ سلگا لیا۔

(۴۰)

جیسا کہ کا مہینہ گزرا۔ جیٹھ کا۔ اساڑھ میں رزلٹ نکلا۔ چمپا احمد پاس ہوگئی تھیں اور حسب توقع فرسٹ ڈویژن انھوں نے حاصل کیا تھا۔ اب ان کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ساریاں خریدی گئیں۔ ہاؤس کوٹ تیار ہوئے۔ لکھنؤ ماموں میاں کو خط لکھا گیا۔ جولائی میں چمپا بیگم آرہی ہیں۔

ایک روز شام کو وہ لیلا بھارگوا کے ہمراہ بازار سے گھر جاتے ہوئے چندن نواس کے سامنے سے گزری۔ اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ باغ پر ہولناک سناٹا طاری تھا۔ محل سنسان پڑا تھا۔ تیسری منزل کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ شاید پنڈتائن اپنی یاترا سے لوٹ آئی ہوں گی۔ باقی ساری عمارت اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھی تو اسے لگا جیسے بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے قہقہے، گھنگروؤں کی جھنکار، تان پورے کی گونج اور سب سے بڑی سناٹے کی آواز۔

اسے وقت کے بھوت نے ستانا شروع کر دیا تھا۔

لیلا کو اس کے گھر پر اتارنے کے بعد وہ حسب معمول اپنے مکان کی سمت بڑھی۔ نہری نے تانگے سے اتر کر چھوٹا سا پھاٹک کھولا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور آنگن میں جا بیٹھی۔ باہر گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈیو اکٹھے بج رہے تھے۔ لکھنؤ سے خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی مؤکل کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے۔

"ڈاک میں تمہارا یہ لفافہ آوا رہا۔" اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چپٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس نے خط کھولا۔ پھر برآمدے کی بتی جلا کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ اجنبی زنانہ لکھائی تھی اور کسی اجنبی کا خط تھا۔ مسوری سے آیا تھا اور انگریزی میں تھا اور مائی ڈیر چمپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا: مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آ رہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا۔ اگر وہ فلاں فلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے فلاں فلاں کلب خوش آمدید کہیں گے۔ اگر وہ آؤٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائرکٹر جے مالا آپا سوامی سے اسے ملنا چاہیے۔ ٹینس کی سکریٹری لیلا شری ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بے حد خوش ہو گی۔ اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے۔ ڈراما گلڈ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کی خواہش مند ہے (اگر اسے اسٹیج سے دلچسپی ہے)، وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوسٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکلٹی کے متعلق۔ اخیر میں لکھا تھا کہ نئی لڑکی کی حیثیت سے مکتوب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کی وہ آفیشل ایڈوائزر ہے۔ لہٰذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچے تو اسے راقم الحروف فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پرابلمز کا حل تلاش کرے گی۔

نیچے راقم الحروف کا نام لکھا تھا: تہمینہ رضا، تارا ہال، مسوری۔

چمپا ہکا بکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہمینہ رضا کون ہے اور اسے میرا پتہ اکس طرح معلوم ہوا اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی معلوم ہوا، یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے لگا وہ اب بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب و غریب دنیا کی طرف سفر کرنے والی ہے۔

اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

(۱۴)

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتے بعد سب آخری بار ملنے

کے لیے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم کھلوایا گیا۔ لاڈو مہری سب کی خاطریں کرتی آگے پیچھے دوڑتی رہی۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہو گئیں، جیسے بولنا جانتی ہی نہ تھیں۔ ان میں سے بڑی لڑکیاں سوچ رہی تھیں، اب جانے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ان میں سے اکثر کی شادی ہونے والی تھی۔ چند کو ابھی کالج میں پڑھنا تھا۔ دفعتاً حمید بانو نے، جو بے حد ڈرامیٹک واقع ہوئی تھی، اس پر دھان کی نئی فلم کا گانا شروع کر دیا: ہنس لے جی بھر بھر کر ہنس لے۔ جانے کون کہاں پھر جائے ۔۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا گایا گیا: رُک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ ۔۔ اور اس کے بعد تیسرا ۔۔ او جینے والے ہنستے ہنستے جینا۔ سورج کبھی نہ ڈوبے تیرا ۔۔ وغیرہ۔ یہ سب گانے کی وجہ سے خوب رقت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب چکو پکو روئیں۔

واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ باقی ساری لڑکیوں کو طلعت نے عمر بھر نہ دیکھا۔ وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جو اتنی اچھی ہجولیاں تھیں۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ الگ الگ ہو جائیں گے، اور جب بچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔

(۴۲)

ہندوستان کا بہترین گرلز کالج ۔۔!

ازابلا تھوبرن ۔۔!!

چاند باغ ۔۔!!!

لکھنؤ کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا چمکتا ہے اور بہت دور ہی سے ایک بے حد طویل و عریض دو منزلہ عمارت نظر آ جاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند بالا پورٹیکو کے ستون دور سے دکھلائی پڑتے ہیں۔ اس پورٹیکو کا فرش مرمریں ہے۔ سامنے لال پریام کے درخت لگے ہیں۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف شیشوں والے طویل در بڑے بڑے دالانچے ہیں اور جھلملاتے ہوئے فرش اور چوڑے مرمریں زینے۔ اونچی چھتوں میں بھاری فانوس آویزاں ہیں۔ اس کا "براؤزنگ روم" جہاں لڑکیاں بیٹھ کر

فرصت کے وقت میں علم چرتی چگتی ہیں، اپنی آرائش کی وجہ سے کسی برطانوی لارڈ کا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیش قیمت نوادر سجے ہیں اور نایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگز سے اس کی دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہیں۔ یہ عمارت ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں، وسیع کیمپس پر، دور دور، فاصلے پر اتنی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر پھولوں کی خوبصورت بیلیں پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کئی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوسٹل ہیں جو نشاط محل، نونہال منزل، اور میری بھون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیسٹ ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکلٹی کی ہے جنھوں نے اپنے کمرے اور سیٹنگ روم دلہن کی طرح سجا رکھے ہیں۔ کیمپس کے وسط میں ڈائننگ ہال کی عمارات ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے جس کی انچارج ایک نیگرو نرس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلے فورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بے انتہا اسٹریم لائنڈ جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا سے لو لگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یسوع مسیح بھی کسی امریکن یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ یا نیو انگلینڈ کے رحمدل اور خلیق پروفیسر ہیں۔ اس کالج کی عمارات کا طرز تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ ——!!

پورنماشی کی راتوں میں جب چاندنی کیمپس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے سبزہ زار۔ پھولوں کے کنج۔ سفیدے کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن دریچے۔ اس وقت کیمپس کے مختلف گوشوں سے موسیقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔ بیتھوون۔ شوپاں۔ ویبر۔ جارج گرشون۔ یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔ نیگرو نرس، ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت اللحم کا اکیلا ستارہ کہرے میں چھپا جھلملا رہا ہے۔ چیپل میں سے برقی آرگن کی گہری گونجتی ہوئی آواز اوپر اٹھتی ہے۔ اندر قربان گاہ کے اوپر منقش لیمپ جلتا رہتا ہے۔ سناٹے کے سارے پر تو قوس قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔ سوا سو سال ادھر یہاں رمنا تھا۔ یہاں کے باغات میں ہرن کلیلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں۔ اور اودھ پوری کے گھوڑوں کے بجرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اونچی

سوسائٹی یہاں آن کر بینڈ مسوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتی تھی۔ وہ پرانا برگد کا درخت، جو کیمپس کے اس کونے میں کھڑا ہے، اس کی پتیاں اس سمے بھی پچھلے پہر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسّی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔ ۱۸۶۲ء میں جو خوش باش نوجوان لڑکیاں لمبی آستینوں کے بلاؤز پہنے اور گاؤن کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لیے گاتی گنگناتی آئی تھیں آج وہ نانیاں دادیاں ہیں یا دنیا کے بہت سے دکھ انھوں نے اٹھائے ہیں یا بڑی معمولی، عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لیے بے چاری لڑکیو، تم جو ہال میں گھسی یوجین اونیل کی ریہرسل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کل تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصہ لینے کے لیے تم یہاں سے نکلو گی اس کے محاذ پر کام آنے والوں کے لیے کوئی پیتل کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چیپل کی سفید سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سوچو: کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریۂ کائنات غلط ہے۔ صراطِ مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرف جانے والی جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لیے بے چاری لڑکیو، تم جو پھولوں کے کنج میں گریا ناچ رہی ہو، چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی رہو (اور چونکہ تم عورت ہو لہٰذا تمھہ مشکل ہی سے ہو گی) یاد رکھو کہ جب تم جا نفنی کی اس دنیا سے باہر چلی جاؤ گی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤ گی۔ دوسرے تمھاری جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہوگا جو تمھارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہوگی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔

تم بدل جاؤ گی۔

کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمھاری سوشیولوجی کی چینی پروفیسر، بنگلے کے ایسے سفید بالوں والی کمر خمیدہ بڑھیا، جو کھٹ کھٹ کرتی مسکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور ’فلاڈلفیا کا گلاب‘ کہلاتی تھی؟

یہ سارے جشن، یہ ساری تقریبات، رسوم، تہوار، کارنیول، موریس ڈانسنگ کے مقابلے، اسپورٹس کے ہنگامے، یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمھارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کیمپس اس کارگہِ شیشہ گری کا، جسے دنیا کہتے ہیں، ایک بے حد چھوٹا سا ماڈل ہے۔

نشاط محل کے پیچھے ڈچ وضع کے باغ کے برابر سے ایک سایہ دار راستہ سوئمنگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی مہینہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی

ہوئی ہیں، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مدراسی، اُڑیہ، نیپالی، پنجابی، پٹھان، یوریشین، امریکن، برمی، سنگھالی ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہبًا یہ لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بودھ اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیرو یہاں موجود نہ ہو۔

اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لیے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں اُن کی نقل کی جاتی ہے۔

اس ارسٹوکریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں گریس فُل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔ "ہم دینے کے لیے لیتے ہیں" یہاں کا موٹو ہے۔

پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیرِ اثر وہ زور اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں ٹیگور جینتی منائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا مشترکہ تہوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں ساری میں چترانگدا کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔

اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔ ان کی ایک ایسی پُر اسرار دنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہو سکتا۔

(۳۴)

حسبِ وعدہ سولہ تاریخ کو تہمینہ رضا، چمپا احمد کو فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا: "تم چمپا احمد ہو۔۔۔؟"

"ہاں۔"

"آؤ، میرے ساتھ چلو۔"

اور دوسرے لمحے چمپا چاند باغ کی دنیا میں شامل ہو گئی۔ اس رات ہال میں نئی لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ انھیں یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا

گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو 'بریک اِن' ہونے میں لگے۔ جبھی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کالج کے دفتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینئر طالبات کو بھیج دیے جاتے ہیں اور مؤخر الذکر ان کی ایڈوائزر مقرر کی جاتی ہیں۔ کالج میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چند خاص خاص سینئر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چمپا کو ملا تھا۔

تہمینہ کی بہن طلعت آرا، جو فرسٹ ایر میں داخل ہوئی تھی، بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی: "ارے چمپا باجی، ہم نے تو آپ کو بنارس میں بھی دیکھا تھا۔"

اور نرملا سریواستو نے سوچا کہ اب کمّن بھیا اور بھیتن صاحب کی تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ان کی دیبی تو یہیں آن پہنچی۔

چمپا دوسری لڑکیوں کے ساتھ 'گلفشاں' بھی گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ تہمینہ کے بھائی کمال رضا نے، جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، بے حد اخلاق اور مؤدبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور طلعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ سنگھارڑے والی کوٹھی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شنکر سریواستو اس کے لیے خود چاء کی کشتی اٹھا کر لایا۔

ایک کو تیسرے پہر وہ گلفشاں پہنچی۔ تہمینہ اور طلعت پچھلے برآمدے کے سائڈ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر بڑھی بیٹھی تھیں۔ پیاز اور مرچوں کا ٹوکرا نیچے رکھا تھا۔ نرملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے ہاں کوئی دعوت تھی۔

چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے، وہ بھی روایتی ہیروؤں والی شان سے۔ ٹینس ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے، خصوصاً جب تہمینہ کی سہیلیاں موجود ہوں کیونکہ تہمینہ کے کراؤڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں پٹتی تھی۔ تہمینہ کے اصل کامریڈ تو کمال اور ہری شنکر تھے۔

مگر بھیا صاحب بہرحال بھیا صاحب تھے۔

چمپا بیٹھی آلو چھیلتی رہی۔ اس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تہمینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے، اس سے بات کر کے وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جاکر انھوں نے گنگا دین کو بلایا۔ "یہ نئی بٹیاکون ہیں جو اندر بیٹھی ہیں۔"

"پتا نہیں سرکار۔" گنگا دین ہڑ بڑا گیا۔ بھیّا صاحب نے آج تک لڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخر بڑی بٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ "بڑی بٹیا کے پاس چاند باگ کی سبتے بابا لوگ آوت ہیں۔"

"اچھا جاؤ۔"

کمال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طلعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خائف رہتے تھے۔ اگر اس سے اشارۃً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے گی۔ کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تہمینہ سے آفیشیل طور پر منسوب تھے لہٰذا دنیا جہان کی کسی اور لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تنہا تھے۔

بھیّا صاحب اپنی ذات کے رومانس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو کمال نے بتایا: "یہ حضرت تہمینہ کے فیانسے ہیں مگر تہمینہ ان کو مستقل نو لفٹ کیے رکھتی ہے۔"

اوہ۔ کس قدر ٹیپکل صورتِ حال تھی۔ دو کزن جو ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ "گلفشاں" کی قسم کے ناموں والی کوٹھیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے اُس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ افسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ جو دوسروں کی زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ دراصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسرے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

(۴۴)

برسات نکلی۔ کاتک پورنماشی آئی۔ پھر ماگھ پوس کی ہوائیں چلیں۔ کمروں میں آتش دان جلے۔ باغوں پر کہرہ چھایا۔ رات کے پھولوں پر شبنم کے قطرے جمے۔ چاند باغ میں کرسمس کے تہوار کی تیاریاں

شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے فیشن کے اوورکوٹ سلوائے۔ غریب غربا پالے میں ٹھٹھر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ بڑے لوگوں نے شکار کے لیے کاپلی اور ترائی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دوبالا ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بسنت آئی۔ سرسوں پھولی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ بہار کی خوشبوؤں سے فضائیں مہکیں۔ انڈر گریجویٹ شعراء نے انگریزی میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تہ خانے آباد ہوئے۔ خس کی ٹٹیاں لگیں۔ اضلاع کے کمپنی باغ چنبیلی کے پھولوں سے مہکے۔ لیچیوں کی کھانچیاں اتریں۔ لو چلی۔ گومتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا۔ امریوں میں جھولے پڑے۔ اسے پیچھے ایک سال نکل گیا۔ عمرِ عزیز کا ایک سال ختم ہوا۔ اب دیوالی آرہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی ٹوکریاں برآمدے میں لاکر رکھی گئی ہیں۔ نرملا اپنے گھر کے آنگن میں رنگوں سے نقش ونگار بنانے میں جٹی ہے۔

طلعت پچھلے برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر روٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہورہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیلاہٹ، جو دور نیچے جا کر درختوں کی ہریالی میں کھو گئی تھی اور شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوٹھی میں مسز میکوسر کے یہاں طبلہ بج رہا تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب وائلن بجا رہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یاجوج ماجوج کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیٹی ہوں۔ ٹھنڈک۔ سکون (جو سارنامتہ کے مندر میں بھی ملا تھا)۔ یاجوج ماجوج تھے۔ یا کون تھے؟ بہرحال۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ مٹھی بیتیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔ گملے، جو سیندوری رنگ میں رنگے گئے تھے، ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آگیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی تیاری کررہے تھے۔ کمال اور ہری شنکر ایم۔ اے۔ فائنل میں آگئے تھے۔ اپّی نے بی۔ اے۔ کر لیا تھا۔ طلعت اور نرملا خود اب سیکنڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ سری ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کررہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکتا۔ وہ لوگ طلعت سے کہتے: جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تم کو احساس ہوگا کہ چمپا کیسی عجیب وغریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔

اپّی کی ان سے اب بھی ویسی ہی ملاقات تھی۔ اپّی بڑی وضعدار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب وغریب اور قابلِ قدر ہستی کون تھا۔ اپّی یا چمپا باجی۔ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے، طلعت نے سوچا کہ زیادہ تر لوگ

خالی صورت کو پسند کرتے ہیں۔ چمپا باجی خوبصورت ہیں۔ اپّی خوبصورت نہیں ہیں۔ بس یہ ہے ساری بات۔ یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی اتنی بھاری قیمت لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھیا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

کمال دہرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا گیا۔ وہ حسبِ معمول دیوالی کی چھٹیوں میں چکّر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لا مارٹینئر کالج کا ایک جواں سال انگریز پروفیسر، جو چند سال قبل اوکسفورڈ سے آیا تھا، سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے کمال کو بھیجا گیا تھا، کیونکہ کمال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے ہری شنکر کے ساتھ ہردوار کی ساری گپھائیں چھان ماریں، چکراتا اور رشی کیش اور ہر کی پوڑی کے مندر، ہمالیہ کی پہاڑیوں کو خوب کھوجا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انھوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی، اب کہ میں جنجال سے نکل آیا ہوں، مجھے واپس مت لے جاؤ۔ مجھ پر رحم کرو میاں۔ میں بہت مزے میں ہوں۔ اور کمال نے کہا: "لکھنؤ میں افواہ ہے کہ یہ پبلسٹی حاصل کرنے کا ایک ریکٹ چلایا ہے آپ نے۔"

"بھائی،" وہ ہاتھ جوڑے مصر رہے، "خدا کے لیے چلے جاؤ بھائی۔" اور اس کے بعد برہمنوں کی طرح زور سے کھنکھارتے ہوئے، اپنا گیروا لباس سنبھالتے، ایک چشمے کو پھلانگ کر جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔ اب کمال منہ لٹکائے موہنی روڈ پر چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسبِ معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے ریسپنا بہہ رہی تھی۔

"یار ہری شنکر،" کمال نے کہا۔

"ہاں یار۔"

"یار یہ پروفیسر۔ ہملٹ ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں، خدا کی قسم۔"

اس روز انھوں نے نیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہا۔

"اور کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے۔" چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

"ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے: کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔" کمال نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر sloppy ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔"

"خوابستان — لاحول ولا قوۃ۔"

"مگر تم خود بھی 'گلفشاں' اور 'خیاباں' میں رہتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔"

"یار کمال۔"

"ہاں یار۔"

"ذرا سوچو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت۔ ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تیج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس داں اور سے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔

"اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔"

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے۔ "نسترن"، "دولت خانہ"، "شیم روک"، "آشیانہ"، "راج محل"۔ کمال کے والد کا مکان خیاباں بھی سامنے موجود تھا۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کے درختوں کی مہک سائے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے نشاط محل ہوسٹل کے وسیع ڈرائنگ روم میں آ کر روشنی جلائی اور کتاب کھول کر اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھی رزم اونار کو ہندی پڑھاتی رہی۔

انگریز سادھو اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان پر پڑا سو رہا تھا۔

(۴۵)

دو سال اور نکل گئے۔ اگست ۴۲ء کا اندولن بھی پرانی بات ہو چکی۔ پنڈت جی اور مولانا اور سارے نیتا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن سپاہی گھومتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں اینگلو انڈین و یک آئی لڑکیوں کے پرے کے پرے ٹہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔ دیواروں پر سے 'کوئٹ انڈیا' کے الفاظ مٹتے جا رہے تھے۔ سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلفشاں کے سید عامر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے۔ فائنل میں آچکی تھی۔ چمپا ایم۔ اے۔ پریویس میں تھی اور کیلاش ہوسٹل میں رہتی تھی۔ طلعت اور نرملا بڑی دھوم دھام کی انڈر گریجویٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی، جو شہر کا فیشن ایبل اسمارٹ انٹلکچول سٹ کہلاتا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشندہ اور کنور سپی چو اور گنی کول اور کرن بہادر کا تجو اور پراکرم وطیشور اور فیض آباد روڈ کی میرانالنی راجونش اور ارجن راجونش اور فواد اور راحیل بلگرامی اور علی اور ایلمر ریکسٹن سبھی شامل تھے۔ پھر گلفشاں اور سنگھار سے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام، اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتھے بندی تھی۔ چہروں کا ذہنی باورچی خانہ۔ بیک، سفید چہروں کا سمندر چاروں اور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی، کیونکہ آخری تجربے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل قطعاً تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویشن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہ ایکویشن غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔

یہی بات چمپا نے دفعتاً سید عامر رضا سے، جو بھیا صاحب کہلاتے تھے، کہی۔

اس روز بھیا صاحب مدراس کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ وہ اس سے ملنے کیلاش آئے۔ وہ اس وقت لائبریری جا رہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: "میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع

مل گیا۔ میرا اپنا دل مدراس کا ہو گیا ہے ۔۔ تم ۔۔ تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار ہو۔؟"

بھیا صاحب ایک تو یوں بے حد حسین و جمیل تھے ما بعد میں شمولیت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ گویا چارلس بوائز کو یونیفارم پہنا دیجیے۔

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔ یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سُنی۔ ایک آدمی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کر رہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا: "کمال ہے ۔۔ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آئی ہو گی۔"

"پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلایا تھا" انھوں نے غصے سے کہا۔

"میں نے آپ کو کسی باغ کے راستے پر نہیں چلایا۔"

"تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں دلچسپی نہیں لی ۔۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمھاری دوست تہمینہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ بالکل صحیح تھا۔ تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔ اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علاحدہ چیزیں ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ خالص فلسفے اور اخلاق کے اصولوں کا جذبات اور امپلسز سے کوئی ایکویشن نہیں۔ ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔

بھیا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لیے۔ "تم بھی بے حد معمولی نکلیں" انھوں نے کہا۔

"میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعویٰ کیا تھا" اب وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ "ٹھہریے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آ رہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے۔"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"گھر تو ہم میں سے کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔" چمپا نے اکتا کر کہا۔ "اب میں اس سمے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے، جو گلستاں کہلاتا ہے۔ لاحول ولا۔ کس قدر بوگس نام ہے ۔۔ اور وہاں تہمینہ موجود ہے۔ واپس جائیے۔"

"تم بے حد معمولی ہو۔ اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمھارے سارے ردِ عمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر ٹائپ پر لوٹ گئیں ۔۔ تمھارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود

ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے۔"

"عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑ رہے ہیں!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "لہٰذا یہ نظریہ ثابت ہوگیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ۔" وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے ٹیگور لائبریری کی سمت روانہ ہوگئی۔

گلفشاں پہنچ کر بھیا صاحب تندہی سے پیکنگ میں مصروف ہوگئے۔ اسی روز تہمینہ ایم اے۔ کا آخری پرچہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں کھچڑیاں پکتی رہی تھیں۔ بڑی بٹیا نے تعلیم ختم کرلی۔ بھیا صاحب نیوی کے افسر بن گئے۔ اب پوسٹنگ پر جا رہے ہیں۔ اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے۔ تو گو یہ بڑا اندھیر ہے،" خالہ بیگم نے کہا، "کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود، ٹھیکرے کی مانگ، اور شادی کا کوئی نام نہیں لیتا۔ اسی کو کل جگ کہتے ہیں۔

رات کو بھیا صاحب خاموشی سے موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گنگا دین بھی نظروں سے اتر گیا۔ نوکر جا کر اسے غصّے سے دیکھتے۔ بے مروّت تھے دونوں جنے۔ حسینی کی بی بی نے زردہ جھانکتے ہوئے سوسن سے کہا اور اپنی لڑکی کی چٹیاں گوندھنے لگیں۔ ذرا سی کمبخت نچلی بیٹھ۔ انھوں نے لڑکی کو ایک چانٹا رسید کیا۔ لڑکی زور زور سے رونے لگی۔

سارے گھر پر بدمزاجی کا دورہ پڑ گیا۔ نواب تقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے کہا۔ اور بناؤ صاحبزادے کو اپنا بیٹا۔ اور کرو لاڈ۔ زمانے کا خون سفید ہوگیا ہے۔ دُنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی ہوگی جب پھپھیرے منگیتر نے چھوڑ دیا۔

کمال اور ہری شنکر تہمینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا بنارس لوٹ گئی۔ اب حسبِ معمول پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا۔ سارے گھر والے نینی تال کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہری شنکر کو اپنے پردکھوے کے لیے مرزا پور جانا تھا۔ اس کے آج کل دھڑا دھڑ پیغام آ رہے تھے۔ کمال اپنی پھوپھی کی دعوت پر مسوری چلا گیا۔

جولائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اُترنا شروع ہوئے۔ "گلفشاں" کے دروازے کھلے۔ پروائی میں باغ کے پودے سرسرائے کہ ایک روز اچانک بھیا صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلفشاں میں ٹھہرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ اماں بیگم کے کمرے میں گئے۔

"مبارک ہو۔ آپ کی بٹیا ایم۔ اے۔ پاس ہوگئیں۔" انھوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پُر سکون آواز میں کہا۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

"میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔"

"کس سے؟" اماں بیگم نے ذرا تلخی سے پوچھا۔

"مجھ سے، اور کس سے؟" انھوں نے بھی اسی تلخی سے جواب دیا۔

"تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ چچا کی بیٹی کو چھوڑ کر غیر لڑکی کے پھیر میں پڑ گئے۔ ہم جدھر جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔"

"یہ آپ نے کس طرح طے کر لیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں پال پوس کر اس گھر میں اسی لیے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تہمینہ بیگم کا شوہر کہلاؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بٹیا کو جُل دے جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

سوسن نے جا کر تہمینہ سے کہا: "بٹیا۔ ہم تو امام باندی کو بلانے جا رہے ہیں، گانے کے لیے۔ کچھ سُنا نہیں، آپ نے آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

"سوسن۔ تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دُنیا ادھر ہو جائے میں ہر گز ہر گز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔"

اتنا کہہ کر تہمینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سوسن ہکّا بکّا رہ گئی۔

گھر میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے۔ کمال کو مسوری تار دیا گیا کہ وہ بہن کو آ کر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے طور پر تہمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی: تم لڑکی ہو۔ ایم۔ اے۔ پاس ہو تو کیا ہوا؟ اور بڑے گھر کی بٹیا ہو تو کیا ہوا؟ ہو تو لڑکی۔ شادی کر لو۔ اس کے بغیر گزر نہیں۔ رشتے ناطے کے معاملات میں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہمینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی، گو خالص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات رات بھر رویا کرتی۔

چمپا بھی واپس آ چکی تھی۔ یہ اس کا کیننگ کالج میں آخری سال تھا۔

کمال نے مسوری سے آ کر گھر کا یہ نقشہ دیکھا۔ پھر وہ چمپا سے ملنے کیلاش گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ چمپا ابھی اپنے ماموں کے یہاں ہیں، اگلے ہفتے ہوسٹل آئیں گی۔ چمپا کے یہاں پہنچا تو وہاں بھیا صاحب

سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ پتا نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدراس کے لیے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آگئے۔ تہمینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا کیا کرے؟ لڑکیوں کے لیے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں سوائے ایک محکمۂ تعلیم کے۔ تنگ آکر اس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی نبھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لونڈیاں ہیں کہ جذبات کے چھچھورے پن میں مبتلا ہوں!

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقتی سطور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

(۴۶)

قحط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں کمال کلکتے جانے والا تھا کہ اسے چچا جی کا خط ملا۔ لاج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دلی میں تھی جہاں چچا جی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمے میں انڈر سیکرٹری تھے۔ اب نرملا کی شادی کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ چچا جی نے لکھا تھا: تم کلکتے جا رہے ہو۔ سر دیپ نرائن کا لڑکا گو تم بھی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے۔ وہ بھی تمہارے بنگال ریلیف اور راہتا و پنا کے چکر ہی میں وہاں گیا ہوا ہے یا شاید وشوابھارتی میں کچھ کر رہا ہے۔ بہر حال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرح خالی بوہیمین ہی ہے۔

کمال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ کمال کے آدمی ہیں چچا جی بھی۔ انسان دیس میں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں، ملک تباہی کی اور جا رہا ہے، یہ شادی بیاہ کے قصے لے کر بیٹھے ہیں۔ (وہ بڑا جوشیلا اسٹوڈنٹ ورکر تھا اور تہمینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے مسئلے سے شدت سے بور ہو چکا تھا) میں کلکتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گا یا نرمل صاحبہ کے لیے دولہا

تلاش کرتا پھروں گا، اس نے جھنجھلا کر طلعت سے کہا۔ مگر بہرحال فرض کے طور پر اس نے ان صاحبزادے کا پتا نوٹ کر لیا جو چچا جی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔ راستہ بھر یہ لوگ ٹیگور اور نذرالاسلام کے ولولہ انگیز گانے گاتے گئے۔ ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہلہاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا — یہ میرا ملک ہے — یہ میرا ملک ہے — وطنیت اور انقلابیت اور قومی جوش اور برطانوی حکومت کے خلاف غم و غصے کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکیچ چھپے تھے۔ ریکھا نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ کمال نے نظریں اٹھا کر ریکھا کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔

سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا: یہ جنگ ہے جنگِ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے — ہم ہند کے رہنے والوں کی — ریل کی چھک چھک گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوئی۔ دوسرے کونے میں چند لڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

کمال نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کی۔ اس کے رفقا اسی طرح بحثیں کرتے رہے — ٹرین بہار کے سرسبز علاقوں سے گزرتی بنگال میں داخل ہو گئی۔

گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلعے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاروں اور تالاب تھے، اور سبزہ زار، اور بانس کے جھنڈ۔ دور سورج گنگا کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر دو پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کا مجمع تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتے جانے کے لیے ٹرین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل میں فوجیوں کی ٹرین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی، جو برما جا رہے تھے، اردو کے فلمی رسالے ہاتھ میں لیے ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی میجر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دو بل ٹیریر کتوں کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑے ایک انگریز کرنل سے مصروفِ گفتگو تھے۔

"جب تک یہ فوجی ٹرین نہ چلی جائے آپ کی گاڑی روانہ نہیں ہو گی۔" ایک گارڈ نے کمال کو بتایا۔

"اس کا مطلب ہے —"

"جی ہاں۔ کوئی چار پانچ گھنٹے لیٹ ہوگی آپ کی یہ ٹرین۔ یہ وار ٹائم ہے جناب۔"

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پر اُتر آئے۔

اردھو گوگوُنے بُوجے مادول۔ انھوں نے نذرالاسلام کا ایک اور گیت شروع کردیا۔

میجر صاحب کی بیگم صاحبہ دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

"یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی۔"

"کمیونسٹ ہیں سالے۔" میجر صاحب نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ "چلو۔ کرنل ہمیں ریسٹوران کار میں مدعو کرگیا ہے۔"

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ریستوراں کار کی سمت چلے گئے۔

کمال اور اس کے ساتھی اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ یکایک ریکھا چیخ کر ایک طرف کو دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ سہما اور سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان، جس کی چھوٹی سی چھدری سیاہ داڑھی تھی، مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک سانولی سلونی دُبلی پتلی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے، جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی، ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔

"کمال۔" فریندر نے آواز دی۔ "ادھر آؤ۔ ہمارا لاشیں اٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہوگیا۔"

سسکیوں کے درمیان اس نے بتایا کہ وہ بنگالی ہیں۔ بتایا کہ وہ اور اس کا میاں ابوالمو نشور رزق ڈھونڈنے کلکتے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کی ٹرین میں سے پھینکے ہوئے دو بسکٹ اور توس کے چند ٹکڑے جو اس نے جمع کیے تھے وہ اپنے بچوں کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اُس نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر ان کی طرف آیا: "آپ لوگ ادھر کیا گڑبڑ مچاتا ہے۔ آج کل روز سو پچاس آدمی اسی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے۔ بھوکا بنگالی۔! آپ کیوں فکر کرتا ہے۔"

"یہاں قبرستان کدھر ہے؟" نریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

"ہم کو معلوم نہیں — کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبر کھود دے گا۔ دیٹ از ویری فنی —!!"
لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے، بچوں کو ساتھ لیا اور بازار کی طرف چل دیں — لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہیب آوازیں نکالتی، دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ پاس سے گزرا جس میں سکھ میجر اور اس کی دلہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انھوں نے کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی جس میں کمال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ کمال کے پاس آیا: "ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کا فرینڈ لوگ کدھر گیا۔"
"ہم اب کل صبح ہی جاسکیں گے۔" کمال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جاکر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس آن بیٹھا۔ یہ ٹرین بھی چلی گئی۔ اسٹیشن دفعتاً بالکل سنسان ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سرے پر اندھیرا تھا۔ گارڈ بہت نیک دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لالٹین لاکر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ کمال نے اپنے ہولڈال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر اڑھا دی۔ آمنہ بی بی جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابوالمنصور جس کی نیلی چارخانہ دار تہمد میں بہت سے پیوند لگے تھے، دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔

کمال اسٹیشن مین اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکیچ دیکھنے لگا — اس دیس کے مصور نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی؟ چند قدم پر گنگا بہہ رہی تھی۔ اس کی لہروں پر ایک اکیلا ناؤ کا جل رہا تھا جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی بڑی دلدوز آواز میں بھٹیالی گاتا جا رہا تھا جس کے الفاظ کمال کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی او نچے بیل پائیوں اور جھلملیوں کے برآمدے والی ضلع کے کلکٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہواؤں پر تیرتی ہوئی بی بی سی کے لائٹ پروگرام کی آواز یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ رابندر ناتھ اور سروجنی دیوی اور سرت

چندر کا دیس تھا ناول نگاروں اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔ تاریخ کے ابواب۔ الفاظ۔ اعداد و شمار۔ رپورٹیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقاریر۔ کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ عین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔ پاکستان —— تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹومیٹک طور پر پاکستانی ہو جائے گا —— یا کیا ہوگا —— لینن۔ اسٹالین۔ گورکی۔ ڈاکٹر اشرف۔ سجاد ظہیر۔ جناح صاحب۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جی ——

کمال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلایا کیا لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دو لاشیں تھیں۔ سارے واقعات اور نظریوں کے سلسلے کی کڑی آ کر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمولنشور —— دو لاشیں۔

دوسرے روز صبح وہ سب پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ شام کو ٹرین ہوڑہ پہنچی۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ پرمود کمار کا گھر ان سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو دوسرے روز جمع ہونا تھا۔ کمال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماموں "مٹیا برج والے نواب" رہتے تھے۔

(۴۷)

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے پھاٹک کے سامنے ایک بند گاڑی آن کر رکی۔ اس مکان کا طرزِ تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے بیل پائے۔ چوڑا برآمدہ۔ برآمدے اور دروازوں پر وینیشین جھلملیاں۔ اندر کمروں میں مرصع سنہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں میں پلیٹی پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلا مہک رہا تھا۔

اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی: "ارے کمن بھیا آ گئے لکھنؤ سے۔" سارے گھر میں شور مچ گیا۔ نوکرانیاں اور نوکر باہر دوڑے۔ نیچے برآمدے میں فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لیے آرام کرسی سے اٹھے۔

یہ مکان پچاس پچپن سال قبل دت خاندان سے مٹیا برج والے نواب کمال رضا بہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خرید لیا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی دھوم دھام سے برہمو سماج کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹوگراف جس میں مہارشی دویندر ناتھ ٹیگور وسط میں بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں ایک طرف سنگِ مرمر کا چبوترہ تھا۔ یہاں بیٹھ کر سنا ہے مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالکِ مکان بابو منورنجن دت کے انتقال کے بعد، جو کیننگ کالج لکھنؤ میں پروفیسر تھے، ان کی اولاد نے یہ مکان فروخت کر کے بالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوالی تھی۔ ان کی اولاد میں اب میں کئی آئی سی ایس افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یورپ میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابو منورنجن دت کی ایک پوتی کی شادی اُڑیسہ کے ایک مہاراجہ سے ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور دت خاندان کی کئی پشتوں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنؤ کے اجڑے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور کلکتے میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا مشغلہ زندہ رہنا تھا۔

نواب کمال رضا بہادر سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ مٹیا برج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچازاد بھائی تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر کا کلکتہ بے حد موڈرن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پریس اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہندو تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ راجہ سریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ سوامی وویکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں ویدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سوشل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنؤ اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنؤ میں یہ لوگ کلکتے والے نواب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انھیں لکھنؤ والے کہا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے: کلکتہ، پٹنہ (عظیم آباد) اور لکھنؤ۔ اس سے آگے کی دنیا کی انھیں خبر نہیں تھی۔

ان کا سارا وقت لکھنؤ، دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔ وثیقے کی آمدنی کی وجہ سے بے فکری سے گزر ہوتی تھی۔ سر پر برطانیہ کا سایہ سلامت تھا۔ راوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد، جو لکھنؤ میں رہتے تھے، سر سید کی نیچری فوج میں جا شامل ہوئے اور انھوں نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڈھ بھیج دیا۔

نواب علی رضا کے دوسرے داماد پٹنے کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی بے حد روشن خیال نکلے۔ پٹنے میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ ان گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیرسٹر بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انھوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنے والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیرسٹری کے لیے ولایت چلے گئے۔ یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنؤ والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوتے ہی تھے، اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سر سید مسلمانوں کو علٰحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر ان کا سر سید سے اختلاف ہو گیا۔ وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ اب ان کے یہاں لکھنؤ کے گولہ گنج والے مکان میں لالہ بھائیوں کا مجمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ ان گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنتا جا رہا تھا۔ ہندو، جو سو سوا سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا، اپنے گنجلک مابعد الطبیعاتی ذہن اور خالص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ دیہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی، تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مغلوں کا کارکشتہ منشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے سو سال سے ہندو اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور سائنٹیفک نظریۂ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر انھوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی، اس کا تدارک کرنے کے لیے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو، جنھیں ۱۸۵۷ء کے بعد بری طرح سے کچلا گیا تھا، اب اپنی عنایات سے نوازنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے یہاں ایک بورژوازی بھی پیدا

ہو چکی تھی جو لیڈر شپ اور لبرل سیاست کے لیے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹیج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں اب تک شہنشاہیت کے تصور موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انھوں نے سلطانِ ترکی سے محبت میں ڈھونڈا۔ وہ ان کا خلیفہ تھا جو قسطنطنیہ میں رہتا تھا۔ پھر حیدر آباد دکن کے نظام سے ان کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان فرمانروا تھا۔ ان کی لیڈر شپ کے لیے جب ہز ہائی نس آغا خاں اور دوسرے نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا کیونکہ نام اور خطابات بہرکیف عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فیوڈل طبقے کا گٹھ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدنی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے تھے اور مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھ رہے تھے۔ مسلمان جاگیردار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کار تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ دوامی بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو مڈل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی الٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔

وفادار انگریزی خواں مسلمانوں کا مڈل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جولاہا اور کسان، جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی فکر تھی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے اور کانگریس نے علی الاعلان سوراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے۔ کھدی کی تحریک اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہو گیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد تقی رضا بہادر، جو تعلقے دار تھے، کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ

نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جاں نثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلّط قائم رہ سکتا تھا۔ یہ لکھنؤ میں "نواب" مرہارکورٹ بٹلر کا زمانہ تھا۔ اس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں کا سنہرا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قیصر باغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جانِ عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور ٹھاکر نواب علی اور رائے راجیشور بالی کا لکھنؤ تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابوالمکارم تقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آمین سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنی دادی اماں کے ماموں نواب کمال الدین علی رضا بہادر کے نام پر کمال رکھا گیا۔

ان کے یہاں ایک دو سالہ لڑکی پہلے سے موجود تھی جس کا نام تہمینہ بیگم تھا۔ کمال کو اپنے طبقے کے دوسرے بچوں کی طرح پہلے ڈیرہ دون اسکول بھیجا گیا۔ پھر اس نے لامارٹینیئر کالج میں پڑھا جو برطانوی اور فیوڈل روایات کا گڑھ تھا۔

کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابوالمکارم کا خاندان اب اگلے وقتوں کا جیسا نہیں تھا۔ اب اس گھرانے کے افراد سرکاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا میاں یعنی بھیا صاحب کے والد بیرسٹر تھے اور کانگریسی لیڈر۔ مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ کمال کو ترکِ موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش و خروش سے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی توتلی زبان میں قومی نظمیں پڑھتا اور پولیس آکر لاٹھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محدود نہیں تھی، روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم ووں تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سیلرز سوٹ کے بجائے پٹنے والی ممانی نے اس کے لیے کھادی کی شیروانی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی ضد کی کہ اسے دلی بھیج دیا جائے مگر

اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہرحال کرنل براڈ شنر ڈیرہ دون اور لا مارٹینیر لکھنؤ کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا، اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے پرکھے پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور سیتلا دیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ میٹھ تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا۔ جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی۔اے۔ پاس سنت بیٹھا تھا اور جس کو ممی نے دس کا نوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشیرباد دی تھی۔ ہندوستان اٹاوے کی وہ کائی آلودہ درگاہ تھی جس کی منڈیروں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے جن میں سے ایک نے کمال کو بتول کے سنترے کھلائے تھے۔ ہندوستان قدیر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پیلے رنگ کی دھوتی پہنے مرزاپور کے اسٹیشن پر کمال کے لیے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول لائنز کی وہ سڑکیں تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائے شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانساماں تھا جو، جب کمال کو سیتلا نکلی تھی تو، اپنی دوپلی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گڑگڑا کر بولا تھا:

"ماتا — اب معاف کرو — بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ — ماتا تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں —"

یہ — سیتلا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا — ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیبیاں بھی ہندوستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال، محاورے، گیت، رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں، جو مغلانیاں سناتی تھیں: اجودھیا کے راجہ دسرتھ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا کیکئی، دوسری کا کوشلیا — ہندو پرانوں اور دیومالا کے قصے، مسلمان اولیا کے قصے، مغل بادشاہوں کے قصے — یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر، ایک تاسف اپنے حال پر، ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق — ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی، جو دھوتی باندھے گھومتے تھے اور ملک کے سنتوں، کبیر اور تلسی داس اور تکارام کی روایت پر پورے اترتے تھے، اس کسان کے لیے سمبل تھے جو خود بھی دھوتی باندھے ننگا گھومتا تھا۔ نہرو اس ہندوستان کے نئی نسل کے سمبل تھے جس کے دل میں یہ سارے دریا اُمنڈ رہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے — مذہب، فلسفہ، آرٹ، رمزیت، تصوف، ادب، موسیقی — کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا، دوسری طرف

انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز لڑکے جو کرنل براؤنز اور لا مارٹینیئر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر، جو 'گلفشاں' میں ڈنر کھانے آتے تھے، اس کی گولہ گنج والی حویلی کی شہ نشین میں بیٹھ کر محرّم کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ انگریز، ہیلی بری سے افسروں کے جانشین، جن کو سکھلایا گیا تھا کہ کن ہندوستانیوں کو، جب وہ تمھاری کوٹھی پر سلام کے لیے حاضر ہوں تو، برآمدے ہی میں بٹھاؤ، کن کو ڈرائنگ روم میں بلانے کی عزّت بخشو، کن کو صرف کھڑے کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو، کن کے گھر خود بھی، جب وہ مدعو کریں، تو چلے جاؤ۔ کمال اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے ملنے کا فخر حاصل تھا — ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۱۹۳۶ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آیند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے، ان کا نچلا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔ پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایہ دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل مالک شدّت سے رجعت پسند ہیں۔ وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورتِ حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہٰذا انھوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مڈل کلاس کی انٹلیجنسیا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے۔ ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا بہت کھلتا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھ کی نوجوان نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔

اس نئے باشعور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور للت لیلوی دیس اسی ملک میں بستا تھا جس کی جھلک کمال نے حیدرآباد دکن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے برطانیہ کے فرزندانِ دلبند کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاہدے انھوں نے

کیے تھے ان کی بنا پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدرآباد دکن مسلمانوں کے لیے خاص جذباتی اہمیت کا مالک تھا۔ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی مملکت۔ تہذیب، شعروشاعری نفاست، آدابِ محفل وغیرہ کا سلسلہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا پھولتا ہے لہٰذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر ابھی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں، مڈل کلاس لیڈروں، ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چائے کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتے، احمدآباد اور ٹاٹانگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لیے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں مختلف حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں، جہاں انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب انھوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا لہٰذا یہاں مسلمانوں کی انھوں نے ہمت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیرنگیں تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے —— بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخر میں آیا تھا لہٰذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی، جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرونِ اولیٰ، قرونِ وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ، وہیں کا کسان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان، جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا، سمجھتا تھا کہ سُوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی۔ کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ —— یہ ایک نیا عنصر اب سیاسی منظر پر ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انٹلکچوئل تھے۔ ساری دنیا اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش پیش تھا۔

پھر ۱۹۳۷ء میں، جب کمال ابھی لامارٹینیر ہی میں تھا، لکھنؤ میں دو اہم واقعات ہوئے: مسلم لیگ کا آل انڈیا سیشن اور کانگریس حکومت کا قیام۔

اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقرئی بارڈر کی ساڑی اور بلیسے بلیسے بُندے پہنے ڈائس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔

اسی سال کانگریس نے ۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے نظم ونسق میں شامل ہوئے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساڑی اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے موٹر میں بیٹھی وہ کونسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گومتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ کمال اندھیرا پڑے گلفشاں کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ شام کے سناٹے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پہنچتیں۔ ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بجتا——

کایا ایک گھروندا ہے — کایا ایک گھروندا ہے—

اسی زمانے میں کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ زراعت، صنعت، تعلیم، بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا۔ پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے ستر سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشائیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لیے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے۔ اور اب ان کو پھر یورپین امپیریلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ اب پھر گورنر کا راج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ زوالِ فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزاد قومی حکومت قائم کر دی جائے تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پیشکش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کیے گئے۔ ہری شنکر اور کمال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۷ راگست ۴۲ء کو کوئٹ انڈیا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی۔ احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔ دس ہزار ہندوستانی پولیس فائرنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیامت کا سامنا تھا۔ چونتیس لاکھ انسان اب تک قحط سے مر چکے تھے۔
چونتیس لاکھ — انسان —
چونتیس لاکھ آمنہ اور ابو المنصور —
کمال دوسری صبح جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے بعد بیت پور روڈ سے نکلا اور پرمود دا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۴۸)

پارک سرکس میں پرمود دا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم، اپٹا کے کارکن، پارٹی کے افراد، لکھنؤ والے بھی سب پہنچ چکے تھے۔

پرمود دا کلکتے کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے ہال میں بڑی سخت گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جو پروگرام اسٹیج کیا جانے والا تھا اس کی ریہرسل جاری تھی۔ کونے میں ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں ٹیگور کی چترا نگدا کے گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برآمدہ تھا۔ اس میں پرمود دا کی بہن کا اسٹوڈیو تھا جو شانتی نکیتن کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈیو میں ایک لڑکا سفید شال اوڑھے ایزل کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری برش لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے بعد یہ تصویر بھی ریلیف فنڈ کے لیے نیلام کی جانے والی تھی۔

پرمود دا کی بہن ارونا دیدی ایک اور کینوس پر جھکی ہوئی تھیں۔
سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

برش صاف کر کے ایک طرف کو رکھنے کے بعد ماتھے پر سے بال ہٹاتا ہوا یہ مصور لڑکا ہال کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور ہال کے منظر پر نگاہ ڈالی۔ ان سب کو اس تندہی سے کام میں جٹے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دادا ادھر آؤ —" ایک لڑکی نے اسے آواز دی۔ "دیکھو اب میرے قدم ٹھیک ہیں نا —"

"تمھارے قدم تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے —" اس نے لڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "تم

بنگالیوں کی رومان پرستی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تم خالص کلاسیکل ڈانس کی آخر کیوں اہل نہیں۔"

"دادا یہ تو خالص بھرت ناٹیم کر رہی ہوں میں۔"

وہ اسے اسی اداسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔

یہ لڑکا بھی یو۔ پی۔ کا رئیس زادہ تھا۔ فی الحال وشوابھارتی آیا ہوا تھا۔ ایم۔ اے۔ اور لاء الٰہ آباد سے کر چکا تھا۔ ابھی اس کے دماغ میں واضح طور پر نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت سے پروگرام تھے: جرنلزم، سیاست، کتابیں لکھا کروں گا نہایت عالمانہ، ایسی ایسی تھیوریز پیش کروں گا کہ دنیا عش عش کر اٹھے گی، آرٹ کا نقاد ہوں گا۔ سیاسی طور پر آپ بہت سخت اشتراکی واقع ہوئے تھے۔ باپ کا کہنا تھا (اور سارے باپوں کی طرح) کہ آئی سی۔ ایس۔ میں بیٹھو۔ وہ خود حکومتِ برطانیہ کے نائٹ تھے۔ اور بڑی چوٹی کے بیرسٹر۔ بچپن میں اسے نینی تال پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔ پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نکیتن چلو۔ اُس نے باپ سے تجویز کیا: بابا ــ ہمیں وشوابھارتی بھیج دیجیے۔ باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیوں میاں صاحبزادے، آرٹسٹ ہو گئے۔ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ ہر دنیا کے سارے باپ یہی بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا اس لیے باپ نے ضد پوری کر دی۔ اب وہ دو سال سے بولپور میں تھا اور وشوابھارتی کے دوسرے طالب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں کلکتے آیا ہوا تھا۔

"یہ لکھنؤ سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔" کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ ہال عبور کر کے اس کونے کی طرف چلا جدھر کمال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا زور زور سے "پالکی چلے، پالکی چلے ہو ہو۔" گا رہا تھا ــ یہ بھی ڈرامے کی ریہرسل کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جا رہی تھی۔

کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: "نمشکار۔"

کمال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہارمونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"آداب عرض ــ ہا،" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہو چکی تھی۔

"گوتم نیلمبر۔" لڑکے نے اپنا تعارف کرایا۔

"کمال رضا۔" اسے اطلاع ملی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا: تنگ پائجامہ، کرتا، نہرو واسکٹ اوپر سے کشمیری شال۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سبھی نوجوانوں کا تھا۔

"میاں کہاں آ پھنسے۔ ان بنگالیوں نے تو بنگالی بول بول کر ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔"

دونوں نے باہر ایک ریسٹوران میں جا کر قہوہ پیا اور پھر واپس آ گئے۔

"آؤ تم کو اپنی تصویر دکھاؤں۔" گوتم نے اُرونا دیدی کے نگار خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"یار تم ہری شنکر سے نہیں ملے۔" کمال نے کہا۔

"ہری شنکر کون ہے۔" گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹسٹوں والے انداز میں سگریٹ ہونٹ میں دبا کر تصویر مکمل کرتا رہا۔

"ہری شنکر۔ یار ہے میرا۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔"

"کہاں ہے بلاؤ۔" گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

"گھاس کھا گئے ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ لکھنؤ میں ہے۔ بیمار پڑا ہے بے چارہ۔"

"تم سب لکھنؤ میں کیوں رہتے ہو۔" گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مڑتے ہوئے پوچھا۔

"اور پھر کہاں رہیں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔"

"تم نے اس کی ناک غلط بنائی ہے۔"

"ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔"

"ماشاء اللہ کیا جواب دیا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔"

"سگریٹ لو۔"

"کیا تم آرٹسٹ ہو۔"

"اور کیا تمھیں گراس کٹر نظر آتا ہوں۔"

"ارے ارے۔ تمھارا ہی ذکر چچا جی نے کیا ہے خط میں۔"

"چچا جی — وہ کون بزرگ ہیں۔"

"ہماری لاج کے میاں۔"

"تمھاری لاج کون ہے۔"
"حد ہے۔ مجاجی تو تم کو جانتے ہیں۔"
"مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔"
"مغالطہ فائیڈ بھی ہو۔؟!"
"ہاں — تم نہیں ہو۔؟"
"ہوں تو سہی۔"
"ٹھیک ہے۔" گوتم تصویر میں لگا رہا۔
"اگر رہ لیے شانتی نکیتن میں چار پانچ سال تو شاید لوٹ پوٹ کر آرٹسٹ بن جاؤ۔ فی الحال تو اس کی کوئی امید ہے نہیں۔" کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔
"خالی آرٹسٹ — ارے میرا ارادہ تو ہے کہ مدراس جا کر رام گوپال سے بھرت ناٹیم بھی سیکھوں گا۔" گوتم نے الٹی میٹم دیا۔
"یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور انھوں نے بے انتہا میری ہُوٹنگ کی۔ اصل میں لڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں — آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔"
"تمھاری بہنیں بھی ہیں۔"
"ہاں — تمھاری نہیں ہیں۔"
"نہ۔"
"یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور نرمی کا احساس رہتا ہے۔"
"ہُوں — پھر کیا ہُوا۔"
"کیا — ؟"
"تم کہہ رہے تھے کہ —"
"یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھسٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں۔"
"واقعی۔"
"چند سال گزرے میں سارناتھ گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے سوچا کہ یار

یہ بدھ ازم میں کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔"

"ہوں۔"

"تم پارٹی میں ہو؟"

"پارٹی؟ — نہیں۔ ابھی میں اس قابل نہیں بنا۔ اس کے لیے بڑا پتہ مارنے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو — ویسے تم کوئی ایسے ریوولیوشنری دکھلائی بھی نہیں پڑتے۔" کمال نے کہا۔

گوتم نے غصے سے اسے دیکھا۔

"معلوم ہے مہاتما گاندھی نے تمہارے گرو دیو سے کیا کہا تھا — کہ گھر میں آگ لگی ہے اور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

گوتم نے برش جھٹک کر رکھا: "بے وقوفی کی باتیں مت کرو جی۔ کیا تمہارے ہری شنکر میں بھی تمہارا ہی جتنا بچپنا ہے —؟"

"تم بھیا صاحب سے بھی ملنا۔" کمال نے اس کی بات کی سُنی اَن سُنی کرکے کہا۔

"وہ کون ہیں؟"

"میرے چچا زاد بھائی۔"

"وہ بھی بہت قابل ہیں؟"

"ہاں۔"

"لکھنؤ ہی میں رہتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر آج کل محاذ پر گئے ہوئے ہیں۔"

"لکھنؤ میں بڑا بڑا اہلِ کمال پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔"

"اور کیا۔"

"چلو فرپو چل کر چاء پئیں۔" گوتم نے اٹھ کر تصویر پر کپڑا ڈالتے ہوئے کہا۔

"فرپو — تم سخت بورژوا معلوم ہوتے ہو۔"

"بکو مت۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصورات رکھنے کا قائل ہوں۔" کمال نے کہا۔

"شوٹ۔"

"کلاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ــــ تم پرولتاریہ کے مستقبل میں یقین رکھتے ہو ــ؟"

"ہاں۔"

"ہاتھ ملاؤ۔" انھوں نے ہاتھ ملایا۔

"تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مر جائے گا؟"

"ہاں۔"

انھوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"تم کو وشواس ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بیخ کنی ہی کر کے دم لو گے۔"

"مجھے تو خیر وشواس ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔"

"تم کو کیسے معلوم ــ" کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اس کی کوئی بہت بڑی چوری پکڑی گئی۔

"مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ہال میں کوئی ذکر کر رہا تھا کہ تمھاری مٹیا برج والوں سے رشتے داری ہے اور تم چیت پور روڈ والے نواب صاحب ــ"

"ہاں ــ ہاں ــ خیر" کمال شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ "وہ تو جو ہوا سو ہوا ــ تاریخ پر میرا کیا بس ہے ــ مگر اب میں پوری کوشش میں لگا ہوں کہ خود کو مکمل طور پر ڈی کلاس کر لوں۔"

"تمہارا ہری شنکر بھی فیوڈل ہے؟"

"ہے تو سہی۔ مگر وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا ہے۔"

"خوب۔" گوتم مسکرایا۔ "میں بڑا سخت مڈل کلاس ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

"رنج نہ کرو۔" کمال نے اسے دلاسا دیا۔ "ہم لوگ تو دراصل اس نئے سماج سے تعلق رکھتے ہیں جو اب جنم لے رہا ہے ــ جنتا کا سماج۔"

اس طرح کی خالص طالب علمانہ گفتگو کے بعد دونوں باہر آئے۔ کمال پر گوتم کا رعب پڑ گیا۔ گوتم میں بڑی گہرائی تھی اور وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ بہرحال سینئر لڑکا تھا اور کمال ابھی متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں نکلا تھا۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر کمال نے چچا جی کو جو خط لکھا اس میں گوتم نیلمبر کی تعریفوں کے دریا بہا دیے۔

اسی سال گرمیوں میں گوتم لکھنؤ آیا۔ اپنی جائے قیام سے اس نے "گلفشاں" فون کیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریڈیو اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ ابھی ابھی سب لوگ کملا جسپال کے ہاں فیض آباد روڈ گئے ہیں۔ فیض آباد روڈ سے پتا چلا کہ وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی — کیا بے تکا نام تھا — اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے — جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ یا گاجر منزل — اور مولی ہاؤس — اسے بے حد ہنسی آئی۔ شاید یہ لوگ سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے ریسیور اٹھایا۔

"ہلو۔" چمپا نے کہا۔

"ہلو — آداب عرض۔ دیکھیے میرا نام گوتم ہے — گوتم نیلمبر — اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔"

"آپ ضرور تشریف لائیے۔" چمپا نے جواب دیا۔ "اور اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو ذرا تیار ہو کر آئیے گا۔ آج ہم سب تلے بیٹھے ہیں کہ کوئی سوشلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔"

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا مگر اس نے فوراً جواب دیا: "بہت خوب — حاضر ہوتا ہوں — آپ لوگ بھی تیار رہیے گا۔"

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کر ندی کے رُخ برآمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا: "طلعت آرا بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟"

"جی میں ہوں۔ فرمائیے۔"

"دیکھیے مس صاحبہ کوئی لکھنے بیٹھ جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جا سکتا ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایسا نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"آپ نے IPTA کی طرف سے جس قدر بوگس ڈرامے کلکتے میں پروڈیوس کیے ہیں ان کا احوال میں بھی کمال کی زبانی سُن چکی ہوں۔ میں آپ کو مارجن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا رعب ڈالیے۔ اتنا ہی وقفہ ہم آپ کو مرعوب کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جائیے کہ نارمل رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رُعب — شروع کیجیے۔ سُنا ہے آپ وشو بھارتی کو نواز رہے ہیں — یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔ ہر قسم کا۔ اور یہ

سب باری باری فرداً فرداً اور مجموعی طور پر آپ کو امپریس کرنا چاہیں گے — پہلے آپ اپنے پولیٹیکل خیالات سے مطلع کیجیے — ری ایکشنری تو نہیں ہیں؟ یا ہما سبھائی؟"

"آپ چیلے بناتے ہیں؟" نرملا نے پوچھا۔

"جی نہیں — کبھی کبھی بنا لیتا ہوں۔"

"گوتم — آپ کا تخلص ہے؟" طلعت نے سوال کیا۔

"جی نہیں — ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا — طلعت بیگم — میں پھر کہوں گا — آپ ابھی اور پڑھیے۔ اس کے بعد لکھنا شروع کیجیے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک کمی ہے۔"

"بھیا صاحب نہیں پہنچے۔" کمال نے کہا۔ "انھوں نے فون کیا تھا کہ چائے یہیں پییں گے۔"

"بھیا صاحب، اس وقت۔" طلعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔ "رائیڈنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اب سوئمنگ سے واپس آتے ہوں گے۔" مجمع اپنی جگہ پر ذرا نادم ہوا۔

"خدا کی پناہ — یہ کون صاحب ہیں — کوئی فلم اسٹار ہیں — اشوک کمار وغیرہ —؟" گوتم نے سوال کیا۔

"بھیا صاحب — میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔" کمال بولا۔

"تعلقداران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کیا آپ سب یہی رائیڈنگ اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں — میں دراصل سارے مڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقۂ امرا پر عاشق ہوں۔ جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا، اپنے بابا کے ہمراہ — تو برٹش لارڈوں کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔ جہاں دور سے کوئی لارڈ نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف — بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے انڈرٹیکر بھی وہی لارڈوں والا لباس پہنتے ہیں۔"

"ہم لوگ بھی انڈرٹیکرز ہیں۔" کمال نے کہا۔

"اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔" ہری شنکر نے اضافہ کیا۔

"لیکن تمھیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔" کمال نے دوبارہ کہا۔ "کیونکہ ہم لوگ اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔"

"میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔ میرے دل میں بڑی وسعت ہے۔" اس نے بڑی تمکنت

سے جواب دیا۔

(۴۹)

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گروہ بہرحال ہمدرد تھا، کیونکہ خود تنہا تھا۔ ہم کتنے قابلِ رحم طریقے سے سہارے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گروہ محض ایک اور کردار تھا جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی مجسم شکل۔ انسانی رشتے بڑے نازک، بڑی گنجلک بنیادوں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں، اسی لیے میر انیس نے کہا تھا: خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم۔ ہر طرف آبگینے تھے جو شیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہِ شیشہ گری تھی۔ کمال نے اس سے کہا — چمپا باجی پوروں کے ذہنی باورچی خانے میں اپنی انگاکھ بیٹھک رکھیے۔ آپ ہمارا گھر رکھائیے، ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجیے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومینٹک ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی، یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا۔ کمال نے کہا: "اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں۔ مگر آپ نہ لکھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈسپلن آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"یہ لیکھک لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟" چمپا نے پوچھا۔

"متوازن نہ ہوں مگر تخلیق کی process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ تلاش کر لیتے ہیں۔ چمپا باجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجیے۔"

"تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔ نہیں کمال، ٹھیک ہے، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں تہمینہ کے ساتھ رہوں گی۔"

"مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجیے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکویلیشن ہونا چاہیے۔ اگر یہ طے کر لیا تو بس سمجھیے کہ بیڑا پار ہے۔"

"پھر وہی نظریے—!"

"اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باجی از خود تجربے نہ کیجیے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق

دے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پر ٹہلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوسٹل، جہاں وہ ایم۔ اے۔ کے لیے رہ رہی تھی، ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں، جہاں یوکلپٹس اور مولسری اور سمل کے پروقار درخت کھڑے تھے، ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی جس میں مسز وانچو رہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سیمنٹ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں، یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں، جو زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھیں، بہت ہوشمند اور سینیئر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند باغ میں بھتوون اور رالبسن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائد اعظم جناح ؒ اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائن مار اور اسمتھ کالج کی وضع پر چاند باغ کے ماحول کی تشکیل کی گئی تھی۔ وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آئیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کی فضاؤں سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہمینہ اور رزملا اور طلعت عموماً اکٹھی وقت گزارتیں۔ ایک روز تہمینہ نے چمپا سے کہا: "سنو۔ آؤ adult سطح پر اس مسئلے کو دیکھیں۔ بھیّا صاحب دسمبر میں مدراس سے آ رہے ہیں۔ اس سال تم ایم۔ اے۔ کر لوگی۔ روحانی طور پر اس قدر مہم پسند اور دلاور بننے کا ارادہ ترک کر کے ان سے شادی کر لو۔"

"بکو مت۔"

"بکنے کا اس میں کیا سوال ہے۔"

"تم خود ہی نہ کر لو ان سے شادی۔"

"میں تمہاری پرچھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

"بکواس۔" تہمینہ نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولی: "علاوہ ازیں بھیّا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہییں۔ مرد اس لائق ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔"

"ظاہر ہے۔"

"زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔"

"ہاں ـــ" چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طلعت دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ''خدا کا شکر ہے ان دونوں کی سمجھ میں بات آگئی۔'' اس نے نرملا سے فون پر کہا۔ نرملا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دسمبر میں لکھنؤ آئے اور چمپا کے سارے نئے نظریے پھر ہوا ہو گئے۔ وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

''وہ گلفشاں والے گلفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔'' ہوسٹل میں لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اُسی اثنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے محکمے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی۔ (اور لوگوں نے کہا: اپنے باپ کی بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے ترنت ہی اسے نوکری مل گئی۔ بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا تھا۔)

یہ زمانہ، جو ان لوگوں نے اکٹھا گزارا، ان سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دور جو ایک بار چلا جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

(۵۰)

شانتا یہ بڑی پرسکون جگہ ہے۔ جھاڑیوں پر کوئلیں بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں جن کے درمیان سے ایک مالینی کڑا بجاتی جا رہی ہے۔ بڑے شائستہ ریٹائرڈ کلکٹروں، اوسط درجے کے زمینداروں اور بیرسٹروں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھاٹ پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں۔ سایہ دار راستوں پر سے پیلے پیلے زرد پھول درختوں سے نیچے برستے ہیں۔ باریک نازک ٹہنیوں والے درختوں پر بڑے بڑے ٹیک پھول پتے کھلے ہیں جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں۔ اتوار کی صبح کو لڑکیاں برمی چھتریاں سنبھالے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں اور شدید انٹلکچول گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست۔ برآمدے کے سبز جنگلے پر پھیلی ہوئی بیل۔ ٹھنڈے فرش پر سٹیل بالٹیاں۔ ایک دیوار کے سہارے غلاف میں ملفوف طنبورہ رکھا ہے۔ کمروں کے اونچے اونچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلملیاں ہیں۔

چوڑی سیڑھیاں اونچی کرسی۔ بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں۔ چھتیں ٹاٹ کی ہیں۔ چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اطالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر استحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی سیڑھیوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں، جہاں میں پیدا ہوا، میرا مکان بھی عین مین ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کتھا لے کر بیٹھ گیا۔ شانتا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آچکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سُنو۔

نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمپا بیگم۔ اچھا نام ہے، ہے نا۔ کہو شانتا میری رائے سے اتفاق کرو۔ دیکھو تم اتنی دور ہو۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو میرے ساتھ ساتھ رہو۔ جب میں نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں شانتا ہوتی تو فلاں کے لیے یہ کہتی، فلاں کو پسند کرتی، فلاں کا مذاق اڑاتی۔ شانتا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے۔ اب کیا میں تمہارے جذبۂ مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہوگیا ہوں—؟ شانتا کاش تم یہاں ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے اَن افیشیل بردکھوے کے لیے بلایا گیا تھا۔ نرمل رانی، جو بی۔ اے۔ فرما رہی ہیں، بجائے اس کے کہ روایتی لڑکیوں کی طرح کچھ شرماتیں، ہارمونیم پر ان سے گانا سنوایا جاتا، انھوں نے مطلق شرما کر نہیں دیا۔ شاید انھیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میرا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال، انھوں نے مجھ میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں۔ ڈاکٹریٹ کریں گی۔ نرملا اور طلعت دونوں انتہائی تیز ذہین لڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے۔ ہر وقت ٹرّاتی رہتی ہیں۔

"لکھ لی تقریر—"

نرملا نے برآمدے کے جنگلے کے نیچے سے اچک کر پوچھا۔

"لکھ رہا ہوں۔"

"دکھلایئے۔"

"دراصل—بھئی اصل میں تقریر نہیں لکھی ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ شروع کر دیا۔"

"یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں—"

نہ وہ چین سے نکلے نہ جاپان سے نکلے۔
نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے۔
محمد مصطفیٰؐ نکلے تو عربستان سے نکلے۔
محمد مصطفیٰؐ ۔‘‘

کمرے میں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوالی شروع کر رکھی تھی۔

’’چلیے چل کر قوالی گائیے۔‘‘ نرملا نے دوسرا حکم لگایا۔

گویا سنگھاڑے والی کوٹھی میں آکر ’’نہ وہ چین سے نکلے‘‘ گانا اس قدر اہم اور ضروری چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ ’نہ چین سے نکلے‘ گائے۔ اس نے نرملا کو اداسی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر خوش ہے۔ ’’چلو نرمل میں آتا ہوں، مگر ایک شرط پر۔‘‘

’’وہ کیا ۔‘‘

’’اپنے بھیّا صاحب سے ملواؤ۔‘‘

عین اسی وقت اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ برساتی کی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے، گھبرائے ہوئے۔ مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سب برآمدے میں آگئے۔

’’بڑے نروس طبیعت کے آدمی جان پڑتے ہیں۔‘‘ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

’’لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔‘‘ نرملا نے جواب دیا۔

’’شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفنگے ہیں — واہ واہ۔‘‘ ہری شنکر نے احتجاج کیا۔

’’ان کے لاشعور میں کوئی پیچیدگی ہے۔‘‘ گوتم نے دوسرا اعلان کیا۔ ہری شنکر نے اسے مُکا دکھایا۔

بھیّا صاحب مجمعے پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کرسی چھوڑ دی اور فرش پر بیٹھ کر ان کے لیے چائے بنانے لگیں۔

’’یہ سلسلہ بھی ہے۔‘‘ گوتم نے دفعتاً بور ہو کر پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔

’’بھیّا صاحب ناچتے بہت اچھا ہیں۔‘‘ نرملا نے موقعے کو سنبھالنا چاہا۔ یہ تینوں باقی مجمعے سے الگ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے تھے۔

"لوک ناچ یا کلاسیکل۔" گوتم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اولڈ والز کے استاد ہیں۔" ہری شنکر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"تب میں ان کو معاف کر سکتا ہوں۔" گوتم نے سر ہلا کر کہا۔ "میں بہت کچھ معاف کر دیتا ہوں۔ میرا بہت بڑا دل ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شنکر زور زور سے غل مچا رہا تھا۔

"اف وہ تم لوگ کس قدر کی ٹرلگاتے ہو۔" گوتم نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

"زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔" کمال نے گوہر افشانی کی۔

"خوب — یعنی؟"

"یہ محض باتوں کا دور ہے۔"

"پھر عمل اور تخلیق کا دور کب آئے گا؟"

"میاں جب سے دنیا بنی ہے اگر پیغمبر دل اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے ہوتے — شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سنتے ہو۔ ایک سمے ایسا آنے والا ہے جب تمہارے کان ہماری آواز سننے کو ترس جائیں گے۔" کمال نے کہا۔

"تم وقت کی ہلاکت خیزی کے قائل ہو؟"

"ہاں۔"

سورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سنہری گنبد کرنوں میں نارنجی نظر آ رہے تھے۔ سامنے لہروں پر سے ایک کشتی سکون سے گزر گئی۔

"تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔" معاً گوتم نے کمال سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"یہ سامنے جو ناؤ جا رہی ہے یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔" گوتم معمولی سی بات کو بے حد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ ہری شنکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے جو ندی میں اترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر timeless become کی علامت ہے۔ پتھر

وقت کی منجمد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ چوہے کی موت کی طرح یقینی ہے اور اتنا ہی غیر اہم —— ویدانت میں لکھا ہے کہ۔"

"یہ ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔" ہری شنکر نے اپنے آپ سے کہا۔

"مجھے دریاؤں سے عشق ہے۔ تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟" اُس نے مڑ کر کمال سے بے حد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں۔"

"میں ندی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔" گوتم نے دوسرا اناؤنسمنٹ کیا۔

"گوتم! تم کیا بیٹھے بورژوا رومان پرست ہوتے جا رہے ہو۔" ان کے نزدیک آکر اکڑوں بیٹھتے ہوئے طلعت نے تشویش سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" وہ چونک اٹھا۔ "یہ وقت کا سحر ہے طلعت آرا بیگم۔" اُس نے انگلی ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔ "تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔"

پُل کے پار بہت دُور سے نوبت بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شام کے سناٹے میں وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔

"آؤ بھوتوں کو ڈھونڈیں۔"

"آؤ۔"

وہ چاروں لان پر واپس آ گئے۔

"یہ چمپا بیگم، بھیا صاحب، اپّی۔" گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو مخاطب کیا —— "آئیے ہم سب چل کر بھوتوں کو ڈھونڈیں۔"

وہ خاموشی سے موٹر کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ موٹر اب کاٹھ کے پُل پر سے گزر رہی تھی۔

"ایک موڑ ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔" عامر رضا نے اپنے آپ سے کہا۔

کمال نے موٹر روک لی۔ "آئیے ذرا لہروں کو گنیں۔" وہ پل کے اونچے جنگلے پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی لہروں پر رنگ برنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان میں جو لوگ

بیٹھے تھے انھوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے، مندیلیں، جواہرات، مالائیں، آبِ رواں کے دوپٹے، تلواں پاجامے۔ جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا پانی جگمگا اٹھا۔

ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو بلانا شروع کیا۔ ان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئیں۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سُریلی، مبہم، سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سُریلی، ڈراؤنی۔ ساحل پر کتے اور گیدڑ چلاّ رہے تھے۔ شمشان گھاٹ کی لکڑیاں چرچرا رہی تھیں۔ قبروں کے تابوت کے تختے چرچرے جا رہے تھے۔

"یہاں سے بھاگو — چلو آگے چلیں۔" چمپا نے کہا۔ اسے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گہرے پانیوں میں سے آ رہی ہے۔

"ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ یہ آخری آوازیں ہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔ لکڑیاں چرچرایا کیں۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے بھوتوں سے بچاؤ۔" عامر رضا نے پل کے جنگلے پر سر رکھ دیا۔ چمپا اس کے پاس کھڑی تھی۔

"خوبصورت آدمی، اگر میں تمہارے دل کو جان سکتی —"

"تم نہیں جانو گی۔ مجھے کوئی نہیں جانے گا۔" عامر رضا نے جواب دیا۔

موٹر پھر ایک دھچکے سے اسٹارٹ ہوئی۔ کمال نے گانا شروع کر دیا تھا۔ چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہو گئی۔ اس میں ان سب کے چہرے دُھلے ہوئے سفید نظر آ رہے تھے۔

"پُل — ہر طرف پُل بنا رکھے ہیں۔" گوتم غصے سے بڑبڑایا۔

وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ قریب سے ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہِ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔ "ان سے ہاؤ ڈو یو ڈو ہی کر لو کم از کم۔"

"یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولایتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔" کمال نے کہا۔

شاہِ زمن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ موٹر پھر آگے نکل گئی۔ سب چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پائپ کو ٹھونکتا بجاتا رہا۔ اگر مجھے کوئی یہ بتلا دے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں سے ان

سے دیلیں چھائیں پر۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہُوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں — گروہ کی سنگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

کمال نے دفعتاً کار روک لی۔ سامنے لا مارٹینیر کالج تھا۔

"یہاں انھوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا۔"

کمال اور عامر رضا اور ہری شنکر نے انگلیاں اٹھا کر یکزبان ہو کر کہا۔ "تم اتنا پڑھتے کیوں ہو —؟" انھوں نے پلٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

"یہ عجب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔" طلعت نے کہا۔ گوتم چپکا رہا۔

وہ سب اتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کو ان میں پھر پڑھائی ہو گی۔ چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی bas -relief کے گلابی، سبز اور نیلے رنگ نیم تاریکی میں جھلملا رہے تھے۔ دیوار پر زودفنی کا بنایا ہوا جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طلعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔ باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے۔

"آؤ — ادھر آؤ — میرے قریب۔" طلعت نے مڑ کر دیکھا۔ جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ اس نے اشارہ کر کے ان کو پھر بلایا۔

"مجھ سے باتیں کرو۔" اس نے کہا۔ "مجھ سے کوئی باتیں نہیں کرتا۔ دن بھر یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکچر ہوتے ہیں۔ میری طرف کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔" وہ سوں سوں کر کے رونے لگی۔ طلعت بڑی گھبرائی کہ اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔ "سنو میری بات۔" طلعت نے سمجھانے کی سعی کی۔ "تم ابدیت کے نقطے پر دھیان دیا کرو — وقت کے مختلف ٹکڑے دراصل —"

"وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے —؟" کمال اونچی آواز میں گوتم سے کہہ رہا تھا۔

"یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا۔ وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے کسی شیر نے کھا لیا یا چڑیوں نے اس کی داڑھی میں گھونسلے بنا لیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھا نارومنی کی موسیقی سنتا ہو گا۔" ہری شنکر نے کہا۔

"اوم — اوم — اوم —" یہ آواز اب سارے میں گونج رہی تھی۔ فضائیں اس آواز سے لرز اٹھیں۔ ہری۔ ہری۔ وہ جھیل کو پیچھے چھوڑ کر سرخ بجری والے راستے پر چلنے لگے۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا

کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھوا۔ ایک پتّا ٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

"دشنو، جو پتّے کے گرنے میں نہاں ہے۔ ہری ہری " چمپا نے دہرایا۔

تہ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے۔ اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جا رہی ہے۔

لائبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔ کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔ لاطینی۔ فرانسیسی۔ انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ ان کے معنی آگیا بھتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔ بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی، کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔ توپ نے گرج کر اطلاع دی۔ "میرا نام 'لارڈ کارنوالس' رکھا گیا تھا اور میں سرنگاپٹم میں استعمال کی گئی تھی۔" ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر استادہ مجسّے زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ پھر طلعت کسی بات پر کھلکھلا کے ہنسی۔ آؤ دلکشا چل کر پدمنی اچاریہ کے یہاں کافی پئیں۔ سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کر وہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد کمال، جو راستے میں سے کہیں غائب ہو گیا تھا، ان سے آن ملا۔ وہ سب دلکشا کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔" گوتم نے غصّے سے پوچھا۔

"میں نے سنا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بسنت کا تہوار بہت دھوم سے منایا جاتا ہے۔ اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر مکلوڈ بیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پائپ بجا رہا تھا۔ پھر رجب علی نفس علی قوال نے بسنت کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا تھا۔ پھر لندن کے بادشاہ کا جام صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجینئرنگ کی دھت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں الم غلم جمع کر رکھی ہیں۔ ایک وہ طامس ڈینہم ان کو فنچی چڑھاتا رہتا ہے۔ لیکنے ایک اسٹیمر گومتی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک صحنچی میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ بشپ ہیبر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر کھڑے بادشاہ انگریز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ پھر وہ سب کو اپنی پکچر گیلری میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی انگریزیت ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا۔ پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو راہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر جوڑی دار پگڑی سر پہ پیچ گوشوارے پہنے، ہندوستانی جامے میں ملبوس، جھالردار پالکی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟ کہا: بادشاہ کا جلوس ہے بکور فیشن

ہے"، میں نے پوچھا: "کون سے بادشاہ کا؟ ایک کے دربار سے تو میں ابھی آرہا ہوں"، بولے: "وہ تو مر گئے۔ ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں"۔ عجب تماشا ہے۔ یار ہری شنکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں"، وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماشی کا اجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوٹھی تھی جس میں اندھیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک مور سو رہا تھا۔ سامنے برگد کے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انھوں نے کوٹھی کے برآمدے میں جا کر پدمنی کو آواز دی۔ وہ اور اس کا میاں باہر آئے۔ ہلو۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"کافی بناؤ"، کمال نے حکم چلایا۔

کوٹھی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو سنہ ستاون میں یہاں کھیت رہے۔ وہاں جھاڑیوں میں گھس کر انھوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کتبے پڑھے۔ لفٹنٹ پال، فورتھ پنجاب رائفلز۔ نوجوان کیپٹن مک ڈانلڈ، ۹۳ ہائی لینڈرز۔ لفٹنٹ چارلی، ڈیش ووڈ۔

"ہلو۔ ہاؤ ڈو یو ڈو"، ان تینوں نے سامنے آکر بشاشت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"ہلو چارلی۔ لو یا پ بیوی"، گوتم نے ان کو تمبا کو پیش کیا۔

پھر نواب قدسیہ محل نے چنبیلی کی جھاڑی میں سے نکل کر کہا: "اگر کوئی مجھے دل کا چین دلا دے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں"۔

"میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا"، چمپا نے نواب قدسیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گویا وہ بھی کالج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پائنچے سمیٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ ٹہلتے ہوئے دلکشا محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرف چلے گئے۔

"ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سسرے شاہِ زمن بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ دیکھو تو مزا آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں بیٹھ کر اڑا اور شہر سے بارہ میل باہر کبوتروں کی چوکی پر جا اترا۔ تم کبھی غبارے میں اڑی ہو؟" ملکہ نے چمپا سے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا؟" چمپا مصر رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات ٹال رہی تھی۔ وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

"تم تو بڑی سخی مشہور تھیں۔ تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنؤ کے تخت پر نہیں بیٹھی۔ لاکھوں روپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ۔ کہ اس سخاوت اور محبت کے بدلے میں دنیا نے تم کو کیا دیا — اللہ بتاؤ نا بھئی۔"

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے۔" ملکہ بے دھیانی سے گنگنا رہی تھی۔ "یہ میرے بادشاہ کا مصرع ہے۔" اس نے چمپا کو مخاطب کیا۔ "تم کو شعر پسند ہیں؟"

باغ بسنت کے سارے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

"برکھا رت تھی اور تم دلکشا محل میں تفریح کے لیے آئیں، اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے، تم نے لے کے سنکھیا پھانک لی — ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب ہے — کیا مرد اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لیے انسان جان پر کھیل جائے۔ ان کی تو اتنی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیے — اتنی سی بھی —" چمپا نے انگلی پر انگلی رکھ کے بتایا۔

قدسیہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اے لو — وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔ آج پورنماشی ہے نہ۔ بادشاہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہوں گے۔ مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔"

"کہاں جاتی ہو —؟" چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہیں نہیں۔ ہم سب یہیں موجود ہیں۔ ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں؟ بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلاتے ہیں —"

"چمپا باجی — چمپا باجی —" رات کے سناٹے میں کمال کی آواز سنائی دی۔ وہ پتھر سے اٹھ کر دلکشا محل کی طرف چل پڑی۔ کھنڈر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گنگنا رہے تھے۔ سب لوگ آس پاس بیٹھے تھے۔

"لڑکیو، چلو کافی تیار ہے۔" پدمنی نے پکار کر کہا۔ اندر کھنڈر کے ایوانوں میں نصیرالدین حیدر کے حرم کی انگریز بیگمات، بڑے بڑے جھالردار سائے پہنے، کہنیوں کے بل لیٹی بڑی محویت سے گنگنا رہی تھیں۔ پھر ان بیگمات نے مل کر پولکا شروع کر دیا۔ وہ سب سیڑھیاں اُتر کر پدمنی کی کوٹھی کی طرف

چلے گئے۔

چمپا پھر تنہا رہ گئی۔

"مادموزیل ــــ وذییت تری شارماں ــــ مادموزیل ـــ" اس نے مڑکر دیکھا۔بادشاہ نصیرالدین حیدر کا فرینچ حجام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولریس انداز میں اس نے اپنا جھالر دار رومال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دو زانو جھک کر اس سے کہا: "تشریف رکھیے۔"

چمپا ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

"مادموزیل ـــ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجیے ـــ جی بھر کر خوش رہیے۔غم بیکار ہیں۔آئیے میں آپ کو مردہ عورتوں کا گیت سناتا ہوں۔" اس نے ایک جھنکار کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل ایجار یہ وہیں بھول گئے تھے۔

مردہ عورتوں کا بیلڈ:

"مجھے بتاؤ کہ لیڈی فلورا اور خوبصورت ہائی پیٹشیا

اور تائیس کہاں چھپ گئیں؟

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلایا تھا؟

مادرِ خداوند ـــ ان سب کا کیا ہوا ـــ؟

لیکن ـــ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے!!

"مادموزیل، یاد رکھیے، خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں۔ حسن پر نازاں ہو جیے۔دولت اور شہرت اور عزت پر نازاں ہو جیے۔وقت بہت کم ہے۔بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائے گا۔میری سنیے۔میں پیرس کا حجام۔میں نے بادشاہ کی ایسی حجامت بنائی کہ پورے چوبیس لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔سارے لکھنؤ پر میری حکومت تھی۔بادشاہ میرے تابع تھے۔ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں۔" اس نے اپنے ساٹن کے جوتوں کو اداسی سے دیکھا۔ اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔

چمپا سیڑھیاں اترنے لگی ـــ "یہ گٹار لیتی جائیے ــــــــ کرنل اسے یہیں چھوڑ گئے۔اب میں جا کر کیس اور منڈلاؤں گا ـــ بوں نوئی مادموزیل۔" اس نے جھک کر بڑے اسٹائل سے کہا۔

پدمنی کے لان پر بیٹھ کر کافی پینے کے بعد وہ موٹر کی طرف بڑھے۔ دور کھنڈر پر چمگادڑیں اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مرگھٹ تھا۔ میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دور پر دلکشا کلب میں ناچ ہو رہا تھا۔ "ادھر چل کر ناچیں"۔ کمال نے تجویز کیا۔

"آج تم لوگ کیا رت جگا منانے نکلے ہو؟" پدمی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر برباد کیا جائے؟" ہری شنکر نے جواب دیا۔ "تم بھی چلو۔"

وہ پھاٹک سے نکل کر کاسلز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے، پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔

سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

"ارے آج تو یہاں بسنت کا میلہ ہے۔" طلعت نے خوش ہو کر کہا۔

"آج معلوم ہوتا ہے سلطانِ عالم اوپیرا ہی کر رہے ہیں۔" نرملا نے کہا۔ "چلیں اندر۔۔۔؟"

"کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔" کمال نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"چلے چلو۔ چوبداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے۔" شنکر نے جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کا فرش جھل جھل کر رہا۔ اسٹیج پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلملا رہے تھے۔۔۔ پکھراج پری گا رہی تھی:

رت آئی بسنت بہار
کھلے جرد پھول، بردن کے ہار
ہر کے دوار مالی کا چھورا
گر اڈارت گیندن کے ہار

وہ سب پنجوں کے بل چلتے اسٹیج کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طلعت نے چپکے چپکے ساتھ ساتھ گنگنانا شروع کر دیا۔

پھر دھن بدلی۔ اب پکھراج پری نے اپنی غزل شروع کی:

ہے جلوۂ تن سے درو دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصلِ بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سر بازار بسنتی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگڑے برسنے لگے۔ یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آ گئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے۔ انھوں نے ان سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پری گائے جا رہی تھی:

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں
جھالے بھادوں کے وہ ہیں اور یہ گھٹا ساون کی

اوپیرا ہوتا رہا۔ یہ لوگ مجمع میں رل مل کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان سب کو روشندان میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے، جو سنگھار کرے میں کھڑی اسٹیج پر جانے کی تیاری کر رہی تھی، گھبرا کر کالے دیو سے کہا: "ادھر نظر ڈالو۔ آنے والے وقتوں کے بھوت ہمیں گھور رہے ہیں۔"

کالا دیو زور سے ہنسا: "کیا کچھ واہی ہوئی ہو۔ کیسے بھوت۔۔ میں اب پردے کے باہر جاتا ہوں۔"

کمال نے ایک چوبدار سے پوچھا: "سبز پری کون ہے؟"

"ارے اس کو نہیں جانتے خداوند۔ چمپا بائی۔ شاہِ زمن غازی الدین حیدر کے زمانے سے ان کی کمان چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کے پیٹے میں آ گئیں مگر وہی آن بان، وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی چھب ہے کر مل علی۔ ان سے بہتر سبز پری کا سوانگ اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ اللہ نے گلے میں نور اتار دیا ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنؤ کے باشندے نہیں؟" کمال جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی:

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان
تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان
تو اپنے معشوق کو ــــــــــــ

اب شہزادہ گلفام اسٹیج پر آ چکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا:

محلوں میں رہتا ہوں میں، عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا، نام مرا گلفام

پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا:

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیر دیں تجھ کو سناچل کے پرستان کے بیچ

وہ لوگ بارہ دری سے باہر آگئے۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آرہی تھی:

اُڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ

باہر جل پریوں کا پھاٹک، چینی باغ، جلو خانہ ——— سب جگہیں روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کا رس ہو رہا تھا۔ جانِ عالم گیروا کپڑے پہنے، دھوتی رمائے، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے، شہر کے باشندے سب گیروا جوڑے پہنے تھے۔ درگا پرشاد کتھک مولسری کے سائے میں پھول کی تھالی کے کنارے پر ناچ ناچ کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی اُبل رہا تھا۔ باغ کی نشستیں سنہرے اور نقرئی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے، جوگن کی بھیرویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں:

تار کشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کے
ہو شبِ ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی
آئی بہار، ساقیا! جام شراب دے پلا
پھول کھلے، پھلے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی
بیکلے زمینِ شعر میں بادل امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا، نکلا زباں سے یا علیؑ

جوگن کی آواز رفتہ رفتہ چاندنی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والوں کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آگئے۔ موٹر میں بیٹھ کر نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن الدولہ کی سرخ رنگ کی عمارات تھیں سڑک کے اس پار چھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں استادہ تھے۔ اندر سے والٹس کی آوازیں آرہی تھیں ——— موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پھاٹک کے اندر جا کر انھوں نے کار روکی۔ لکھنؤ کا اعلیٰ فیشن ایبل طبقہ

سینٹر ڈے نائٹ منا رہا تھا۔

"آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے — ابھی ایک اے۔ ڈی۔ سی۔ کو میں نے اندر جاتے دیکھا۔" ہری سنکر نے اظہارِ خیال کیا۔

"کون والا اے۔ ڈی۔ سی — وہی رسی جو اطالوی جگلو معلوم ہوتا ہے۔" طلعت نے بے دھیانی سے پوچھا۔

"بکومت — تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار — رسی ہے تو ہوا کرے، تم سے مطلب؟" کمال نے ڈانٹا۔

وہ اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس ایڈن نے لکھا تھا: "الف لیلےٰ کی زبیدہ نے اپنے نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی۔ وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہوگا۔" کمال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے تاریخی نقش و نگار دیکھتا رہا۔

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو 'اودھ لگر' میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں مسوری، نینی تال، شملے اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

"ان کا بھی ایک زمانہ ہے۔" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیڑھیوں کے نیچے گومتی آہستہ خرامی سے رواں تھی۔ وہ سب اٹھ کر باہر آ گئے۔ ٹیرس سنسان تھا۔ سیڑھیوں پر نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ ننگے پاؤں بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنا ایک جوتا لہروں میں پھینک دیا تھا۔ جب وہ ذرا بہتا ہوا دور نکل جاتا تو یہ تالی بجاتے تاکہ چوبدار آئے۔ جب کوئی چوبدار نہ آتا اور محض بال روم کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا جوتا پانی میں پھینک دیتے۔ اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوتم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

"نہیں — ہم مشکبو گڑگڑی پیتے ہیں — کوئی ہے —"

"معاف کیجیے گا — ہم لوگ ہیں —" گوتم نے گھبرا کر کہا۔

"تم لوگ کون —" انھوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

"بس ہم ہی لوگ —" وہ خاموش ہو گئے۔

"ان کو یہیں چھوڑ دو — کیا کریں گے ہم ان کا — آؤ چلو۔ یہاں سے —" کمال نے چپکے سے

گوتم سے کہا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کو پانی کے کنارے تنہا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کہارتیں اور پالکی بردار اور مہریاں اور یکّے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش، البساطی، کمہار، شہر کی اصل آبادی، اصل اہلِ زبان۔ وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پر اسرار شہر تھا۔ حویلیاں، پھاٹک، احاطے، چھتّے، پیچ در پیچ تنگ و تاریک گلیاں جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی، آصف الدولہ کا چوک، نخاس، اکبری دروازہ، سبزی منڈی، حسین آباد، گول دروازہ، وکٹوریہ پارک، بڑا امام باڑہ، بچھی بھون، رومی دروازہ

آصف الدولہ کا لکھنؤ، لکھنؤ کا دل، سڑکیں اور گلیاں اب سنسان پڑی تھیں۔ یکلخت بارش کی پھوار شروع ہو گئی۔ بہار کی بارش جو چند منٹ برس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے ایراوت ہاتھی کی طرح ایک بادل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالاخانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

"میرا ہمیشہ جی چاہا ہے کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں"، طلعت نے کہا۔

"ارے یہ تو تنویر کا مکان ہے جو ریڈیو اسٹیشن آتی ہے۔" نرملا نے کہا۔ "پچھے اس کی سٹوڈیو بیکر کھڑی تھی۔" اس کے پاس چلیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔" طلعت مصر رہی۔

"بکو مت۔" چمپا نے ڈانٹا۔

"ارے بجیا، آپ کو تو اس طبقے کو سوشیولوجیکل نقطۂ نظر سے ۔"

"بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔" گوتم اور کمال موٹر سے باہر اترے کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہوا ناک میں داخل کر رہے تھے۔

دکانوں کے برآمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو جامدانی کا انگرکھا پہنے لکڑی ٹیکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالاخانے کے نیچے موٹر روکے کھڑا دیکھ کر اس نے آہستہ سے لاحول ولاقوۃ کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ لوہے کے پل پر سے گزرتے ڈالی گنج ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا۔ دوسری طرف بادشاہ باغ۔

"آؤ پروفیسر بنرجی کے پاس چلیں"، انھوں نے نعرہ لگایا۔

وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھاٹک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوسٹل کے پہلو میں کھلتا تھا۔ باغات

یہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سُرخ بارہ دری چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ ٹیگور لائبریری کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پُر سکوت، پُر جلال نظر آ رہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ عمارت نے کہا۔ میرے اندر آؤ، میں تمھارے دُکھ بھلا دوں گی۔

"الفاظ دکھ بھلاتے نہیں، دُکھ اور گہرا کرتے ہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔

"خاموشی سب سے افضل ہے۔ اسی لیے لوگ مُنی ہو جاتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔

"خاموشی کی زبان جتنی تکلیف دہ ہے اس کا تم کو کیا اندازہ۔ سناٹا مار ڈالتا ہے۔" کمال نے ہری شنکر سے کہا۔

وہ نہر کے پُل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارات پر چاندنی برسا کی۔ نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ

بے چارے نصیر الدین حیدر۔

پھر انھوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ سو در درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر بنرجی خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

"یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں؟" کمال نے مُنہ لٹکا کر کہا۔ "شب بخیر —— پروفیسر ——" انھوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا اور واپس آ گئے۔ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کو اڈرینگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن چلتی ہوئی موتی محل برج پر جا نکلتی تھی۔ اس کے سرے پر رجسٹرار آفس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں وائس چانسلر رہتا تھا۔ برج پر آن کر انھوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچے راستے پر اُتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف جاتا تھا۔

آدھی رات کا گجر بجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر ندی کے بہتے پانی کو دیکھا۔ وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چمپا، طلعت، نرملا اور تہمینہ دوسری سیڑھی پر موجود تھیں۔ کمال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر امام باڑہ نجف اشرف اور موتی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا سحر زائل ہو چکا تھا۔

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سُنا چل کے پرستان کے بیچ

گوتم نے آہستہ سے دُہرایا۔

"افوہ — گوتم بھائی — تم تو اندر سبھا کے شعروں پر اتر آئے۔ کس قدر ڈیکیڈنٹ ہو" طلعت کہہ رہی تھی۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یار اب محفل برخاست کی جائے۔ ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دی —" کمال کی آواز آئی۔

وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا۔ گوتم نے لیٹتے جائے قیام کی طرف جاتے ہوئے اُداسی سے سوچا۔

(۵۱)

پروفیسر بنرجی بین الاقوامی شہرت کے مالک ماہرِ اقتصادیات تھے۔ ان کی کوٹھی پر بھی بڑی اُداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون۔ ان کا گھر صحیح معنوں میں علم کا مسکن تھا۔ پُرامن، خوبصورت اور خاموش۔ سہ پہر کو اکثر لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں لیے ان کے گھر پہنچتے۔ پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے نظر آجاتے یا اندر چار کی میز پر بیٹھے ہوتے اور کھانے کے کمرے کے خنک اندھیرے میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلملایا کرتے۔ اس وقت وہ اپنے شاگردوں سے بڑی اُداس آواز میں باتیں کرتے۔ پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی۔ جاڑوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ مذہب، فلسفہ، سیاست، عمرانیات، آرٹ، ادب۔ ذہن کی دنیا وسیع تھی بڑی پُرکشش، بڑی تکلیف دہ اور انتہائی پُرخطر۔

"پروفیسر،" ایک روز چمپا نے پوچھا، "ذہن اور جذبات کی کشمکش سے کس طرح نجات

ملے گی؟ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو درختوں کے سائے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش مکش ہر سطح پر جاری ہے۔ قومیں، حکومتیں، انسان، فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی عملداری ہے اور بے اطمینانی، نفرت، کھنچاؤ، دہشت، وفاداریوں کی کش مکش۔ اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بیتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پلک جھپکتے میں غائب۔ مجھے بڑی شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

"جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلا بھارگو کے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے، میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی باسی ہوں، اپنے لیے دوسرا ملک کہاں سے لاؤں؟ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے۔ وہ جرمن ہوں تب بھی یہودی ہیں، امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قومیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے، چندے جمع ہوتے ہیں، ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ دو طرح کے پناہ گزیں تھے: ایک وہ جنھوں نے اپنی مرضی سے ترک وطن کیا، دوسرے وہ جن کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوشی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترک وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا چاہ رہے ہیں۔ مجھے اکثر یہ تصور بہت بھایا کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا، نہ خواب دیکھے جاتے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کش مکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

"امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے۔ میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈرو ولسن۔ لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں مہاتما گاندھی کی

روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیے اور قائداعظم جناحؒ کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ ایک دفعہ ہم بچھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے، یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے۔ وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے۔"

"تم نے کبھی غور کیا۔" پروفیسر نے اوپر درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی ایک گوریا کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا، "تو تم ہسٹری کی طالب علم ہو۔۔۔ کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تھے۔ جنگیں ہوتی تھیں مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں۔ پھر انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں، ہزاروں قومیں بستی ہیں، ہندو مسلمان ایک دوسرے سے متنفر ہیں، یہ ملک ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں کے ذریعے نفرت کا بیج بویا گیا۔ مثال کے طور پر ایک کرنل ٹاڈ کی 'تاریخ راجستھان' ہی دیکھ لو یا انیسویں صدی کے سفرنامے۔ لیکن تم کو ۵۷ء یاد ہے جب اسی لکھنؤ میں ہندو امرا اور رعایا نے برجیس قدر کی حکومت کو، جو بہر حال مسلمان حکومت تھی، بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑا دیں۔ مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون۔۔۔"

"مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں۔"

"ویشنو بھگتی کا مذہب ہے۔ اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔"

"پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی۔"

"ہاں لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔"

"اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہو سکتا۔"

"تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو۔۔۔ ایسا نہ کرو۔"

"پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شامل تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطۂ نظر سے وہ حق بجانب تھے۔ وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں بٹی تھی: کفر اور اسلام۔ انھوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرا انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے اپنے نقطۂ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملا کے یہاں رات گئے تک بیٹھے رہے تھے۔ وہاں ہم ماضی کے متعلق

سوچ رہے تھے اور وقت کے گورکھ دھندے کے متعلق۔ گھر واپس جا کر میں دیر تک جاگی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا۔ اس وقت میں سوچ رہی تھی، ہمارا اور تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ ہم مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پراکشچت ہم کو کرنا پڑتی ہے۔ میری قوم نے جو جرم کیے میں ادا کر رہی ہے بحیثیت فرد کے مجھے ان کی سزا بھگتنا ہو گی۔ بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو گا کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج، اس لمحے تک، ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کفارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یا دنیا تباہ ہو گی یا پُر مسرت۔ تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اسٹیریوٹائپ مجھے آپ سے نفرت کروا رہا ہے۔ سوشیولوجی کی طالب علم کی حیثیت سے میں نے اسٹیریوٹائپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کل میں نے نرملا کے گھر سے لوٹ کر کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آ گئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک نظم بھی درج ہے۔ فیض آباد کا ماجرا ہے جو اجودھیا کہلاتا ہے۔ لکھا ہے: 'مغل بادشاہوں اور ان کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں۔ جب مندر گرے تب بھی ایک ہندو جوگی املی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکر دوارا بنانے کی کوشش کی۔ بڑا فساد رہا۔ فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرابا ہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطانِ عالم کو عرضی بھیجی جو نظم کی صورت میں تھی۔ میں نے وہ نظم نقل کر لی تھی۔ آپ کو سناتی ہوں۔"

اس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے پروفیسر کو سنانا شروع کیا:

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہِ اودھ کی خدمت میں

قریب دیر نہایت واجب التعزیر
بنا تھی مسجدِ اسلام ہم چو بدرِ منیر

لگے بنانے بڑھا کر یہ کافرِ مقہور
سوادِ مسجدِ اقدس میں خانۂ لنگور
امید ہے کہ شہنشاہ، قبلۂ عالم
ابو المظفر و منصور و خسروِ اعظم
شہپرِ رفعت و قدسی صفات، والا جاہ
خدیوِ کشورِ ہندوستاں، فلک درگاہ
زبانِ فیضِ مبارک سے یوں کریں ارشاد
کہ کافرانِ اودھ پر شتاب ہوئے جہاد
روانہ ہوگا شتابی کو لشکرِ اسلام
برائے غارت و تاراج شہرِ لچھمن و رام

"یہ مذہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیئت میں گو یہ ایک علحدہ بات ہے کہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرضداشت پر کان دھرتے انھوں نے الٹی مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور ایودھیا میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاعِ سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا ہے۔ یہ بھی ایک علحدہ بات ہے کہ سلطانِ عالم کو انگریزوں نے اس لیے تخت سے اتارا کہ وہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر، بتاؤ، میں کس کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے، جنھوں نے میرے بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلمہ گو بادشاہ سے نفرت کروں جو ہندو دیو مالا کا عاشق تھا، کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کا قتل کرواتا تھا؟ ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو لچھمن اور رام کے پُرامن خوبصورت شہر کو تاراج کرنے جا رہے تھے؟ یا ان ہندو جوگیوں کو موردِ الزام ٹھہراؤں جو رام گھاٹ پر دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں؟"

اب کمال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے نظم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔

"اور پھر تم متوقع ہو" کمال نے کہنا شروع کیا "تم جو فخریہ اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہو اور سومنات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی

دھاندلی ہے۔"

"کمال! تم تو بالکل مہا بھائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ تم نفرتوں سے آزاد بڑی وسیع النظری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمھاری اس شدت کی قوم پرستی بذاتِ خود ایک اور تعصب ہے۔" چمپا نے کہا۔

"اس منطق کا میں جواب نہیں دے سکتا۔" کمال نے کہا۔ وہ دونوں اٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔

"اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کہ مسلمان قوم کی سائیکولوجی عجیب و غریب ہے۔ تم کو کبھی اس سرزمین سے محبت نہیں ہوئی۔ چھوٹتے ہی 'میرے مولا بلالے مدینے مجھے' کا نعرہ تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار برس یہاں، تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑے رکھا عجم اور عرب سے۔ پھر مجھے مہا بھائی بنا رہی ہو۔ واہ بھئی ـــ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جاملے ـــ" اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ "کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۳۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن کیا کہ ان کے مذہب میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہٰذا ان کے اوپر یہ قانون عائد نہیں ہوتا۔ انھیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کروگی کہ جب لیگ نے یومِ نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جو الزامات ـــ"

"کیا کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے ـــ؟" چمپا نے بات کاٹی۔

"یہی عرض کر رہا ہوں ـــ راجندر بابو نے کہا کہ لیگ نے جو الزامات کانگریس حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکوائری اور فیصلے کے لیے رکھے جائیں۔ لیگ نے یہ بھی منظور کر دیا اور کہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پر برطانوی حکومت تیار نہ ہوئی ـــ"

"ہاں، کیونکہ برطانوی گورنروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا۔"

"تمھارا خیال ہے کہ برطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریس کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ہوش کے ناخن لو چمپا باجی۔ ۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفظ کے مخصوص اختیارات دے دیے گئے تھے۔"

"چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے۔"

"یقیناً۔" کمال نے گلا صاف کیا، "لیکن یہاں روس کی طرح ملٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کرو تان جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی۔" چمپا نے کہا۔

"اور آپ کی تان جا کر مکّے مدینے پر ٹوٹتی ہے —— ایٹم کے عہد میں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی تصوّرات لیے پھر رہی ہیں۔"

"دیکھو۔ تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔"

"کیوں نہ دہراؤں؟ دیکھیے چمپا باجی ساری بات یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور پر پسماندہ ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصوّر ہے —— انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جس کو چاہے مانے جس کو چاہے رد کر دے۔ ایک مخصوص قسم کی تنگ نظری ہے، ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی۔ پھر اس کی انٹیلجنسیا نے سائنٹیفک حساب سے پہلے سیکھا۔ وہ مذہب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس کا ذہن انتہائی ریشہ دوانی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب، جمع تفریق۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا رسولؐ کا عاشق۔ بات بات پر ہجرت پر تیار۔ ترکی میں کسی کو چھینک آئی، آپ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا، یہ بیکل ہو گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجمیریؒ پیا بھی، ہیں محبوب الٰہیؒ بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بنایا تھا مگر اس اسلامی بین الاقوامیت کے چکر نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

کمال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اٹھا کر پانی کا گلاس پیا۔ "مسلمانوں کی ساری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو ——" اس نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا، "ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑے۔ شان و شوکت اور امپیریلزم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ بنو امیہ، بنو عباس، ایران کی حکومتیں، عثمانی ترک، ہندوستانی مغل، افغان، عرب، مصری —— سب نے آپس میں کیا کیا خونریز جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا؟ مار اسلام اسلام کی رٹ لگا رکھی ہے ——"

"لیکن خلفائے راشدین کا زمانہ ——"

"چمپا باجی — کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو! رسولِ خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی تو تمھاری ملّتِ بیضا نے خانہ جنگی شروع کر دی — جنگِ جمل بھول گئیں — آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصب اور نفرت۔ تعصب کے مسئلے کو تو تمھارا اسلام بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنؤ کا شیعہ ہوں، مجھ سے پوچھو، شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر متنفر ہیں۔ نہیں چمپا باجی — مجھے مذہب نہیں چاہیے۔ فقہ اور حدیث اور امام غزالی اور ابن خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ انسان کو امن چاہیے اور روٹی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکار غزالی پر غور کر سکتا ہے۔" اب وہ پھر پارٹی لائن چلا رہا تھا۔

کمال موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا تھا: ذہن پرست، با اصول، ایماندار، شدید طور پر پر خلوص، تصور پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا، جنھوں نے اس سے صرف فرانسیسی پروفیشل شاعری اور رسی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں، کسی دوسری دنیا میں بستے تھے۔ کمال اور گوتم اور ہری شنکر — یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف مگر کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں بھی جانا چاہتی تھی جہاں دیودار کے درختوں میں چھپے ہوئے کاٹج ہیں اور جن میں شوپاں کی موسیقی بجتی ہے۔

"ہماری لڑکیوں اور عورتوں کو ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں کوڑے لگائے گئے۔"

اس کے کانوں میں کمال کی آواز آئی۔ وہ جوش کے ساتھ بولے جا رہا تھا: "ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تنہائی کاٹی۔ تم، جو جیل جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہو، ذرا سوچو، زندگی اور آزادی کسے عزیز نہیں؟ عمرِ عزیز کے ان گنت سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے؟ محض ایک اصول، ایک نظریے کی خاطر ہزاروں لوگوں نے جا کر قید خانے میں چکیاں پیسیں اور برطانوی سپاہیوں کے ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے بھوکے تھے؟ کیا خالی جذباتیت کی بنا پر انھوں نے یہ قربانیاں دیں؟ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہنسی خوشی جا کر کال کوٹھریوں میں بند ہو گئے۔ سیاسی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرح آرام کرسیوں پر بیٹھ کر ان پر ہنستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ

راستوں پر چلے جائیں گے۔ تم کو معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھری میں سانپ اور بچھو تھے۔ کن کن مصائب کا ان سب نے سامنا کیا۔ مگر اب بجائے اس کے کہ متحد ہو کر ہم ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔" کمال کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"تم بڑے پکے نیشنلسٹ ہو کمال؟" چمپا نے خائف ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہو گا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان نیشنلسٹ قوم پرست ہیں؟ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں؟ کانگریس نے ان کو رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرو چمپا باجی۔ اور ایک اور بات۔" اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا، "تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے، تم دیہات سے واقف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کو اچھال رہے ہیں۔ تم کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو؟ اگر مادھوپور کی ہندو لڑکی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھوپور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پیئے گا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سسرال ہے۔ یہ انسانیت کی اقدار ہیں چمپا باجی جو مذہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔"

اب شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طلعت بیٹھی گوتم اور چند لڑکوں سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کی طرف آگئی۔ کمال کہتا رہا: "ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مراعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا: نوں کو اتنی ملازمتیں ملنا چاہئیں، سکھوں کو اتنی، ہندوؤں کو اتنی۔ مڈل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں مڈل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کاریگروں کا تناسب کیا ہے اور ہز ہائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کاریگروں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ان میں اور احمد آباد یا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے؟ وہ اور برلا اور ڈالمیا"

"اوہ —" چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے، "وہی کمیونسٹ پارٹی کے گھسے پٹے دلائل۔"

"تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا باجی۔" کمال نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

طلعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔ "تم نے آج کا اخبار پڑھا؟"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" کمال نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"کیا ہوا —" چمپا نے پوچھا۔

"میرے بابا، خان بہادر نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور، لیگ میں شامل ہو گئے — یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ ٹائپ پر لوٹ گئے۔"

"مایا سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ —" طلعت نے کہا۔

"تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات" کمال نے کہنا شروع کیا۔
"بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقہ داروں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ کانگریس حکومت بنتے ہی پیرو ہی کھڑاگ شروع ہو جائے گا: زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ۔ انھیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ فیوڈل اقدار کے آخری رکھوالے ہیں۔ مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے والد کا نقطۂ نظر خوب سمجھتا ہوں۔ میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ اس سرزمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترکِ وطن کر کے سندھ اور بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔ بابا بوڑھے آدمی ہیں۔ میں ان کو اس وقت دل شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہو گا۔"

"کمال وطنیت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصورِ اصل چیز ہے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون؟ کیا تم آزادیِ افکار کے قائل نہیں؟" چمپا نے جواب دیا۔

"وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پھینکا جا سکتا۔" طلعت نے غصے سے کہا۔

"کیا وطن ہے یار، بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔" چمپا نے کہا۔

طلعت اسے غور سے دیکھتی رہی۔ "بجیا آئیے۔" اس نے کہا، "پروفیسر چار کے لیے بلا رہے ہیں۔"

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گوتم بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر چمپا کو نمستے کیا۔

"چمپا باجی مسلم لیگی ہو گئی ہیں بڑی بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے لہٰذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی۔" کمال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے قمقموں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کا غم گہرا ہوتا گیا۔

"چمپا چلو، نو بجے سے ریہرسل شروع ہے۔" پھولوں کے پرے سے کسی لڑکی نے پکارا۔

"اچھا۔" وہ سائیکل سنبھال کر پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روش پر سے گزرتا دیکھتے رہے۔

(۵۲)

کیلاش ہوسٹل میں سالانہ ڈراما تھا۔ لڑکیاں ہفتوں سے تیاری میں جُٹی تھیں شام کو ہال میں یا گھاس پر ریہرسلیں کی جاتیں۔ موسیقی کمپوز ہوتی۔ ناچ کی مشق کی جاتی۔ کوسٹیومز کے ڈیزائن تیار ہوتے۔ اسٹیج کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔ فیروز جبیں نہایت تندہی سے سب کو پارٹ یاد کروا رہی تھی۔ کملا انارکلی تھی طلعت دلآرام۔ ای نِڈ سلیم۔ ایک اور سوانگ۔ پھر کواڈرینگل میں اسٹیج تیار ہوا۔ وائس چانسلر اور اسٹاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرا نے اسٹیج کے پیچھے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔ اب کملا محل سرا میں کنیزوں کے ساتھ بیٹھی گا رہی تھی:

لب جُو ہو، فرشِ آب ہو، شبِ ماہ ہو، بادۂ ناب ہو۔

ای نِڈ دریچے میں کھڑی کہہ رہی تھی — راوی کے نوجوان ملّاح — انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیز سے محبت — کیسی ہنسی کی بات — یہ سب خواب کی طرح گزرتا گیا۔ پھر پردہ گرا اور لوگ باتیں کرتے باہر نکلے۔

عامر رضا نے چمپا سے کہا: ”ڈائریکٹر صاحب آپ نے کمال کر دیا۔“

کمال نے کہا: ”چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہیے — انارکلی سے بہتر کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو؟ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہیے۔“ پھر وہ مجمعے میں غائب ہو گیا۔

گوتم نے قریب آ کر کہا: ”چمپا باجی کیا آپ کمال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں کمال نے آپ سے کافی سست سخت باتیں کہیں۔ میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداسی ہے، اس اداسی میں اضافہ نہ کیجیے۔“

”نہیں۔“ اس نے گوتم کو جواب دیا۔ ”میں دراصل آج کل جینے کے مختلف رویے اسٹڈی کر رہی ہوں۔“

”میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔“ طلعت نے بشاشت سے قریب آ کر کہا۔ وہ ابھی تک دلآرام کا لباس پہنے تھی۔

”آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکسپریشن اپنے چہرے

برقائم رکھوں: وقار، بشاشت، سنجیدگی — مصیبت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساسِ کمتری ہے — اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غرور پر محمول کیا جاتا ہے — ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چنچل لڑکی ہے — رکھ رکھاؤ سے رہو تو یوریا بد دماغ سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ بے چاری چار آدمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے، کونے کھدرے ہے — میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمنا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں کیجیے تو لگتا ہے افلاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے۔ یا خلیل جبران کا المصطفیٰ دیودارون کے باغ میں مصروفِ گفتگو ہے — نہیں چمپا باجی۔ جینے کے رویے کے متعلق نہ سوچیے۔" پھر وہ بھی چھلاوے کی طرح مجمعے میں غائب ہو گئی۔

گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔ "کس قدر ٹرّاتی ہے یہ لڑکی —"

"مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی اُلجھن نہیں۔" چمپا نے کہا۔

"اُلجھنوں سے ہم سب خود کو بچا سکتے ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں چمپا باجی۔"

"تم کبھی اُلجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔"

"شاید — نہیں۔"

"سنو گوتم — کون کس سے کہہ سکتا ہے کہ اس طرح نہ جیو — اس راستے پر چلو — یہ باتیں سوچو — تم مجھ سے کہہ سکتے ہو؟"

"شاید نہیں —"

سڑک پر مولسری کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ہواؤں کے راگ بہت سُریلے تھے۔ وہ دفعتاً پھاٹک کی بُلیا کے پاس ٹھٹھک گئی۔ "نہیں گوتم، میں کمال سے خفا نہیں ہوں۔ مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا —"

"آپ درجۂ شہادت حاصل کرنے والی ہیں؛ یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟"

"تم — تم لوگ بڑے کمینے ہو" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہم لوگ محض بے حد پُر خلوص ہیں — مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ بھتیا — صاحب کے پاس موجود ہے —"

"تم — تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو — مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فراٹے سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں — وہ پردے جن پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر۔ اب آخر میں صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے۔"

"چمپا باجی، آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے۔ آپ کو بھیّا صاحب سے بہت محبت ہے، بس ساری بات یہ ہے، باقی سب فروعات ہے — اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔" گوتم نے حسبِ معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

نفرت سے چمپا نے اسے دیکھا: "الفاظ —"

"ہاں۔ سر یحاً۔ میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔"

"اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟"

"کوئی چیز بے معنی نہیں — خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔"

"طلعت ٹھیک کہتی تھی، تم بھی بور کرتے ہو۔ تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے۔"

"چمپا باجی —" وہ گھبرا گیا — "للہ خفا نہ ہو جیے — چلیے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلائیے — وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے — اور للہ افسردہ نہ ہو جیے۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے — آئیے —"

چمپا چاند باغ کی ایک بہاری لیکچرر ریتا ڈکشٹ کے ساتھ کالج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کاٹج میں رہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ سامنے امرودوں کے اندھیرے باغ میں رکھوالا سگوں کو اڑانے کے لیے آوازیں لگا رہا تھا جو رات کا بسیرا لینے کے لیے ٹہنیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کی کوٹھی میں پیانو بج رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیر گیا۔ گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"چمپا باجی آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم —"

"واقعی؟"

"چمپا باجی، ایک بات بتلائیے۔"

"پوچھو۔"
"آپ بھیّا صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟"
"کئی سال سے۔"
"اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا؟"
"پڑھا۔ اور کیا کیا!"
"اس کے بعد؟"
"اور پڑھا۔"
"اس کے بعد؟"
"بس پڑھتی چلی گئی۔" چمپا نے جھنجلا کر جواب دیا۔
"اور بھیّا صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا خیال آپ کے لیے ایک بڑی رئیسانہ عادت میں شامل ہو چکا ہے گو آپ خود رئیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتلادوں۔ آپ ذرا غور کرتیں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق—"
"واہیات باتیں مت کرو۔"
"واہیات۔ غضب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلو اسٹوکنگ نکلیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے؟ بڑی عمدہ چیز ہے۔ میں خود اس میں اکثر مبتلا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت بُرا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی، سوری۔ اتنا سامنا مجھے ہے، مجھے چاہیے تھا کہ آپ سے۔ بجواکر سُنتا ستار پر گت باگیشری، تین تال اور یہاں میں نے آپ کے پرابلمز کا تجزیہ شروع کر دیا۔"
"یہ دوسروں کے پرو بلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کالج میں پڑھاتی ہوں۔"
"میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پٹے پٹائے جملے دہراتے گزر جاتی ہے۔" وہ منہ لٹکا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔ "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومینٹک ہونے کے لیے آپ کے بھیّا صاحب کون سے مینرازم استعمال کرتے ہوں گے، کون سے جملے دُہراتے ہوں گے۔ سنا ہے، فرینچ بہت فرسٹ کلاس بولتے ہیں۔"
"لیکن آخر تم بھیّا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟" چمپا نے کہا۔

وہ دفعتاً جھینپ گیا۔ اس قدر جھینپا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مجھے چڑنے دیجیے، آپ سے مطلب؟" وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔ اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور نکلا، چمپا نے حیرت سے سوچا۔

"مطلب یہ ہے" چمپا نے کہا، "کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔ تمیز بھی کوئی چیز ہے۔ یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو۔ یہ کیا ہر سے ہلڑ، دنگا، فوجداری۔ یہ چنڈو خانہ ہی کیا کم تھا کہ اوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔"

"بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرما رہی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھا دیں۔ ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔"

"میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں؟ اور دوسری بات یہ کہ۔۔"

"دوسری بات یہ ہے چمپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپی کی اور بات تھی۔ وہ تو پیدا ہی اسی لیے ہوئی تھیں۔ مگر آپ ۔۔ حد ہے۔"

اب چمپا جھینپی۔ "میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔" اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

"میں رائے کب دے رہا ہوں؟ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر آپ ہیں کہ ۔۔۔ آہ ۔۔۔ اس بظاہر سمجھ دار تعلیم یافتہ لڑکی کو دیکھو۔" اس نے ٹہل ٹہل کر تھیٹریکل انداز میں کہنا شروع کیا۔ "یہ معاشیات کی استاد، ڈائیلکٹکس کی طالب علم، برسوں برس سے کس مصیبت میں گرفتار ہے ۔۔۔ اے رومانیت کی شکار نادان کنیا۔" کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دہاڑا۔

"گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔" چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

"اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسی کی طرح پھٹکار بھی کریں گی۔ میں کہتا ہوں، یہ تُک کیا ہے؟ یعنی غضب خدا کا، جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اطلاؤ والٹس ناچے، پکنکوں اور پارٹیوں میں کالج کی لونڈیوں کی ٹھوڑی کھینچتا پھرے، خود لونڈیوں کی طرح حسین ہو اور قیامت یہ کہ اپنے حسن پر نازاں بھی ہو ۔۔۔ اس کو آپ پسند فرماتی ہیں۔ مگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالیے باکمال اور میری خشکری ہی میں کیا برائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علاحدہ بات ہے کہ میں بے حد مفلوک دستی ہوں۔" اس نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا۔ پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی

سے کہنا شروع کیا۔ "نہیں، چمپا باجی مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایت، بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت، گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کی روایت، دلکشی، کشش، جذبِ دل — مگر خالی دلکشی کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔"

"پڑھاتی جو ہوں۔" چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو، اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی، پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابلِ افسوس معلوم ہوئی۔ "اب ہر ایک تو کلاکار نہیں بن سکتا۔" اس نے بآوازِ بلند کہا۔

"کلاکار نہ بنیے۔ آج کل کلاکاروں کی تو فوج کی فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بنیادی کام کیجیے۔ اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔" اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔ "آپ کو نظر نہیں آتا؟"

"نظر آتا ہے۔" چمپا نے کہا۔ "لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں تو تین سو روپے مہینے کے ملتے ہیں۔ میرے ابا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں۔ میں تم رئیس زادوں کی طرح خالی عزت کی بھبوری سے واقف نہیں، مجھے تنگدستی کی حقیقت معلوم ہے۔"

کسی اور موقعے پر اس سے یہ گفتگو کرتے سخت شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیسر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جا سکتی تھی!

"اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ والٹس ناچیں گی اور رائڈنگ کے لیے جائیں گی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"تو کیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں۔ کس قدر ہائی منڈی باتیں کرتے ہو۔ جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو ویسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنؤ میں مجھے زمانہ گزر گیا ہے۔"

"تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پرابلم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چمپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔"

"انڈر گریجویٹ باتیں مت کرو۔" چمپا نے غصے سے کہا۔

"انڈر گریجویٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے، ٹھیک ہے، لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھیا صاحب سے لو لگائے بیٹھی رہیں۔ بتائیے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر

پسند کیوں ہیں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا اور اسے سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی بغیر منگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

"اچھا، آپ کو اچھی شکلیں پسند آتی ہیں؟ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!" پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیٹ ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بھوئیں اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ "مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بدصورت نہیں۔"

"شانتا تم سے اتم عشق نہیں کرتی؟"

اب گوتم اپنی جگہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا ندہ پکبتر ٹوٹ رہا ہے۔

"گوتم بہادر، تم بھی شیشے کے گھر میں رہتے ہو۔ دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔"

"تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟"

"تم اس کو چاہتے نہیں ہو؟ جو کوئی بھی وہ ہے، جو تمھارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ ہم کس کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں؟ اور اب تم اس اپنی شانتا نیلمبر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔ بہت دنوں سے تم نے اس کو خط لکھ کر یہاں کی رپورٹ نہیں بھیجی۔ وہ تمھاری ذہنی رفیق ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ تم کسی سے بھی شادی نہیں کر سکو گے۔ نرملا سے بھی نہیں۔ گوتم بہادر یہ بڑے ادق معاملات ہیں۔ یہاں تمھارے نظریے نہیں چل سکتے۔ میں بھیا صاحب کو پسند کرتی ہوں۔ ان سے میری کوئی ذہنی رفاقت نہیں مگر گوتم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔ بتاؤ اس کا کیا کیا جائے؟ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔ کیا میں فطرتاً فلرٹ ہوں؟ ہرگز نہیں۔ ذرا باہر جا کر پوچھو، میری کس قدر عمدہ ریپوٹیشن ہے۔ مجھے دیبی کہا جاتا ہے۔ یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیشن کیا تو اس لیے کہ تمھارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اسے تم نے افسوس خود ہی مسمار کر دیا۔ کچھ دن اور ثابت رہ لینے دیتے اسے۔ بڑا خوبصورت تھا۔ بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی مورتی براجمان تھی۔ سلرناتھ سے واقفیت ہے؟ سارناتھ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی۔" اس نے اُداسی سے بات ختم کی۔

اندھیرے میں وہ جس کشتی پر سوار تھا وہ کشتی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

وہ دریچے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کیسا پیارا لڑکا تھا۔ اس میں ہری شنکر اور کمال کی کس قدر مشابہت تھی۔ ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان۔ یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اپنے جیسے کردک دستیاب کرلاتے تھے۔ اسی کو دیکھو۔ جنّتے کہاں سے بہتا بہتا آ نکلا۔ آیا تھا کسی دیس سے اک ہُنس بے چارہ — سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات — نقش گر — وہ اپنے ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تاکہ اس جذباتی لینڈ سلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

"تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟" گوتم نے دریچے میں کھڑے کھڑے غرّا کر پوچھا۔ وہ اس سے لڑ رہا تھا، یعنی اتنا نزدیک آچکا تھا کہ اسے ڈانٹے، اسے بُرا بھلا کہے اور اس سے لڑے، اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اداس کر دیا۔

"گوتم!" اس نے کہا، "اس خوفناک، پٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا مگر یہ کہ ہم سب کھُلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے۔ وہ نیم تاریکی، وہ دھندلکا تم کو کہیں نہ ملے گا۔ جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو۔ جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تیز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آر پار دیکھ رہے ہو لیکن میں تم کو خود آر پار دیکھ رہی ہوں" اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے —"

"— آر پار دیکھ رہا ہوں — چمپا الفاظ کو ختم کر دو — الفاظ ہمیں کھا جائیں گے۔"

"الفاظ کو ختم کر دو مگر معنی کے معنی موجود رہیں گے۔ بتلاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" چمپا نے بڑی بے بسی سے کہا۔

(۵۳)

بھیا صاحب کے لاشعور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا، البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے انھوں نے بالکل مَونِ برت رکھ لیا۔ پہلے ہی وہ کون سی بات کرتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔

"بھیا صاحب کی خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں،" حمید بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

"واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جوتا چھپا ہوا ہے۔ لاحول ولا قوۃ" طلعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورژوا رومانیت نے ہر طرف اودھم مچا رکھا تھا۔ خود حمیدہ بانو ان دنوں بڑے زوروں پر شاعری کر رہی تھی۔ موضوع سخن ایک مبہم سا اور اس قدر مثالی کردار تھا جو شاید یونانی دیو مالا کے لیے بھی تخلیق نہ کیا ہو گا۔

"ہمیں اس بورژوا ذہنیت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جاگیردارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی" طلعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا۔

"اور ذرا سننا — قسم خدا کی — دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن سڑکیں کٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے — سنا تم نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف — یہ گوتم سے جلتے ہیں۔" طلعت نے ایک وقت نرملا کو خبر دی۔

"گوتم سے —؟ ہائے رے۔ یہ تو بڑا لطیفہ ہے۔ کون جلے گا اس بے چارے سے اس قدر تو وہ defenceless ہے۔"

"اسے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں۔" طلعت نے کہا، "ہاں ہاں اور کیا — مطلب یہ کہ وہ تو — حد ہے بھئی۔"

ٹھگوں کی منڈلی کی مانند ان سب کو اپنی منڈلی سے شدت کی وفاداری تھی۔ جو اس میں شامل ہوا باقی سب اس پر جان چھڑکنے کو تیار۔

"مگر کیا چمپا باجی تو کہیں۔" نرملا نے دفعتاً سوچ کر کہا۔

"ہشت، ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔"

"اس میں بچپنا کیا ہے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔" نرملا نے بے حد بزرگی سے کہا۔

"غلط۔" طلعت نے پر زور احتجاج کیا، "چمپا باجی اب ایسی بھی ام پیچور نہیں — اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق؟" اس نے خوفناک طریقے سے پوچھا۔

"گوتم سے؟ حد ہو گئی۔ اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہی عشق کرنے کے لیے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہیے۔"

"اور اسی اسرار اور دھندلکے کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے ہیں۔" طلعت نے کہا۔

"اور کیا۔" نرملا نے صاد کیا۔

"دراصل چمپا باجی کے اس مسلسل عشق نے ہم سب کی سائیکولوجی خراب کر دی ہے۔ غضب

خدا کا۔ جب سے وہ یہاں آئی ہیں — یاد ہے ہم لوگ فرسٹ ایر میں تھے — تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ کس قدر تھرڈ کلاس بات ہے۔"

"بے حد تھرڈ کلاس ہے" نرملا نے دوبارہ صاد کیا۔

"اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کر کیوں نہیں لیتیں شادی ہے۔"

شام کا اندھیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے تھے۔ کشتی پر کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طلعت نے غور سے سننا چاہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات سمجھ میں آگئی۔ وہ گیت گایا جا رہا ہو اور فاصلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے۔ وہ سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اندر آگئی۔ "آؤ ترپ چال کھیلیں" اس نے ہری شنکر سے کہا۔

"بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے" اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بتایا۔

"پھر وہی قصہ" طلعت نے بور ہو کر سوچا۔

"وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا لفٹ کیوں دے رکھا ہے۔ ہر سمے یہاں گھسا رہتا ہے۔"

"ماشاء اللہ سے" طلعت نے کہا "وہ کیا یہ ہمارے گارجین ہیں۔"

"اب بہر حال — بڑے بھائی تو ہیں" ہری شنکر نے طرف داری کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا صاحب سے وفاداری، گوتم نیلمبر سے وفاداری۔ غریب شنکر سر پوا ستوا کرے تو کیا کرے۔

"اور چمپا باجی کہاں ہیں۔"

"وہ تو کل سے ہسٹری کانگریس کے لیے الٰہ آباد گئی ہوئی ہیں۔"

اتنے میں سائیکل آن کر رکی اور گوتم نیلمبر آ موجود ہوا۔

"چمپا نہیں ہیں؟" اس نے آتے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

"نہیں۔ مگر ہم لوگ تو موجود ہیں — آؤ بیٹھو۔"

"یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا۔"

"اب کہاں جاتے ہو" طلعت نے پوچھا۔

"یہی ذرا ولایت تک - اخبار بھیج رہا ہے - پر سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں ٹک گیا تو ساتھ کچھ پڑھ بھی لوں - بہت وقت برباد کیا ہے۔"

"یہی ذرا ولایت تک"، طلعت نے نقل اتاری - "وہ کس قدر کا رعب ڈال رہے ہیں - جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جا ہی نہیں سکتے - چلو تم، ہم سب بھی آتے ہیں تیچھے پیچھے —"

"کیا وہاں بھی منڈلی سے چھٹکارا نہیں ملے گا - اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر منسوخ، بندہ جاپان کا رُخ کرے گا -"

"ہم جاپان بھی آئیں گے۔"

"قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے؟"

"ظاہر ہے - پہلے ہی تمھاری شامت آئی تھی تو شہر کا رُخ تم نے کیا - اب بھگتو۔"

"ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔"

"ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو، تمھارا دیہانت تو نہیں ہو رہا پھر مل لینا —" شنکر نے کہا۔

"ہسٹری کا انگریس کب ختم ہو رہی ہے۔"

"ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں — مگر اس کے بعد دسہرہ ہے - وہ سیدھی بنارس چلی جائیں گی۔"

"یہ ہسٹری کانگریسوں میں جانے لگی ہیں؟"

"اور کیا - اتنی قابل جو ہیں۔"

"یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں - یار افسوس تو ہونا ہی چاہیے - میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔"

طلعت ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر نرملا کے پاس چلی گئی -

"گوتم جا رہا ہے" اس نے کہا۔

"میں نے سُنا ابھی۔" وہ رو رہی تھی - طلعت حیران رہ گئی۔

"اری کس قدر بیوقوف لڑکی ہے - روتی کیوں ہے؟ شادی کرکے تو بھی ساتھ چلی جا۔ تیرا تو اس کے لیے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے۔"

"وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی - چمپا باجی کا دم بھرتا ہے - عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا میں چمپا باجی کی برچھائیں بن کر جیوں گی؟"

"چمپا باجی — چمپا باجی تم سے زیادہ برا کون ہوگا؟ اب جانے تم اور کس کس کی قسمت برباد کروگی"، طلعت دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ "مت رو" اسے کہنا "بیوقوف"، اس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا۔ برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

طلعت چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

(۵۴)

یہ گوکل بے حد خوبصورت جگہ ہے۔ مدھو مالتی ہوائیں جھولتی ہے۔ پروائی کے جھونکے بچوں کی طرح کنج میں کلکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ پھول ماں کی سوچ کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوکل، یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمھارے ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبتے سورج کے مانند جگمگاتا ہے۔ کل اس نے کہا تھا۔ اور میں، کمزور عورت، مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاٹ پر پانی پھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اٹھتی ہے: ہری — ! ہری — ! ! ایک لڑکی رو رہی ہے: گوپالا — وہ کہتی ہے۔ زندگی میں اس کی وجہ سے راحت ہے، زندگی میں اس کی وجہ سے اتھاہ دُکھ ہے۔

ورندابن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی گاگریں دھندلکے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ سبز گھاس کی گرم گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی ہے۔ رات کو سارے ورندابن پر جگ کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم ادم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون لہریں مار رہا ہے، جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ — روشنی — موسیقی — کرشنا! کرشنا۔ موہن — ہری — نندلالہ — کانہا — اس کا ہر نام اس ابدی راگ کے نئے سُر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے۔ وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

اور یکایک سنہری موسیقی کی بوچھار میرے کانوں پر آن گری، جیسے سرسُر کے کنارے ایک ستارہ جل رہا ہو اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہوگئی اور اس کی تیز جگمگاہٹ کی تاب

نہ لاکر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ مجھے بتا نہ چلا کہ میں موسیقی کو سُن رہی ہوں یا دیکھ رہی ہوں
اس سمے مجھے معلوم ہوا کہ سمادھی کا مطلب کیا ہے۔ وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے روبرو کھڑی ہو
کر کہتی ہے ـــــ یہ میں ہوں۔

لڑکیاں گھاس پر راس ناچ رہی ہیں۔ ایک دو تین چار ـــ ایک دو تین چار ـــ ما ـــ آ
ـــ دھا ـــ دا ـــ مادھو ـــ مادھو ـــ مادھو ـــ

بادلوں میں چھپی ہوئی دیمی کی طرح وہ گاگر اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ سکھی تیری رادھے
کرشن کی سب سے بڑی بھگت اور گرو ـــ رادھا کرشنا! تخلیق کائنات سے لے کر آج تک
اس سے زیادہ خوبصورت موسیقی کسی نے سُنی تھی؟ ورنداین پر بسنت کا سورج چمک رہا ہے۔
ہرن موسیقی کی تانوں کی طرح کلیلیں بھرتے پھر رہے ہیں۔ مرلی کی آواز بلند ہوئی۔ موسیقی اس کی آواز
ہے، پھول اس کی مسکراہٹ، سمندر اس کے خیال کی وسعت، طلوع آفتاب سے پہلے کا آسمان اس
کی سمادھی کا سایہ۔ میں شرمیلا بھی گاؤں گی۔

کائنات گہری نیلی روشنی میں تیر رہی ہے۔ زمین، آسمان، خلاء اوم کی سنسناہٹ سے گونج
رہا ہے شرمیلا؟

میرا نام اب شرمیلا نہیں۔ میں بھی کرشنا ہوں۔ ہر شے کرشنا ہے۔

میرے سامنے ایک نیلا سورج طلوع ہوا اور ساری فضا جگمگا گئی ـــ اور اس نے کہا۔
او بیوقوف گوپیو ـــ تم جو پانچوں حواسوں کے جھمیلے میں گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کہ ہر شے فریب نظر
ہے، ایک مکمل ورنداین جس میں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں۔ درخت کے پھول نادنجی قمقموں کی
مانند جگمگا رہے تھے اور رادھا کلی کا گجرا اس کی کالی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھٹکی روح
کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ سمادھی میں کھو گیا اور اس کے جگتے ہی
شاخیں دوبارہ سرسرائیں، ستارے چمکے، ہوائیں بہنے لگیں ـــ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی
سمادھی میں کھو گئی تھی ـــ

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی:

مُراری ـــ تینوں دنیاؤں کے نور ـــ جے جے کرشنا

کچھ کو تو اپنے حسن سے اپنی اور کھینچتا ہے

کچھ کو بانسری کی آواز سے

کچھ کو تو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ بناتا ہے
کچھ کو اپنے قہر و غضب سے متاثر کرتا ہے — گوبیوں نے کہا —
کچھ کو تو میدانِ جنگ میں نلیست و نابود کرتا ہے
کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے — گوبیوں نے کہا —
مگر تیرا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے
جے کرشنا — جے جے کرشنا
ادم شانتی! شانتی! شانتی!!

— موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ ہوگئی — چمپا چونک اٹھی — اندھیرے کمرے میں صرف ریڈیو کا ڈائل روشن تھا۔ "ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف 'گوپی کے دل' کا ترجمہ آپ نے سنا — اب آپ کماری گیان وتی بھٹناگر سے چندر کونس کا —" طاعت کی آواز آرہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سیٹ بند کر دیا۔

پھر وہ دریچے میں جا کر شام کے آسمان کو دیکھنے لگی — کرشنا — کرشنا — کرشنا۔ اس نے دل میں دہرایا۔ برابر کی کوٹھی میں کیرتن ہو رہا تھا۔ وہ کان لگا کر آواز سنتی رہی۔ وجدان کیا شے ہوتا ہے اور محبت — اور جنوں خیز عشق — اور پُرسکون احساسِ رفاقت — یہ سب کیا ہے؟ اور بھگتی — ریحانہ طیب جی، اس مسلمان لڑکی نے بھگتی کے جس جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے اسے بڑے بڑے پنڈت بھی نہ سمجھ پائیں گے۔

یہ کیا شے ہے؟ میں ڈائیلکٹکس میں اس کا حل ڈھونڈوں گی —

اور محبت —

خداوندا —

جے جے کرشنا — بنت بناؤں بن ناہیں آوے ہری کے بنا — ہری کے بنا — برابر کے کمرے میں کوئی لڑکی بے دردی کا خیال گا رہی تھی —

دفعتاً اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آگیا — محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں — سوشل روم میں پیانو بجایا جا رہا تھا — ہر طرف گوپی کا دل نظر آرہا تھا —

"بجیا — کیا کر رہی ہیں؟" حمیدہ بانو نے کھڑکی میں سے سر ڈال کر اندر جھانکا — "پروفیسر بنرجی

کے یہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"ارے۔" اس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ سارے میں جنم اشٹمی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ ہوا میں طوفان لرزاں تھے۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے جن میں کنہیا کو جھلایا جا رہا تھا۔ دور سڑک پر ایک ٹولی کیرتن کرتی جا رہی تھی۔ ادم جے جگدیش ہرے۔ بھگت جنوں کے سنکٹ ۔۔۔ چھن میں دور کرے ۔۔۔

وہ اتر کر نیچے آئی اور سائیکل اٹھا کر حمیدہ بانو کے ساتھ بادشاہ باغ روانہ ہو گئی۔ پروفیسر کے یہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ شاید جنم اشٹمی کی تقریب منائی جائے گی۔ اس نے سوچا۔ وہ ابھی تک ورندابن میں گھوم رہی تھی۔ ڈائریکٹ ایکشن ۔۔۔ کلکتہ ۔۔۔ دو ہزار موتیں۔

"یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" خواب سے اس کو کسی نے جھنجوڑ دیا۔ سامنے دیکھا گوتم بھی موجود تھا اور چند کاغذات پر جھکا جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

طلعت نے غصّے سے اسے دیکھا۔ ریڈیو اسٹیشن سے وہ بھی سیدھی وہیں پہنچی تھی اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "جو کچھ ہو گیا چمپا باجی وہ آپ کو خود ہی معلوم ہوا جاتا ہے۔"

"ہم امن چاہتے تھے۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم ہرگز نہیں لڑیں گے۔" گوتم آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر چمپا کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

"لیکن ڈائریکٹ ایکشن۔" کسی نے جوش سے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم ۔۔۔ اب یہ کیا ہو رہا ہے۔" کسی اور نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ میرے لیڈر ۔۔۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ تمہارے لیڈر ۔۔۔ بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی تھیں۔" نربندا نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس نے گوتم کی طرف دیکھا لیکن گوتم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اگر غلط ہے تو کل اخبار میں بیان دو گی؟ بتاؤ۔" نریندر نے گرج کر کہا۔

"چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو۔ وہاں بیٹھ کر طے کریں گے۔"

"طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھانسی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔" چمپا نے تلخی سے کہا۔

مجمعے نے اسے گھور کر دیکھا۔

"رشیدہ آپا کے یہاں چلو۔"

"رشیدہ آپا کیا کرلیں گی۔ اور تم۔" ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بے رنگ چہرے تھے) ہری شنکر کی طرف مڑا۔ "بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے تھے بےچارے۔ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔" وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

"اب خالی امن کی اپیلیں کرنے اور امن کمیٹیاں بنانے سے کیا ہوگا۔" کمال نے کہا۔ "امن کی اپیل پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے؟"

"ہم نہیں لڑیں گے۔" گوتم نے دہرایا۔

"ہونہہ۔ گاندھی وادیوں سے زیادہ بڑا فراڈ کہیں نہیں دیکھا۔" تیسرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوسٹل میں یونین کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چیپل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں "جنگلی بطخ" کی ریہرسل کی جا رہی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ "کون ہے؟" گوتم کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

"ہلو۔ میں نے سوچا تم سے بات کرلوں۔"

"کیا بات۔" گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

"تم۔ تم بھی سمجھتے ہو کہ میں ری ایکشنری ہوں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھتا چمپا رانی۔ یہ وقت ذاتی مسائل اور الجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے۔ اگر تم اپنے مسائل کے باوجود ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر نہیں، تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ہم۔ گوتم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا۔ وہ پھر تنہا تھی۔

"لیکن میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔"

"میرے ساتھ؟"

"ہاں۔"

وہ بڑا متعجب ہوا۔ "چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔"

چمپا کو بڑا سخت صدمہ ہوا۔ وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

"گوتم نیلمبر تمہارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کہہ رہی ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لیے کلکتے جا رہے ہو کل، میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں ماری ماری پھرو گی؟ جان کا خطرہ الگ ہے! اور تمہارے دیا بنارس سٹی مسلم لیگ کے صدر ہیں، کیوں ان کا نام ڈبوتی ہو۔"

"تم نے بھی مجھے طعنے دینے شروع کیے۔"

"میں نے بھی!! کیوں، مجھ میں کوئی خصوصیت ہے؟ میں اور سب کی طرح ہوں۔ ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھ لو ـــ سنگھ بڑی چیز ہے اور آخری حقیقت ہے۔ تم انفرادی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"تم نے پھر فلسفیانہ بحث شروع کر دی۔ اچھا، شب بخیر گوتم ـــ" چمپا نے جھنجلا کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پر کفن باندھ کر کلکتے روانہ ہو گیا۔ نرملا، طلعت، تہمینہ سب چلی گئیں۔ صرف وہ اکیلی رہ گئی۔

مہینے گزرتے گئے۔

گروہ کلکتے کے بعد اب بنگال اور بہار کے سارے علاقے میں امن امن کی رٹ لگاتا پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر وہ رگھوپتی راگھو راجہ رام الاپتے، دن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ لڑکیاں واپس آ چکی تھیں۔ لکھنؤ کی زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ مزید ڈرامے، مزید پارٹیاں، مزید کانفرنسیں۔ ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں پھلگو ندی کے کنارے بلوائیوں نے چند ورکرز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں کمال اور شنکر اور گوتم بھی شامل تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائیکل اٹھائی اور گلفشاں روانہ ہو گئی۔ پھاٹک پر سے اس نے دیکھا کہ اسٹیشن ویگن میں سامان لد رہا ہے۔ تہمینہ اور طلعت اور نرملا سفر کے لیے تیار کھڑی ہیں بیلیاں قدیر گھبرائے گھبرائے پھر

رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع دو تین روز پرانی تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت گیا میں موجود تھے اور ان تینوں کو موٹر پر لاد کر گورکھپور لے گئے جہاں کے وہ سول سرجن تھے اور اب وہ تینوں بھی گورکھپور جا رہی تھیں۔

”خیریت سے ہیں وہ لوگ۔“ چمپا نے تشویش سے پوچھا۔

”گوتم کی آواز سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرنک کال کیا تھا۔“

”حالانکہ چوٹ سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے، چاچا کہہ رہے تھے فون پر۔“ نرملا نے اضافہ کیا۔

”چمپا تم بھی چلو۔“ تہمینہ نے کہا۔ وہ مصروفیت سے جھکی ایک اٹیچی کیس بند کر رہی تھی۔ ”تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم سمجھے بہت مصروف ہو۔“

”میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجاتی ہوں۔ سوائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہو سکتی ہے۔“

”کالج تو بند ہے تمہارا۔ چلو ہمارے ساتھ چلو۔ ہم واپسی میں تم کو بنارس چھوڑتے آئیں گے۔“ تہمینہ نے کہا۔

چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سرجن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے — چلو ہے ناگوری — جول پائے گوری دھاجے — تینوں بہت زخمی ہوئے تھے لیکن بے حد بشاش تھے۔ دن بھر وہ پڑے پڑے دنیا بھر کے گانے گایا کرتے: اپٹا کے گیت، بنگالی کورس، راجستھانی اور گجراتی لوک گیت، فلمی گانے۔ لڑکیاں پہنچ گئیں تو اب دن بھر رمی کھیلی جاتی۔ شنکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان لوگوں کے نزدیک نہ آنے پائے، ریڈیو کی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے اہتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کر لاتی۔ گوتم روز خبروں کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ ”پتا نہیں میں پھر یہ تین انگلیاں استعمال کر سکوں گا یا نہیں۔“ وہ بعض دفعہ اداسی سے کہتا۔ ”چمپا“ ایک روز اس نے چلا کر کہا، ”ذرا سوچ سکتی ہو کہ اب میں پیانو کبھی نہیں بجا سکوں گا۔“

”کیوں نہیں بجا سکو گے؟ یار موربڈ نہ ہو۔ کیا ڈرامہ کھیل رہے ہو۔“ کمال نے کہا۔ اس کی اپنی

ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

"اب بہر حال کیا ہو سکتا ہے۔"

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

"چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں۔ جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔" کمال نے کہا۔ کمال کو اب چپ لگ گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراقبے میں چلا جاتا مگر گوتم کو موربڈ نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

"ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہئیں۔ ہم مرزا پور بھی جائیں گے جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔"

"مرجا پور میں اوسان ٹھوران کا تنی ہمار گھاٹ ہے۔" گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔ وہ اداسی سے مسکرائی۔

یہ علاقہ بڑا دلفریب تھا۔ سرسبز اور پُر سکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔ معصوم اور پُر امن۔ رام دیا اور رام اوتار اور کدیر اور کمرن کا دیس۔ یہاں چاروں طرف جولاہوں اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حویلیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گنج اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ یہاں ہری شنکر کی موسی ڈھیروں پھل پھلاری اور ناشتے کے انبار لے کر پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

"یہاں سے ذرا آگے کپل وستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں۔" چمپا نے تجویز کیا۔

"میں ایک زمانے میں بدھسٹ تھا بڑا بھاری۔" کمال نے اداسی سے کہا۔

"کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھرو گی چمپا بیگم۔" گوتم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہوت لمبا سفر با ٹے۔" شنکر کی موسی نے کہا۔ "یہاں موٹر و نہیں ملت ہے۔"

وہ خود بہلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لیے ملتے تھے۔۔۔ ترائی کے ہاتھی۔ وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر کپل وستو پہنچے۔ گاؤں والے ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دور ہمالہ کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں اور سرخ چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کپل وستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چمپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمال بڑی تندہی سے ایک پتھر کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس پر لکھا تھا:

"مہاراجہ پیادا س نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال بہ نفسِ نفیس یہاں آکر عبادت کی کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگذاری معاف کی جاتی ہے۔"

اب یہاں وہ کنول کے تالاب اور سنہرے برقوں کی ڈاریں اور درختوں کے کنج اور چنبیلی کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں؟ چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑ راتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی مایا دیوی کے محلات سُرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آرہے تھے۔ قریب روہنی ندی اس سکون سے گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں۔

"یار بڑا سناٹا ہے رے" کمال نے یکلخت گھبرا کر کہا۔

"بڑا شدید سناٹا ہے" ہری شنکر نے جواب دیا۔ "چلو اب واپس چلیں۔ ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔"

گوتم نے کیمرہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ "دن کا وقت ہوتا تو تصویریں ہی کھینچتا۔" اس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔

"شنکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے۔ تاریخ ہمیں برابر دھوکہ دیتی ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔" شنکر نے حسبِ معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف آئے۔ ان کے سائے چاندنی میں مہارانی مایا دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب سے لگے۔

(۵۵)

واپسی میں چمپا بنارس اتر گئی۔ کینٹونمنٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ درگا پوجا اور رام لیلا کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ اس نے

اپنے شہر پر نظر ڈالی: تپلیشور — اُس نے کہا۔ ابدی کاشی — کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دور سے اپنے گھر کا چھوٹا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی، جس طرح اندھیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے۔ وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتے کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چو طرفہ غُل مچ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھُٹے تھے۔ اندر تخت پر میراسنیں چڑھی بیٹھی تھیں۔ وہ جا کر ایک نیم تاریک صحنچی میں کھرّے پلنگ پر لیٹ گئی جس کی پائنتی کسی مہمان بی بی کا بچہ دلائی میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ دالان میں سے بوا حسین باندی کی پاٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی:

اُس نے کہا: تو کون ہے؟
میں نے کہا: شیدا ترا
اُس نے کہا: کرتا ہے کیا؟
میں نے کہا: سودا ترا

آنگن کی دیوار پر عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزاں رہے۔ کسی نے زور سے آفتابہ چوکی پر رکھا۔ صحنچی میں کوئی بچی سوتے میں روئی۔

میراسنوں نے گانا گایا:

اُس نے کہا: کرتا ہے کیا؟
میں نے کہا: سودا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دہراتی رہی۔ پھر ایک نوجوان میراسن نے گانا شروع کیا: اٹریا پر چور، بھوجی دیا تو جلاؤ۔ پھر سمدھنوں کی گالیاں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد سہاگ گایا گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سنتی رہی۔ باورچی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی کالونچ تھی اور بگھار کی مہک۔

گھر — گھر — اپنا گھر —

پھر رات کا سناٹا چھایا اور ایک بیل گاڑی کھڑکی کے نیچے سڑک پر چرچر چوں کرتی گزری۔ اس کے پہیوں سے وہ عجیب و غریب سمع خراش آواز نکل رہی تھی۔ اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ گنگا پار اپنے نانا کے گاؤں شیخم پور جایا کرتی تھی تو ایک مرتبہ رسولن مہری نے کہا تھا: جانو جیسے ای گاڑی ملے ای آواز نکلی جاتو بھوانی خفا ہوئیں — بُرا شگون ہو — بیتے بُرا شگون —

دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ اور اس کے منطقی وجود نے اسے سمجھایا: کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے کہ۔۔۔ مگر کمال کی انالسس تو یہ ہے۔۔۔ اونہہ کمال کو مارو گولی۔۔۔ کیا اسی کی انالسس صحیح ترین ہے۔۔۔ اور یہ کمیونسٹ کیا کہتے ہیں۔۔۔ ہونہہ، ان کی بھلی چلائی۔۔۔ سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا فلسفہ، کمال کا جوش و خروش، طلعت کی تیز گفتاری، تہمینہ کی پُرسکون شخصیت۔۔۔ سب یک ایک کرکے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی؟ کیا تھی؟ اس کو لوگ کیا سمجھتے تھے؟ گوتم اس کو کیا سمجھتا تھا؟ گوتم کی رائے اس قدر عزیز کیوں ہے؟ جہنم میں گیا وہ۔۔۔ اور عامر رضا۔۔۔ عامر رضا۔۔۔

صبح کو وہ، دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ سروپ نکھا کی ناک کٹی۔ راون جلا۔ بھرت ملاپ ہوا۔ دُبلے پتلے لڑکے مُنہ پر سیبروں غازہ اور سفیدہ پوتے، پنی کے نقلی تاج پہنے، رام اور لچھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تختِ رواں پر سوار ہوئے۔ انسانوں کو ان میں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنؤ واپس آگئی۔ زندگی جاری رہی۔ پھر کوار کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیپ مالیکا نے روشن کر دیا۔ چھوٹی اور بڑی دیوالی منائی گئی۔ گھر گھر لکشمی کی تقدیس کی گئی۔ آج ٹونا چاری کی عملداری ہے۔ گلفشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہارِ خیال کیا۔ بچو، باہر مارے مارے مت پھرو۔ آج کی رات جانے کتنے جادو ٹونے ہوں گے؟ سامنے چوراہے پر ایک دونے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔ جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔ یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہنڈیا اُڑتی ہوئی آئی تھی اور ہمارے احاطے میں گری تھی۔ طلعت نے کہا۔ وہ گھاس پر آکر آسمان کو دیکھنے لگے۔ آج کی رات لکشمی اپنی سواری کے الو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔ جانے وہ کس کس کے دروازے میں داخل ہوگی

"باہر گھاس پر مت جانا بچو۔۔۔" خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی۔ "برسات کا سانپ دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔۔۔"

جگہ جگہ چوراہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔ رام اوتار اور قدیر جوا کھیلنے گئے۔ "ارے اگر آج جوا نہ کھیلا تو اگلے جنم میں چھچھوندر کی جون ملے گی" رام اوتار نے کہا۔ پھر بھیا دوج کا تہوار آیا۔ ہری شنکر قالین پر چڑھا بیٹھا تھا اور نرملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے سامنے مٹھائی پروس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے۔ اس نے منتر دہرایا۔ پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتر چڑھا دیے۔ گاؤں میں نوٹنکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہابھارت کے قصے

دہرائے گئے۔ سفید اٹنگی ساریاں پہنے عیسائی عورتیں گاتی پھریں: او ہو مسیح آیا سرِ آسمان — سرِ آسمان، سرِ آسمان۔ کھچڑی کا تہوار آیا تو لوگ ماگھ میلا نہانے تربینی چلے۔ بسنت پنچمی میں گھر گھر سرسوتی پوجا کی گئی — انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دیبی سفید ساری پہنے سفید کنول پر بیٹھی شفاف نیلے پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کمہاروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انھیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ پھر پھاگن کی رت آئی۔ شوراتری کی تیاریاں کی گئیں۔ نرملا نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں بلوا کی پتیاں، دھتورہ اور چاول تھالی میں رکھ کر شو کی آرتی اتاری۔ محرم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور موم اور کاغذ کے تعزیے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صناعی ان پر ختم کر دی۔ ان کاغذ اور پنی اور ریشم کے گہواروں، تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انھیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چراغاں ہوا۔ گلی کوچوں سے پیلو اور سوہنی اور درگا میں نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضا نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ہر شخص حسینؑ کا سوگوار بنا۔ (سبطین آباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیرنی نے چمپا کا دامن پکڑ کر کہا: بٹیا — مولا کے نام پر ایک ڈبل دیتی جایئے۔) شاہ نجف کے امام باڑے میں چراغاں کے روز حسبِ معمول برقی قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں "ہز میجسٹی کنگ غازی الدین حیدر" کا نام جگمگایا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلال اور عبیر سے سرخ ہو گئی۔ کرشنا کی مورتی کو جھولوں میں جھلایا گیا۔ صبح صبح بون فائر میں راکھشسی ہولکا جلی۔ ہلیارے سڑکوں پر کبیر گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکا تھا، ذہن کا فریب، نظر کا بہلاوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے، جس قیمت پر ملے ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمھارے اصول، تمھاری جیل یاترائیں، تمھاری کانگریس، تمھاری مسلم لیگ — سب بکواس ہے۔ تم لوگ جو انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کروانے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہیے۔ گھر، سکون، بچے، شوہر کی محبت۔

تم کیا افسوسناک باتیں سوچ رہی ہو چمپا بیگم — شرم کرو — شرم کرو — اس کے منطقی وجود نے، جو کھڑکی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا، پلٹ کر اس سے کہا — شرم کرو — شرم کرو — فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے یہی سناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے، ندی نالے جل سے بھر گئے، اگوڑ ملہار کی تانوں میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا، پروائی کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاتی سڑک پر آ گئی۔ سامنے پروفیسر بنرجی کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے۔ (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟ میں، چمپا احمد، جو یہاں تنہا کھڑی ہوں۔) ڈرائنگ روم کے پردوں کے پیچھے وہ سب موجود تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چنبیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی دریچے کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سعید دھوتی اور کرتے میں ملبوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور کمال بھی۔ گوتم نئے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جا رہا تھا۔ کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے تقسیم کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے لندن بھیجا جا رہا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ ملازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطاں و پیچاں بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے۔

"ان کا خیال ٹھیک بھی ہے،" گوتم کہہ رہا تھا۔ "پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے — تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے؟"

"بابا کیسے جا سکتے ہیں؟ زمینداری تھوڑی چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کر دیا ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

دلی — شملہ — نمبر ۱۰ — اورنگ زیب روڈ — وائسریگل لاج — بھنگی کولونی — یہ الفاظ اس کے کانوں میں آتے رہے۔ وہ دریچے سے ہٹ آئی — اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آ گئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیائیں تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے، ان کے دل و دماغ، ان کے تصورات، ان کی جدوجہد — مگر یہاں مستقبل بے حد مبہم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مسرت — عامر رضا پاکستان جا رہے تھے۔ کیوں نہ جائیں آخر۔ وہ کمال کی طرح سر پھرے تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے؟ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مسرت، ذاتی ترقی، ذاتی مقاصد — آخر کیوں نہیں؟ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لیے میں کیوں سوچوں؟ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا — میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی۔ کتنی آسان بات ہے۔ یکلخت ایسا لگا جیسے بحران ختم ہو گیا۔ سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا — بیگم عامر رضا۔ کراچی — واہ بھئی۔ مگر یہ لوگ کمبخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تم کیک رکھو بھی اور اسے کھاؤ بھی، یہ ناممکن ہے۔ وہ شاہی پھاٹک تک پہنچ گئی۔ اس

کے پیچھے پیچھے گوتم آ رہا تھا۔

"چمپا باجی، خدا حافظ۔" اس نے کہا۔

"جاتے ہو ماسکو۔"

"ہاں۔"

"کمال کا کیا ہوا؟"

"وہ جا تو رہا ہے۔ جولائی میں چلا جائے گا۔ طلعت اور نرملا بھی جا رہی ہیں۔ ان سب کو کیمبرج میں داخلہ مل گیا ہے۔"

"بہت خوب۔"

"آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں، چمپا باجی۔ یہاں بیکار اپنا وقت گنوا رہی ہیں۔ یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔"

وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک کے پرانے کھمبوں سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گوتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ "آخر تم بتاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔" اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دے گا؟ کون کس کا ناصح بن سکتا ہے۔ میں کمینہ نہیں ہوں چمپا باجی۔ محض حقیقت پرست ہوں۔"

"تمہارے پاس میرے لیے صرف یہی الفاظ ہیں؟"

"آپ تو الفاظ میں معنی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس لیے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہوگا۔ خدا حافظ۔ گلفشاں جائیے تو اپّی کو بتا دیجیے گا میں صبح دلی روانہ ہو رہا ہوں۔" وہ آگے چلا گیا۔

طلعت اور نرملا باتیں کرتی قریب سے گزریں۔

"دل نہیں مانتا، ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں، حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری ہے۔ گو یہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوئی نا۔" طلعت کہہ رہی تھی۔

"بالکل۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے۔ اگر اب نہ گئے تو مجھو کئی سال برباد گئے۔" نرملا نے جواب دیا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔" وہ دونوں بھی اسے ہلو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

اب کمال قریب سے گزرا۔

"چمپا باجی، مبارک ہو تمہارا پاکستان بن گیا۔" اس کے لہجے میں جس قدر تلخی، نفرت اور شکستہ دلی

چھپی تھی اس کا احساس کر کے چمپا لرز اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کمال ایک اور تقریر کرے گا، اسے برا بھلا کہے گا مگر یہ کیا ہوا کہ کمال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے، سننے، خفا ہونے، بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا۔ اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی، فیصلے اور عمل کی منتظر۔ کمال ایک لحظے کے لیے خاموش کھڑا پھاٹک کو دیکھتا رہا۔ جس کے ایک اندھیرے طاقچے میں چوکیدار کی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔

وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیم تاریکی میں کھڑی رہی۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر چلے گئے۔ وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں، جو اس کے لیے اجنبی تھی مگر اس میں وہ موجود تھا ــــ وہ جو اس کا ہاتھ تھامے گا۔ وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی بس رومان اور محبت اور گلاب کے شگوفوں کا وجود ہے کہ نہیں! انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے۔ وہ اس سے کہے گی: تو بھئی میں یہاں ہوں ــــ ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک پھانکنے دو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ تو میں آن پہنچی۔ خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی جس کے تم سمبل ہو۔ (یہاں ہر چیز کا سمبل موجود ہے۔ ان لوگوں نے سمبلز میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا۔) مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

پھاٹک پر اسے رام اوتار ملا۔

"بھیا صاحب ہیں؟" اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے۔ وہ چوروں کی مانند خوفزدہ ہے۔ وہ گلفشاں میں سیندھ لگانے آئی ہے۔

"بھیا صاحب تو ابھی چلے گئے۔"

"کہاں۔"

اب اندھیرے میں سے نکل کر گنگا دین بھی سامنے آ گیا۔

"کہاں چلے گئے بھیا صاحب؟" چمپا نے دہرایا۔

"وہیں ــــ" رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا، "مسلمانوں کے پاکستان۔ اب آپ بھی چلی جائیے گا ــــ سب جنے چلے جائیں گے۔ ہم یہاں اکیلے رہ جئیہیں ــــ"

گنگا دین، رام اوتار کے قریب آگیا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور روز ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بھیّا صاحب بڑے بے وفا نکلے۔ چمپا بٹیا کو چھوڑ کر چلے گئے چپکے سے۔ انھوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔ بھیّا صاحب نے گنگا دین سے دغا کی۔ بڑی بے وفا بے مروت قوم ہے۔ اسے صبح کا ہندی اخبار کا اڈیٹوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا۔

بھیّا صاحب بمبئی گئے ہیں ـــــ ہواں جہاجن کا بٹوارہ ہوت ہے۔ اپنے مسلمانی جہاج لے کر کراچی چلے جئیں۔ کہ یہ بتاوت رہے۔ رام اوتار نے اطلاع دی۔ "ہو ـــ لا ـــ لا ـــ لا ـــ لا ـــ" اس نے طوطوں کو اڑانے کے لیے پھلوں کے درختوں پر ایک پتھر پھینکا۔

گنگا دین اور رام اوتار کو اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ واپس لوٹی۔ بھیّا صاحب چلے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موٹروں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی: نیا ملک، نیا عہدہ، ترقی، نئے مسائل۔ مردوں کی دنیائیں بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

"اس آدمی کے لیے میں نے اتنا وقت برباد کیا؟ ارے میں کتنی بور کھتی ـــ"

پھر اسے احساس ہوا، ساری بات یہ تھی کہ بھیّا صاحب بے حد خوبصورت تھے اور اس نے بھیّا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں ـــ سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلفشاں کا لان جس کے سرے پر یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصاحبین: کمال، گنگا دین ہر ان کا خاندان۔ ان کی کزن تہمینہ جو اندر بیٹھی ہو گی۔ وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیّا صاحب خوبصورت تھے اور مغرور۔ ان کو غرور جانے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر ہنسی آگئی۔ اس کا جی چاہا خوب زوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو آخر غرور ہوتا کس بات پر ہے؟ اپنی شخصیت پر، شخصیت؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔ کمال کو اپنی اصول پرستی کا زعم ہے۔ تہمینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں؟ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آرہی ہے۔ ہواؤں میں آزادی تھی۔ پتیوں کی سرسراہٹ میں عجیب قسم کی طمانیت پنہاں تھی۔ محض میں ہی محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تہمینہ ـــ اور ـــ گوتم جو اپنے کزن کی بیوی شانتا پر عاشق ہے۔

"ہا ـــ ہا ـــ ہاؤ فنی ـــ اس نے دل میں کہا۔

پھر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع بھیگی خوشبودار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گیلے راستے جن کے دونوں طرف اونچی باڑیں تھیں اور روشیں ـــ گھاس جس پر سرخ بیر بہوٹیاں چل رہی

تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گہرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نمی اور خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے برساتی نالے کے برابر جو پگڈنڈی ایسی بن گئی تھی اسے اُلانگ کر وہ برسوں دوسری لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سے گزرتے اب بھی لڑکیوں کے پرے کے پرے ہوسٹل کی طرف جا رہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کر وہ پچھواڑے والی سڑک پر آ گئی جدھر سے ایک کچا راستہ سنگھارہ والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹٹی لگی تھی۔ چار طرف اور پھولوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوطے شور مچا رہے تھے۔ ہر چیز وہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

"کا بات ہے بٹیا ـــ" قمرن نے دفعتاً سامنے آکر پوچھا۔

"کچھ نہیں دریبر کی بی بی ـــ" اُس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"ہم یہاں بیٹھ جائیں دریبر کی بی بی ـــ"

"جی ہاں، آیئے۔ ضرور بیٹھیے ـــ بارش آ رہی ہے بٹیا ـــ او سارے میں آ جایئے۔"

وہ شاگرد پیشے کے برآمدے میں آ گئی۔ برآمدے کا فرش خنک تھا۔ منڈیر پر برتن رکھے جگر جگر کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ چادر پر پاپڑ پھیلے تھے۔

"پاپڑ سکھائے خاطر تنکو گھام او نہیں ملت ہے۔" قمرن نے بات شروع کی۔ اسے معلوم تھا کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سناٹا تھا۔ "بٹیا آپ لوگ منی کی طبیعت نہیں جانت ہیں۔ ہم پہچانت ہیں۔ منی جیسے خوش رہت ہے جب برابر اُن کی ٹہل کیے جاؤ، اُو کے لیے اپنی زندگی تج ڈالو۔ ویسے ای لوگ کہتے خوش نا ہیں ہووت ہیں۔ ہم تمہارا بٹیا کو کیسے سمجھائی کر او کین کا اپنی اوکات پہچانے کا چاہی۔ وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن۔ وہ ان سے ایک ٹھو بات کیے بغیر ہی پاکستان چلے گئے۔ اب بٹیا صاحب رووت ہیں۔"

چمپا خاموش رہی۔

"لڑکی کی کا اوکات ہے۔" قمرن اُداسی سے کہتی رہی۔ "مہارانو بن جائے تب بھی منی کی نوکر۔ مہتاری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو بیاہ کر لائے او کی دھونس الگ سہے ـــ کا آپ ہو بلایت جا رہی ہیں؟"

"ہاں شاید۔"

"اچھا ہے بٹیا۔ مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چین ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملیہے۔"

"بھیا صاحب نہ سہی کوئی اور سہی۔ سب ستئی ایک سے تھوڑا ہی ہوت ہیں وزیر کی بی بی" چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔ پروائی کا ایک جھونکا آیا۔ بارش کے قطرے ٹپ ٹپ چھپّر پر برس گئے۔

"سب منئی ایک سے ہوت ہیں بٹیا۔" قمرن نے کہا۔ "پان بنائی؟"

"ہمیں قمرن رہے دیو۔ اب ہم ہو جاباے" چمپا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھتری سنبھال کر پگڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہو گئی۔

قمرن چھپّر میں سے باہر آ کے اُداسی سے اسے دیکھتی رہی۔ "ای بٹیاون ہلت کاہے نہیں سمجھ پلوت ہیں" اس نے چھنگی رم تریا سے کہا۔

"بٹیاون میں ہمت نہیں۔ ڈرت ہیں۔ سمجھت ہیں تھوڑا سا انگریجی پڑھ لیہیں تو دنیا جان گئیں۔ بٹیاون میں ہمت نہیں۔" چھنگی نے سر ہلا کر کہا۔

(۵۶)

طلعت طنبورہ اٹھا کر برآمدے میں آن بیٹھی۔ اس نے 'اب کے ساون گھر آجا' الاپنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ تہمینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلاوز سی رہی تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم حبس طاری ہو گیا۔ طلعت اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست ۔۔۔ طلعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل ٹھیک تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایکٹ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ۔۔۔ بھگوڑے کہیں کے ۔۔۔ وہ تہمینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی۔ "چمپا باجی نے بڑے خوبصورت کھنچ پلیس تحریدے ہیں" اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہمینہ نے سر اٹھا کر اسے اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پراسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوں گھوں کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئل مستقل کو او، کو او کیے جا رہی تھی۔ بہت دور سے رام اوتار کی آواز

آ رہی تھی۔ طلعت میں یکلخت خود اعتمادی واپس آ گئی۔

"دراصل آپی یہ سب جذبات کی بات ہے — جذبات اور ذہنی ہمدردی اور ایگریشن۔" اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ پر یقین آ گیا تھا۔

"اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔" تہمینہ نے اکتا کر کہا۔

"چار سو بیس؟" طلعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "آپی یہ اصلیت ہے۔ پرابلمز کا خلط بن جاتا ہے۔ تمہارا پرابلم — بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پرابلم — اور ان سب کا انٹرایکشن — یعنی کہ —"

تہمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم ڈاکٹریٹ کے لیے کیمبرج جا رہی ہو نا؟"

طلعت بُرا مان گئی۔ مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔ قسم خدا کی آپی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔

"آپ کے نزدیک میں چُغد ہوں؟" اس نے دکھ سے پوچھا۔

"نہیں۔ تم بے حد عقلمند ہو — مگر عورت بھی ہو —"

"آپی —" طلعت دہاڑی — "آپی تم نے حد کر دی۔ تم اس قدر بورژوا ہو گئیں۔ تم نے پڑھ لکھ کر گدھے پر لاد دیا۔" اس کا جی چاہا آپی کی ذہنیت پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ "ہائے آپی۔" اس نے تہمینہ کو الماری میں سے رنگین دھاگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "ارے تم تو موومنٹ میں شامل تھیں۔ تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ وہ ۴۲ء کا واقعہ یاد نہیں جب دلی یونیورسٹی کا مارس گائیر آیا تھا اور تم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔ رشیدہ آپا کی تم لفٹننٹ رہیں۔ کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کر ڈالیں۔ چمپا باجی جیسی سی ایکسٹری کو تم نے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی اور اب تم عورت کا لیبل چپکا کر قانع ہو گئیں۔ ارے لڑو۔ کام کرو۔ بھیا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا؟ جہاں مرغا نہیں ہوتا وہاں سویرا نہ ہوگا؟ بھیا صاحب کی قوم کے سیکڑوں موجود ہیں اور یہ امرا میرے پلے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اور اب بیٹھی روتی ہیں۔ جہنم میں جائیں بھیا صاحب۔ ارے ان کا دماغ بھی تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نرملا بالکل ٹھیک کہتی ہے، مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ ارے پوچھو، آپ ہیں کون چیز؟ نہ شکل نہ صورت۔ گورا رنگ، مولی کا ایسا ہر اٹیلین لوفر اسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے سستی تین سو ساٹھ ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک علی الاعلان تمہاری ناک کے نیچے چمپا باجی سے فلرٹ کیا کیے اور اب تشریف لے گئے تو بیٹھی چھکو پھکو روتی ہیں۔ ارے لگائیں ایک جوتا بھیا صاحب کی ناک پر۔"

"طلعت ـــ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ بدتمیزی مت کرو۔"

"ہاں اور کیا۔ اب اسی کی کسر رہ گئی ہے کہ تم ان کی طرفداری بھی کرو۔ پرانوں میں یہی لکھا ہے۔ ہر پتی ورتا استری کا یہی دھرم ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں کہتی ہوں تم میں اور چھپکلی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز پٹتی ہے۔ حسینی کی بی بی نے کل اس کی ہمدردی میں رام اوتار کو برا بھلا کہا تو اے لو، وہ تو حسینی کی بی بی کی جان کو آگئی کہ خبردار جو میرے آدمی کو کچھ کہا۔"

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طلعت روہانسی ہوگئی۔ بھیّا صاحب کے بجائے اسے اپنی پر غصہ تھا۔ اگر عمر میں بڑی نہ ہوتیں تو ان کی اتنی ٹھکائی کرتی کہ ساری وفاداری اور محبت اور پورتر دا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل اٹھا کر وہ نرملا کے گھر پہنچی۔ وہاں جا کر اس نے چقندر کی بھجیا کھا کر پانی پیا اور نرملا اور مالتی اور ہری شنکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیلی تب جا کر اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔

طلعت کے جانے کے بعد تہمینہ مشین پر سے اٹھی اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا۔ اس نے دل میں کہا۔ ہوا میں طوفان لرز رہے ہیں اور گلغستاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈراما لکھا جائے تو میرے کردار کی تشریح یوں ہوگی:

نواب زادی تہمینہ بیگم۔ عمر پچیس سال۔ فرسٹ کلاس ایم ۔ اے۔ سانولی۔ دبلی۔ حساس۔ اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خلیق اور منکسر المزاج۔ مغرور۔ اس حقیر وضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا:

دس سال کا وقفہ۔ تہمینہ، جواب ذرا موٹی ہوگئی ہے، بچے کو گود میں لیے گنگنا رہی ہے: میں کھاؤں، مور ہالا کھائے، بابے کا جھنجھنا کو ؤ نہ کھائے۔ بابے کا ـــ چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آگیا ہے ـــ صبر اور سکون ـــ لاحول ولاقوۃ ـــ وہ برآمدے میں آگئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ چبوترے پر ریت سے رشتے دار بچے "کوڑا جمال شاہی" کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سوسن طلعت کی چنریاں رنگ کر پھیلا رہی تھی۔ کمال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا۔ واہ کیا سماں منظر ہے۔ دوپٹے رنگے جا رہے ہیں۔ اپی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار خالائیں مصروفِ گفتگو ہیں۔ وہ بھی اندر آکر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ جی ہاں، چھوٹی خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ عزیزو پاکستان جائیے۔ وہاں بڑے ٹھاٹھ رہیں گے۔ وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ تہمینہ

نے اسے دریچے میں سے دیکھا۔ یہ سب ڈرامے کے کردار تھے جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اسٹیج پر دھندلکا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آگئی۔

کمال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھلانا شروع کیا۔

"کوڑا جمال شاہی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی — پیچھے دیکھا — ہو — اپی —" اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ "پسل گئے بلاور — کوڑا جمال شاہی —"

تہمینہ برآمدے کے ستون سے ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کوڑا جمال شاہی — اپی چمپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں، بلکہ لے گئیں تشریف — پیچھے دیکھا مار کھائی —"

"کیا ہوا؟ کمال؟" تہمینہ نے چونک کر پوچھا۔

"فرانس — کوڑا جمال شاہی —" اس نے زور سے ایک چھوٹی سی بچی کو چنتے ہوئے دوپٹے سے مارا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پیچھے دوڑی۔

"کیسے؟" تہمینہ نے آواز دی۔

"یونیورسٹی اسکالرشپ —" کمال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا — یہاں تک کہ کمال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پہ پھینک کر باہر بھاگ گیا۔

سڑک پر آ کر کمال نے گلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر سنگھاڑے والی کوٹھی کا رُخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں سیتل پاٹی بچھا کر وہ سب بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے۔ موقعے کی مناسبت کے لحاظ سے طلعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہار شروع کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جو شفاف تھا، شردن کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی، اس میں خون ملا تھا۔ خون کی بوکھا رُت، خون کی کیچڑ، خون برسانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طلعت عاجز آگئی۔ نرملا کی نئی کینوس کے قرمزی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی۔ (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا۔) پھولوں پر خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نرملا اور ہری شنکر کو دیکھا۔

(۵۷)

اور اب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا:
اوجناردھن! میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیان کھڑا کر دو تاکہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہیے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں سے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے بزرگ، باپ، دادا، چچا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، دوست، استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا: او کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ او کیشو! میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے برے شگون دکھلائی دے رہے ہیں۔

او مادھوا! میں اپنے ہی کنبے، اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحانیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور بزرگوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ بزرگوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

او مدھوسودن! میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہیے یا انھیں ہمیں۔ او گووندا! میں نہیں لڑوں گا۔

(۵۸)

ہندوستان ۔ ۱۹۴۷ء ۔

(۵۹)

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈلی کے ٹیوب اسٹیشن میں گھڑی کے نیچے، جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا، ٹہلنا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے وُو سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے پکڑ لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہرحال ضروری تھا۔ تنگ آ کر اس نے نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور اس کے مسئلے کے متعلق چھپا تھا سرل بیتاب تھا کہ سر کلیا کے گھر پہنچ کر اس پر دوستوں سے بحث کرے۔

سرل دوسرے لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل ڈیرک ایڈمن ایشلے خاص ارسٹوکریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جو اب سٹی میں ربر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پردادا سر سرل ہاورڈ ایشلے ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کلرک کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے کمائے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں بھی انھوں نے خوب ہاتھ رنگے اور جو لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے جواہرات شاہ اودھ نے ان کو تحفے میں دیے وہ علیحدہ۔ وہ کسی صوبے کے گورنر بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں ربر کی تجارت شروع کی، گاؤں اور محلات خریدے، لارڈ کا خطاب حاصل کیا، پارلیمنٹ میں بیٹھا اور باقاعدہ ارسٹوکریسی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لارڈ بارن فیلڈ تھا۔ اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔ اس کا بیٹا دوسرا لارڈ بارن فیلڈ ایمپائر کا اور بھی زیادہ قابلِ فخر فرزند ثابت ہوا۔ اس نے برطانیہ کی فارن سروس میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کیے۔ کلکتے سے ایک کنزرویٹو اخبار نکالا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمڈنز کو البتہ وہ گوارا کر لیتا تھا جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن کلکتہ یا امپیریل ہوٹل دلّی کی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے دادا "نباب" سرل ایشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اس

کے دادا نواب سرل ایشلے فی الواقع بڑی رومینٹک ہستی رہے ہوں گے جو اردو میں شعر کہتے تھے اور مرغے لڑاتے تھے، کتھک ناچ دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ ان کی ایک تصویر رائل اکیڈمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی۔ جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں اور کالا بھجنگ نیٹو ملازم پیچھے کھڑا مورچھل جھل رہا ہے۔ پس منظر میں تاڑ کے پتے ہیں۔ یہ تصویر ٹیمز کے دسلی ہال میں لگی تھی۔

دوسرے لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دو لڑکے تھے: بڑا لڑکا تیسرا لارڈ بارن فیلڈ اب خاندانی کاروبار اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا لڑکا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گردش میں تھا۔ ملایا میں ان کے ربر کے جنگلات میں کمیونسٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماؤ ماؤ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی ملی تھی کلکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرقی پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پر ٹکٹ لگا کر پبلک کو اس کی سیر کراتے تھے۔ محل بیش قیمت نوادر سے بھرا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پر پارک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز، کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ چھوٹا بیٹا تھا لہٰذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی کمانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اس نے روز ماری سے شادی کی تھی بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی سنتھیا سے اس کا بیاہ رچائیں گے۔ شاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے۔ ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا۔ انگلستان کی ارسٹوکریسی کے بچے کھچے افراد کو چاہیے کہ اس نازک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل، اس سر پھرے لڑکے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ لونڈا کمیونسٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس لڑکے کو سیاست سے چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو خدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس کو پائلٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پہ جا کر بم گراتا تھا۔ جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روز میری، جس سے اس نے شادی کی، متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجسمے بناتی تھی۔ بے چاری کامیاب سنگتراش بھی نہیں تھی اسی لیے سرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل ماہر فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی

بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری ہے، سرل نے سوچا۔ لہٰذا اس سے شادی کرلی اور لندن سے فون پر اپنے بھائی اور بھاوج کو مطلع کیا۔ لارڈ بارن فیلڈ نے فی الفور اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ ایک تو روزمیری گمنام اور مفلس، اوپر سے رومن کیتھولک۔ لارڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہو گئے۔ لیکن سرل نے پرواہ نہیں کی۔ وہ ہیگل کے مطالعے میں جٹا رہا۔ سرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفرڈشائر کے چینی کے کھلونے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بڑا تعجب سا لگتا۔ پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روزمیری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شلنگ کا ٹکٹ خرید کر خود اپنے "اسٹیٹلی ہوم" کی سیر کرنے کے لیے جا پہنچا۔ اس کے بھائی اور بھاوج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اسٹاف کے لوگ محل کی سیر کرا رہے تھے۔ وہ نئے لوگ تھے، کسی نے سرل کو نہیں پہچانا۔ وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا، کیسی عجیب بات ہے، میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سرل کا محل قصبے کے اختتام پر تھا۔ چار یا پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کمرے اور ہال اور غلام گردشیں۔ سرے پر لیڈی چیپل تھا۔ مارننگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور طلائی سنگِ مرمر کے مجسمے پھولوں میں استادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ ان باغات میں خالص کنٹری اسکوائر کی مانند ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے چہل قدمی کیا کرتا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارھویں صدی کی دور راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ان کے تابوت کی جگہ پر جو پختہ گڑھا سا بنا ہوا تھا اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے لڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گورکھ دھندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہر والوں کے لیے اس محل کے چپے چپے میں افسانویت کی افراط تھی۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہ اتنا بڑا اکھٹراگ جو امرا کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پردادا نباب سرل اور ڈ الیسلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انھوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیرِ اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ ڈبلو۔ ای۔ ییٹس کا اس نے

کافی مطالعہ کیا اور قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی ماسے جب وہ خود اپنے ہی عمل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلکچولز کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح، آزادی، کو بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اینڈول کے معنی بھی سمجھ آجاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا۔ اس عہد کی ساری ذہنی الجھنوں، روحانی ناآسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شبہوں کا شکار۔

روئرنگ ٹوئنٹیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ ۳۰ء سے ۳۹ء کے دور میں اس نے ہوش سنبھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجمع رہتا جو اس کی سوتیلی ماں لیڈی ایلین سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیں بازو والوں کا دور۔ بلومزبری والے اینٹی فاشسٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوئیس اور اسپنڈر ترقی پسندوں کے گرو بنے ہوئے تھے۔ لندن کے یونٹی تھیٹر میں کمیونسٹوں کے ڈرامے ہوتے تھے۔ ویسٹ منسٹر تھیٹر میں گروپ تھیٹر والے مک نیس اور اوڈن اور اشروڈ کی تمثیلیں اسٹیج کر رہے تھے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنا ذہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسٹفر وڈ اور سیڈرک موریس اور بن نکلسن کی پینٹنگز کا زمانہ تھا۔ آرٹ، ادب، ڈراما، موسیقی، بیلے، انٹیرئیر ڈیکوریشن — ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں اسے مسز بیسنٹ اور ڈبلیو۔ بی ییٹس اور کرشنا مورتی اور اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رادھا کرشنن کے مطالعے کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل ونچسٹر سے (نہیں — میں ایٹن کبھی نہیں گیا۔ ونچسٹر بھی اتنا ہی خوفناک تھا۔) کیمبرج بھیجا گیا (میں کیمبرج نہ جاتا تو کیا گروکل کانگڑی جاتا؟) وہاں پیٹر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا۔ اور پھر مسلسل تفریح، مسلسل ذہنی ڈسی پیشن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا۔ لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبار پائلٹ بن کر چند خوبصورت جرمن شہروں کو، جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے، اس نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اس کے بعد وہ پھر کالج واپس آیا اور سرل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے

ادھر راجھوڑ کر دہ ایر فورس میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا تھا یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کیے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ امن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت کے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ویلیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی طرح سوچتا۔ اب ذہنی ڈپریشن کا دور از سر نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریاکاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلخی آ گئی تھی۔ مائیکل اور ڈینس اس کے ساتھی تھے۔ سائیکل یہودی تھا۔ ڈینس بھی مائیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے سرل نے بہت امید کی کہ ذرا ان میں اسنوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈینس کو شاعری کی سودا تھا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے، یورپین لڑکے۔

اور لڑکیاں۔

سرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا، بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا ایک ایسے عظیم عہد تھی جس میں دنیا بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے اور کلچرل مفاہمت (یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا) کے دور میں داخل ہو رہی تھی اور کیسی کیسی لڑکیاں دنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لیے آ رہی تھیں۔ کالی لڑکیاں، پیلی یعنی مشرق بعید کی لڑکیاں جنہیں دیکھ کر وہ پرل بک کے ناول، ہنگری لڑکیاں جن کو دیکھ کر جدید سنگ تراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جون کارٹر تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حلیہ درج ہوتا ہے اس پر وہ پوری اترتی تھی۔ سیاہ فریم کی بیلرینا عینک لگائے، سر پر جھوا ایسے بال، انتہائی انٹلکچول۔ یہ ٹائپ اب بائیس تئیس سال پرانا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

روز میری تھی۔۔ لیکن اس سے سرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کی کلچرل ایونگز کا دور شروع ہوا جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلبا جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں "اورینٹل ناچ" ہوتے (جو زیادہ تر بکواس تھے سوائے سریکا کے ناچ کے)، نظمیں پڑھی جاتیں، بے سرے ساز بجائے جاتے۔ سنا تھا امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیمانے پر چلایا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس فار ایسٹرن اور مڈل ایسٹرن تماشے سے اس کا جی اکتا گیا۔ اب وہ اپنے کمرے پر لوٹتا اور کوئی اس سے

کہتا کہ تھائی لینڈ والے یا انڈونیشیا والے کلچرل ایوننگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کود کر باہر بھاگ جائے۔

"جانتے ہو سیرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے" ڈینس نے ایک روز بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داخل ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دور دراز لکھنؤ سے آئے تھے۔ (بڑی اداسی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی پشیمانی ہوتی۔) نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کر کے چھپاتا کہ لارڈ فلاں کا بیٹا ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیڈنٹ کہا تو وہ جھٹ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ وارد کالوں سے اس کی کافی دن تک ملاقات نہ ہوئی گو اسے معلوم ہوا کہ یہ بڑے انکسار سے ملنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا جس سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آرا تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی جھگڑے نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا گو وہ اس ٹنٹے کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک اور کلچرل ایوننگ ہو رہی تھی۔ یہ 'ایوننگ' انڈیا والوں نے منعقد کی تھی۔ وہ جوتے اتار کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید ٹیگور جینتی منائی جا رہی تھی۔ ڈینس فوراً مراقبے میں چلا گیا۔ مجمعے پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سیرل اپنی پتلون کی کریز کی فکر میں غلطاں رہا۔ اس سے آلتی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے اداسی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سادھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کوئیکرز ہوں گے شاید، اس نے کاہلی سے سوچا۔ ڈینس ان سب کو جانتا تھا۔ ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈینس ان سب سے بچھ بچھ کر ملے گا اور اس کا ان سب سے تعارف کرائے گا۔ یہ سوچ کر اسے پھریری سی آ گئی۔

اتنے میں ایک دبلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی اور کچھ اناؤنس کیا۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بجیں۔ سیرل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سارا ہال، جو چھوٹا اور گھریلو سا تھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سینٹر وغیرہ تھا۔ اسی طرح کی لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا اور قسم قسم کے لڑکے۔ سب بڑے کامریڈانہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے

لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔ روشن کی طرح کی ایک اور لڑکی۔ باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موٹے ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لیے کوئی انوکھاپن نہ رہا تھا۔ اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے لیے زیادہ مواقع ہیں۔ اس نے یونہی سوچا کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا اور ٹیگور کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ رومان پرست مڈل کلاس، جذبات زدہ لوگ ــــ اس نے بڑی عیاشی سے سوچا۔ (ان دنوں وہ مغربی عیسائیت اور یورپین تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا۔)

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گداز سی بی بی اسٹیج پر آئیں۔ یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینانِ کلکتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، پھولے پھولے گال، کانوں میں سونے کے پھول، بڑا سا جوڑا۔ سیاہ ساڑی کے نیچے سفید پیٹی کوٹ پہنے تھیں۔ جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا۔

پھر ایک عدد تقریر میں انھوں نے بتایا کہ ٹیگور دنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔

"جانتے ہو یہ کون ہیں؟" ڈینس نے بڑے رعب سے سرل کو مطلع کیا۔ ڈینس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبر دتھا۔

"اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ یقیناً سوفسٹ ہوں گی یا ہندوستانی کلچر کی علمبردار جو بتلائیں گی کہ atomic تھیوری کو سب سے پہلے شنکر اچاریہ نے پیش کیا تھا۔" سرل نے بور ہو کر کہا۔

"یہ مسز شیلا اگروال ہیں۔" ڈینس نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

"یعنی؟"

"ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے۔ اگر تم اوبزرور کے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔"

سرل کے سامنے جو گوناگوں مسائل تھے ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ بی بی سی؟ وہ پہلے ہی اس کی طرح کے انٹلکچولز سے اٹا ٹوٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رائٹنگ؟ اس کی بھی گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ محکمہ تعلیم؟ وہ کبھی کالج

کے بونڈوں کو سنز پڑھائے گا۔ کولونیل سروس؟ یعنی میں، سرل ایشلے، انسانیت پرست، کینیا یا ملایا یا ویسٹ انڈیز میں نوکری کروں گا، سولا ہیٹ پہن کر دوروں پر جاؤں گا، شام کو کلب جا کر گولف کھیلوں گا؟ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔

پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر بتر ہوا اور لڑکے لڑکیاں ٹکڑیوں میں منتشر ہو کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ڈینس اٹھ کر شریمتی شنیلا دیبی کے پاس گیا جو او بزرور کے کالم نگار بل کریگ سے باتیں کر رہی تھیں۔ "ہلو ڈینس۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"مسز مکرجی، ہمیں اپنے گھر لے جا کر کافی نہیں پلائیں گی؟" ڈینس نے اپنی بچوں والی ادا سے ذرا مچل کر کہا۔

"ضرور۔ سب لوگ چلو۔"

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی نذرالاسلام کی جینتی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سرل کو یہ مجمع بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوسپ تھی، اپنی مصروفیات۔ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر یہ شادیاں بڑی سنسنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

"چلو۔ چلو۔" وہ سب شور مچاتے باہر آگئے۔ گلی نیم تاریک تھی۔ لڑکے سگریٹ خریدنے کے لیے ایک پب میں چلے گئے۔ لڑکیاں کہنے لگیں، "شنیلا دیدی تھوڑی سی ترکاری خرید لیں۔ آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔"

مسز مکرجی کا فلیٹ چیلسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا جس میں لفٹ لگے تھے اور گیلریوں میں دبیز قالین بچھے تھے اور وردی پوش پورٹر تھے۔ وہ سب فلیٹ میں داخل ہوئے۔ لڑکیوں نے سرل سے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ روشن کی طرح tense نہیں تھیں۔ بڑے گھریلو اور سیدھے سادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام طلعت تھا اور دوسری کا نرملا۔ لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں، اسے معلوم ہوا، اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مسز شنیلا مکرجی فرید پور، مشرقی بنگال کی رہنے والی تھیں۔ ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ۔ کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔ انھوں نے خود وشوا بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی۔ (شادی، مائی ڈیر، ایک جوا ہوتا ہے۔ گرودیو نے کہیں پر لکھا ہے کہ....) ان کا ایک لڑکا فلائنگ آفیسر پرفلا مکرجی ہندوستانی فضائیہ میں ہوا باز تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ مسز مکرجی اب

مدتوں سے یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

"لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں ہیں کہ تم ان پر لٹو ہو جاؤ۔" دوسرے روز ڈینس نے برا مان کر کہا۔ وہ لوگ کالج کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ دو رویہ سیاہ عباؤں کی قطاریں۔ چھری کانٹوں کا شور۔ ہال کے سرے کی میز پر پروفیسروں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی بھنبھناہٹ۔ اونچے دریچے میں سے باغ کا منظر ٹرنر کی کسی پینٹنگ کے مانند دکھلائی دے رہا تھا۔

"ایں؟" سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"لیکن وقتاً فوقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو۔ وہ اور بزرور کی کورسپونڈنٹ شپ . . ." ڈینس نے کانٹا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب لندن گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جنیوا جا چکی ہیں۔ وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پہچان کر ذرا سا مسکرائی۔ "ہلو۔" اس نے کہا۔

سرل نے شائستگی سے جھک کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا، یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز ٹیگور جینتی میں اسٹیج پر اناؤنسمنٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈینس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے، چمپا نے یاد کیا۔ "میں بھی مسز مکرجی سے ملنے آئی تھی۔" اس نے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آتے ہوئے کہا، "مگر وہ جنیوا گئی ہوئی ہیں۔"

"آپ یہیں پڑھتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟"

"جی ہاں۔ میں مس سریواستوا سے یہیں ملا تھا۔"

"اور کمال رضا؟"

"سرکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آرا کو جانتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے بھی سرکھا اور ڈینس ہی سے ان کا ذکر سنا ہے۔"

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اسی طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔

"آپ نرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں؟" چمپا نے باآواز بلند استفسار کیا۔

"جی نہیں، میں کسی کو بھی نہیں جانتا — میرا مطلب ہے — میرا حلقۂ احباب ڈینس کی مانند وسیع نہیں ہے۔"

چمپا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میرا خیال تھا آپ شاید پنگ، اشوتوش سے مل چکے ہوں۔"

"میں پنگ اشوتوش سے نہیں ملا۔ وہ کون ہے؟"

"مسز مکرجی کا چھوٹا لڑکا۔ وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔"

چیلسی کا انڈر گراؤنڈ آگیا۔

"اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمبرج میں ملاقات ہو۔ اگر آپ کبھی وہاں آئیں۔"

"یا شاید نہ ہو!"

"بہرحال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔"

"خدا حافظ!" وہ ایک اخبار خریدنے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسلریٹر پر اتر گئی۔

ایک مکمل، پراعتماد، جدید ہندوستانی لڑکی۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈلی کے انڈر گراؤنڈ میں چمپا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سریکھا کے یہاں سب لوگ جمع ہو کر کھانا کھائیں گے۔ سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بحث کرے۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا کہ سرد جنگ میں غیر جانب دار رہنے کا جو رویہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے اینگلو امریکن بلاک، ظاہر ہے، اس کو پسند نہیں کر سکتا، وغیرہ وغیرہ۔ سریکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا انگارے اگلنے والا انسان ہے۔ حال ہی میں ماسکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ سرل کو افسوس تھا کہ آج شام کو وہ اس شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سریکھا کی اطلاع کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ٹہلتا رہا۔

(۶۰)

کیمبرج میں ایک دکان سے نکل کر نرملا لائبریری کی طرف جا رہی تھی کہ اسے گوتم نیلمبر دکھلائی پڑ گیا۔

"نرمل — میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" گوتم نے کنگ کراس کی طرف آتے

ہوئے کہا۔ "ایک انگریز مجہرد خاتون تمھارے کالج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں۔ انھوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگادیا۔ پھر کمال نے کہا شاید اس وقت تم لائبریری میں ہو۔ کیسی ہو۔ کیا حال چال ہیں؟"

نرملا نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا!

"تم یہاں کیسے آگئے؟"

"لندن سے آیا ہوں، تم لوگوں سے ملنے۔"

"سنا ہے تم اب باقاعدہ فارن سروس میں ہو۔"

"ٹھیک سنا ہے۔"

"مزے میں ہو؟"

"ہاں۔"

باتیں ختم ہوگئیں۔ گوتم نے دیکھا کہ نرملا بڑی ہوگئی تھی: سنجیدہ، باوقار، کم گو۔

"لائبریری گول کرو۔ کمال اور طلعت نے کہا ہے کوہ نور میں ملیں گے۔ چلو۔"

نرملا خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔ برابر سے سیاہ عبائیں پہنے طالب علموں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ نرملا، گوتم کو بتاتی جارہی تھی۔ یہ ڈینس ہے، وہ روشن جارہی ہے، وہ سرل ایشلے ہے، ادھر والا، بلونڈ لڑکا۔ یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے ہیں۔ ان کا جواب نہیں۔ یہ بھی چمپا باجی کے چیلے بن چکے ہیں۔"

"اچھا۔ چمپا۔ چمپا سے تم لوگوں کا ملنا ہوتا رہتا ہے۔"

"اکثر۔"

"خوش ہیں؟"

"کیا پتا۔ خوشی تو بڑی اضافی چیز ہے۔"

گوتم خاموش رہا۔ وہ کنگز کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوچکی تھی۔

"مجھے لگتا ہے"، نرملا کہہ رہی تھی، "کہ چمپا باجی چند سال بعد مسز مکرجی کی ایسی بن جائیں گی۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔ تم جانتے ہو مسز مکرجی کو۔"

"ہاں۔"

"وقت چوٹ دے کر چپکے سے آگے نکل جاتا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔" نرملا نے دہرایا۔ گوتم

اب بھی خاموش رہا۔

"شبنلا دیبی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز رہی ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باتیں کر لینا بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے میاں کا فی بلا نے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور ہیں۔ مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی مسرت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انھوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔"

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرملا کو غور سے دیکھا۔

نرملا کی آنکھوں پر بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف کیا اور کہتی رہی:

"یہ سرل کا دور ہے کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا بیٹا ہے جس طرح تم سر دیپ نرائن اور بھیا صاحب سر ذکی رضا بہادر کے فرزند تھے۔"

"نرمل تم چمپا کے ساتھ سخت بے انصافی برت رہی ہو۔" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں گوتم، یہ واقعہ ہے۔ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کہ وہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل کمال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طلعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہی تھی۔ اس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں، ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔"

گوتم نے اداسی سے دیکھا۔ نرمل نے بات جاری رکھی:

"پیرس میں تھیں مگر کام ادھورا چھوڑ کر انگلستان آگئیں۔ اب سنا ہے لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ حد ہے۔ گوتم، چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔"

جیزس لین میں سے ٹرمپیٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھٹھک گیا۔

"جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دھنیں بجاتا ہے۔" نرملا نے کہا۔ بارش کی پھوار میں اس کے بال بالکل بھیگ گئے۔ "بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی پینٹنگز دکھلاتے رہتے ہیں۔"

اب وہ کووِ نورنک پہنچ چکے تھے۔

"گوتم،" نرملا نے سوچتے ہوئے پوچھا، "لوگ اتنے بیٹیچر کیوں ہوتے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طلبا کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے لائلک اور زرد پھول

پھیلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیم کی سطح پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔

"نرملا"، گوتم نے رک کر کہا۔

"فرمائیے۔"

"تم مجھ سے شادی کروگی؟"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں — نرمل —" آواز اس کے حلق میں اٹکی۔

"اس لیے،" نرملا نے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا، "کہ تم بھی پھیپھڑ ہو۔ آؤ اندر چلیں۔ بارش میں مت بھیگو۔"

نرملا واقعی بڑی ہو چکی تھی۔

وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے۔

(۴۱)

صبح چھ بجے چمپا اٹھ بیٹھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ رات وہ دو بجے تک سرکھما کے یہاں گپیں ہانکتے رہے تھے۔ آخر لوگ اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ غسل خانے میں سے جون نے سر نکال کر جھانکا۔ "آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔" چمپا نے بستر سے اتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا۔ پھر اس نے جون کو آواز دی: "میں ورکنگ کلاس لڑکی ہوں: تم ہی کہو کون سی ساری پہنوں؟" پھر ناشتہ کر کے وہ بس میں بیٹھی اور سینٹ جانز ووڈ پہنچی۔ بل کے فلیٹ پر جا کر اس نے گھنٹی بجائی۔ "کم آن ان —" کسی نے اندر سے بشاش آواز میں کہا۔ وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوفہ بچھا تھا۔ نیچی تپائیوں اور الٹرا ماڈرن آرٹسٹک طرز سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک ایسیشن کتا بے نیازی کی شان سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ بل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ "ہلو مائی ڈیر — کیا پیوگی؟"

"کچھ نہیں، شکریہ۔" چمپا نے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بوہیمیا کے افراد کس اپنائیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔

"پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟" ہل نے بے پروائی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جاکر کھٹر پٹر کرنے لگا۔

شانتا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سُرخ پھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اتری جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شانتا، چمپا نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے برسک انداز میں وہ ٹائپ رائٹر پر جاکر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے ہل سے شادی کیوں کی۔ عجب گھپلا ہے زندگی۔ چمپا نے تعجب سے سوچا۔ "گڈ مارننگ مسز کوریگ۔" اس نے اخلاق سے کہا۔ سُنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لیے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی، اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا۔

"میں گوتم سے تمھارا بہت تذکرہ سُن چکی ہوں۔ یہ بڑی عنقر دنیا ہے۔" شانتا نے ٹائپ کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

ہل کافی کی کشتی اٹھا لایا۔ چمپا نے محسوس کیا کہ شانتا خاصی مغرور ہے۔ ہل اتنا ہی خلیق تھا۔

"فرینک وہ کاغذات کا پلندہ اٹھاکر پریس جانے کے لیے تیار ہوئے۔ چمپا کو ہل کے پبلشنگ ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

"تمھارا کیا پروگرام ہے زندگی کا؟" ہل نے اس سے لنچ کے وقفے میں پوچھا۔ وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

"یہ تو بڑا زبردست سوال ہے۔"

"کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو؟"

"ہاں۔"

"تم بھی جال میں گرفتار ہو؟"

"ہاں۔"

ہل منہ لٹکاکر خاموش ہوگیا۔ سب جال میں گرفتار تھے۔ وہ خود اور اس کی بیوی شانتا جو پہلے شریمتی شانتا نیلمبر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں ناول لکھتی تھی اور سرل ایشلے اور سارے مصنف اور ادیب

اور روزمن پرست، سارے مغربی انسان، اور مغربی یورپین تہذیب، اور نیا ایشیا، جس کے نمائندے یہاں موجود تھے، مختلف جتھوں کے درمیان معلق تھے۔ انھیں اب معلوم ہوا تھا کہ پل صراط پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیف لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹوئنبی نے دس کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

اور نیا ہندوستان اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا جارہا تھا۔ یہ پبلسٹی کی دنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے پمفلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دنیا۔ اور بل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن میں یقین رکھتا تھا اسی لیے وہ شام کو اپنے اسٹوڈیو فلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی۔

وہ بھی جال میں گرفتار تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جنتیں، ذاتی تہ خانے اور رنج کا سناٹا۔ زیادہ تکلیف دہ اس لیے تھیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بل نے چمپا کو دیکھا۔ "تم کمیونسٹ کبھی نہیں بنیں!"

وہ چپ چاپ بیٹھی آلو کھاتی رہی۔

"تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو بلڈاپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے۔ نرائن اور ملک راج کو دیکھو۔ تم بھی لکھو، سمجھیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"افسوس کہ میں تمھارا مطالبہ پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔"

"اچھا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمھارے گروپ میں تو ایک سے ایک لکھاڑ موجود ہیں۔"

"مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔"

"اچھا۔ تو آپ کا fad یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی۔" بل نے جواب دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دفتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر بیٹھی رہی۔

یہ چوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جاننے والے دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے۔ وہ ویٹرس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کو دیکھے بغیر کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں۔ "یہ چمپا احمد ہیں۔ دوسروں کے منگیتر پھانسنا ان کا کریر ہے۔ اگر تم سمجھو کہ میں اسکینڈل مونگرنگ کر رہی ہوں تو نرملا سریواستوا سے پوچھو جسے ٹی بی ہو گئی ہے۔" ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نرملا کو ٹی بی ہو گئی؟" دوسری نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ اور وہ مڈہرسٹ سینی ٹوریم جانے والی ہے۔" پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی اپنی اپنی ٹرے اُٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور اُن سے پوچھے: نرملا کیسی ہے؟ اسے ٹی بی کس طرح ہوئی؟ مگر وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ دریچے کے باہر سڑک پر سے رنگارنگ ہجوم گزر رہا تھا۔ پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں اپنی اور آتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ماسک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے: زرینہ، سریکھا، طلعت، نرگیش، کملا، فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے۔ وہ سب نرملا کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پریشان نظر آتے تھے۔

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سرل کی ہم جماعت روشن آرا تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سوا اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے تھے اور زیادہ اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انھوں نے چمپا کو دیکھا، ذرا ٹھٹھک کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دُور کونے کی میز پر جا بیٹھے۔

"یہ دونوں ہم سب سے دور ہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔" طلعت کی میز پر کسی نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ہی ہے۔ ہماری سنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔" کسی اور لڑکی نے جواب دیا۔

"اور ایمان جو خراب ہو گا وہ الگ۔"

"وہ الگ۔"

چمپا نے خلاف ارادہ سر اٹھا کر ان کو دیکھا: سید عامر رضا، گلفشاں والے، لا مارٹینئر کالج والے، بھیا صاحب۔ انسان جو لوازمات اور ایسوسی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے وہ پل کی پل میں کیسے بدل جاتے ہیں! اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری لڑکی۔ جو ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طلعت کی میز کی طرف گئی اور ان لوگوں سے نرملا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

(۶۲)

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔ وادی میں ٹرینیں مکانوں کے پیچھے انگلیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتر کی اور جا رہی ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈولتی ہے۔ آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یار و مددگار آنکھوں سے سامنے کا دھندلکا دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر کھا رہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی، لارکورٹس سٹی کی اور جا رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ چوزے کی سرائے میں وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں معروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ zero-hour ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں اور وصل ختم ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کرائسیس آکر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں جبکہ آج کی تہلکہ خیز خبریں کل ردی میں بکتی ہیں۔

گو سینٹ سیبستیان اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی گزری ہوں۔ ہم سب گزرے ہیں۔ میں نے اس میں بید کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے۔ (طلعت نے کہا۔)

کالج میں چھٹیاں ہیں۔ صولت روم سے آئی ہوئی ہے اور شکنتلا کے یہاں ٹھہری ہے۔ ہم سب کملا کے گھر میں محفوظ بیٹھے ہیں۔ گھر — نیچے صوفے، فرش پر بکھری ہوئی کتابیں، کھڑکی میں رکھی ہوئی اناس کی ٹوکری، نیوٹن اور سرل کی بنائی ہوئی کیوبسٹ تصاویر، پرانے طبوسات۔ تم چولھا سلگا دو، میں پورٹر کو فون کرتی ہوں، دودھ کی بوتلیں کہاں رکھ گیا، مسز جنکنز — مسز جنکنز — بس بس — تو میں ایک کمرہ ساری کائنات کا مرکز ہے۔

او فوہ روشن ڈیر، آج اتنا کام تھا۔ کملا کہہ رہی ہے، چند روز بعد دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم

کی کانفرنس ہے اور پھر سارا انفرمیشن ڈویژن۔ کشمیر کا مسئلہ، کوریا کا امن، کمیونٹی پروجیکٹس، آسام کے لوک ناچ، پبلسٹی — پبلسٹی۔

گیلری میں اوپر کی پانچویں منزل سے لفٹ آن کر رکا۔ نرگیش اندر آئی۔ وہ سب مل کر شکنتلا کے یہاں پہنچے جہاں ڈرائنگ روم میں خاصا تھا اور پل موجود تھے اور سریکھا، رام گوپال کی پارٹنر، سیدھی سادی، دلچسپ، خلیق اور ذہین پنجابی لڑکی جو دیکھنے میں مرہٹی نظر آتی تھی اور زریتہ، بوندرمہ، ہفت زبان، آرٹسٹ جو فرّاٹے سے روسی بول رہی تھی۔ وہیں ڈلن طامس بھی بیٹھے تھے۔ ان سب کا روشن سے تعارف کرایا گیا۔ ایک دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں، اس نے سوچا۔

پیرس میں ایک روز عامر رضا نے اسے مادموزیل دو پاری گا کر سنایا تھا اور اس سے کہا تھا: متیس کی تصویروں کے پیچھے گھوما پھرتا ہوں۔ میں صریحاً متیس پر عاشق ہوں۔ آپ کی شکل بھی متیس کی پینٹنگ کی ایسی ہے اور اس نے کہا تھا: "حسین خاتون، میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا ہوں۔ جہاں سایہ ملا وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔" وہ کہانی کیا ہوگی، کہانی کہنے والا کون ہے اور سننے والا کون؟ جی ہاں، میں نے پروفیسر رادھا کرشنن کے لیکچر اٹنڈ کیے ہیں۔ جی نہیں — میں ہیگل پر مونوگراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر پل سے کہا۔ جی نہیں مجھے ویدانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے۔ وہ باتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گزر رہی تھیں۔ تھیٹروں میں تمثیلیں اسٹیج کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسٹوڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند، نہ جھانک رہا تھا جہاں ناکام مصوّر اور گمنام ادیب اور دولتمند مصوّر اور مشہور ادیب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حدِ نظر تک مکان تھے جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور مڈل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان۔ اور قلعے اور محل اور کاٹیج۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور ناامیدی اور کامرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈی نیرو کی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا تھا: سُرخ اور زرد اور سیاہ دھبوں اور لکیروں کا ہیبت ناک مجموعہ۔

(۶۴)

جون کارٹر کا مکان ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں وکٹورین عہد میں اصطبل تھا۔ اصطبل کے اوپر کوچمین کے کمروں میں جون اور نیل اور اجیت رہتے تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتمالی جماعت کا سکرٹری تھا۔ اجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کیمبرج میں سرل سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور یہاں یونیورسٹی میں انگریزی زبان پڑھاتی تھی۔ کوچمین کے کمرے بہت خستہ حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ جس میں وہ گھڑیاں اور بچوں کی موٹریں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر کسی مشہور ایکٹر سے شادی کر لی تھی بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت میں بے حد انہماک اور تندہی سے کوئی مکینیکل کھلونا تیار کرتا۔ اور مہینے کے آخر میں اسے اپنے بچوں کو دے آتا۔ وہ بے حد کم گو انسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹوٹا صوفہ بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسٹوو کے اوپر ریڈیو رکھا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ نیل اسے ہمیشہ اوورہال کرتا رہتا تھا۔ نعمت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن دھونے کا حوض برتنوں سے بھرا رہتا کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کاہل تھے۔ الماری میں سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا ٹکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی کیونکہ اس گھر کے مکین بے حد مفلس تھے۔ اجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تنخواہوں کا بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا جو بیک وقت اس کی سنگھار میز، ڈیسک، کپڑوں کی کھونٹی اور بک شیلف کا کام دیتا۔ بہت سے خیر خواہوں نے کمر ہمت باندھ کر اجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان سب کوششوں کو کامیابی سے رائیگاں کرتا رہا۔ غسل خانے کی چھت بجائے باہر ٹیرس تھا جس پر تمام چینی کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا صندوق پڑا تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آ کر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صبح صبح لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی گاڑی آ کر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دہلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکڑ پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جون کارٹر کا کمرہ اس فلیٹ میں گویا ہر میجسٹی کوئین الزبتھ کے کمرے کا درجہ رکھتا تھا۔ الماریوں میں ان گنت کتابیں ٹھنسی تھیں کیونکہ بہن جون کارٹر اللہ کے فضل سے چھ سات یورپین زبانوں کی ماہر

تھیں۔ آتشدان پر رنگ برنگی گڑیاں اور مشرقی یورپین ممالک کے نوادر سجے تھے کیونکہ جون ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تحفوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے دریچے میں روایتی سُرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر ٹیلیفون لگا تھا۔

چمپا احمد چند ہفتے قبل پیرس سے آکر جون کے یہاں ٹھہری تھی جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی۔ وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اسے جون دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک امن کانگریس کے لیے وارسا تک جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم یہیں رہو۔ راشن کے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور ادجیت سے کہے جا رہی ہوں کہ وہ ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی تم کو باقاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔

صبح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گئی اور ناشتہ تیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے اپنے کمروں سے نکل کر گڈ مارننگ کہتے چائے پینے کے لیے آجائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ نو بجے ادجیت سو کر اٹھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے، ارادہ ہے پلنگ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ ٹھنڈی چائے پی کر بڑے اطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے ہلتے ہلتے ڈگ بھرتے زینے پر سے اتر گئے۔

فرانسیسی انداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرائی اور برساتی اوڑھ کر اُس نے بھی اپنے دفتر کا رُخ کیا۔ یہ دستور العمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڈ ہوتی دوسرے سے بات کر لی ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ ویک اینڈ پر فیروز یا سریکھا کے یہاں محفل جمتی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنارس اور لکھنؤ اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹرن کی بھی عادی ہوگئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سُنا تھا کہ وہ اب بے حد اہم آدمی بن گیا ہے، بے انتہا مصروف رہتا ہے، انڈیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کار پرداز افسر ہے۔ کمال کیمبرج میں تھا۔ ہری شنکر امریکہ میں۔

ایک روز وہ اور سب کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کانفرنس میں گئی جو ایسیکس کے سبزہ زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناچتے اور گاتے اور سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک وقت جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے سبزے پر بپا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سرسراتا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ جس طرح

سبک خرام ندی پُرخطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تندرو ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹان پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ انٹرنیشنل گا رہا تھا۔ بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی، اردو اور فرانسیسی میں ادا کیے جا رہے تھے۔ وہ کان لگا کر سنتی رہی: دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہان لیے۔

One great vision unites us, tho' remote be the lands of our birth.

Foes may threaten and smite us, still we live to bring peace to the earth.

Ev'ry country and nation stirs with youth's aspiration.

Young folks are singing, happiness bringing, Friendship to all the world. Ev'ry where the youth is singing freedom's song, freedom's song, freedom's song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے، ان کے ساتھ کیا ہوگا، باہر کی دنیا کے ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے؟ برابر سے برطانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی ویلش لوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جا رہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ہیملیٹ کے کردار کی طرح دہرایا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی باتیں کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھندلکے میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروزا اور طلعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے باتیں کرتی سبزے کی طرف جا رہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل طور سے گھلی ملی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ہمیشہ، ہر جگہ علیحدہ رہوں گی، اس نے اپنے آپ سے کہا، حالانکہ ادیت مجھے ساری ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی پڑھا چکا ہے۔ آخر میں وہ سب کیوں نہیں کر سکتی جو دوسرے کرتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا کر گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گربا میں شامل ہو گئی جو باغ کے ایک حصے میں جاری تھا:

ہے گووند راکھو چرن اب تو جیون ہارے
سندھ کے کنارے، سندھ کے کنارے

لڑکیوں نے دہرایا۔

ناچتے ناچتے اس کے دل پر چوٹ لگی۔ سندھ؟ سندھ تو پاکستان میں ہے؟ یہ اسے دفعتاً یاد آیا، یہ حقیقت ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ دو قومیں ہیں۔ میں مسلمان ہوں اس لیے قابلِ نفریں ہوں؟ یہ لوگ

ہندو ہیں اس لیے قابلِ گردن زدنی ہیں؟ پنجاب سندھ گجرات مراٹھواڑہ اور اتکل ونگا — کیا بکواس ہے۔ میں تو ہمیشہ ٹیگور کی اس رومان پرستی کی مخالف رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اور یہ لوگ دو مختلف قومیں ہیں — مگر میں ہندوستانی ہوں۔ اس سے کیا ہوا؟ مسلمان تو ہوں اور کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان دل سے پاکستانی ہوتا ہے۔ مائیکل سے پوچھنا چاہیے اس نے یہودی کی حیثیت سے اس کشمکش کو کیسے حل کیا۔ کیا میں ڈاکٹر لیوی سے چل کر اس کا حل پوچھوں؟

ناچ کے اختتام پر وہ چند لڑکیوں کے ساتھ فارم ہاؤس کے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

(۶۴)

الاؤ سرد ہو چلا تھا۔ وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا تھا۔ ہال میں سے اکارڈین کی آواز آ رہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب ''لٹریچر ان دی ایج آف سائنس'' ایک گھنٹے سے زیرِ بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاند کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ چکی تھی۔

''مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔'' انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اپنے متعلق؟'' طلعت نے جواب دیا، ''ہم لوگ — ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں — بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔ قطعاً۔''

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقلوں اور عمروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا لیکن اس کے باوجود، ان کی فرشتوں کی ایسی شفقت کی وجہ سے، گریا کی اس خنک رات کو دفعتاً کیسی یگانگت محسوس ہوئی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تھے، دنیا کے چوٹی کے عالموں میں سے ایک، اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے: ''جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو، حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا، پر میں نے سوچا، میری قوم نے اتنی صدیوں تک جو برتاؤ تمھارے ساتھ کیا ہے ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ میں اس کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ تم لوگ جب بھی کہو میں تمھاری محفل میں آ شامل ہوں۔''

طلعت نے ایک خشک ٹہنی آگ میں پھینکی اور اس نے مائی یین لیوی سے کہا: ''ہم تو اتنے، یونہی سے لوگ ہیں اور غالباً سخت خوف زدہ جو طامس بیکٹ کے کورس کی بچاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں:

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علاحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گلّے، ہم خود، خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سرزمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھو لوں تو ان میں سے بھی خون بہنے لگتا ہے۔ میں ٹھنڈے موسم بہاراں کی طرف کس طرح لوٹوں؟

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علاحدہ کر کے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ ——''

بارن میں سے یک لخت گٹار کی آواز بلند ہوئی۔ ایوان مک کال کی صاف، گہری آواز سارے میں چھا گئی۔

''اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی اسٹیشن سے شہر کے لیے ٹرین پکڑ لوں گا۔'' پروفیسر لیوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ —— آپ پیدل جائیے گا؟'' فیروز نے گھبرا کر کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' انھوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔''

لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں مختلف یورپین زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں ایک کار آن کر رکی۔

''اَلو ——'' عامر رضا نے آواز دی۔

''اَلو ——'' اودیت نے خالص فرانسیسی لہجے میں نعرہ بلند کیا۔

''آیئے آیئے بھیّا صاحب۔'' طلعت نے کہا۔

وہ سب بارن میں داخل ہوگئے۔

''میں جلدی ہی میں ہوں۔ دور سے گانوں کی آوازیں سنیں تو ٹھٹھک گیا۔'' انھوں نے طلعت سے کہا۔ پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گیلنٹ انداز میں جھک کر مخاطب ہوئے: ''مجھے اپنا سیکسوفون دو۔''

''بھیّا صاحب، آپ ایوان سے ملے ہیں؟'' فیروز نے لکھنؤ کے خلطے سے ان سے اخلاق برتنے

کی سعی کی۔ "یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈ گانے والے ہیں — اور بہترین ڈرامائسٹ۔"

"مجھے اپنا سیکسوفون دو — میں تمہیں وینس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔" عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ —" فیروز نے جھنجلا کر ان سے سوشل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

"آیئے، یہاں بیٹھیے عامر بھائی۔" ونود نے ان کے لیے پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طلعت اور کمال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ "ترقی پسند عوامی محاذ خطرے میں ہے۔" امریکھا نے چپکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

"بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہے۔" فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

"اور یہ بس مریا گرزولی اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لیے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو وینس کے گیت سنائیں! یا اللہ تو ہی رحم کر۔" طلعت نے جل بھن کر کہا۔

"یہ بھی اپنے وقت کے رڈولف ویلنٹینو ہیں۔" شیلا نے اظہار خیال کیا۔

لڑکوں نے پرچھتی پر چڑھ کر ایک اسپینش گیت شروع کر دیا۔

"اچھا بھئی، بون نوئی۔" کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بون نوئی۔" کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سیبوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

"— ؟" یلوان نے مجمعے کی طرف استفسارانہ نظریں اٹھائیں۔

"یہ ملک کمال صاحب — ایک طلسمی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔" فیروز نے کھڑکی میں سے کہا۔

"ماشاءاللہ سے کس قدر پروفاؤنڈ بات کہی ہے۔" طلعت نے داد دی۔

سب نے مل کر امریکن حبشیوں کا بیلڈ شروع کر دیا:

For if you are white, you're all right ;
If you are brown stick around,
But if you are black,
Oh, no! Brother , get back, get back, get back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع سناٹے میں گونجتی رہی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیبنوں کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔

کوگ کیبن میں ساری لڑکیاں آ چکی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے

سارے صوبوں سے آئی تھیں اور بیرسٹری پڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہی تھیں اور اخبار نویسی اور ڈائرکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس دان تھیں اور آرٹسٹ تھیں اور گاتی اور ناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفتے سے کانفرنس میں نہایت مدلّل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باورچی خانے میں مندوبین کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سنّاٹا آسمانوں سے اتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دور پر خانہ بدوشوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس بڑھتے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

(۶۵)

اے ہمارے آسمانی باپ، ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔ طلعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اسٹیشن پر پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی اور سرپٹ دفتر کی طرف دوڑی۔ آج کل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوز روم میں وہی گہما گہمی تھی۔ اُس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو الٹ پلٹ کیا اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

”ہلو — ہلو —“

”ہاں کون ہے بھائی —“

دوسرے سرے پر فیروز دھاڑ رہی تھی۔

”ساجدہ آپا کسی بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں۔ بجیا نے کہا ہے فوراً اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرویو کر و —“

وہ سہ پہر کو اسٹوڈیو پہنچی۔

بی بی سی کی کینٹین میں حسبِ معمول شورِ قیامت مچا تھا۔ یورپین، مڈل ایسٹرن اور فار ایسٹرن سروسز کے لوگ اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر لنچ کے لیے آ رہے تھے۔ ہسپانوی، اسرائیلی، عرب، ایرانی، فرانسیسی، ہندوستانی، پاکستانی — ان سب کی عجیب و غریب برادری تھی۔ بہت سی میزیں برابر برابر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی کراؤڈ اکٹھا بیٹھا کرتا۔ یہ تقریباً سارے کے سارے اولڈ ٹائمرز

تھے: صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے جگت بچا اور اپنی ذات سے انجمن تھے، یاور عباس، اعجاز بٹالوی، تقی سید، آلِ حسن، عطیہ، زرینہ۔

"اور وہ وفد آگیا جس کا انٹرویو ہے۔" طلعت نے اندر آکر فیروز سے پوچھا۔ کنٹین میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کا نٹا بجا رہی تھیں۔ "اب چلو ان کا انٹرویو کرنے۔" زرینہ نے چپکے سے کہا۔

"ان کا — ان کا؟"

"اور کیا۔"

"اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہو کر آ رہا ہے؟"

"یہی تو وفد ہیں۔" زرینہ نے اس انداز سے کہا گویا اب دنیا کا کوئی رنج و غم اس پر مزید اثر نہیں کر سکتا۔

"— بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پیتے رہتے ہیں۔" ساجدہ بیگم بیزاری سے فیروز سے مخاطب تھیں۔

"جی ہاں۔ بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے، سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔" زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

"کون؟" طلعت نے چپکے سے پوچھا۔

"اطالوی یا غالباً فرنچ — ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفا ہیں۔" زرینہ نے بتایا۔

"بیچ بیچ — بورژیرز۔" طلعت نے کہا۔

"بورژ"، ساجدہ آپا نے بات ختم کی۔ "مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔"

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: "جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔"

طلعت نے نڈھال ہو کر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

"دیکھو، ساجدہ آپا، گپ نہ ہانکو۔ مجھے معلوم ہے تم میڈرڈ کبھی نہیں گئیں۔"

"چلو میڈرڈ کے بجائے اوسلو کردو۔ فرق کیا پڑتا ہے؟" زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

"اور اہلیہ اہرن برگ کون ہیں؟" فیروز نے طلعت سے مطالبہ کیا۔

"یہ اہرن برگ صاحب کے گھر میں سے ہیں۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"دوسری بات یہ کہ یہ میڈرڈ میں کیا کر رہے تھے؟" فیروز نے مزید جرح کی۔ "کہاں میڈرڈ کہاں عزیب ابلیہ۔"

ساجدہ بیگم نے کھسر پھسر سنی تو اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لمحے کے لیے زرینہ کو دیکھ کر چونکیں کہ یہ سبز فراک میں ملبوس بلونڈ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آگیا کہ یہ زرینہ ہے۔ "کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"ہاں پیاری بہن — پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا" — زرینہ نے طلعت سے کہا۔

ساجدہ بیگم نے، جو مانی ہوئی زنانہ لیڈر تھیں، کہنا شروع کیا: "مجھے یہاں کا طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔"

"کتنی خوشی کی بات ہے۔" فیروز نے کہا۔

"ہالینڈ میں، جہاں میں ابھی گئی تھی، ہر جگہ لالہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔" انھوں نے مزید انکشاف کیا۔

انٹرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد سنا گیا کہ ساجدہ آپا نے طلبا کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کوپن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتلایا کہ بائی دی گریس آف اللہ —

اس کے چند روز بعد اطلاع ملی کہ سیّد عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استنبول کھانے پر مدعو کیا ہے۔

یہ دعوت ساجدہ آپا کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

(۶۶)

وقت کالے بھتنوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت، جو گزر رہا ہے، آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوندکی ماں مریا۔ جس کا دل سات بار زخمی ہوا۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے پرانے دشمن۔ روشن سیبوں کے سلسلے میں جلتی رہی۔ جیزس لین میں کسی نے ٹرمپیٹ پر ایک پرانی دھن بجانا شروع کردی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جارہا تھا۔ ایک کتا ہنستا ہوا اسے عبور کر رہا تھا۔ پتلی ٹہنیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پرچھائیوں میں ایک بطخ تیر رہی تھی۔

وہ کوا ڈرینگل میں داخل ہوئی۔

"روشن۔" کسی نے دریچے میں آکر اسے آواز دی۔

"روشن — اندر آؤ — کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آرہی ہو جس میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں؟" سرل نے دروازے میں آکر کہا۔

"نہیں۔" اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ "نہیں۔ میں محض ہیزل میئر تک گئی تھی۔"

"وہاں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"ڈینس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔"

"ہو ڈارلنگ۔" سریکھا نے آتش دان کے پاس سے اٹھتے ہوئے اُس سے کہا۔

"تم کب آئیں۔"

"میں؟ مجھے کیمبرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔"

"میں اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنون کروں گا۔"

ڈینس سریکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن دریچے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سنتی رہی۔ (پھر یہ سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہوگئے یا حلق میں کینسر نکل آنے کی وجہ سے ختم ہوئے۔ چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں، شہرت پائی اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آگئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے۔)

"ہوسنہ — خدا۔" ڈینس کہہ رہا تھا۔

"خدا۔" سریکھا نے کہا۔ "جب میں ناچتی ہوں، مجھے لگتا ہے، واقعی شیو نے تلانا کے سروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل منجمد کردیا جائے تو شاید خدا ہو گا — تلانا کی دھن کا احساس — پتا نہیں۔"

"ابھی شاید دروازے میں سے وہ داخل ہوگا جس کا کوئی نام نہیں۔ دیکھو باہر ایک منحوس چاند

پرانی قندیل کی طرح ڈول رہا ہے۔" سرل نے کہا۔
"ویک اینڈ کے لیے شہر چلو گی۔ میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں" سریکھا، روشن سے بات کرنے کے لیے دریچے کی طرف مڑی مگر روشن باہر جا چکی تھی۔
"چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میئر چلیں۔" سرل نے سگریٹ رول کرتے ہوئے تجویز کیا۔
"کیوں ہیزل میئر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں؟" مائیکل نے سوال کیا۔
"سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ڈینس نے کہا۔
"لہٰذا ہیزل میئر چلو" سب نے مل کر نعرہ لگایا۔
"روشن۔ ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔" سرل نے کہا۔
وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آگئے۔
یہ وسط گرما کی رات ہے۔ چڑیلیں اور بھتنے اور اگیا بیتال درختوں کی چھاؤں میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔
سنڈریلا؟ روشن بھاگتے بھاگتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔
تمہاری حقیقت دھندلکے میں چھپی ہے۔ عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا۔ میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔
پہاڑیوں پر روشنیاں جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوٹ پہنے شکاری ویبر کی دھنیں بجا رہے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہیمپٹن کورٹ اور سرل ایشلے کے محل میں داخل کیا جاتا ہے۔ مائیکل نے کہا۔
لیکن ہم بھوکے تھے لہٰذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا کوئی نام نہیں۔
جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل کھڑا کملا کو اپنی نظم سنا رہا ہے۔ سریکھا نٹ راج کے ایک انداز میں منجمد ہو گئی ہے۔ ڈان طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔
دوستو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فاصلے کی فون کال کا انتظار ہے؟" سرل نے قریب آکر عامر رضا سے دریافت کیا۔
"ہاں۔ نہیں۔" عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ ہمارے خواب مختلف ہیں۔

خالص خیال خوفناک ہے۔ ٹھہرو۔ تفصیلات کی دنیا میں ہمارا میموں کہاں ہے؟ جلد بتاؤ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اُس نے یک لخت گھبرا کر روشن سے پوچھا۔ وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ چمپا ہے!

ہمیں دیر ہو رہی ہے — جلدی کرو — جَلدی — چَل — چَل — چَل — چل — پہاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئی ہیں۔ میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوائیں سنسنا رہی تھیں اب وہ آندھی بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن تھی — میں تمھارے تھکے ہوئے پاؤں جھوؤں گی۔ تم گرم قالین پر آگ کے سامنے بیٹھے رہنا — جلدی۔ جلدی۔ دیر ہو رہی ہے —

شور میں اضافہ ہوگیا۔ چلو۔ چلو — ہیزل میئر چلو — دلّی چلو — چرچل کے گھر چلو — دُنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان — ایک آدرش مہان لیے — خطرہ ہو بلیدان کا — پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین — لائیں گے سکھ چین —

— ان بستیوں کو جگمگانا ہے سدا — ان کھیتیوں کو لہلہانا ہے سدا — ہم، کیا گورے کیا کالے — سب ایک ہیں — ایک ہیں — ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں — ایک ہیں — کہہ رہے ہیں ہم، ہیں شکتی مان — اور روشو ماتنا یہ ست گان — خطرہ ہو بلیدان کا — خطرہ ہو بلیدان کا — جوانیاں ہیں گا رہی — بستی خوشی منا رہی — دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان — نوجوان — کارارائی تو ہو کو پاٹ بھنگ رہے — بھنگ کو رہے تو پاٹ — آزاد دلّی میں ہیں — نہرو جنیوا میں ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے — روشن، عامر رضا کے چکّر میں ہے — مسٹر کھنّہ یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔ معاشرے کی خرابیاں۔ کل میں نے ایک نیا کوٹ خریدا — دماغوں کو دھوؤ — روحوں کو دھوؤ — آلو کو دھوؤ — پتیلی کو دھوؤ —

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔ خاموشی چھا گئی۔ چاند علین اوپر آگیا۔ عامر رضا نے دفعتاً ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

وہ پگڈنڈی پر بیٹھی رہ گئی۔ سرل اور ڈینس مائیکل دلدل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے اور منہ لٹکا کر ادھر ادھر بیٹھ گئے۔

یہ ٹھنڈے اور اداس دن — روشن نے سر اٹھا کر اس سے کہا۔

بھیگے، نم خوردہ، خوفناک دن — سرل نے کہا۔

بھاری، گھسٹنے والے، لنگڑے، اپاہج دن — ڈینس نے کہا۔

یوں ہماری زندگی بیتتی ہے۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
ہمارے لیے کٹھن آزمائشیں ہیں۔
تکلیفیں
دل کا رنج
ندامت
پشیمانی
وہ ہنس رہی
ہم روتے ہیں ——
ہینرل میٹر کا جنگل آہستہ آہستہ دھندلکے میں محو ہو گیا۔

(۴۷)

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

"ساجدہ آپا نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لیے مدعو کیا ہے۔" طلعت نے اطلاع دی۔

"صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی لومڑی کیوں نہیں؟" سریکھا نے پوچھا۔

"دراصل ساجدہ آپا کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔" طلعت نے کہا۔

"تو پھر کرا دو ان کا انٹرویو رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براڈ کاسٹنگ ہاؤس آتے رہتے ہیں۔"

"دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اوریجنل ہیں۔"

"اوہو ــ یہ بات ہے۔" فیروز نے کہا۔ پھر دفعتاً وہ چلائی۔ "ارے یہ تو واقعی بڑی اکیٹوٹی ہو گئی۔"

اٹھا لاؤ کھنجر، کرو قتل ہم کو
بڑی دیر سے مونڈی جھکائے ہوئے ہیں

طلعت نے کہا۔ (یہ قدیہ کا پسندیدہ شعر تھا۔)

"یہ بات ہے تو آؤ میدان میں۔" بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ بڑبڑا کر فیروز نے کہا: "السلام علیکم۔ لائیے میم کا۔"

اشعار کسی کو یاد تھے لہٰذا پہلے غلط پڑھے گئے، پھر حسب ضرورت ان میں ترمیم کی گئی۔ بزم گرم نشین بے وقفی کی باتیں۔ میں بھولا نہیں بس وقفی کی باتیں۔ خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے جانے لگے۔ "یاد رکھنا چاند تارو اس سہانی رات کو۔ لاؤ واؤ کا۔" طلعت نے کہا۔

"واہ، کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔" کملا نے کہا۔

"یہ فاؤل ہے۔" طلعت دہاڑی۔

"ہرگز نہیں۔"

"اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔"

طلعت نے میز پر مکا مارا۔

"آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔" کملا نے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملا کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا: "ہائے کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔"

"یہ سب ہو چکا ہے۔" طلعت چلائی۔

"یہ دوسری مرغیاں ہیں۔" کملا نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے روز ساجدہ آپا نے طلعت کو ویمنز پریس کلب میں فون کیا۔

"سنو ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چوہے دیکھنے سے معذور رہوں۔ میرا سارا دن تو مت سے اگلی چوہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔" طلعت نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے رائے لینا ہے۔ ایک نہایت ضروری بات ہے۔"

"اچھا تم سیدھی یہیں آ جاؤ اور لنچ بھی یہیں کھاؤ۔" طلعت نے زور سے ریسیور پٹخ دیا۔

شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اودھم جان آفت میں کر رکھی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طلعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ افیمچیوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔

"کل میں عامر رضا سے ملی۔" انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"یہ جوزسے کی سرائے کا ذکر ہے جہاں آپ بی بی سی والوں کے ساتھ گئی تھیں؟" طلعت نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ ہم دونوں استانبول میں کھانا کھا رہے تھے۔"

"اوہ۔"

"اور پھر انھوں نے بتایا۔"

"انھوں نے بتایا کہ وہ مجمعے سے کتنا گھبراتے ہیں؟ کہ وہ سائے کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتے ہیں۔ جہاں سایہ ملا وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز دھوپ ان کی آنکھوں کو بری لگتی ہے؟"

"ہاں کہا تو تھا۔ بالکل یہی کہا تھا انھوں نے۔"

"خدایا۔ لو یہ گوبھی کھاؤ۔" طلعت نے پلیٹ ان کی طرف سرکائی۔

"میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں ان پر ایک افسانہ لکھوں۔" ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

"ضرور۔ اس سے عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے!" طلعت نے ویٹرس کو بلانے کا اشارہ کیا۔

"کافی لوگی ساجدہ" اس نے اونچی آواز میں پوچھا "یا آئس کریم؟"

برابر کی میز پر برطانیہ کی مشہور اخبار نویس خواتین ٹوپیوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلۂ خیالات کر رہی تھیں۔

طلعت اداسی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رو دے۔

(۶۸)

چمپا نے نرگیش کے کمرے میں آ کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ مانوس کمرہ۔ صوفہ۔ تصویریں۔ نیلے پھول۔ "میرے لیے ایک ساری نکال دینا۔" نرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔ دوسرے کمرے میں شاستا ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جا رہی تھی۔ اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔ بل نیچے کورٹ یارڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چمپا نے الماری کھولی۔ ایوننگ گاؤن اور ساریاں اور جوتے اور بیگ۔ ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک پھلوٹا سا مندر تھا جس میں ایک ننھا سا بت رکھا تھا۔

پارسی کس کا بت پوجتے ہیں؟ وہ سوچتی رہی یا شاید زرتشت یا جانے کیا۔ اسے پارسی مذہب سے واقفیت نہ تھی۔ اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹا سا شرائن ہے جس میں ایک گمنام بت رکھا ہے۔ اس بت کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ سینٹ طامس کرشنا۔ تارا ئیو۔ زرتشت۔ یہ بت آخر وقت تک گمنام رہے گا۔ انت سمے جب انسان کی آنکھیں آخری بار ہمیشہ کے لیے بند ہونے لگتی ہیں، اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے، وہ گمنام بت کون سی شکل اختیار کرتا ہے ۔۔۔ یہ کسے معلوم۔

شانتا نے اندر آکر نرگیش کے لیے ایک سرخ ساری نکالی۔ "الماری بند کر دو۔ الماری بند کر دو۔" چمپا نے بآوازِ بلند کہا۔

"ہیں؟" شانتا نے کمرے میں آکر پوچھا۔ "کس سے کہہ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار نرگیش یہ الماری کھولتی ہے۔"

"ہاں؟" شانتا بالکل نہ سمجھی۔

"اور اس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکلتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں ۔۔۔ تو؟"

"اور ہینی گھاس کا عطر۔ اور پیرس کی شیشیاں۔" چمپا کہتی رہی۔ "اس کا بت شرائن میں رکھا رہتا ہے اس کو تے میں۔ اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں چھپا بیٹھا ہے۔ تمہاری الماری بھی کوئی بستا ہے؟"

"میری الماری میں ڈھانچے ہیں۔" شانتا آتشدان کے قریب آکر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ "تم ۔۔۔" اس نے کہا۔ "تم تھوڑی سی دیوانی ہو۔"

"ہاں۔ تم نہیں ہو؟"

"تمہاری باتیں معرفت کی حدوں کو چھو رہی ہیں۔ اس طرف مت جانا۔ بڑی افسوسناک بات ہو گی۔" شانتا نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے، بال تولیے میں لپیٹے باہر آئی اور دریچے میں کھڑی ہو کر ٹیرس گارڈن کو دیکھنے لگی۔ باہر، جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جگمگا رہا تھا۔

"زندگی ۔۔۔ زندگی۔" سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

"سریکھا میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔ بشاش۔ رقصاں۔ تم علامتوں کی رمزیت کی قائل ہو؟"

چمپا نے مڑ کر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سرخ انگاروں کو دیکھا کی۔

زندگی میرے سامنے سہمی کھڑی ہے۔ سفید ساری میں ملبوس۔ ہنستی، گنگناتی۔ خوفزدہ۔ نڈر۔ باہمت۔ بزدل۔ ہر لفظ کے دو مختلف متضاد معنی ہیں۔ زندگی ۔۔ اس نے شانتا کو دیکھا۔ میں نے ایک مرتبہ گوتم سے کہا تھا ۔۔ میں اور تم ہمیشہ مختلف رہیں گے۔

کئی سال قبل گلستاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے، طلعت نے کہا تھا۔ چمپا باجی گوتم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔ اس بات سے خبردار رہیے گا۔ وہ کسی کو بخشنے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔"

"مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑ ہے جو بات بے بات، ہر فقرے، ہر لفظ، ہر لکھے ہوئے جملے میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لاحول ولا۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟" نرملا نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا۔

"بالکل۔" طلعت نے جواب دیا تھا۔

"تب تو گوتم بہت برا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کردیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے نہ تلاش کیا کرے، خصوصاً آپ کی باتوں میں۔" نرملا نے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحاً بدتمیزی پر اتر آئی تھیں۔ نرملا مجھ سے جلتی ہے ۔۔ کس قدر واہیات بات ۔۔ تہمینہ کی طرح ۔۔ لاحول ولا ۔۔ میری باتوں سے اسے مطلب! اس نے غصے سے سرخ ہو کر بآواز بلند کہا۔ تین چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا:

"اور وہاں اس نے باتوں کو ایسی ٹرپھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بولنے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے، ہر علم میں وہ ماہر ہے ۔۔ توبہ ۔ آدمی نہ ہوا راکھشس ہوگیا، دس سر والا۔

"ہے ۔۔ بت ۔۔" تہمینہ نے بڑی مہارت سے پیڑے کاٹتے ہوئے باورچی خانے کے دوسرے کونے سے کہا تھا: "گوتم نے تم پر بہت رعب ڈالا ہے اور آگئیں تم اس کے رعب میں۔"

"میں نہیں آئی اس کے رعب میں۔" اس نے بگڑ کر کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

"پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں کر رہی ہو؟ ہم لوگ تو بے چارے گوتم کو ایسا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ نہ راکھشس نہ دیوتا۔ تم نے اس چکر میں چاء بھی ٹھنڈی کر دی۔ اے وہ مصالحہ جلا جا رہا

ہے۔ بھن گیا مصالحہ، لے اب گوشت ڈال دو بی طلعت ۔"

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں۔ یہ نرگیش کا فلیٹ تھا اور سر لکھپا جھولوں میں کھڑی بال سکھا رہی تھی اور شانتا صوفے پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔ چہرے وہی تھے، ماسک نئے تھے۔

"گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے؟" شانتا نے باآوازِ بلند پوچھا۔

"کیا؟" وہ چونکی۔

"میرا مطلب ہے"، شانتا نے سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا گویا چمپا ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی، "وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لائبریری کے بک شیلف پر واپس رکھ دیا گیا؟"

"پتا نہیں۔"

"تمھاری ممبرشپ کی میعاد ختم ہو چکی؟"

شانتا کریک علاوہ مغرور ہونے کے کمینی بھی تھی۔

"یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔"

شانتا اداسی سے مسکرائی۔ اس کا پُرغرور تبسم، اس کا انداز، اس کا طرزِ لباس — چمپا کس دھیان سے ان دنوں اس کی تقلید میں معروف تھی۔ خوبصورت، کامیاب، ہردلعزیز، کریر وومن۔ وہ بھی شانتا نیلمبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شانتا نے اطمینان سے اسے دیکھا: "میں اس کے الوژن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے۔"

"واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔" چمپا نے طنز سے کہا۔

"تمھیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ تم خود اپنے تصورات میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہو۔ آدمی قربانی چاہتے ہیں۔ بغیر اپنی قربانی دیے تم ان کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم پیرس سے یہاں کیوں آگئیں، اپنا اکیڈیمک سال ادھورا چھوڑ کر؟ اس لیے کہ وہ یہاں ہے۔"

"بکومت — یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟" چمپا کو بے حد غصہ آیا۔ اب وہ اپنی مزید توہین نہیں کروائے گی۔

"لیکن یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے۔" شانتا اپنی سریلی آواز میں کہتی رہی۔ (وہ احمدآباد اور بمبئی سے مرہٹی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتی تھی۔)

"تم افسانہ نگار ہونا اسی لیے میرے متعلق تم نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔"

"— اب ہل تم کو بلڈ اپ کرنا چاہتا ہے"، شانتا نے اپنی سریلی آواز میں بات ختم کی اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔

تہمینہ رضا، نرملا سریواستوا، شانتا کریگ۔

"اچھا، یہ بات ہے۔" چمپا نے اپنا کوٹ اور دستانے اٹھائے۔ "میں قابلِ نفرت ہوں۔ میں قابلِ نفرت ہوں۔ اچھا بھئی اب چلا جائے۔ نرگیش — سریکھا — شانتا — خدا حافظ۔"

"کل دفتر آؤ تو وہ نیلی اون لیتی آنا جو ہم لوگوں نے اس دکان پر دیکھی تھی۔" شانتا نے اسی اطمینان سے کہا۔

"میں شاید کل دفتر نہ آؤں۔" دروازے تک پہنچ کر اس نے دوبارہ پلٹ کر کہا۔ "کل کیا معنی، میں شاید کبھی تمہارے دفتر نہ آؤں۔ شب بخیر۔"

باہر چیلسی کی سڑک پر آ کر اس نے دیکھا مکانوں کے دریچے بارش کے سہانے دھندلکے میں چھپ گئے تھے۔ نکڑ کی بوڑھی عورت، جو پھول بیچتی تھی، بارش سے بچنے کے لیے برساتی اوڑھے، کرسی پر، دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دریچوں میں سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچی جو بہت دور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں اسے سرل کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا: "تو ہم میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آ رہی ہو۔ یہ گرمیوں کے چند مہینے کسی اداس اور رومینٹک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گزار آؤ۔ میں شمال جا رہا ہوں۔ روز ماری بیمار ہے۔"

روز ماری؟؟

(۴۹)

کوہِ نور کی ایک میز پر، جو دریچے کے پاس بچھی تھی، گوتم، نرملا کے مقابل بیٹھا باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتا رہا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں آ آ کر بیٹھ رہی تھیں یا اٹھ اٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔ کمال "معاف کرنا" کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لیے ایک دوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش و خروش سے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماؤ اور ربیلیز جیانتا کا نام دہرایا

جا رہا تھا۔ گوتم نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔

"کمال کتنا پیارا لڑکا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں — کمن بھیا کے ہونے سے مجھے یہی لگتا ہے کہ بھیتن یہاں موجود ہیں۔ اگر کمن بھیا اور طلعت نہ آ رہے ہوتے تو اماں مجھے ہر گز اکیلا ولایت نہ بھیجتیں۔" نرملا نے کہا۔

"تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سن کر بڑا دکھ ہوا۔" گوتم نے کہا۔ وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نرملا نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔ چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

"تم سب نے، ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ ہم نے ان کو برابر غلط سمجھا ہے — مثال کے طور پر —" اس نے ذرا جوش سے دہرایا اور کانٹا اٹھا کر نرملا کو سمجھانا شروع کیا، "انھوں نے کبھی بھیا صاحب کو اپنے سے، یعنی کہ، چھیننا نہیں چاہا تھا۔"

"بہر حال، میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔" نرملا نے کہا۔ اور مصروف نظر آنے کے لیے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔ "تمھارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپنے سے جانتے ہیں۔"

"یہ بچپنے سے جاننے کی دھونس اچھی ہے!" گوتم نے کہا۔ "تمھارے یہاں ہر سمے بچپنے کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمپا احمد کو بچپنے سے نہیں جانتے، وہ گدھے ہیں؟"

اب گوتم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی۔ لیکن دیکھو کیا ہوا کہ گوتم نے ہاتھ بڑھا کر دفعتہً سوئچ بند کر دیا۔

گوتم: انسانی کردار کا بے رحم نقاد، ویدانت کا گرو، چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے۔ بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا:

"نرمل — میں تمھاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب! میں بہت بیچ ہوں، تم نے ٹھیک کہا، مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نعم البدل؟ نہیں، سوری گوتم۔"

"نرمل — مجھے سمجھنے کی کوشش کرو — او نرمل —" اب وہ پھر اندھیرے میں چلا گیا۔ وہ بہت قابلِ رحم تھا۔ اسکول کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے مرد سمجھدار ہوتے ہیں۔ ارے ان سے زیادہ مورکھ کون ہوگا۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرملا کو احساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح عورتوں کی طرح،

بیرومیٹر کے پارے کی طرح اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گیان آ رہا ہے۔ اب مصنوعی روشنیاں بجھا کر وہ بھی اس اندھیرے میں چلی جائے گی جو سب کیفیتوں سے اتم ہے۔ اس میں بیٹھی وہ باہر جھانکا کرے گی۔ اب وہ سلیمانی ٹوپی پہن لے گی جس کی کہانی بچپن میں اسے گلفشاں کے شاگرد پیشے میں قدیر ڈرائیور نے سنائی تھی۔

یہ سلیمانی ٹوپی ہر ایک کو دستیاب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ میں تمھاری شکر گزار ہوں شری نیلمبر کہ تم نے میرے بڑے ہونے میں میری مدد کی اور سلیمانی ٹوپی پہننے کا راستہ دکھایا۔ کاش میں تم سے بیاہ کر سکتی۔ مگر مجھ میں بہت زیادہ گیان آ گیا ہے ۔۔۔ چمپا احمد کی پرستش کیے جاؤ گوتم جی۔ شاید تم کو بھی راہِ نجات مل جائے۔

اسی رات نرملا کی ایکسرے رپورٹ میں معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کی دق ہے۔

(۷۰)

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ مڈہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل، اب کے ویک اینڈ پر ضرور مڈہرسٹ چلیں گے، بے چاری نرملا کو دیکھنے۔) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بد دماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ، سلیقہ، نفاست، بردباری، ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچتی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیومالا، ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی، یا وہ لڑکی جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈپلومیٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور کون سی لڑکی کو لے کر تھیٹر دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کیمبرج میں فلسفی لڑکی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ لائبریری کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک بلیا پر بیٹھی مائیکل سے باتیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤں بلیا سے ٹکائے یہودیوں کی جلاوطنی کی نفسیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا۔ دفعتاً اس نے نعرہ لگایا۔ روشن ۔۔۔ مگر روشن سوچ میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

"ہاں ڈون اسپنوزا" مائیکل نے کہا۔ دوسرے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے

بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی کیم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراخ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

روشن نے چمپا کو بڑے شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولادِ نظیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر ہی اسے بڑی دہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو بہ تلا کرتی اور کہنے والے کو صلواتیں سناتی کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود تھوڑا سا کم ہونے کے بعد وہ وہی خالص یو۔ پی۔ کی باعزت مڈل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولادِ نظیم کہلانا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن سے اسپنوزا کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ روشن حکومتِ پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی اور اسے طرح طرح کے وظائف ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔ قصہ مختصر وہ ان ہونہار طلبا میں سے تھی جو بیرونی ممالک میں وطنِ عزیز کے نام میں چار چاند لگاتے ہیں اور پبلسٹی کے رسالوں میں اکثر جن کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔

ایک چھٹی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چائے خانے کے باغ میں بیٹھی تھی۔ ایک اطالوی طالب علم اینجلو سیب کے نیچے گٹار بجا رہا تھا۔ قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم دراز بڑی اداسی سے سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔ اس روز اس نے اناؤنس کیا تھا کہ وہ ترکِ وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔ وہ گئی گھنٹے سے وطنیت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ "میں یہ پیارا، ہرا بھرا خوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگ زاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔" اس نے کہا۔ سرل اسے دیکھا کیا۔ "ہاں، مائیکل، تم ضرور ایسا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "یونیورسٹی کے کئی پروفیسر، سائنس داں، موسیقار اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنا رہے تھے۔"

"وطن میں بڑی طاقت ہے۔" ڈینس نے کہا۔ "ذرا شاعروں کی شاعری دیکھو۔"

"طاقت تباہ کن ہوتی ہے۔" سرل نے منہ اٹھا کر کہا۔ سامنے چائے خانے کے پھاٹک پر ایک کار آن کر رکی۔ گوتم نیلمبر، کمال اور طلعت اور چند اور لوگ اتر کر چائے خانے کی طرف بڑھے۔ انھوں نے اندر ٹھ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔

گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کن طاقت ہے کیونکہ اس کا وطن سب سے زبردست ہے۔ ہندوستان کی

——" اینجلو نے کہا۔

"جدید تصورات میں شاونزم خطرناک ترین تصور ہے۔" سرل نے مائیکل سے کہا۔ "تمہاری میمورنت، پاکستانیوں کا اسلام، ہندوستانیوں کی یکتا عیلی کی تجدید۔"

"گوتم شاونسٹ نہیں ہے۔" سریکھا بولی۔ "وہ صرف امن کا خواہاں ہے جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ ہم مذہب کی لائنز پر نہیں سوچتے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ، جن کے خیالات کی اہمیت ہے، پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد سے، اگر دیکھو، اس کی حالات کتنی سدھرتی جا رہی ہے—ہمارا—"

"تم تو انڈیا ہاؤس کے کسی پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو۔" سرل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

"اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق۔ یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔" گلشن نے کہا۔

"امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ آج کل ترکی میں قرآن شریف کے نسخے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔ جس طرح نپولین اور مسولینی اسلام کے بڑے زبردست خیر خواہ تھے۔" ڈینس نے کہا۔

"پاکستان کا اسلام—" مائیکل نے کہا۔

"تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو۔" روشن نے مائیکل سے کہا۔

"نفرت کی نفسیات سے" ڈینس نے کہنا شروع کیا۔ "آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔ جینز نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔"

"میں درندہ ہوں!" مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔ "میں صرف تیغہ جا کر سڑکیں کوٹنی چاہتا ہوں۔"

"تم سب کو کواکرز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گاندھی کا مطالعہ کرو۔" ڈینس نے کہا۔

"ذرا گوتم کو بلا کر پوچھو جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔" روشن نے جذبے سے کہا۔

"اور پاکستان اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔" سریکھا نے جواب دیا۔

"اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپیگنڈے کی مشینری رک جائے تو کتنا سکون ملے۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب کو تو صبح شام گوئبلز کی تصویر پر پھول چڑھانے چاہییں۔ تم گاندھی کی بات کرتے ہو، ہمارے عہد کا سب سے بڑا پیغمبر گوئبلز تھا۔ ڈاکٹر گوئبلز زندہ باد۔" گلشن نے کہا۔

"دراصل"، ڈینس نے بات شروع کی، "ہم سب غیر شعوری طور پر فاشسٹ ہیں۔ ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔ میں رومان پرستوں کی موت کی خواہش کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔"

"میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت اور حیرت ناک دنیا تباہ کر دیا جائے۔" چمپا نے دہشت کے ساتھ کہا۔

"ہم سب چھپے ہوئے فاشسٹ ہیں۔ ہم سب کے ہاتھ میں عجیب سی مشین گنیں ہیں جن کا رُخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔ خیالات کی مشین گنیں۔ صرف بوڑھی عورتیں امن چاہتی ہیں لیکن دنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔" اس نے چمپا کو دیکھا۔ وہ اسے ایک بوڑھی سنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

"مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا۔" مائیکل نے سر اٹھا کر کہا۔ "لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمہارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قندیلیں روشن کیں۔ میں زندہ ہوں۔ میں صرف —"

"سرگیس کو ختم کرنا چاہتے ہو —" ڈینس نے بات کاٹی۔ "ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔ تم اپنے وژن کے راستے پر چلو۔"

"دوسروں کے وژن میں مخل ہو کر اس کو برباد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے۔ دس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔" سل نے کہا۔ "میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔"

اینجلو نے گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ "مائیکل تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو۔ تم نے اپنے بمبار طیارے پر آ کر میرے خوبصورت شہروں کو برباد کیا تھا لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔"

"مائیکل"، سریکھا نے کہا، "تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو لہٰذا خود کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔ اب تم بڑے ذوق و شوق سے ایشیائی بننے جا رہے ہو کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔ حالانکہ تمہاری جڑیں دراصل ہیمپسٹیڈ میں ہیں۔ لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ روشن! مائیکل ایشیائی بننے جا رہا ہے، اسے خوش آمدید کہو۔"

"میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں مسلمان ہوں لہٰذا مجھے اسے قابلِ نفرت سمجھنا چاہیے۔ یہ سب بہت زبردست گھپلا ہے۔" اس نے میز پر اپنا سر ٹکا دیا اور پیالیوں کے نقش و نگار کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں سریکھا سے بھی نفرت کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہندو ہے۔"

"ہاں۔"

"لہٰذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔" مائیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا "ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا۔"

"میں نے نہیں نکالا، یہ خود نکل گئے۔" سریکھا نے احتجاج کیا۔

مائیکل سنی ان سنی کر کے کہتا رہا: "تمہاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ بنا لیا تو ہم کیوں قابلِ گردن زدنی ہو گئے؟"

"تم — تم نے عربوں کو اُن کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔"

"تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔"

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں تتریاں اڑ رہی تھیں۔ سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔ اینجلو نے پھر گٹار بجانا شروع کر دیا۔

(۷۱)

گوتم نیلمبر اور اس کے ساتھی کار سے اتر کر چائے خانے کے اندر چلے گئے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر انھوں نے لسنر کی ورق گردانی کی اور چائے منگوائی اور گوتم نے چند خطوط ویٹرس کو پوسٹ کرنے کے لیے دیے۔ وہ لندن سے آ رہے تھے اور ہرٹ فورڈ شائر جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ بل تھا اور خوبصورت برنارڈ جو اسکول آف اکنامکس میں استاد تھا اور شانتا، طلعت اور ہرنگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاقی مسئلہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ کمال نے دریچے سے باہر جھانکا جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلان پر ندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور پریم روز کے بنوں میں سے ایک سفید لانچ نظر آ رہا تھا جس پر اس کا نام "کلارا جین" لکھا تھا۔ امن۔ امن۔ کمال نے دہرایا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

"باہر چچا باجی اور سرل وغیرہ بیٹھے ہیں"۔ طلعت نے دریچے میں آ کر کہا۔

"نرملا کے لیے میں اینگس ولسن کی کتاب لانا بھول گیا"۔ بل نے کہا۔ شانتا پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نرملا کو دیکھنے جا رہے تھے۔

اسے اب سینی ٹوریم میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک پھیپھڑے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کے معالج سر رونلڈ گرے کا خیال تھا کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پر صحتیاب ہو جائے۔ ہفتے کے روز اس کے دوست لندن

سے اسے دیکھنے کے لیے آتے۔ گوتم بھی برابر، جب اُسے فرصت ملتی، کمال اور طلعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے جاتا اور پابندی سے اسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقعے پر مہری ننگو بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملا کا خیال کرتا۔ اکثر جب کمال ہفتے کے روز مڈہرسٹ نہ پہنچ سکتا تو گوتم کو تار دے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملا چمپا کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر گنجلک، اتنی مصروف، اتنی بے ربط اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شناساؤں اور جاننے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا اسے لے بریٹی تھا۔ کامیاب اور ہر دلعزیز ——— متوازن اور سلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ”۱۹۴۷ء میں ہم نے کیا کیا۔ ہم بیمار لوگ تھے۔ اب ہم اپنے ذہنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تندرست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحانیت اور گیتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گیتا بہت پسند ہے لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے۔ اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔“ وہ کہتا۔

ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا ”گوتم تمھاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا مینن بنتے جا رہے ہو۔“

”مجھے خطرہ ہے کہ گوتم لیڈر بن جائے گا۔“ سرل کہتا۔

”گوتم لیڈر نہیں بنے گا بہت بڑا اسٹیٹسمین بنے گا۔ وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔“ کمال فخر سے کہتا۔

۱۹۴۷ء نے ذہنوں کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور کمال بدلے ہوئے عالمگیر حالات بین الاقوامی سیاسی جرائم اور ریاکاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دورِ جدید سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاونسٹ اور مہاسبھائی نظریات کے لوگ اس سے خفا تھے۔ کمال کی قوم پرستی اور صاف گوئی نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اس کے بیشتر مسلمان دوست اور رشتے دار پاکستان جا چکے تھے مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلبا اسے انڈیا ہاؤس کے گوتم نیلمبر کا اسٹوج کہتے۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں۔

نرملا کی بیماری نے، جو اسے طلعت کی طرح عزیز تھی، زندگی کے متعلق کمال کا سارا رویہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ باریک حدِ فاصل قائم ہے۔ زندگی ایسی شے نہیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابلِ قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں، دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کلنٹے چبھے ہیں۔ ہاں، دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے!

نرملا کی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ نجی جہنم، جو انسان کی روح ہے، اس میں کیسی کیسی دنیائیں آباد تھیں، ان میں کون لوگ بستے ہیں، آفاق کے اس کونے میں، جہاں پر "گوتم نیلمبر" کا بورڈ لگا ہے، کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں، اس گھر میں (جس طرح کا گھر ہر نوجوان کے دل میں ہوتا ہے) کون لڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نوجوان جو صرف ایک بار اس گھر کے دروازے وا کر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندور لگاتا ہے۔ مگر اس نوجوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں دراصل کون ہے، شاید اس کو بھی معلوم نہیں، یا شاید معلوم ہو۔ دوسرے جاننے والے کون!

اور اس بال سے زیادہ باریک پل پر، جسے زندگی کہتے ہیں، نرملا کھڑی تھی۔ زندگی سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ دل جو بہت عظیم شے ہے اس سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔

گوپی کا دل — جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

"چمپا باجی باغ میں بیٹھی ہیں" طلعت نے دریچے میں جا کر دہرایا۔ "چلو ان سے ملتے چلیں۔ عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

گوتم نے گھڑی دیکھی۔ "نہیں۔ اب سیدھے مڈ ہرسٹ چلو۔ ورنہ ہمیں واپسی پر دیر ہو جائے گی۔"

وہ سب چار خانے کی لاؤنج سے نکل کر کار میں جا بیٹھے اور مڈ ہرسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۷۲)

چمپا نے دیکھا کہ کارتن سے چار خانے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ انجلو درخت کے نیچے بیٹھا گٹار بجایا کیا۔ روشن، مائیکل، ڈینس، سریکھا اور گلشن میز سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کرسی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"وہ تمہارے دوست لوگ جا رہے تھے، کار میں۔"

"ہاں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ تم کراؤڈ سے خود کو نمائش بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراؤڈ کی چاہت بھی بہت ہے۔ ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لیے کہ تمہارا اور ان کا ماضی مشترکہ رہا ہے۔ تم عجیب مجموعۂ تضاد—" سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت اُداس ہوتا ہوں۔"

"اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو،" چمپا نے کہا۔

"یہ بھی تمہارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو— بزدل— تمہیں اپنی بزدلی اور کمزوریوں کا علم ہے؟" وہ کرسی سے اتر کر درخت کے تنے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ "اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاسد ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں دیکھنا چاہتیں۔" وہ کہتا رہا۔ "مثال کے طور پر— تمہیں روشن پسند نہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز ہے۔ تم لکھنؤ میں مشہور رہی ہوگی مگر وہ ۱۹۴۲ء تھا اور تم بھولتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا۔ وقت کا سب سے بڑا کمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لیے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم خفیلا عرجی کبھی نہ بنو۔"

"شنیلا مکرجی؟"

"ہاں - میں تم کو ایک انسٹی ٹیوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا - چمپا احمد، جو آج سے دس سال بعد چیلسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور فن پرستوں کی سرپرست اور گرو ہو گی - خداوندا - یہ بڑا دہشت ناک خیال ہے۔"

"میں اس قدر قابلِ رحم ہوں؟"

"نہیں - ہم سب قابلِ رحم ہیں - تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو - تم نیکدل ہو - یہ بہت بڑی چیز ہے --- اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی اہلیت بھی ہے -- ہے نا؟"

"ہاں شاید"

وہ خاموش ہو گیا - ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی - وہ اٹھ کر چائے خانے کے لاؤنج میں آ گئے - روشن اور مائیکل اور ان کے ساتھی دور لانچ پر بیٹھے نظر آ رہے تھے - لاؤنج کے ایک صوفے پر چند ردی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا -

"تم دوستی کر سکتی ہو -" سرل کہتا رہا - "ورنہ باقی تم سارے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہو --- اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرح -" اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اٹھایا جس پر گوتم کا پتا لکھا ہوا تھا - اس نے لفافے کو توڑ موڑ کر آتشدان میں پھینک دیا -

"سرل، میں اتنی تیز روشنی میں ہوں، جتنی تم نے ابھی ظاہر کی؟"

"ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں -" اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا - اس پر بھی گوتم کا نام چھپا تھا -

"تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہو نا؟" اس نے رسالہ چمپا کی طرف پھینک دیا -

ایک وقت تھا خود گوتم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے -

"لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں؟" اس نے دوبارہ کہا -

"پتا نہیں - مجھے اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے -"

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو -"

وہ ایک اونچی چوٹی پر کھڑی تھی اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی - میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا - اب بہت دیر ہو چکی ہے - اب کیا ہو سکتا ہے - سارا زمانہ نکل چکا --- سارا زمانہ ---

باہر بارش میں چند اور موٹریں آ کر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیئرین اداکار لاؤنج میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تہوار کے لیے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایکٹر سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتشدان کے قریب جا بیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

(۷۳)

ڈہرسٹ کا عظیم الشان اور پرفضا سینی ٹوریم سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا، سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے بشاش اور خوبصورت ماحول میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف، طویل گیلریاں۔ حسین ڈرائنگ روم۔ جھلملاتا ہوا آڈی ٹوریم جہاں مشہور تھیٹر کمپنیاں آ کر مریضوں کے لیے تمثیلیں اسٹیج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وقفے کے لیے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارات کے ایک ونگ میں سرے پر نرملا کا کمرہ تھا جس کے تین طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ ہمارے آئی ٹی والے نشاط محل ہوسٹل کے کسی کمرے کا ایسا ہے نا۔ نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سوئیٹزرلینڈ نینی تال تھا۔ لیک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبئی کی جھلک تھی۔) ماضی محفوظ تھا کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی، کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔

نرملا تکیوں کے سہارے نیم دراز خوشی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ "اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔"

"اچھا۔" طلعت اچک کر دریچے میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شانتا، کمال اور بل کے ساتھ، نرملا کے پلنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوتم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا ہربرٹ رڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

"گوتم جی"، نرملا نے اسے مخاطب کیا، "اب ہندی سماچار ہو جائیں۔" وہ اٹھ کر اس کے ساتھ دریچے میں جا بیٹھا۔

"مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟" نرملا نے طلعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بڑے زوروں میں۔" طلعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہر سال

نرملا مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

"بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔" کمال نے کہا۔ "اگلے سال انشاء اللہ تم پھر میلے کی لیڈری کر رہی ہوگی۔"

"انشاء اللہ۔" نرملا نے مسکرا کر کہا۔

"کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔" گوتم بولا۔ "کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔"

"وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لیے آچکے ہیں بے چارے۔" نرملا نے کہا۔ "ان کی لڑکیوں کی صورتِ حال کیسی چل رہی ہے۔"

"ٹھیک چل رہی ہے۔ روشن آرا سے۔" طلعت نے کہا۔

"پھر اسکینڈل شروع ہوئے۔" کمال نے ڈانٹا۔

"نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر ٹوئن بی کا ذکر کرنے والی تھی۔" طلعت نے ذرا سہم کر کہا۔

"تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔" گوتم نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"یہ اچھا ریکیٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادری انٹلکچولز کو اپنی محفلوں میں بلا بلا کر وہی بڑے ہلاتی ہو اور اس طرح ہندوستان کے لیے ان کی موافقت حاصل کرتی ہو۔ وہی بڑا ڈپلومیسی۔" ہل نے ہنس کر کہا۔

"وہی بڑا اور جیرت ناٹیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے ہیں۔" گوتم نے کہا۔

"اب رام گوپال کے مقابلے میں انھوں نے بلبل چودھری کو کھڑا کیا ہے۔" برنارڈ بولا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور بلبل اس میں کشتی لڑنے کے لیے اتر رہے ہیں۔" طلعت نے اداسی سے کہا۔

"تمہاری یہ تشبیہہ،" گوتم نے کہا۔ "بالکل صحیح ہے۔ سب سے بڑی ٹریجڈی وہ ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے۔"

"ہم نے میلے میں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔" طلعت نے منہ لٹکا کر کہا۔

"یہ بکے ہوئے اور خریدے ہوئے انٹلکچولز کا دور ہے۔" گوتم نے کہا۔ "اس عہد میں آرٹسٹ کی

بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دنیا میں آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو ایشیا کے فن کار لوگ کس طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے وظیفوں پر دھڑا دھڑ امریکہ چلے جا رہے ہیں۔"

"ایشیا کے فن کار لوگ تو دھڑا دھڑ سوویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں۔" بل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانبدار تھا۔

باہر دیودار کے جنگل پر شفق کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"اب چلیں۔" گوتم نے کہا۔ "لندن واپس پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔"

"تم سب جا رہے ہو۔" نرملا نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"تم اکیلی نہیں ہو نرمل۔" کمال نے اس کے پلنگ پر جھک کر کہا۔ "ہم سب ہر سمے تمھارے ساتھ ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اگلے ہفتے تک کے لیے خدا حافظ نرملا۔" طلعت نے اس سے کہا۔

"نرمل، شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لیے دلّی سے آ رہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔" گوتم نے نرمی سے کہا۔

"ہاں گوتم، تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔" نرملا نے رسان سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کر کے باہر آ گئے۔ زرد رنگ کے روشن دریچے میں سے نرملا ان کو دیوداروں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔

(۴۷)

طلعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شانتا اور بل رہتے تھے۔ آس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سے سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر بسیں گزرتی رہتیں۔ چوراہے کی گرو سر اور تمباکو فروش کی دکانوں میں خریداروں اور دکانداروں کے درمیان پنی تلی گفتگو جاری رہتی۔

آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطالوی ریسٹوران تھا۔ اس میں ایک داڑھی والا پولش یہودی آرٹسٹ اپنے کونے میں بیٹھا اسکیچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتا کہ کوئی اس سے اس کے اسکیچ خرید لے گا۔ کوئی اس سے اس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی ذہنی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں، طلاقوں، نفسیاتی الجھنوں، کشمکشوں اور سیاہ قہوے پر یہ لوگ اپنی زندگیاں چلاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرٹی انداز میں سجے تھے۔ لڑکیاں بالوں کی پونی ٹیل بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی تنگ موری والی پتلونیں پہنتی تھیں، اپنے والدین سے نفرت کرتی تھیں اور اپنی سائیکو انالسس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب "ہوموٗ" تھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند فنکاروں کا محلہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطیم، رومن کیتھولک چرچ اور گپتا عہد کے آرٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ برطانیہ کی ذہنی ارسٹوکریسی تھی۔

چند فرلانگ پر سریکھا کا مکان تھا۔ اس کا شوہر گلشن آہوجہ اسکول آف اکنامکس میں تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شرنارتھی تھے اور دلی سے یہاں تعلیم کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سریکھا رقاصہ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کر چکی تھی اور رائل اکیڈیمی آف آرٹ میں کریوگرفی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ آشا سنگتراش تھی۔ ستیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روز ان کے یہاں ہندی کے حلقۂ اربابِ ذوق کا اجتماع ہوتا۔ جیلسی کی ایک عالیشان موڈرن بلاک میں کملا کا الٹرا ماڈرن فلیٹ تھا۔ کملا، طلعت اور نرملا کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی ذہین اور بڑی زبردست انٹلکچول۔ بے حد خوش شکل لڑکی تھی۔ کلاسیکل رقص کی ماہر۔ وہ فارن سروس میں تھی۔ نرگیش بمبئی کے کسی کروڑپتی کی لڑکی تھی۔ کیمبرج کی تعلیم یافتہ۔ دوسری پارسی لڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی۔ وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملا کی بڑی بہن شکنتلا کا مکان نائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انٹلکچول تھی اور بے حد دلکش اور پیاری لڑکی تھی۔ اس کے شوہر انڈیا ہاؤس میں پبلک ریلیشنز آفیسر تھے۔ فیروز جبیں یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور راوسٹرلی میں اپنی والدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑی مصروف زندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل میں جٹے تھے۔ صرف نرملا سریواستو اس ہنگامے سے الگ مڈہرسٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خیال کر کے طلعت کا دل ڈوب جاتا۔ اس کو مسرت اب کس طرح حاصل ہوگی؟ نرملا، جس کو اور سب کی طرح زندگی سے

بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خوشی بے حد عظیم چیز ہے لیکن بے حد اضافی۔

طلعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔ سریکھا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ "آنکور" ہوتا یا گوتم کی کتاب کا نیا ایڈیشن نکلتا یا کملا کی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طلعت کی عید ہو جاتی۔ وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔ وہ چمپا کا خیال کر کے بھی کافی ملول ہوتی۔ اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست ناول لکھنے کا وقتاً فوقتاً اعلان کرتی رہتی مگر کاہلی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو پاتا۔ دن بھر اور اکثر راتیں گئے اخبار کی رپورٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوپنا پڑتا اور اس میں طرح طرح کے ایڈونچر ہوتے۔ اسے عموماً سے لے بریٹیز کے انٹرویو کے لیے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنا رکھی تھیں۔ ایک ایشین فلم سوسائٹی قائم کی گئی تھی جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔ انڈیا کلب میں نیٹو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔ فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسٹنشن تھا۔ یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔ بی بی سی والوں کی ساری زندگی باتیں کرتے گزرتی تھی بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنٹین میں بحثیں کرتے بتا دیتے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا۔ آلِ حسن اور اس کی بی بی کرشنا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سنٹر تھا۔ کرشنا قانون پڑھ رہی تھی۔ آلِ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ ترونا اور فیروز کے مکانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کا جمگھٹ رہتا۔ اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔ یہی لوگ لندن مجلس کے روح و رواں تھے۔

طلعت مڈہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پر پہنچی اسی وقت اودجیت کا فون آیا: "ہلو، سنو" وہ دہاڑ رہا تھا۔ "دیکھو، یہ ٹیگور ٹیگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ایوننگ ہونا ضروری ہے۔" (اودجیت خود بنگالی تھا۔ اسے ایک لفظ اردو کا نہ آتا تھا۔ پراگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔) طلعت نے رئیف رسل کو فون کیا۔ یہ علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے۔ "اقبال سنگھ سے کہہ دیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔ "ہاں۔" طلعت نے جواب دیا۔ "اور اودجیت نے تو انگریزوں کے جگر مرادآبادی کو بھی بلایا ہے۔"

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گو شاعر تھے۔ جگر مرادآبادی ان پر کچھ اب چپک گیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے افلاس میں ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہرسلیں شروع ہوئیں۔ ڈھاکے کا عطاء الرحمٰن، اقبال کے کلام کے لیے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہوگیا۔ فیروزا سکرپٹ تیار کرنے میں جٹ گئی۔ ترونا، شیلا، پربودوا، او جیت اور سارے بنگالی اور کشمیری اور گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں نے گانے کے لیے صحیح تلفظ کی پریکٹس شروع کی۔

طلعت اور رمیش سنگوی مڈل ٹمپل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔

اقبال ایوننگ منعقد ہوچکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

(۷۵)

لندن مجلس کا سالانہ میلہ شروع ہوا۔ ہال کے اوپر کے زینے پر آکر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ لڑکیوں نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں دہی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ "ہاکرز" اپنے اخبار بیچ رہے ہیں۔ کمیونسٹ اپنا لٹریچر فروخت کرنے کے لیے آواز لگا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں کا ایک گروہ اپنے پمفلٹ لیے کھڑا ہے۔

بل ایک ستون سے ٹکا چپ چاپ کھڑا تھا۔ "ہلو روشن۔" اس نے کہا۔

وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اسٹال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔

دفعتاً خاموشی چھائی اور وہ سب گلتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پربودوا حسب معمول آرکسٹرا کنڈکٹ کر رہے تھے۔

لالئی سال پچھے پیار بھرے ناداں —

"کشمیر؟" ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔

"کشمیر — یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔" روشن نے کہا۔

"یہ لوگ جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ مقبوضہ یا آزاد؟" تماشائی نے سوال کیا۔

پوشن مالہ کرنا واں چھس

شالیمار گوشن چھس دور راواں ——

"دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے۔" گلشن نے کہا۔

بل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔

روشہ روشہ یراں وچھ پوشن کارواں

پوشن مالہ کر ——

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

"یہ اتنے جوش و خروش سے گا رہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟" ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

"یہ؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔" طلعت نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نویس خفا بیٹھا تھا۔

"تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو؟" ایک برطانوی ادیب نے آہستہ سے کہا۔ اب تک وہ بڑی اداسی سے اس منظر کو دیکھتا رہا تھا۔

"ہم لوگ بے حد بدقسمت ہیں اس لیے۔" طلعت نے طول آواز میں جواب دیا اور پھر کسی کام سے اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔

اب ڈھولک بج رہی تھی

"پنجاب؟" ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

"ہاں۔ پنجاب بھی دو ہیں۔" قریب بیٹھے ہوئے سریکھا کے میاں گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ "اور سوال کرو، میں تمھاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔"

—— دھرتی چی آمی ہی لے کر بھاگواں —— دھرتی

شینا ور جادویا۔ سنگاتی گادویا —— رانو پاکھر ——

یہ مرہٹی گیت تھا۔

پھر گجراتی کورس شروع ہوا:

ہمے کھیتر تی واڑی وتی ۔ جنگل تی جھاڑی وتی
ساگر بھی گردر تھی
سونی ساد آدیا ۔۔۔ او ہمیں سُونی ساد آدیا
فلیٹ اسٹریٹ کے نمائندے اسٹیج کے قریب فٹ لائٹس کے اندھیرے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگمگاتے منظر کو دیکھا کیے۔
اسٹیج پر وہ گا رہے تھے ۔
ہمیں جُگ جُگ کیرا کنگال
بھانگی نرکو نہ دوار
دتیا ڈگ ایک تال
دھرتی پر آویا ۔۔۔ او ہمیں دھرتی پر آویا ۔۔۔
دیکھ دیکھ اور سے اندھ
کارسین آدیا
کارسین آدیا ۔۔۔
پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا بنا کر کھڑے ہوئے اور انھوں نے انٹرنیشنل شروع کیا۔
ہر جگہ جوانیاں ہیں گا رہی
ہنسی خوشی منا رہی
اور رلا رہی دشو منتر تا ۔۔۔
دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہان لیے
خطرہ ہو بلیدان کا ۔ پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین
سُکھ چین ۔۔۔ سکھ چین ۔۔۔

ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں ۔ روشن باہر آگئی ۔ یہ سب کیا بکواس ہے ۔ ہجوم میں سے نکل کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے سوچا ۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے جوش سا پیدا ہوتا ہے ۔ یہ لوگ اس قدر ہلڑ کیوں مچا رہے ہیں کیونکہ سب فنا ہے اور انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے ۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے ۔

"مس کاظمی" کسی نے پیچھے سے آواز دی ۔ وہ ٹھٹھک گئی ۔ یہ تروناتھی ۔ پھر لڑکیوں کے ایک

ریلے نے اسے آلیا جس سے بچ کر وہ ابھی باہر نکلی تھی۔

"روشن،" فیروز نے کہا، "ووٹ نذرِل دا کے گئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ رہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے ہم ان کے لیے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لیے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں، تیار رہنا۔"

طلعت اس کے نزدیک آئی۔ "یہ کنجی لیتی جاؤ۔ میں شاید دیر سے آؤں۔ یا شاید سر یکھا کے یہاں رہ جاؤں۔ صبح کو ضرور چلنا ساتھ۔ گڈ نائٹ۔"

وہ سب دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ وہ حسبِ معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ مصروفیت۔ تکمیلِ مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا کیا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لیے طلعت کے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ ہیڈ اویل کے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ اوپر آ رہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضا مل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آ رہے تھے۔

"تم کہاں تھیں؟ میں تمہارے سارے ٹھکانوں پر تمھیں ڈھونڈ آیا۔"

"میلے میں۔"

"میلہ؟ اوہ۔ ہاں۔ میلہ۔ ٹھیک ہے۔ آؤ۔"

وہ نکڑ کے اطالوی ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہودی آرٹسٹ انھیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا۔

"روشن،" عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا، "تم بڑی غلطی کر رہی ہو۔ تمہارے ابا کو تمھاری رپورٹ پہنچ جائے گی۔"

"اوہ۔" وہ ہنس پڑی۔ "لیکن عامر ان لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات یا ان کی نوعیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تمہارا نظریہ ہے"، عامر نے کہا، "لیکن زیادہ پریکٹیکل بنو اور اپنے نفع نقصان کو دھیان میں رکھو۔ تمہاری سرگرمیوں سے تمہارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔"

"اور شاید میری اور تمہاری دوستی پر بھی۔" روشن نے متحمل میں کہا۔ "لیکن عامر — میری کیا سرگرمیاں ہیں؟" اس نے چڑ کر کہا۔ اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا۔ پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان، جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کر رہی تھی، ایک مختلف ہستی تھا؛ ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا؛ اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر وہ تیار ہو گئی کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے

گی مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے۔ فلسفے یہاں بیکار تھے۔ مرد بہر حالت عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے۔ یہ کامریڈ وامریڈ سب غلط بات ہے۔ اور یہ عامر رضا بہر حال کامریڈ نہیں تھا۔ اب یک لخت اس کی سمجھ میں آگیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ نبھ سکی۔ چمپا، اپنے خیالات میں، خواہ وہ کتنے ہی گنبلک کیوں نہ رہے ہوں، خود مختار رہنا چاہتی تھی۔ لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خود مختار نہ تھی۔ کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مصروف ہے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ باہر ریسٹوران کے دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک ہنگرین سازندے نے وائلن پر "ہسپانوی باغ میں ایک رات" بجانا شروع کر دیا تھا۔

"اسپین چلو گی؟" عامر نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"جرمنی؟"

ہاں۔ جہاں کہو گے، چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفے اور آزادیِ افکار لغویات ہے۔ اگر اس وقت طلعت یا کملا کو اس کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو وہ فوراً اسے پھانسی پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کر وہ اداسی سے مسکرائی۔

عامر رضا نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کرکے طلعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔

"آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔" اجنبی نے کہا۔

"جی؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"یہ غلط ہے؟"

"بالکل۔ وہ لوگ کمیونسٹ قطعی نہیں ہیں۔"

"آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ..."

"مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"جی!"

"آپ کا مطلب ہے"، وہ وہیں مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی، "کہ میں انسانی رشتوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔"

"انسانی رشتے؟" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیا چیز ہے؟ رشتے صرف سیاسی ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے کس چڑیا کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو معاف فرمائیے گا مس کاظمی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسفوں اور آئیڈیلز نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفے اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی دنیا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں نہ پڑھا؟"

روشن غصے سے تلملا رہی تھی لیکن ہنس پڑی۔

"تشریف رکھیے" اس نے دوسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔" اجنبی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی قابلیت کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ ـــــ"

"کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی؟ میں آپ سے عرض کروں مسٹر ـــــ"

"ـــــ خان ـــــ"

"مسٹر خان کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں؟"

"نہیں، ہیں؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟"

یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا تھا۔ وہ، فلسفے اور خیالات کی طالب علم، اس بے بسی پر بے حد تلملائی۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو۔ اس رات پلنگ پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔ (اسے آئندہ سال ہارورڈ جانے کے لیے فل برائٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عدالتیں۔ سزائیں۔ جیل۔ بندوق۔ گولہ بارود۔ نعرے۔ رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

"آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے وہ آسمان سے تو نہیں اترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح ہی کے انسان ہوتے ہیں۔" ناشتہ تیار کرتے ہوئے اس نے طلعت سے کہا۔

طلعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔" روشن نے جھنجلا کر کہا۔

"بالکل نہیں۔" طلعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سوال یہ ہے" ، روشن انڈے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی، "کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے اور سیکیورٹی۔ اور دوسری طرف محض دھندلکا ہے، اور دھندلکے میں خواب نظر آتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایک طرف سیکیورٹی ہے، دوسری طرف سیکیورٹی ایکٹ۔ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔" طلعت نے کہا۔

سرلیکھا نے جلدی جلدی چائے پینے کے بعد گھنگرو باندھ لیے۔ وہ سب نذرالاسلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لیے صبح صبح طلعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔

"روشن،" گوتم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا، "تمھارا پرابلم کیا ہے؟" وہ حسبِ معمول پیغمبرانہ شان سے آکر دیوان پر بیٹھ گیا۔

"ذہنی کشمکش۔" طلعت نے مختصراً جواب دیا اور توس سینکنے میں مصروف رہی۔

"تو کیا ہوا؟ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں ریوولیوشن آئے گا۔ اس میں تمھاری بڑی ضرورت ہوگی۔" گوتم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ روشن کو ہنسی آگئی۔

"لیکن میں ریوولیوشن نہیں چاہتی۔" اس نے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں۔" گوتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جب ریوولیوشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔"

"اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔" طلعت نے کہا۔ "پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو چکی ہے۔ اسی طرح تم نے چمپا باجی کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے۔ اور دیکھو ان کا کیا ہوا؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ نہیں ہوتا۔ معلق رہتے ہیں، کہیں نہیں پہنچ پاتے، بہتے رہتے ہیں۔" گوتم نے آہستہ آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طلعت نے سوچا۔

"لیکن روشن تم اپنے سفارت خانے جا کر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں۔" گوتم، روشن کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمیر پرستی پر اب تک بہت ناز رہا ہے۔ مجھے تم لوگوں

سے بہت بڑا مطلب ہے۔ تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں دوستی کا مطلب سمجھتی ہوں۔ اس کی قدر و قیمت۔"

"مطالب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دکھی ہو گی۔" گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طلعت نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے، اس نے دل میں دہرایا۔

"اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔" اس نے گوتم کا دھیان بٹانے کے لیے شگفتگی سے بات شروع کی۔ "ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔ اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔" اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ "اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں۔ نہ کل نہ آج۔"

"بھیا صاحب نے بھی تو مضامین لکھے تھے۔" فیروز نے سوچ کر کہا۔

"مگر اب تو وہ بہ بانگِ دہل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔" طلعت نے جواب دیا۔

"بھیا صاحب کو لٹریچر میں بھی دخل تھا؟" گوتم نے پوچھا۔

"جی ہاں، ایامِ جہالت میں۔ اب انھیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لیے جاتے۔" طلعت نے کہا۔

"یہ ایامِ جہالت کب تھے؟" گوتم نے سوال کیا۔

"۳۹ء وغیرہ میں۔" طلعت نے جواب دیا۔ "ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں لکھنؤ کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپا کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نظمیں لکھتے تھے۔"

"چمپا باجی اتنی پرانی ہیں؟" روشن نے چونک کر پوچھا۔

"معلوم نہیں، ہوتیں۔" تردنا نے کہا۔

"سدا بہار ہیں۔" فیروز نے جواب دیا۔

"دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔" گوتم نے آہستہ سے کہا۔ "بہت سے لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔"

"تم بھی اعلان کر دو جی"، طلعت نے پھر جلدی سے گفتگو کا رخ اصل موضوع کی طرف موڑا، "کہ مجھے ان موئے سرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔"

"تم کہہ دو کہ تم سرخا سرخ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں، نہ ہو، نہ ہو گی۔" فیروز نے کہا۔

دروازہ کھلا اور مولانظر مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔
"دستِ صبا لائے؟" کورس ہوا۔
"جی ہاں۔" انھوں نے کہا۔
سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور "دستِ صبا" عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی۔
"سمجھیں تم؟" گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ "بس تم جا کر کہہ دو، آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کر لو گی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے۔"
"تم اسٹیون اسپینڈر کی طرح..." طلعت نے کہنا شروع کیا۔
"یہ بات بے بات انگریزی ادیبوں کا ذکر کیے بغیر تمھارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" فیروز بولی۔
"کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔" طلعت نے کہا اور بات جاری رکھی۔ "تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوب بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف بچ گئیں۔"
"تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔" فیروز نے لقمہ دیا۔
"وغیرہ وغیرہ۔" سریکھا نے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تلانا کی پریکٹس کر رہی تھی۔
"کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ۔" تروتا نے پیانو پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "روشن تم جرمنی جا رہی ہو کل؟"
"ہاں۔"
"تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یوتھ فیسٹول کے لیے کل جا رہے ہیں مشرقی برلن۔"
"مشرقی برلن میں کیسے جا سکتی ہوں؟" روشن نے کہا۔
"کیوں؟ تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ جا سکتے ہیں، تم نہیں جا سکتیں۔"
"کمال ہے بھئی۔" فیروز نے سر ہلا کر کہا۔ "ساری رامائن ہو گئی، آپ پوچھتی ہیں سیتا کون تھی؟ ارے یہی تو قصہ ہو رہا ہے۔"
"بکواس۔" سریکھا نے کہا۔ "چلو روشن، یہ ایسا تجربہ ہے جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔"
"نہیں۔"

"ارے، کیا رکھا ہے؟ واپس آکر سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔ سب یہی کرتے ہیں۔" طلعت نے کہا۔

"یہاں اتنی بے ایمانی ہے، اتنی ضمیر فروشی ہے، روشن بیگم جس کا تم کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔" گوتم نے کہا۔ "آج کی دنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں۔"

وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

"ہم تم سے برلین میں ملیں گے۔"

"مغربی برلین میں۔" روشن نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ہم تم سے مشرقی برلین میں ملیں گے۔"

"یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ ملک، انسان، نظریے، روحیں، ایمان، ضمیر — ہر شے تلواروں سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔ اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں۔ روشن،" گوتم نے کہا، "ہم تم سے مشرقی اور مغربی برلین کی سرحد پر ملیں گے۔"

"اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔" طلعت نے ہنس کر کہا۔

(۷۶)

بارش ختم ہونے پر چمپا اور سرل دیساتی چائے خانے سے باہر نکلے۔ لانچ پر بیٹھ کر وہ سب کیمبرج واپس پہنچ گئے۔ راستے میں ندی ہرے ہرے کنجوں میں سے گزری جہاں گھنی شاخوں نے پانی پر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ ٹرم کا آخری دن تھا۔ کل سے چھٹیاں شروع تھیں۔ چمپا نے سرل پر نظر ڈالی۔ ہر چیز کہی جا چکی تھی۔ اب کہنے کو کیا باقی تھا؟ ہر شے میں گھسا پٹا پن آ گیا تھا، سرل ایشلے میں بھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور وہ اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھی۔ کتنے رنج کی بات تھی۔ اب وہ کن جنگلوں میں جا کر چھپے گی۔ اب بن اپ بن ہیں۔ چنچل مورے من میں۔ کنج کنج پھرے شام۔ وہ ریلنگ پر جھک کر ایک بہت پرانا گیت گنگناتی رہی۔ سرل کھانے ندی کی سطح کو دیکھا جو بہت پُرسکون تھی۔ کنارے پر پہنچ کر وہ لندن کی طرف روانہ ہو گئی۔

اسے واپس پہنچ کر مجلس میلے کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے بعد وہ برلین جا رہی تھی۔ وہاں سے لوٹ کر اسے ٹی وی پر ناچنا تھا۔ پھر وہ رام گوپال کے ساتھ سارے یورپ کا دورہ کرنے والی تھی۔ "گریٹ ریکھا دیوی ——— انڈیا زاینا یا ولووا۔" سرل نے تمسخر سے کہا۔ "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" ریکھا نے اپنے خلیق تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ وہ لوگ اسے رخصت کرنے کے بعد لکڑی کے بوٹ ہاؤس کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ سرل کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ چمپا کو اس قدر مانوس معلوم ہوا گویا اس کا شوہر تھا۔ اسے ایک پھریری سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شوہر تھا۔ اس لڑکی کو چمپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشتیاں کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوشبوئیں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیر رہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گایوں نے آ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پرم روز کی بیلوں کے کنارے کنارے بنسیاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

"چمپا —" سرل نے ایک الٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا۔ "مجھے کچھ اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔" اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بے حد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کون سی تھی۔ دنیائیں برابر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انتہا مانوس نظر آئی۔ روز مارّی اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ یکلخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چمپا احمد سے ایک غیر مرئی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

"کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے؟" چمپا نے پوچھا۔

"نہیں۔ اور کون لکھنے والا تھا؟"

"بل ——— ولیم کریگ۔"

"نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔"

"کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟"

"تم عجوبۂ روزگار نہیں ہو تمہاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین، حساس اور دلکش۔"

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے — چمپا نے دل میں کہا۔ اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلہ۔ گھر۔ آنگن میں کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ بابا پیچوان پی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے ہیں۔ سرل کو یہ منظر دکھانا اسے اچھا نہ لگا۔ وہ اسے پھلانگ کر آگے

بڑھ گئی۔ لکھنؤ۔ آئی ٹی کالج۔ کیلاش۔ گلفشاں ۔ لیکن گلفشاں اس کا گھر نہ تھا (ہو سکتا تھا)۔

"یہ دیکھو کون آرہا ہے تمھارے پس منظر سے نکل کر۔" سرل نے کہا۔

چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور دور تک بکھرے ہوئے تعطیل مناتے والوں کے مجمعے سے نکل کر کمال بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

"ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔" اس نے قریب آکر کہا۔

"ہلو۔"

"کل صبح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔"

"ہاں۔"

"مگر ہم لوگ ذرا ۔ جلدی میں تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔"

وہ بھی ایک الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گیا۔

"میں سرل کو لکھنؤ کے متعلق بتا رہی تھی۔" چمپا نے کہا۔

"واقعی۔" کمال نے اخلاقاً دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہیں، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کمال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے کمال کے لہجے کے رنج کا اندازہ لگا لیا۔ تم مجھے کبھی نہیں سمجھ سکو گے کمال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پرستش کا الزام لگایا ہے لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گاڑی ۔ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں ۔ لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر میں بہت زیادہ عقل مند ہوتی تو تمھارا فلسفہ پڑھتی اور مطمئن ہو جاتی۔

او جیت ندی میں سے نکل کر آیا اور کمال کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"سرل کاش تم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جو رنگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھے ہوتے۔ یا رام نگر کی وہ گرد آلود سڑک جس پر گرمیوں کی بھری دوپہر کے سناٹے میں ایک بھونڈا سا اداس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تنہا بیٹھا سوائیوں کا پہاڑہ یاد کر رہا تھا ۔ نہیں سرل ۔ میں تم کو ایسا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔"

"میں تم کو بتاؤں گا۔" کمال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا۔ وہ فوراً اس دنیا میں داخل ہو گیا جو

یہاں سے بہت دور تھی، جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو کمال سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

"تو سنو، گیان وتی کندھوں پر بال چھٹکا کر ایمن کا خیال گاتی تھی ـــ آلِ نبیؐ اولادِ علیؓ پروار ی واری جاؤں ـــ زہراؓ کے فرزند حسنؓ حسینؓ ـــ اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہوں ـــ اور مالتی گاتی تھی ـــ کانہا موہے آساوری راگ سناؤ ـــ اور شادیوں کے موقعوں پر کلیان پور میں دلہن کے پردے گرا دیے جاتے تھے اور تختوں کے چوکے پر بیٹھ کر میراسنیں الاپتی تھیں۔ اس بنے پر سایہ علی کا۔ مورا شیام سندر بنا۔ کون مغربی سوفسٹی کیٹڈ اس منظر کے حسن کو سمجھ سکتا ہے ـــ مورا شیام سندر بنا ـــ"

"اور ـــ" چمپا نے کہا، "میرے گھر کی میراسنیں گاتی تھیں ـــ منگل گاؤں۔ چوک بچھاؤں ـــ گجرا چنبیلی کا لاؤ ری ـــ چنبیلی کا گجرا تم نے دیکھا ہے سرل؟"

"اور گھاگرا کے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آلہا اودل کی تانیں اڑاتے تھے ـــ علی علیؓ کرکے سید دوڑیں ـــ آلہا کھینچ لیہن تلوار ـــ اور قدیر کا بھانجا نوٹنکی میں چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا شکر ہے لیلیٰ ترے دربار میں آیا
کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا

"چمپا باجی ـــ وہ نوٹنکی تم کو یاد ہے ـــ ہم تمھیں کرسمس کے زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں پٹ کر ہم نے لیلیٰ مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور میرے گاؤں کے اداکار ہم کو خوش کرنے کے لیے اپنا سارا آرٹ صرف کیے ڈال رہے تھے۔"

"ہاں۔" چمپا نے، جو اس وقت لکھنؤ سے پچیس میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی، وہیں سے جواب دیا: "ہاں۔ اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا تھا:

تیرا چہرہ مرا قبلہ، تری زلفیں میرا ایماں
طوافِ کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا۔"

"ہاں۔" کمال نے کہا۔ وہ بھی کلیان پور میں موجود تھا۔ وہ سب نوٹنکی میں منڈپ کے نیچے شال اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اسٹیج پر صرف مدھم ساگیس کا ہنڈا روشن تھا۔ پردے پر ایک فوارہ بنا ہوا تھا اور چار پریاں جو کہنیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ قدیر کا بھانجا ماسٹر پھریدے، جو اپنی

تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے جھنگر وا کہلاتا تھا، پیلے کے سامنے کھڑا دہاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہارمونیم اور طبلہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماسٹر پھر یہ نے گایا:

زلیخا کی طرح جب ترا عاسک ہوا پیلے
تو یوسف کی طرح بکنے ترے بازار میں آیا

برابر کے مونڈھے پر گوتم نیلمبر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ہری شنکر موجود تھا اور ساتھ کی ساری لڑکیاں۔ اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چمپا کے سامنے فوک کلچر کے مسئلے پر روشنی ڈال رہا تھا۔ وہ سب صبح چار بجے تک نوٹنکی کے منڈپ میں بیٹھے رہے تھے اور انھوں نے مٹی کے کورے کلھڑوں میں ادرک والی چائے پی تھی اور گنّے کا رس —— یہ کمال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا موروثی گاؤں تھا۔ یہاں کمال کی موجودگی میں اس کی رعیت میں صرف سید اور برہمن پلنگ پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لیے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ اب اسٹیج پر ماسٹر مراری لال، جو کلکتہ تک تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا، سوہنی میں گا رہا تھا:

یاس کا عالم نہ تھا، یوں بےکسی چھائی نہ تھی
اب تو لیلیٰ تھی تماشا، خود تماشائی نہ تھی

وہ سب مونڈھوں پر بیٹھے نوٹنکی دیکھتے رہے۔ باہر آم کے جھرمٹ میں پوس کی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ گرم اور محفوظ، وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کہروا سنتے رہے۔ دفعتاً ایک موٹر لانچ ایک انگریزی ریکارڈ بجاتی ہوئی تیزی سے کیمپ کی طرف پر سے گزر گئی۔ چمپا اور کمال واپس آ گئے۔

"ہمارے گاؤں کی نوٹنکی میں نل دمینتی اور اندر سبھا بھی بہت فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔" کمال کی طویل آواز سنائی دی۔ وہ جھک کر سرل کا سگریٹ جلا رہا تھا۔

"اور تم کو جو منیکا را اسے یاد ہے کمال۔" چمپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "اور وسنتی کا وہ گیت: جوگن کھوجن نکلی ہے۔"

"ہاں۔" کمال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

"اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر ہری شنکر گاتا —— اگر دینی تھی ہم کو حور و جنت تو یہاں دیتے —— اور پیا ملن کو جات تھی میں، سج دھج بیس گندھائے —— لوگ کہت میں باوری —— سب جگ ہنسی اڑائے —— تم کو کیا پتا"، اس نے غصّے سے سرل کو مخاطب کیا، "کہ بنکیچ ملک کون ہے، ہماری ساتیاں اور آرزو لکھنوی اور نرائن راؤ ویاس اور کانن دیوی —— ان لوگوں کا ہماری زندگیوں میں کیا مقام

ہے۔"

"تمھیں کیا پتا—" چمپا نے اس کی خفگی کا کیولے کر کہنا شروع کیا۔ "تم جو مجھ سے میرا پس منظر دریافت کرتے ہو— کہ پیارو قوّال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خاں اور دیبالی تعلقدار— اور—"

"اور تم کو کیا معلوم کہ لکھنؤ اور علی گڈھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی اور آنند نرائن ملّا کی۔" کمال نے کہا۔

"اور تم کو کیا پتا"، اب چمپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتھاہ رنج نے لے لی، "کہ کالی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں— یہ شعر—

نروندھیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بطخوں کی معیت میں بادل پیغام لے کر چلا—"

"اور تم کو کیا معلوم کہ ہالڈر کی بنائی ہوئی تصویر: اشوک کے جھنڈ میں سیتا، ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔" کمال نے کہا۔ "نہیں سرل، یہ بڑا مشکل کام ہے۔"

"اور یاد ہے کمال،" چمپا واپس جانے پر مصر رہی، "ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پرانے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔ کملا جھریا اور جانکی بائی اور ہری متی۔"

"ہاں۔" کمال نے کہا۔ "اور محمد حسین ساکن نگینہ کا ریکارڈ دھوئیں کی گاڑی اڑائے لیے جا۔"

"ہاں۔" چمپا خوش ہوئی کہ کمال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی۔ مگر اب کمال حال میں آ کر سامنے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعتاً کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہی ہے، اڑی جا رہی ہے اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کمال،" سرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا، "مجھے کچھ اور بتاؤ۔"

"اور کیا بتاؤں!" اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا۔ ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

"کمال— سنو—" چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔ "رات کا سماں ہے۔ کتے بھونک رہے ہیں۔ سناٹا بازار بھر میں پڑا ہے۔ چڑیاں چنگن تک سوتی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچا رہے ہیں۔ باغبان گوندنی کے کھٹکھٹے کو کھٹکھٹاتے ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔"

"سرشار؟"

"ہاں۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"ہم لوگ عموماً ہری شنکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک برجی تھی۔" کمال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "اس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر ان گنت پرانے فوٹوگراف تھے اور دو ٹوٹے ہوئے صوفے۔ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے لاتعداد کتابوں کے موضوع سوچے۔ دنیا کے مسائل حل کیے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے اٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھندلکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسند ناپسند کے بجائے عجز ہمارا رویہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ رویہ احساسِ برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، ہمیں اس خون کو دھونا ہے۔ اور دیکھو کیا ہوا!" اس نے ہاتھ آگے پھیلائے۔ "ایک روز صبح کو ہم اٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ہمارے وہ سارے کردار، جن کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سنا ہوگا، فوٹل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ذہین اور پرلطف گفتگو کرنے والے نوجوان، مارکس کا مطالعہ کرنے والی اور منی پوری ناچنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الاپنے والے پوزیشرز — ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خون کا کفارہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے — حقیقی، اصل انسان۔" اس نے چمپا کو دیکھا۔

"قدیر — اور قمرن؟" چمپا نے کہا۔

کمال نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے۔ وہ اسے بے حد مقدس ہستیاں معلوم ہوئیں۔

"ہاں۔ قدیرا اور قمرن اور رام اوتار اور رم دیا۔ اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے اکے والے اور بر نواڑی — اور ہمارے زردوز جو چکن کاڑھتے کاڑھتے اندھے ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے کنجڑے اور بالکیوں کے کہار — یہ سب ہمارا پس منظر ہے جسے تم کبھی نہ جانو گے۔" اس نے بات ختم کی۔

چمپا ابھی واپس نہ آئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا: "ہاں۔ اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سنو: سرجو۔ شاردا۔ دُرگاوتی۔ مندکینی۔ مدھومتی۔ گومتی —" "وہ گندھرو مالائیں جو بھارت سے اتر کر بنوں میں بسنت رُت منانے نکل آئی تھیں۔" طغیان صاحب

نے کہا۔

کمال نے چونک کر انھیں دیکھا۔ اب تک وہ ان کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے قبل آکر چوتھی الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے یار" کمال نے آزردگی سے کہا۔ "میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کویتا لکھی ہے۔ یہ اسٹیج سب پر آتی ہے۔"

"تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔ گنگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی ہری شنکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی — گوتم نے بتایا ہوگا کہ — ہم لوگ، ذرا سوچو، دریاؤں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔ ارے پُل دیکھو۔ کشتیاں۔ گھاٹ۔ سنگھاڑے۔ کنول کے پھول۔ اور پھر ندی پر برستی ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ سمندر بیکراں ہے۔ ندی کو اپنا راستہ معلوم ہے۔"

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے کمال بور ہونا شروع ہوا۔ لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے، اس نے سوچا، کہ ایک تو ہوتی ہی بکّی ہیں، اگر ان پر یہ وحی آجائے کہ کلاکار بھی ہیں تو بیڑا ہو گیا۔ چمپا باجی کلاکار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہو سکتا تھا!

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور کمال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ندی کا کردار، مجھ سے زیادہ اور کون یہ بات جان سکتا ہے، اس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں، وہ ندی، وہ درخت — چمپا باجی تم خود —

"اور باغ میں املتاس کے درخت تھے،" وہ کہہ رہی تھی۔ "اور ایک بیل کا درخت بھی۔ بیل تم نے کھایا ہے کبھی؟" اس نے ادجیت سے پوچھا۔ "پورب کی خاص چیز ہے۔ کمال، گوتم سے پوچھنا، اسے وہ ٹپ ٹپ گرتے بیل یاد ہیں؟" اس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

کمال سوچتا رہا۔ میں انھیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے۔ مگر بھولنا کیا معنی! ضرور یاد ہوں گی، جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور املتاس کا درخت۔ اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔ یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں — اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوچنا شروع کیا — ان کو ہزارہا برس سے اس کمپلکس میں مبتلا کر دیا گیا ہے — ایک ستی ہے وہ ستی تھیں۔ پھر سیتا۔ پھر گوپیوں کا فراڈ چلا — ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں۔ بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی

پوجا۔ وے اس کی پوجا۔ اری نیک بختو، اللہ رسول سے دل لگاؤ۔ اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رابعہ بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی بیبیاں گزری ہیں۔ لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یسوع مسیح مل جائیں تو لے کر ان کے موزے رفو کردیں۔" "میں گوتم سے مزید پوچھوں گا۔" اس نے بآواز بلند کہا۔" اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔" اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رو میں کہا۔ کل یوتھ فیسٹیول کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طلعت میرا سارا سامان سفر ٹھیک کر دے گی۔"

"بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔" طلعیان صاحب نے بات کی۔

"جی ! جی ۔" کمال نے جواب دیا۔" اس لیے چچا، ابا جی اب اجازت دیجیے۔ خدا حافظ سرل۔ او جیت ۔"

"چلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔" سرل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کمال اسٹیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں آکر دریچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیمپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ دور جینرس لین میں کوئی شخص ٹرمپیٹ پر اپنا غمگین نغمہ چھیڑ رہا تھا۔

(۷۷)

گھنٹی بجی تو طلعت نے دروازہ کھولا۔ وہ مشرقی برلین کے ایک جدید وضع کے فلیٹ میں اپنی ایک سنگتراش دوست کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ باقی کے سب لوگ ابھی ادھر ادھر سڑکوں پر گاتے بجاتے پھر رہے تھے۔ اس نے بالکنی پر سے جھانک کر دیکھا۔ پھولوں کی بیل کے نیچے نیم تاریک پورٹیکو میں دو سائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نو وارد اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو طلعت نے اسے پہچانا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

"میں نے سنا تھا کہ مشہور سنگتراش فراؤلین کریمر یہاں رہتی ہیں۔"

"آپ نے بالکل صحیح سنا تھا۔ لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں۔ فرمائیے آپ کی کیا خدمت

کی جا سکتی ہے۔ آپ کو سر چاہیے، تانبا یا پلاسٹر آف پیرس؟" طلعت نے بڑے پروفیشنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی۔ میں سر نہیں چاہتا۔" اس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔ "میری ایک دوست ہیں، ان کو چاہیے۔" پھر دفعتاً اس نے چونک کر غور سے طلعت کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ فیسٹول کی وجہ سے کامریڈ کریمر کا کام خوب چمک گیا تھا۔ بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آ رہے تھے۔ وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور البتانی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر بناتی اور ان کو تحفتاً دے دیتی۔ سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔ طلعت، جسے آرٹ میں بھی دخل تھا، اس کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔

نو وارد جب یہاں آ رہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراؤلین کریمر بورژوا آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ وہ لیکچر پلائے گی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے یا سارے مجسمے توڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی اور تم کو دام بھرنے پڑیں گے۔

"اپنی دوست کو بلا لائیے — تاکہ میں ان کا مولڈ بنا لوں۔ میں فراؤلین کریمر کی پارٹنر ہوں۔" طلعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے ہنگیرین لڑکیوں کا رنگ برنگی کڑھت والا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز تحفے میں ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پہچاننے کی بے انتہا کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔ اسے اس طرح ایکٹنگ کرنے میں بہت لطف آیا۔ "اس الماری میں چائے کی پتی رکھی ہے۔ ادھر اسٹوو ہے — آپ کافی بنائیے میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے — بوہیمین انداز کی بے تکلفی کی نقل کرتے ہوئے کہا اور پلاسٹر نکالنے کے لیے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔

دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

"ملی؟" انھوں نے اجنبی سے پوچھا۔

"نہیں، یہاں بھی نہیں ہے، مگر آہستہ بولو، شاید یہ لڑکی اردو سمجھتی ہو۔"

"کون لڑکی۔"

"وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔ اس کی اسسٹنٹ ہے۔ ہنگیرین سی دکھلائی پڑتی ہے۔ مگر مجھے تو کچھ گھپلا نظر آتا ہے — اس میں بھی —"

اسکرین کی دوسری طرف سے طلعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھلائی دی تو اس نے ذرا گھبرا کر اونچی

آواز میں کہا: "اس بدتمیزی کو معاف کیجیے گا مادموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔"

"کوئی بات نہیں۔" طلعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔ "مجھے اس کی ساؤنڈ بہت اچھی لگتی ہے، جیسے مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔"

"مکھیاں؟"

"جی ہاں۔ یہ میں نے تشبیہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے ٹیونس میں رہی ہوں۔ وہاں عربی سنا کرتی تھی۔"

"ٹیونس میں؟"

"جی ہاں — حبیب بورغیبہ کے ساتھ۔"

"وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟"

"جاسوسی۔" طلعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاسٹیسن کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔ ساجدہ بیگم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلین نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اب دیکھو کہاں پھنس گئے۔ انھوں نے اب تک ہالی ووڈ کی فلموں میں جو کچھ سنٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا، سب پل کی پل میں تصور میں کوند گیا۔ آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس بین الاقوامی سازشیں۔ اغوا۔ اورینٹ ایکسپریس۔ وکی باؔم کا "گرینڈ ہوٹل"۔ کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں کی دست بدست جنگ۔ اندھیری گلیوں میں تعاقب۔ قتل — ہاں قتل — ساجدہ بیگم لرز اٹھیں اور انھوں نے گھبرا کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

ان کے ساتھی پر طلعت کی بات کا بالکل مختلف ردِ عمل ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکی کون ہے اور یہ بھی کہ یہ اس کی اس اسٹوڈیو میں آمد کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

طلعت اسکرین کے باہر آئی۔

"ارے یہ تو طلعت بہن ہیں۔" ساجدہ بیگم چلائیں۔ "توبہ ہے۔ تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔ اچھا بیوقوف بنایا۔"

"ہلو، ساجدہ آپا۔" طلعت نے شگفتگی سے کہا۔ "بیٹھیے۔ ابھی آپ کا فرسٹ کلاس مولڈ بناتی ہوں۔ آپ نے کافی تیاری کر لی؟" اس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

"معاف کیجیے گا میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔ لندن میں بھی آپ سے ملنے

کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ۔صرف آپ کا ذکر بہت سنا ہے ۔"

"جی — آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی ؟ میں نے دیکھا تھا آج آپ پولش لڑکیوں سے بہت برادرانہ سلوک کر رہے تھے ۔"

"وہ — تو میں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے آیا ہوں ۔میں ایک انگریزی اور دو اردو اخباروں کے لیے لندن لیٹر لکھتا ہوں ۔یہاں سے جا کر ان لوگوں کی قلعی کھولوں گا ۔"

"تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں ۔" ساجدہ نے کہا ۔" بڑے مشہور جرنلسٹ ہیں ۔"

"جی ۔ اور ساجدہ آپا آپ یہاں کیسے —"

"میں — میں ذرا ان لوگوں کا —"

"— جھوٹ سچ معلوم کرنے آئی تھیں !"

"بالکل !" انھوں نے جواب دیا ۔

"مگر ساجدہ آپا — اور آپ —"

"خان —"

"مسٹر خان — مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کا تعاقب کرتے یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی ۔ وہ یہاں کبھی نہیں آئی ۔ اگر آ جاتی تو اس کے لیے اچھا ہی تھا ۔ اتنی شدت سے الجھی ہوئی نہ رہتی ۔ مگر وہ عین اس لمحے سالز برگ میں موزارٹ کی موسیقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے — جہاں تک میرا خیال ہے ۔"

"کیسا تعاقب بھئی — کیا اڑا رہی ہو ۔" ساجدہ نے خفگی سے کہا ۔

"نہیں تو ۔ اچھا ہے ساجدہ آپا ۔ یہاں ایک سے ایک تحفے آپ کو ملیں گے ۔ پندرہ دن تک وہ وہ خاطر مدارات ہوگی جس کا ٹھکانہ نہیں ۔ مفت کی تفریح ۔ کیا حرج ہے ۔ آپ لوگوں نے ان ممالک کو جانے کیوں ہوّا بنا رکھا ہے ۔" وہ سرعت سے ان کی ناک بناتے ہوئے بولی ۔

"یہ مشغلہ آپ نے کب سے شروع کر دیا ۔" مسٹر خان نے کہا ۔" مجسمہ سازی ۔"

"جی ۔ مشغلوں مشغلوں کی بات ہے ۔ بعضوں کا مشغلہ مخبری ہوتا ہے ۔"

ساجدہ نے گھڑی دیکھی ۔" اب چل دو — جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں کھانے پر انتظار ہو رہا ہوگا ۔"

"بہت خوب ۔ دوسری سٹنگ کب دیجیے گا ؟"

"میں فون کر دوں گی۔"

"بہت اچھا۔"

وہ بالکنی میں سے ان دونوں کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی بیل پھر جھک آئی جس کے سائے میں "مسٹر خان" ایک لمحے کے لیے گم سم کھڑا رہا۔ پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

واپسی وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ٹرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑی گئی۔

"کیا چنڈو خانے کی اڑاتے ہو۔" طلعت نے آزردہ ہو کر کہا۔ "وہ سیاسی کبھی نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی تک کیا ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لیے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ۔ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگلنگ کرتی تھی؟ بم بناتی تھی؟ امریکہ کے اہم راز روس کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی؟ آخر کیا کر رہی تھی بھائی؟ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کو یہ تک تو معلوم نہیں کہ فورتھ انٹرنیشنل ہے۔"

"اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جا سکتی۔" گوتم نے اس کی بات کاٹی۔ وہ مغربی جرمنی کے سفارت خانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ "تم افواہوں کی نفسیات نہیں جانتیں۔ اور اسٹیریو ٹائپ کی طاقت۔ اگر میں مستقل تمھارے لیے پروپیگنڈہ کروں کہ تم طلعت رضا نہیں ہو دراصل ولائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمھیں ولائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپیگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں، سموچے ملکوں کے خلاف اسٹیریو ٹائپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے۔ طلعت آرا بیگم جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی تو سب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔"

"اب میں نے دیکھا کر پروپیگنڈہ کسے کہتے ہیں۔ کمال ہے بھئی۔ روشن غریب، جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے کہ دو بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے برلین تک آئے گو وہ ان کو تب بھی نہ ملی۔"

"مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کر لی۔"

"بتا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے بون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکالرشپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کراچی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔

"وہ کس طرح؟" طلعت نے پوچھا۔

"سنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے۔ بہرحال تو وہ سول سروس کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کو ویسے ہی کسی پچھلے وزیرِ اعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیرِ اعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے روشن بے چاری کے خلاف جو مضحکہ خیز کارروائی کی جا رہی ہے اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔"

"یا اللہ۔" کمال نے گڑبڑا کر کہا۔ "اس قسم کے حالات ہیں؟"

"ہیں تو سہی۔" حمید نے جواب دیا۔ وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے سبزہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

(۷۸)

شیو پرشاد بھٹناگر رنجور بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں برسوں برس سے خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجور صاحب دوسری جنگِ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوکسفرڈ آئے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدد لیتھوین یا یستونین لڑکی سے شادی کر لی۔ سخت ٹھوڑی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی۔ وہ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستانی کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ سیدھا یہیں آتا۔ رنجور صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ سب کی بہت خاطریں کرتے۔ اکثر مہمان ان کا بل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجور صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آنکلتا تو اس کے لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراز فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔ رنجور بارہ بنکوی ہندو تھے اور ہندوستانی۔ ہمراز فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے کٹر پاکستانی۔ یہ دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل بحث کرتے۔ رنجور صاحب کہتے: تم لوگوں نے ہندو شعراء کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلایا وغیرہ۔ یارامکنِ فرحت لے کر بیٹھ جاتے اور بیئر کے چند گلاسوں کے بعد روہانسے ہو کر کہتے تم کچھ مسلمنٹے، تم نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کر ڈالے۔

اس پر ہمراز بھائی بھارت ماتا کی شان میں کچھ گوہر افشانی کرتے۔ شیو پرشاد روتے روتے کہتے: یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہمراز بھائی کہتے: ہاں یار، اچھا ہے۔ مگر ذرا بوئے پکوری و ہینگ می آید۔ اس پر دوبارہ فساد شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہمراز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے۔ وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پر دونوں گھنٹوں باتیں کرتے کرتے نہ تھکتے۔ گو ہمراز بھائی بڑے شعلہ بداماں پاکستانی تھے مگر بہرحال آبائی وطن اتر پردیش تھا کہتے: ارے، یہ پنجابی گھڑ سوار، رسالدار اردو کیا جانیں! شیو پرشاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جو لڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چنڈی گڈھ میں رہتی تھی۔ جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی شیو پرشاد صاحب نے خاص طور پر آکر ہمراز بھائی کو اس سانحے کی اطلاع دی۔

"لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم اس پنجاب گردی سے کہاں تک بچے رہتے۔"

ہمراز بھائی اس صدمے میں ان کے دلی شریک ہے کیونکہ خدانخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہو سکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پردیش والے ہندو مسلمان، ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے، اس کی عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک روز کمال اس محفل میں گیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ "کس قدر غیر منطقی ہیں آپ؟" اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔ "آپ کا وطن پاکستان ہے۔ آپ کو اب یو۔ پی۔ سے مطلب؟"

"اجی وہ تو ٹھیک ہے — مگر —" ہمراز بھائی نے گڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔

"وہ ٹھیک کیا ہے؟" کمال نے ان کی بات کاٹی۔ "اسی لیے تو پاکستان میں یو۔ پی۔ والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔ دل اٹکا ہوا ہے فیض آباد میں، ملازمت کرتے ہیں کوئٹے میں۔ اور پاسپورٹ بنوا کر اماں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اٹھانے کے لیے آگئے ہیں ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔ حد ہے واللہ!"

"میاں صاحبزادے، زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔" ہمراز بھائی نے جواب دیا تھا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ تم ہندوستانی مسلمان ہو، یاد رکھو، جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کا رُخ کرو گے۔"

غالباً ہمراز بھائی ٹھیک کر رہے تھے۔ اس نے لرز کر ان کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلوریاں بنا بنا کر خاصدان میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر ہفتے ہمراز بھائی کے لیے لندن آتی تھی اور بطور تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے کھلائے جاتے تھے۔ پان بنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوی کمال کی طرف مڑے اور ملول آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”مصیبت یہ ہے کمال میاں،“ انھوں نے اپنے خوبصورت لہجے میں اداسی سے کہا، ”تم شاعر ہو۔ ہر نوجوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مر مٹنے والا۔ وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست داں چلا رہے ہیں جن کو تمھارے وژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمھاری اصل بڑائی یا گھٹیاپن اس وقت ظاہر ہوگا کہ تم نے حقیقت سے، یعنی بے ایمانی سے، جھوٹ سے، ریاکاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک سمجھوتہ کیا۔“

طلعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال یونگ میں جا کر انھوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، ان کے اکثر کرائے دار ان کو کرایہ دیے بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہمانوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انھیں کھلاتے۔ ”سوئیٹ کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔“ طلعت نے ایک روز کہا تھا۔ ”ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے؟“ ان کی بی بی مایا (ان کا اصل نام یہی تھا اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں، جو ۱۹۳۹ء میں زمانہ کانپور میں چھپا تھا، یہ ثابت کیا تھا کہ لیتھوین لوگ دراصل ہندو تھے۔ بعد میں جب جدید تحقیقوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اوریجنل وطن بالٹک کی طرف تھا اور سنسکرت اپنی اصل حالت میں انھی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور صاحب نے طے کر لیا وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اب وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ برس سے وہ اس کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس تحقیق کے لیے ان کو آئرلینڈ کا سفر درکار تھا جہاں اشومیدھ عہدِ عتیق میں منایا جاتا تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی۔ مگر اس سفر کے لیے جو روپیہ چاہیے تھا وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے لہٰذا وہ کتاب ابھی نامکمل تھی) بڑی خاموش طبع اور گھریلو خاتون تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔

(رنجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتیں۔ طلعت وغیرہ کے گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور شاعری ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی جو وہ مایا کی طرف توجہ کرتے۔ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی پتی ورتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باورچی خانے میں گھسی رہتیں یا کپڑے دھوتیں۔

زندگی یونہی گزرتی جا رہی تھی کہ شیو پرشاد بھٹناگر رنجور بارہ بنکوی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارسی طالب علم آن کر ٹکا۔ لڑکیاں جرمنی سے لوٹ کر آ چکی تھیں اور اب قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہو رہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک ڈرامائی پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شروع ہو چکی تھی۔ ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹروں کی فیسیں بہت زیادہ تھیں، شاید ان کو وی آنا بھی لے جایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح سے کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی پارٹی ملی تھی۔ ٹوٹینگ میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے بچوں کی طرح حیرت زدہ سب کو دیکھتے رہتے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ ان کی بی بی کے اعضاء مفلوج تھے۔ وہ نزدیک ایک پلنگ پر لیٹی رہتیں۔ ان کا گھر بنگالی طلبا کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ ٹیگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت ہے اور نذرل کے لیے بے پناہ محبت — اوجیت نے ٹائمز کے نمائندے کو بتایا تھا۔ ایک روز طے ہوا کہ چند ہندوستانی علم اسٹاروں سے جو لندن آئے ہوئے تھے، پیسہ وصولا جائے۔ اتوار کے روز چندہ جمع کرنے کے ٹروپ بنا کر لڑکے اور لڑکیاں مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ طلعت اور فیروز نے پہلے سوئس کاٹیج کا رخ کیا جہاں رنجور بارہ بنکوی رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے۔ ”ہمراز بھائی! لائیے پیسے“ طلعت نے دستِ سوال دراز کیا۔

”یہ طالب علم کیوں نذرالاسلام کے لیے اتنے بے حال ہوئے جا رہے ہیں“ ہمراز بھائی نے کہا۔

”یا اللہ — ہمراز بھائی“ طلعت نے کہنا شروع کیا۔ ادھر یہ لوگ ہمراز بھائی سے بحث میں الجھ رہی تھیں عین اسی وقت علامہ رنجور بارہ بنکوی کی زندگی میں ایک قیامت بپا ہو گئی۔

شام کا وقت تھا اور سورج صنوبر کے درختوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ مکانوں کے دریچوں کے شیشے ڈوبتے سورج کی روشنی میں قرمزی نظر آ رہے تھے۔ رنجور صاحب فکرِ شعر میں مبتلا مکان کے سامنے

ٹہل رہے تھے۔ نیچے تہ خانے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جہاں مایا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھلائی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سمے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ ان کو یقین ہوگیا کہ مایا بھٹنا گر، ہوشنگ ماچس والا سے افیئر چلا رہی ہیں۔ چلا رہی ہیں کیا معنی، عرصے سے چلاتی آئی ہیں اور یہ اب تک کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ رنجور صاحب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تہ خانے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طلعت اور فیروز کو تہ خانے میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں دوڑی ہوئی نیچے گئیں۔ مایا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے پر "ہکم" "بکم" کھڑے تھے۔

"کیا ہوا؟" طلعت نے دہل کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" انھوں نے سکون سے جواب دیا۔ "زینے پر سے ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ فکر مت کرو۔" پھر وہ خاموشی سے اوپر چلے گئے۔

دوسرے لمحے اوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی۔

لڑکیاں بوکھلاہٹ میں دوڑی ہوئی اوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طلعت نے ۹۹۹ کو فون کر کے ایمبولنس منگائی اتنی دیر میں رنجور صاحب ہوشنگ ماچس والا کی ٹھکائی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پا چکے تھے۔ ہمراز بھائی اور دوسرے لوگ ہال ہال کرتے اپنے اپنے کمروں سے بیچ بچاؤ کے لیے دوڑے مگر رنجور صاحب نے بڑبڑاہٹ میں ایک ایک جھانپڑ ان سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہمراز بھائی سے باقاعدہ ان کے دو دو ہاتھ ہوگئے۔ لینڈنگ پر، جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے۔

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے پب سے اپنی بے چاری بی بی کے لیے تھوڑی سی برانڈی لے آئیں۔

یہاں برانڈی کا انتظار رہتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پب میں شغل کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ طلعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز ان کے بچوں کو بچکارنے میں مصروف ہوتی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسباب باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہڑبونگ میں نسیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بھٹنا گر کی مرہم پٹی کروانے کے بعد

طلعت اور فیروز نائٹس برج کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں نسیم بانو کی والدہ سیٹی پر ہاتھ موتیم لیے بیٹھی تھیں اور جنہوں نے سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی کہا کہ تم لوگوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ کب تک پڑھتی رہو گی؟ اب شادی کر ڈالو۔ اور نسیم بانو نے پکوڑے تل کر کھلائے مگر چندے کے نام کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑبڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اسٹار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہوکر انھوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طلعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا کیونکہ جب سے انڈین فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار لندن آ پہنچتا۔ ایشین فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلسٹی سے ہندوستان کی پبلسٹی ہوتی تھی "اس پبلسٹی کے ریکٹ نے دماغ چکرا دیا ہے۔" طلعت کہتی۔

"چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔" وہ الٹے پاؤں سوئس کاٹیج گئیں۔ فیروز پر اس وقت ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

"حد ہے یار" اس نے کہا۔

"ہاں یار حد ہے۔" طلعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پہل تھی۔ ساری عمارت کے مکین، یعنی رنجور صاحب کے مہمان، وہاں جمع زور و شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال بھی موجود تھا۔ وہ طلعت کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آنکلا تھا۔

"ہیڈ کوارٹرز میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھئی؟" اس نے کہا۔

"مسز بھٹناگر اب کیسی ہیں بھابھی؟" طلعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

"مگر صاحب ــــ رنجور جیسا رنجان مرنج اور بھگت آدمی، جو کبھی اونچی آواز میں بول کر نہ دے، اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنا رہا ہے واللہ!" ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

"مگر یہ ہوا کیا؟ ایسی پتی ورتا عورت۔۔۔" ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"اور وہ خود کیسا تھا۔ مرگلا بالکل۔ پیلی پیلی چھپکلی ایسا۔ لاحول ولا ــــ وہی مایا جس والا ــــ" ان ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

"مطلب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔" کمال نے آہستہ

سے کہا۔ ''رنجور صاحب کا طوفان۔ مایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جوالا مکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں صاحب بھئی۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب دہلیز میں کھڑے نظر آئے۔

''آیئے آیئے۔'' ہر ایک نے کہا۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اندر جھانک کر چاروں طرف دیکھا۔ ''نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلۂ خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ ایسے ہی ادھر آ نکلا تھا۔ خدا حافظ۔'' دوسرے لمحے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پرشاد بھٹناگر کئی دن تک گھر نہ لوٹے۔ ان کی بی بی اسی طرح سر پر پٹی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں معروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پرشاد بھٹناگر رنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پلٹئے گئے۔

(۷۹)

جبل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور نذرالاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے۔ ان کا ٹور بری طرح فیل ہوا تھا۔ پھر وہ بیمار پڑے۔ ان کو بے حد خراب پریس ملا۔ ہر نقاد نے 'پاکستانی' اور 'ہندوستانی' رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان میں کیا فرق ہے حالانکہ فنونِ لطیفہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب و غریب نظریوں سے پریس کی تواضع کرتے رہے تھے۔

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔ نذرالاسلام کے لیے اتنا پیسہ اب تک اکٹھا نہ ہو سکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج کرا دیا جاتا۔ ''نذرل ایڈ کمیٹی'' میں سر پھرے طالب علموں نے کیھر اور اصفہانی کو اکٹھا کر دیا۔ (کم از کم ان کے نام سرپرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برابر برابر چھپ گئے) کمیٹی کے صدر ہندوستان ٹائمز کی شریمتی ایلا سین تھیں۔ نائب صدر وی۔ کے۔ کرشنا مینن۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتریکا کے سندر کبا ڈی بھی تھے اور ڈان کے نسیم احمد بھی۔ (یہ اجتماع ضدین ۔۔ نذرل دادا تمہارا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کمال نے کہا) اس مرتبہ پی ایس ایف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔ پچھلے سال دونوں جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم دھام سے ایشین اسٹوڈنٹس کانفرس

منعقد کی تھی جس میں عرب اور اسرائیل طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ (عالمگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ ان لوگوں کے بھڑ سے میں مت آنا۔ عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا۔)

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ ہم تنزیل وادا کو اس بے کسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پدما کے سیلاب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جا رہی تھی۔ گھنٹوں رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہرسل کی جاتی۔ ایک ایک نکتہ پر بحث ہوتی۔ کاسٹ بے انتہا پلیٹ ہو رہی تھی۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھٹیالی گانے والے ملاح۔ سیلاب کی زد میں خزاں کے پتوں کی طرح بہتے اور ڈوبتے ہوئے کسان۔ سرکاری لنگر خانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے پناہ گزینوں کی قطاریں۔

"اُفوہ۔ کس قدر خوفناک . . . ." رومینٹک بل نے نیم تاریک آڈیٹوریم میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر سامنے روشن اسٹیج پر ریہرسل دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ ٹریجڈی سے محظوظ ہوتے ہو۔"

"موت سے تو ہماری بڑی پرانی دوستی ہے بل کریگ۔" طلعت نے اسکرپٹ کے کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہماری پوری نسل تو سمجھو عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے پر ابھی چند سال ہوئے ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ یہ سامنے والی ٹریجڈی ہمارے لیے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔ بہت سوں کو تو اس ٹریجڈی کا احساس تک نہیں۔" طلعت نے ترشی سے بات جاری رکھی۔ "اور بہت ممکن ہے ابھی، جس وقت میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں، یہ سیلاب کا منظر مشرقی بنگال میں سچ مچ لوگوں کو نظر آ رہا ہو۔"

چھن چھن کرتے بل کے ٹروپ کے افراد ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

"سیلاب کے منظر میں سرریلزم چلاؤ تھوڑی سی" اسٹیج کی پروڈیوس کے انبار میں سے سر نکال کر زرینہ چلائی۔

سرریلزم چلائی گئی۔ ڈراما پروڈکشن کی جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جا رہی تھی۔ پیچھے گیلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی مشق کرا رہی تھیں:

——بیلا نائی رے جولدی جولدی —— بیلا نائی ——

بالآخر فرسٹ نائٹ آن پہنچی۔ گرین روم کی گہما گہمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ۔ کاسٹ کے افراد کی طرف سے فکر۔ جانے کون کہاں ہے کوئی ناظر کر دے۔ ویسٹ اینڈ کی پروفیشنل اسٹیج کے اہم افراد کو مدعو کیا گیا

تھا۔ پریس والے سامنے کی قطاروں میں بڑی انہماک سے بیٹھے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پریس اور تماشائیوں کے ردِ عمل کے عادی تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ کل صبح مانچسٹر گارجین اور ڈیلی اسکیچ میں کس طرح کے نوٹس نکلیں گے۔

انٹرول کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آ گئے۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑسے، سنتھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

"یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں؟" ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنبھالتے طلعت سے دریافت کیا۔

"یہ — ہ نہیں — وہ سنتھال لڑکی فیروز جیلیں ہے۔ اتر پردیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذرا حیدر ہیں۔ یہ ادھر والی پنجابی خاتون ہیں —"

"ہاؤ فیسی نٹنگ —" نمائندے نے بڑے صدقِ دل سے کہا اور اپنی نوٹ بک پر جھک گیا۔

"دیکھو، ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا، "تم ہو تو ان ہی لوگوں میں سے پر آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو لہٰذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا۔ میں — میں تم لوگوں کو اس طرح یکجا دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صبح سے شام تک میری ساری زندگی تمھارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خونریزیوں کی خبریں چھاپتے چھاپتے گزری جا رہی ہے اور اب یہ کیا سلسلہ ہے۔ تم ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہو۔ تم ایک ساتھ لباس پہنے، ایک موسیقی کی آہنگ پر، ایک سے گیت گا رہے ہو۔ یہ کون سا ایکٹ ہے — ایں؟"

"رابرٹ صاحب،" طلعت نے منہ لٹکا کر کہا، "اسے تو بس اسٹنٹ ہی سمجھو۔

اچھا اب تم باہر جاؤ۔ دیکھو اگلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے۔"

"پتا نہیں اگلا ایکٹ کیسا ہوتا ہے؟" اس نے غیر یقینی لہجے کے ساتھ رنجیدہ آواز میں کہا۔

"مجھے تو ڈر ہی پتا نہیں۔" طلعت نے گرین روم کے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔"

دروازے میں پہنچ کر اخبار نویس پھر ٹھٹھکا: "ایک بات اور — صرف ایک آخری سوال —"

"مجھے معلوم ہے —" طلعت نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "— خدارا —" طلعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیو کے انتظار میں مصروف ہو گئی۔

دھان کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اونچی

ہوتی گئی:

بیلا نائی رے جولدی جولدی —
(وقت نہیں ہے جلدی کرو۔)
او بیلا شونار کونا ر آنچل دھوئی را —
(سنہری کنیا کا آنچل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے)
جادو رکاٹھی ہاتھے لوئی یا آئی لورایت بوجھی۔
بیلا نائی رے جولدی جولدی —
بیلا نائی —

(۸۰)

وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی کرو —

وقت نہیں ہے —

لوگوں کو دیکھو ان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ ان سے بھاگو — بھاگو — اب میں کس اور جاؤں۔ میرے دشمن۔ میرے دوست۔ میں نے انہیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا۔

جھیل کے پار، ندی کے پار، سمندر کے پار وہاں کیا ہے۔ ہم نے ٹکٹ تو جنوبی ممالک کا لیا تھا پر کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے، گائیڈز نے جو بتایا وہی ٹھیک ہے؟ یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو۔ باقی سب میرا پروجیکشن ہے۔ یہ مستقل "میں" سامنے سُرخ چھت کا چیپل ہے اور اس میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ یہاں کس کی شادی ہے؟ بہار آگئی ہے۔ پگڈنڈیوں پر پھول جھک آئے ہیں۔ ابھی وہ دونوں نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہوگا۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ایک سوتا ہوا چاند برخٹس گارڈن کے اوپر ڈول رہا تھا۔ وہ سرحد عبور کر کے ہنستے ہوئے سالزبرگ میں داخل ہوئے۔ یونہی خوشی سے ادھر اُدھر گھومتے ہوئے ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا۔ بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باہر آ کر وہ ایک اور سرائے میں جا بیٹھے۔ وہ اپنی ٹانگیں کرسی پر رکھ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ ایپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا خوش مزاج دھندلی آنکھوں والا بوڑھا ان کے سامنے آیا۔

"یہ شاہانِ اودھ کا خاندان ہے۔" وہ خوب ہنسا۔ "تم جانتے ہو شاہانِ اودھ کون تھے؟" انھوں نے کاغذ کے نیپکن پر اپنے نام اکٹھے لکھے۔

وقت نہیں ہے — وقت نہیں ہے —

"ہلو بھائی جان —" دروازہ کھلا اور زرد تنگ موری والی پتلون پہنے ایک بے حد حسین لڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی۔ "بھائی جان آپ کا تار مجھے آج ملا۔"

"آپ کون ہیں؟" روشن نے پوچھا۔

"یہ میری کزن ہیں — شاہ رخ سلطان۔ پیرس میں ریڈیالوجی پڑھتی ہیں۔"

"بھائی جان یہ کون تھیں؟" روشن کے باہر جانے کے بعد نو وارد لڑکی نے دریافت کیا۔

"یہ — ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو۔"

"ہائے اللہ — آپ کتنے مزاحیہ ہیں — پر یہ کافی مغرور سی معلوم ہوتی ہیں — ایک دم اٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں؟"

"مغرور تو نہیں لگی بر و ضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرٹن کالج انٹرنیشنل سٹ سے ملاقات وغیرہ۔ جانتی ہو تم یہ ٹائپ؟"

"ہائے اللہ، کس قدر دلچسپ۔" شاہ رخ سلطانہ نے مسرت سے کہا۔

اس نے ایک گہری، تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سالز برگ ہے اور مئی کا مہینہ۔ میں تھیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت نکلا جا رہا ہے — جلدی کرو۔

بھاگو — بھاگو — بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کرسیاں پڑی تھیں اور گلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجا رہا تھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا: "ہاؤ ڈو یو ڈو۔" اس نے کہا۔

"کیا تمھیں اپنی روح بچانی ہے؟" مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لہجے میں کہا۔ گویا اگر آپ کو مضبوط جوتے بنوانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لائیے۔

"امریکن؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کھو لپٹے تو ہو۔"

"جی تھینکس۔۔ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔"

پیٹر نے آسمانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ "میں پرنسٹن میں پڑھتا تھا۔"

"ہاؤ ونڈر فل۔"

"میں پروفیشنل بیس بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا جب میں نے دفعتاً کال سُن لی۔"

"کیا سُن لی؟"

"کال۔"

"تمھیں ایک بات بتاؤں پیٹر۔۔ میں نے بھی کال سُن لی ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سنی؟" پیٹر نے دلی مسرت سے پوچھا۔

"ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے۔ تقریباً نو بج کر پندرہ منٹ پر۔" اُس نے گھڑی دیکھی۔ "یا شاید نو بج کر بارہ منٹ تھے۔" اس نے سڑک کی دوسری طرف سرائے کے جگمگاتے دریچے کی اور نظر اٹھائی۔ پھر اس نے ہنس کر مشنری کو دیکھا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح مُنہ کھولے اسے تکتا رہا۔

(۸۱)

سونا ہوا چاند تیرتا تیرتا دریچے کے عین سامنے آ کر ٹھہر گیا اور اس کی روشنی سے خاموش کمرہ دفعتہً جگمگا اٹھا۔ برابر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناتھن مردنگم بجا رہے تھے۔ براؤن بالوں، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والے ڈیچ انڈونیزین لڑکے، جو سر یکھا کے ٹروپ میں شامل تھے، ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کاہلی سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ طلعت دریچے میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوبے کو سیسہ پلا رہا ہو۔

ہائے اللہ آپ کتنا عمدہ گاتے ہیں۔

ہائے اللہ اسکیٹنگ کا لباس آپ پر کتنا سجتا ہے۔

ہائے اللہ۔۔

فیروز دوسرے دریچے میں بیٹھی جانے کاہے کی نقل کر رہی تھی۔ طلعت نے اجنبیوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیام
برج باسیوں میں شیام بنسری بجائے جا — بجائے جا —
طلعت نے یکلخت الاپنا شروع کیا۔

"بھیرے وقت کی راگنی"، فیروز نے غصے سے طلعت کو دیکھا۔

"روشن آگئی۔" نرگیش نے دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی

"ہوا میں پھولوں کی مہک اڑ رہی ہے اور یہ مئی کا مہینہ ہے۔ ہم اس اندھیرے کمرے میں حسب معمول الوؤں کی طرح بیٹھے بول رہے ہیں — ٹووٹ — ٹوہو — آؤ بہن روشن، تم بھی آؤ"، طلعت نے اسے صدق دل سے خوش آمدید کہا۔

"تم لوگ —" اس نے شک و شبہے کی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھا۔ "تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ میں سرحد کے پار تنہا رہ گئی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں یہ کتنے بدصورت ہیں۔ میں چاروں طرف گھومتی ہوں۔ کہیں جگہ تلاش کرسکوں جہاں بیٹھ کر روؤں۔"

وہ لڑکی کے فرش پر بکھرے ہوئے سازوں کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم ابھی کون گانا گا رہی تھیں؟" اس نے پوچھا

"یونہی — بکواس تھی — لکھنؤ ریڈیو کا ایک پرانا گیت"، طلعت نے جواب دیا۔

"مجھے وہ گیت سناؤ۔"

"میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو؟" طلعت نے فرش پر چاروں طرف ناچتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"تم لوگ۔ تم اتنے مغرور کیوں ہو؟" وہ زور سے چیخی۔

گلی کے نیم تاریک محراب میں سے نکل کر کملا دریچے کے پاس آگئی۔

"ٹھہرو روشن، میں تم کو ایک گیت سناؤں گی۔ گندھرو وید کا سام گیت۔ رنگا ناتھن"، طلعت نے ناچتے ناچتے رک کر آواز دی۔ "مردنگم اور زور زور سے کیوں نہیں بجاتے؟"

"تم روتی کیوں نہیں؟" کملا نے روشن کے قریب آکر اسے غور سے دیکھا۔ "کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں روتی ہیں؟" اس نے اداسی سے سوال کیا۔

"دیکھو،" روشن نے کملا کو مخاطب کیا۔ "اتنے برسوں تک میں ایک گھر بنانے میں جٹی رہی لیکن ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آرہا۔"

"کہا ہے؟ کیسے؟" طلعت نے پُوچھا۔

"میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور اَڑا اَڑا دھم۔ وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بے فکر ہوں۔ اب میں آرام سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "اب میں تمہارے بدصورت، اداس اجاڑ مکانوں میں رہا کروں گی۔"

ڈیج اندڈونیزین لڑکے ایک جمائی لے کر دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔

"میں نے اس گھر کے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔" چلتے چلتے اُس نے دروازے میں سے سر نکال کر کہا اور زینے کی اور مڑ گئی۔

طلعت بھی دریچے میں آگئی۔ اُس نے دیکھا کہ باہر بے پایاں اندھیرا ہے اور اندھیرا مہربان ہے اور اندھیرا ہمارے ہر دکھ، ہر غم، ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا ہے کیونکہ آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

گو ہمیں کبھی اس طرح نہ مرنا چاہیے۔

"ہلو ―" اچانک فیروز نے گلی میں آکر دریچے میں سے اندر جھانکا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں دھوبن کے یہاں گئی تھی۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" طلعت نے بے دلی سے کہا۔

"اب ان کا ― تمہارے جیجا صاحب کا کیا کیا جائے!" اُس نے فکرمندی سے پُوچھا۔

"ڈارلنگ ― کانی میں تم نے پھر کتھا گھول دیا۔" اسٹور کے پاس سے کملا چلائی۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔" طلعت نے گرج کر جواب دیا۔ "سارے میں ماریان کے لوازمات بکھرے ہوئے ہیں۔"

"ڈارلنگ۔" سریکھا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی۔ "ساجدہ آپا ― نیچے گیلری میں کھڑی پوچھ رہی ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر لائیں۔ یہ کون سا نیا ریکٹ تم نے چلایا ہے ―" کملا نے غصے سے مطالبہ کیا۔

"دراصل ― دراصل کملا ― برلین کے واقعے کے بعد سے میں ساجدہ آپا کی رائے گویا بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انھوں نے کہا کہ وہ اپنے مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ لکھنے جا رہی ہیں تو میں نے ― میں نے ― ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں چھپنے کے لیے بھجوا دوں گی۔" طلعت

نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "از برائے خدا ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اپنڈی سائیٹس کا حملہ ہوا ہے اور مجھے ہسپتال لے گئے ہیں۔"

"ادھر آؤ تم سب۔" نرگیش نے گیلری میں سے آواز دی۔

ریہرسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹی پر بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم — پیاری بہن —" انھوں نے گرم جوشی سے کہا۔

"وعلیکم السلام پیاری بہن — بٹیا قیس کس حال میں ہے — اور خیر لوہے کے جال میں ہے —" طلعت نے نعرہ لگایا۔

"ہائے بس تم ہر وقت مذاق کرتی ہو —" انھوں نے کہا۔

"اب اپنا افسانہ پڑھ کر بھی سناؤ گی، ساجدہ بہن؟" طلعت نے لرز کر سوال کیا۔

"آہ — یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانۂ قیام کی —" انھوں نے بیگ میں سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "تم تو مجھے سمجھتی ہو نا —"

"لو ساجدہ بہن — کافی پیو —" فیروز نے مہمان نوازی شروع کی۔

"ہرگز نہ پیجیے گا۔ اس میں کتھا گھلا ہے —" کملا نے آگاہ کیا۔

"اجی کتھا ہو یا نہ ہو، کیا فرق پڑتا ہے؟ دنیا کی ہر چیز فیراڈ ہے فیراڈ —" فیروز نے سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔

طلعت کو غصہ آگیا۔ وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا کر اس نے کہنا شروع کیا:

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی، مجھے معلوم ہے دوست
میز میں پیر لگا۔ میز کو جھٹکا سا محسوس ہوا
ہل گئی میز تو کافی چھلکی، کافی چھلکی تو مگر گر نہ سکی
میز کا فعل عبث
یا مرا فعل عبث
دونوں میں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں
گھور کر دیکھ نہ یوں دوست مجھے
بدتمیزی سے عبث دور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے یہ گہرے نکات
میز تو میز ہے گردوں کو ہلا دیتے ہیں
اور سیارے چھلک جاتے ہیں
ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں۔ "اس کا عنوان کیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"فیراڈے — ہی سمجھ لو — تال جسن کی تازہ ترین تصنیف ہے۔"

"اچھا، سریکھا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ انھوں نے فون پر مجھے اسی وقت کا اپوائنٹمنٹ دیا تھا۔"

سریکھا دوسرے کمرے میں ڈیج انڈر نیزین تعاملوں کو ریہرسل کرا رہی تھی۔ "تم اپنے حواس میں ہو۔" طلعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ "یہ تم لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دینے لگیں؟"

"روشن کو تم نے کہاں غائب کر دیا؟" وہ گرجی۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سمے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔" طلعت نے جواب دیا۔

"ہائے کس قدر دلچسپ۔" ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔ "میری ہمیشہ تمنا تھی کہ بیک اسٹیج زندگی دیکھوں۔"

"کیا ذلیل تمنا تھی۔" طلعت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دل میں کہا۔

"نمستے جی۔" سریکھا نے بے حد سنجیدگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔" اس نے فوراً انٹرویو دینے والا انداز اختیار کیا۔

"تمھاری رائے نے سب کا بیڑا کر دیا۔" ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملا نے طلعت سے کہا۔

"ایں؟"

"ہاں۔ مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی لیڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اُتر آئیں تو کیا ہوتا؟"

"تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی لیڈر ہوتیں۔" طلعت نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن اب وہ انسپریشن کی تلاش میں رومینٹک جنگلوں میں گھومتی ہیں۔" نیرو نے کہا۔

"جنگلوں میں؟" کملا نے پوچھا۔

"ہاں جنگل یعنی ووڈلینڈ۔"

"سینٹ جانز ووڈ لینڈ؟" طلعت نے سوال کیا۔

"کیپنے بن پرمٹ اتروے" فیروز نے کہا۔

"دراصل سینٹ جانز ووڈ کے اسٹوڈیو فلیٹس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اور ان میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفسیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا ہے۔ اور دوسری بات یہ ——" کملا نے خفگی سے کہا، "کہ اگر تم نے روشن کو کوئی سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب کی گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لیتی۔"

"وہ لامحالہ گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کرے گی۔ وہ فلسفی ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورژوا فلسفی ہے۔" طلعت نے کہا۔ "ارے جب میاں بنرے باگوں میں آئے — مالی بھئے اگوانی —" اس نے ڈھول اٹھا کر الاپنا شروع کر دیا۔

"اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا آخر؟" سریکھا نے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

"پیرس میں کزن شاہ رخ سلطانہ ڈاکٹری پڑھتی ہیں۔ یہ اب تک روشن کو معلوم ہی نہ تھا۔" طلعت نے کہا۔

"اتفاقات کے یہ گہرے نکات —" سریکھا نے سیٹی بجائی۔

"میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔" فیروز نے دریچے میں سے باہر گلی میں کودتے ہوئے کہا۔

(۸۲)

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ اسٹیٹ گارٹ، ترویز، ویزن ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ لیا۔ کرسمس کے پینٹومائم شروع ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹرن برگ میں جار خانے دار موزے پہنے غریب جرمن لڑکیاں کرسمس کی خریداری کر رہی تھیں اور امریکن سپاہی انھیں سگریٹ کے ڈبے تحفے میں دے رہے تھے۔ نوتردام کی راہبات سین کے کنارے کنارے اپنی بطخیں ہانک رہی تھیں۔ ونٹر سپورٹس کا زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علحدہ کر دیا گیا تھا۔ وکی بام نے شاید کوئی نیا ناول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پگھلی۔ درختوں میں نئی کونپلیں نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید، خالص رنگ بکھر گئے۔
خزاں آئی۔ جنگلوں میں سرخ آگ ایسی لگ گئی، تیز سرخ بتوں کے انباروں نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپا لیا۔ ہوا کی نیلاہٹ میں زردی شامل ہوگئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا۔ وہ غیرارادی طور پر قبروں کے کتبے پڑھنے لگی۔ پھر وہ اندر گئی۔ چیپل خالی پڑا تھا۔ گھسے ہوئے اوک کی بنچیں۔ بپتسمہ دینے کا سرد حوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور کپتانوں کی تاریخ وفات کی پیتل کی تختیاں لگی تھیں جو اس قصبے میں پیدا ہوئے اور سلطنت کی حفاظت کرتے ہوتے جانسی اور کابل اور رنگون میں کھیت رہے۔ اس نے بے دھیانی سے ادھر اُدھر گھومتے ہوئے چند سکے فنڈ کے ڈبے میں ڈال دیے۔

"ہلو۔ میری بچی —" بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا۔ وہ پیچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا رہا تھا۔

"ہلو۔ گڈ ایوننگ —" اسے بے حد ڈر لگا۔ اس نے مسکرا کر چند اور سکے بکس میں ڈال لیے اور باہر آگئی۔ کیا فضول بات ہے۔ چرچ بنا رکھے ہیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی بنچ پر سر رکھ کر پڑی سوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے۔ جزیروں میں سے گزری تھی۔ طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔ اونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند یک لخت سامنے آجاتا تھا اور رچاردں اور سائپرس کے درخت تھے۔ آسٹریا۔ یونان۔ اٹلی۔ اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سریکھا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔
"وہ سب ایکٹنگ تھی۔" اس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔
"پتا ہے۔" عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا پتا تھا۔ خود ان کو نروان ملنے والا تھا۔ نروان کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔
"مجھ میں بہت کمال کا اسٹیج سنس ہے۔"
"معلوم ہے — تم نے بھی کالج میں ایلوکیشن سیکھا ہے اور اسکا لا تھیٹر میں تم —"
"ہاں —" اس نے خوشی کے لہجے میں بات کاٹی — "اور اسی لیے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے مسرت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھ دار ہو — دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔

میں صدقِ دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔"

"میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔" اس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکے سیٹی بجاتے رہے۔

(۸۳)

سوتا ہوا چاند کابل سے چارول اور تیر گیا۔ بالکنی کے نیچے سریکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نئے اسٹیج ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں۔

"وہ دیکھو۔ چاند مر رہا ہے۔" اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔

"ہاں۔" روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاند مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے رحم و کرم پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

"تم نے دیکھا۔" سریکھا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "یہ سب اسٹیج کی سینری تھی۔ ڈیزائن۔ ڈیکور۔ کینوس کے رنگین پردے۔ پردیس۔"

گیلری میں لفٹ آن کر رکا۔ طلعت اور نرگیش اندر آئیں۔ وہ نرملا کو دیکھنے نرسنگ ہوم گئی تھیں اور واپسی میں انھوں نے دیکھا کہ مینرل میٹر کا جنگل وہاں نہیں تھا۔ تب طلعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ مینرل میٹر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کملا نے روشن کو غور سے دیکھا، گویا اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر وہ اپنی اور سریکھا کی بھرت ناٹیم کی ملبوسات کو الٹنے پلٹنے لگی

"کملا۔" طلعت نے دفعتاً کہا۔ "لوئی میک نیس کی وہ نظم سنا دو۔"

"کون نظم؟"

"وہی — جو 'خزاں نامے' میں شامل ہے۔"

کملا آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"I loved my love with a platform Ticket"
A handbag, a pair of stockings of Paris and
I loved her long
I loved her between the lines and against the clock,
Not until death
But life did us part
I loved her with peacock's eyes
and the wares of Carthage.
With blasphemy, camaraderie,
and bravado and lots of other stuff.
I loved her with my office hours, with flowers and
Sirens,
With my budget, my latchkey
and my daily bread ;
And so to London and down the
ever-moving Stairs."

سب خاموش بیٹھے رہے۔

"کملا —" طلعت چلائی — "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ قریب آکر ٹھنڈے سنگ فرش پر بیٹھ گئی۔

"تمھیں یاد ہے،" کملا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جولائی یا اگست کی ایک شام، جب بارش ہو کر تھمی تھی، گلستاں بالکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں اور نرملا اور تم اکیلے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی روشنی سارے میں پھیل گئی تھی۔ اور اس سمے دو سنیاسنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر آگئی تھیں اور مصر تھیں کہ ان کو دکشنا دی جائے۔ اور بچوں کی طرح ہمیں ایکا ایکی یہ خیال آیا تھا کہ یہ چڑیلیں ہیں، ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں، ابھی یہ ہمیں کوئی شراپ دیں گی، ابھی کچھ ہوگا، اس سناٹے میں کوئی خوفناک انجانی بات ہوگی۔"

"پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑبڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ ہم نے خوفزدہ ہو کر انھیں زور سے ڈانٹا تھا۔" طلعت نے آہستہ آہستہ کہا۔ "اور پھر ہمیں ہوا کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہمے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے — میں نے کوشش کر کے آیۃ الکرسی پڑھی تھی اور تم نے ایشاہ کا اکلوتا اشلوک دہرانا چاہا تھا جو تمھیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔"

"وہ بڑی سنسان شام تھی،" کملا نے یاد کیا۔ "تم نے کبھی سوچا ہے، ساری شامیں بہت سنسان ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی بے پایاں اداسی ہوتی ہے۔ شام — جب دونوں وقت ملتے ہیں، جب ہم جگمگاتے کمروں میں ہنستے ہیں — اس وقت بھی دفعتاً بڑے رنج، بڑی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔"

پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے تھے اور وہاں لاج کے

ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت ہنسے تھے۔" طلعت بولی۔

"وہ سینیا سنیں ہمیں ہر جگہ، ہر موڑ پر ملتی ہیں۔ وہ ہمیں بد دعائیں دیتی ہوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں میں نے ان سنیاسنوں کو چلا چلا کر روتے سنا ہے۔" کملا نے کہا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے مردنگم بجنا شروع ہو گیا۔ آج رات سریکھا اور کملا کا ناچ ہے۔ سارا عالم دیکھنے کے لیے آئے گا۔ طلعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔ "میں واپس جا رہی ہوں۔ تم لوگ مجھے کبھی کبھی خط لکھا کرو گے؟" طلعت کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں التجا تھی۔

"ہاں۔ ہم تمھیں ہر سال عید اور سالِ نو کے کارڈ بھیجیں گے۔" طلعت نے کہا۔ (کیا انجام بس اتنا ہے۔ کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشن کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ راہ میں جب مختلف خرابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشگوار تعلقات کو گھسیٹا جا سکتا ہے۔) ہاں۔ ہم تمھیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیر۔" اس نے دہرایا۔ "ہم سب ایک شراپ کے زیر اثر ہیں۔"

مردنگم کی آواز تیز ہو گئی۔ نادر دام تا نادری دے نا --- سریکھا چھن سے اسٹیج پر آئی۔ اب حسبِ معمول میں ناچوں گی۔ اس نے سوچا۔ کملا ناچے گی۔ سب ناچیں گے۔ ای ریو جنتی سورم۔ سشیدم۔ تو جاری رہے۔ ایسی کیا خاص بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔ کرِدھنگ تام تت تام۔ کرِدھنگ تئی تت تئی۔ کل مجھے دلی ویژن پر ناچنا ہے۔ پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لیے رقص کرنا ہے۔ دریا بہے جا رہا ہے۔ ڈلن ٹامس مر گئے۔ بلبل چودھری مر گئے۔ روشن --- افسوس کہ وہ بھی شاید مر گئی۔

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔ صرف راڈا کی چند لڑکیاں اور لڑکے ادھر ادھر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اخباروں کے نمائندے کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے سریکھا دیوی کے قیمتی الفاظ سننے کے لیے کان لگائے کھڑے تھے۔ کارڈ بورڈ کے سیٹ افراتفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔

"رقص میری زندگی ہے۔" سریکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر سر ٹکاتے ہوئے انٹرویو والی شائستہ اور متوازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

"خداوندا --- سریکھا۔" طلعت نے بے انتہا بور ہو کر جمائی لی۔

"شش --- میں پریس کو بیان دے رہی ہوں۔"

اخبار کے رپورٹر مسحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طلعت نیم تاریک آڈیٹوریم کی ایک نشست پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔ یہ ننھا سؤر مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سؤر مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سؤر گھر پر رہا۔ اس ننھے سؤر نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ ننھا سؤر سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا۔۔۔ وی وی وی وی وی۔۔۔

(۸۴)

وی وی وی وی۔۔۔ شور اب آسمان تک پہنچ گیا۔ چمپا نے دریچہ بند کر دیا اور ہوسٹل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سہ پہر کا سناٹا طاری تھا کل کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ (زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے۔) یہ تجربہ بھی غالبؔ ناکام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دور دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہریالی پر نیلی گھٹائیں چھائی تھیں۔ وہ بیکس پر سے گزرتی لائبریری کی طرف جانے والی پلیا پر آ گئی۔ "شولوم علیخم۔" ایک یہودی طالب علم دوسرے یہودی طالب علم کو، جو پلیا پر بیٹھا تھا، سلام کرتا ہوا سائیکل پر گزر گیا۔ "تم پر خدا کی رحمت ہو۔۔۔"

"تم سب پر خدا کی۔۔۔ رحمت ہو۔" چمپا نے دل میں دہرایا۔

زندگی میں بذاتِ خود اتنی شدت ہے۔ اس کے لیے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر رکیک بن جاتے ہیں۔ یہودی طالب علم، جو پلیا پر بیٹھا تصویریں بنا رہا تھا، اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل گیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" اس نے چمپا سے درخواست کی۔ "میں تمہارا اسکیچ بناؤں گا۔" وہ بیٹھ گئی تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ "آج آخری دن ہے۔ کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔ تمہارا اسکیچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔" اس نے تندہی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔

چمپا نے جھانک کر دیکھا۔ اسکیچ بڑا خراب تھا۔ مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چپکی بیٹھی رہی۔ شاید میری اصل شکل ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ "یہ ناکام مصور ہی شاید میری شبیہ اتارنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔"

"پسند آئی تم کو تصویر؟" یہودی لڑکے نے خوشی سے پوچھا۔ "میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم کو کس طریقے سے خوش کر دوں؟" وہ بڑا پُرخلوص نظر آیا۔

"تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔" چمپا نے دفعتاً بڑی کرختگی سے کہا۔ (ہم سب کمینے ہیں۔ مسرت کی خوشی میں ہماری چار سو بیس تو دیکھو۔ اس نے دل میں سوچا۔)

"وہ کون ہے؟" لڑکے نے یکلخت بے حد رنجیدہ ہو کر پوچھا۔ "وہ کون ہے جو تم کو مسرت بخشے گا؟"

"یہ بڑا بے رحم اور کمینے پن کا سوال ہے۔"

"معاف کرنا۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"اچھا۔ خدا حافظ شولوم علیخم۔" چمپا نے مسکرا کر کہا۔

"شولوم علیخم۔" لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا جدھر مائیکل اور ڈینس کھڑے تھے۔

"سرل اب تک نہیں ملا؟" ڈینس نے سراسیمگی کے عالم میں چلا کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"کہاں غائب ہو گیا سرل۔" ڈینس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

"میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں ڈینس۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ چمپا، مجھے معاف کر دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا؟" مائیکل نے عجز سے کہا۔

"نہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔"

"آج آخری دن ہے چمپا۔"

"ہاں۔"

"چلو چل کر آخری مرتبہ کوہِ نور میں کھانا کھا لیں۔"

"آج آخری۔" سب یہی دہرا رہے تھے۔ وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا۔

ریستوران میں بیٹھ کر انھوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے تو روشن کمار کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دوسرے سے اتنی ہمدردی کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بہی خواہ ہیں۔ اب میں پھر کمینے پن پر اتر آئی ہوں۔

چند روز قبل اس نے برسبیلِ تذکرہ روز ماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

"اچھی ہے۔" سرل نے جواب دیا تھا۔ "وہ غریب تو بیماری کی حالت میں بھی نوکری کرتی ہے تاکہ میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کر سکوں۔"

"۔۔۔ اور دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاسکو۔" چمپا نے بے دھیانی سے کہا تھا۔ یہ سن کر سرل چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اس روز سے سرل غائب تھا۔ کالج کے کواڈرینگل میں، گلیوں میں، ندی کے کنارے، قہوہ خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں کہیں سرل کا پتا نہ تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھیگتا دکھائی دے گیا۔ ڈینس لپک کر اس کی طرف دوڑا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر مائیکل اس کو بلانے کے لیے گیا۔ مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم برساتیاں اوڑھے خراماں خراماں چل رہے تھے۔

"اندر چلو۔ یہ کیا بچپنا ہے۔" چمپا اٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بکو مت۔"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔" اس نے آہستہ سے ڈینس سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا تھا: تمہاری بی بی اس لیے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاؤ۔

پھر وہ چمپا کی طرف مڑا۔ "تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہوگی کہ روزماری نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تمہارا۔ تمہارا دماغ یعنی کہ ۔۔۔ بالکل چل گیا ہے۔" چمپا نے ہڑبڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مائیکل اور ڈینس اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفرت جو اس نے تہمینہ، نرملا اور رخشندہ کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

"ہاں۔" سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈینس اور مائیکل خاموشی سے ریستوران میں واپس چلے گئے۔

بارش چمپا اور سرل پر برستی رہی۔

"چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھیگنے کی کون تک ہے۔"

"ایسے تو کس بات کی کون تک ہے۔" سرل نے اسی انداز میں کہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔ "دیکھو تو سہی۔ بالآخر مجھ پر بھی تمہارے ایفلوئنس کا اثر ہو ہی گیا۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل" چمپا نے دوبارہ کہا۔

"ہر واقعہ منفرد ہے۔ دہرایا نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا چمپا کہ لمحے دہرائے جا سکیں گے۔ تمہاری زندگی — میں — یہ ساری چیزیں۔ وقت کے المیے پر تم ہنس نہیں سکتیں —"

"چلو — میں تمہاری طرف چلتی ہوں" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پاتھ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناسا لڑکے اور لڑکیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو ہلو کہتا جاتا۔

"تم کیا واقعی — میری وجہ سے — یعنی کہ —" اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ "یعنی کہ"، اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا "کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔" فیصلہ — اور اس کی وجہ — دو چیزیں جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

"جی نہیں — مجھ کو بقول تمہارے باؤلے کتے نے کاٹا تھا" سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں ماں کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔"

چمپا چوراہے پر آکر دفعتاً اپنے ہوسٹل کی سمت مڑ گئی۔

"تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھے مستفید کرنے میرے ہوسٹل آرہی تھیں!"

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"یہ تمہارا آخری، قطعی جواب ہے؟" سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

"آخری، قطعی، بالکل۔ تمہیں اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تم گوتم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کرو گی؟"

"میری توہین مت کرو سرل" چمپا کے تن و بدن میں آگ لگ گئی۔

"اچھا — اچھا" سرل نے سانس روک کر کہا۔ "سڑک پر جھگڑا مت چمپا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غلطی میری ہی تھی۔ خدا حافظ۔" بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہرا گئے۔ ہوا میں خنک گلابوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کالج گئی۔ رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔ سینور کارلوس برازیل جا رہا تھا۔ اس سے اسی کی کتنی تکرار رومن کیتھولک فلسفے پر ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بارش سے بچنے کے لیے پھاٹک کے اندر کھڑے تھے۔ پھاٹک کا بھاری، پندرھویں صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہوگا۔ اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو

سب کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا

بارش اور زور سے ہونے لگی۔ پورٹر ٹیکسیاں لے لے کر آ رہے تھے۔ لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اٹھا لیے تھے۔ لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھیں۔ سب خاموش تھے۔ اب بات کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹس آئی تو تم سے ملنے نارتھ ڈیکوٹا ضرور آؤں گی۔ یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آ کر ٹھہرنا۔ یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی۔ اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے مگر نہیں۔ کھڑے ہیں۔ بے ربط، بے تکے جملے ادا کیے جا رہے ہیں۔ نظریں بچا بچا کر آنسو پیے جا رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ ٹیکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنسان کوارڈرینگل کا چکر لگایا۔ چیپل میں گئی۔ سنگِ مرمر کی تختیوں پر ان لڑکوں کے ناموں کو آخری بار پھر سے پڑھ ڈالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ مالیوں سے بات کی۔ ایک خانساماں ڈائیننگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا گویا وہ خود میدانِ جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے۔ پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو جیزس لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ "میں تم کو ڈھونڈھ رہی تھی۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ "میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟"

"پتا نہیں کیٹ۔" چمپا نے اس لایعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ "سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔" اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو سینئر کومن روم میں بیٹھا ہے۔" کیٹ نے جواب دیا۔ "اس کے مزے ہیں۔ کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا، ڈاکٹریٹ ختم کرے گا۔ اور تم کو معلوم ہے، مجھے کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے — یوکن۔ اچھا ڈارلنگ — خدا حافظ۔"

چمپا کچھ دور تک اس کے ساتھ چلی اور پھاٹک تک پہنچا کر سینئر کومن روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سناٹا طاری تھا جسے صرف برستی بارش کی آواز مخل کر رہی تھی اور پتوں کی سرسراہٹ۔ سرل ایشلے کومن روم میں، دریچے کے پاس، چمڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معمہ دیکھ رہا تھا جو لنگڑے مارٹن پر ہفتے اپنی انتہائی انٹلکچول ریڈنگ پبلک سے حل کرواتے ہیں۔ چمپا کمرے میں آ گئی۔ تب بھی وہ معمہ حل کرتا رہا۔ پھر جب چمپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے سر اٹھا کر ایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی۔ چمپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو۔" اس نے خالص برطانوی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دفعتاً دیکھا کہ اس کے سامنے، صوفے پر، سنہرے بالوں والا ایک برطانوی لارڈ کا لڑکا تھا: قدامت پسند، مغرور، خاموش طبع، باوقار۔ اس لڑکے کے ساتھ اس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناتے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے اس کے ساتھ گھنٹوں دیوانی بحثیں کی تھیں، کیم میں کشتی رانی کی تھی، کھیتوں میں دوڑتے ہوئے گیت گائے تھے، جو چمپا کے ذہن اور روح کے مصور میں بلا خوف و خطر کود نے کے لیے تیار ہو گیا تھا، جس نے صبح بارش میں بھیگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈمن ہاورڈ ایشلے تھا جس نے معمہ حل کرتے ہوئے بڑی تمکنت سے اس سے پوچھا: ”تم اب تک گئی نہیں۔ کون سی ٹرین سے جا رہی ہو؟“

”ساڑھے چھ کی ٹرین سے۔“ چمپا نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ ”تم کب لندن آؤ گے؟“

”جب بھی آؤں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں تم سے عمر بھر نہیں ملنا چاہتا۔“

وہ خاموش رہی۔ بانی کی شفاف پھوار دریچے پر ٹکرایا کی۔ ہوا کا بھینا بھینا پن کمرے میں رچ گیا۔

یکلخت چمپا نے نہایت بشاشت سے باتیں شروع کر دیں۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد کے جو پروگرام گروہ کے افراد نے بنائے تھے ان کا ذکر کیا ”میں تو ابھی قانون پڑھوں گی۔“

”مبارک ہو۔ اس کے بعد کیا کرو گی۔“

”علم نجوم تو مجھے آتا نہیں کہ بتا دوں کہ ۱۹۶۰ء میں کیا کروں گی اور ۱۹۶۵ء میں میرا کیا ارادہ ہے۔“ اس نے خوشدلی کا لہجہ برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ رسالے پر جھکا رہا۔

”تم البتہ ڈاکٹریٹ لینے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے۔ تنقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھو گے۔ ٹی وی کے برین ٹرسٹ کی پینل پر بیٹھو گے۔ دنیا عش عش کرے گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کر لو۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔“

”اچھا اب چلنا چاہیے۔“ چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اگر میں تمھاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تاخیر نہ کرنا چاہیے۔ ٹرین کا وقت قریب ہے۔“ سرل نے

کہا اور کھڑا ہو گیا۔ گویا، اب تشریف لے جایئے بیگم صاحبہ۔

چمپا نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ نظر ڈالی۔ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت نادم ہوتی تھی۔ دروازے تک آ کر اس نے سرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ بہت نیچا تھا۔ کئی سو سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح اس دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھائے رکھا۔ "اتنے عرصے ۔" اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ، صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ "تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ خدا حافظ۔"

وہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

"تم مجھے پھاٹک تک چھوڑنے نہیں آؤ گے؟" اس نے یک لخت اپنی اٹل، ازلی اور ابدی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"نہیں،" سرل نے جواب دیا۔ "مجھے معمہ حل کرنا ہے۔ اور خدا کرے میری تم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو۔"

وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کواڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دریچے کے اندر رسالے پر جھکا معمے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھاٹک کھولا اور سنسان سڑک پر آ گئی۔

سرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

(۸۵)

بس بڈہرسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ہیزل میئر کے جنگل پر شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ سڑک کے لیمپ لطیف سے دھندلکے میں ٹمٹما رہے تھے۔ چاروں اور اونچے درخت کھڑے تھے، انسانوں کی قسمتوں کے پاسبانوں کی مانند، خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفر طے کر کے بس مڈ ہرسٹ کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہو یا کسی ان دیکھے اسکاؤٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سگنل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے، روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمبر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پہ چڑھنے لگا۔ اندھیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگمگاتی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نرملا کے کمرے میں داخل ہوا۔

نرملا اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"بی بی۔" گوتم کی آواز یکایک اس کے حلق میں رندھ گئی۔ باہر کی شور مچاتی، خود غرض، دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کاہے کے انتظار میں مصروف تھی۔

اس کو دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلائی کہ کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

"اُفوہ۔ تم تو بے حد صحت مند نظر آ رہی ہو۔ بالکل مسز خانہ رخ فرخ آبادی۔" عیادت کرنے والوں کی طرح بہ بشاش انداز اختیار کرتے ہوئے گوتم نے دل میں خود کو گالیاں دیں۔

"کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو پتا چلے گا بچہ جی کو۔ آج بھی میرا بخار ایک سو ایک تھا۔ اب تو مہینوں سے چلا آ رہا ہے۔" اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسبِ معمول لندن کے تازہ ترین اسکینڈلز سنانے کی فرمائش کرے گی۔ دوستوں کے جمِ غفیر کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرے گی۔ بات بات میں جرح کرے گی۔

نرملا تو، جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا، اب تو میری روح میں شامل ہے۔

مگر وہ دو لڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ چمپا — اور یہ لڑکی — جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود نہ تھیں، سیدھی سادی، خوش خلق، معصوم لڑکی۔

چمپا، جو "وومن آف دی ورلڈ" بن چکی تھی، ہمیشہ سے مردوں کی اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔ تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے مگر اس کے باوجود بے بس تھی اور اس کی توجہ کی منتظر۔ نرملا تھی جو بسترِ مرگ پر پڑی تھی، گھریلو، ناتجربہ کار، اس کی توجہ کی منتظر۔ وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔ کس قدر کوشش کے

بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ ایک ملک اور دوستوں کے ایک حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا۔ مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈرڈ اور روم اور ویانا میں بجتے ہوئے آرکیسٹراز میں سنائی دیتی، بارش کی پھوار میں، بازاروں اور طعام خانوں کی چہل پہل میں، اٹلانٹک کی لہروں میں، نیویارک کے شور و شغف میں — ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آ رہی تھی۔ آوازوں کے تلاطم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔ شاید سناٹا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی، نرملا سناٹا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں: لکھنؤ کے بادشاہ باغ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، کوسی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے، گلفشاں اور سنگھارڑے والی کوٹھی اور پروفیسر بنرجی کے گھر اور کیلاش ہوسٹل کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھے ہوئے، بکنکوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔ اسے وہ سب باتیں یاد تھیں، وہ سب شامیں، دوپہریں، لمحات۔ یہ سب سروں کا ایک تسلسل قائم تھا، اٹل اور مضبوط۔ کیونکہ جب گیت ختم ہو جائے تب بھی سُر فضا میں موجود رہتا ہے۔ نرملا خاموش تھی۔ گومتی خاموش تھی — برسات کی دوپہر کا سکون، جب بارش ہو کر کھلی ہو۔ کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔ نرملا نے اس سے کبھی خصی باتیں نہ کی تھیں۔ چمپا کے ہر لفظ، ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی mystic رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا: مدتیں گزریں جب وہ پہلی مرتبہ لکھنؤ گیا تھا۔ اس نے سنگھارڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ مجھے افیشل طور پر بردکھوے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے مگر میری ہونے والی منگیتر نرمل رانی کو اپنی الٹی سیدھی بکتوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں۔ ہاں نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود سپردگی کا انداز کبھی نہ آیا۔ وہ علاحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش۔ دیبی کی طرح بلند اور اتم۔ دیبی کی طرح سکون بخشنے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے — اس نے نرملا پر جھک کر دل میں کہا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”گوتم!“

”ہاں — بی بی —“

”سریکھا کا نیا فلیٹ کیسا ہے؟“

اس نے تفصیل سے سریکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ ”اب اچھی ہو جاؤ تو آ کر خود ہی دیکھ لینا۔“

”ہاں — بالکل۔“ نرملا نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

”آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں، طغیان بھاگل پوری۔“

"ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟"

"بہت سخت۔"

"یحندرا ابھی ہے؟"

"ہاں ہاں۔"

"تمہارے سنئے نئے دوستوں کا ذکر سن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں، خصوصاً رمیش سگوی سے۔"

"ہاں۔ رمیش سگوی بالکل آفت کا پرکالہ ہے۔" گوتم نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

"اب رات زیادہ آگئی ہے گوتم ماتھر۔" نرملا نے حسبِ عادت کمال اور ہری شنکر کے لہجے میں اس سے کہا۔

"ہاں۔" وہ کرسی پر سے اُٹھا۔

"ارے رے رے ایک بات تو سنو۔" دفعتاً نرملا نے بشاشت سے کہا۔ "اتنی زبردست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔"

"کیا؟" گوتم نے آہستہ سے پوچھا۔

"کل طلعت بتا رہی تھی کہ چمپا باجی اپنا فائنل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے لندن آگئی ہیں۔ تم کو معلوم ہے؟"

"نہیں۔" گوتم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں بھر کر گالیاں دیں۔

"اچھا۔" نرملا نے سادگی سے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا شاید طلعت نے بتایا ہو۔ تم ان سے مل لو ضرور، بے چاری سے۔" اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

"مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے نرمل کہ میں لوگوں سے سوشل ملاقاتیں کرتا پھروں۔ ایچ سی[ل] رات کے دس دس بجے تک کام کرواتے ہیں۔" اس نے نظریں بچاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "اچھا بی بی، خدا حافظ!" وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا، گویا نرملا کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہو۔

نرملا، جس کا چھٹا حس بیدار ہو چکا تھا، سمجھ گئی کہ گوتم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ اس کو چمپا باجی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگ کو دیکھ کر نرملا کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا باجی سے ضرور ملے گا۔

[ل] ہائی کمشنر

نرملا نے آہستہ سے بیڈ سوئچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

(۸۶)

گوتم نے نرملا سے جھوٹ بولا تھا۔ اس روز، مڈہرسٹ آنے سے کچھ دیر قبل، اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کار کوئی دوست لے گیا تھا اور وکٹوریہ اسٹیشن جا کر وہاں سے مڈہرسٹ کے لیے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دیر ہوئے جا رہی تھی اور اب یہ فون آ گیا تھا۔

اُس نے ریسیور اٹھایا۔

آواز — اس کے کانوں میں پہنچی۔

"گوتم — ہلو — ارے بھئی گوتم —"

وہ خاموش رہا۔

"گوتم نیلمبر" دوسرے سرے پر چمپا نے زور سے کہا "کیا بات ہے؟ میری آواز سن رہے ہو؟"

"سن رہا ہوں"

"فون خراب ہے کیا؟"

"نہیں تو —"

"شرم کرو —" چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی۔ "ڈوب مرو جی — حد ہے۔ میں اتنے برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی توفیق نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے۔ کیا میں کھا جاتی تم کو؟" پھر وہ ہنسی۔

وہ چپکا رہا۔

اتنا بڑا ڈپلومیٹ اور حاضر جواب، بذلہ سنج آدمی اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اور چمپا نے کہا تھا: "میں کیمبرج سے آ گئی ہوں اور جون کارٹر کے یہاں ٹھہری ہوں۔ آؤ کسی روز ملنے۔ تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا۔ اب مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔"

"ہاں چمپا، میں ضرور آؤں گا،" گوتم نے ہڑبڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "دراصل — وہ تم جانتی ہو لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات — یہ کوئی لکھنؤ یونیورسٹی کا زمانہ

تھوڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھے گپ کر رہے ہیں — اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دورے پر رہتا ہوں۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں، کل وہاں جا رہا ہوں۔ جب کبھی کشمیر کیس یو۔ این۔ میں جاتا ہے تو کرشنا مینن کے ساتھ پندرہ چکر نیویارک کے لگانے پڑتے ہیں — ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برابر دریافت کرتا رہا۔"

اس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انتہا نروس ہو کر سگریٹ جلایا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سن کر اس قدر مسرور ہے جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو، جیسے اسے راج سنگھاسن پر بٹھلا دیا گیا ہو۔

مڈہرسٹ سے واپسی میں رات کے بارہ بج گئے۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہلو— کون ہے؟" ادھر سے نیل کی سوتی سوتی آواز آئی۔

"مس احمد ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں چلی گئیں؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"آپ کون صاحب ہیں۔"

"نیلمبر۔"

"ہلو ہو— ہلو مسٹر نیلمبر— مس احمد نے شام کو کئی بار آپ کو فون کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے۔ اس وقت تو وہ جون کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔"

"اوہ۔"

"آپ نے گیننگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا؟ کوئی ضروری بات ہے؟" گوتم کی آواز کی سراسیمگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔ "فیروز، سریکھا، تزینہ، کملا، طلعت — ان سب کے یہاں فون کر دیکھیے۔ شاید مل جائیں۔"

"بہت بہت شکریہ نیل — میرے خیال میں اب رات بہت آگئی ہے، کل دیکھا جائے گا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گڈ نائٹ —" اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور سگریٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

(۸۷)

اس رات ٹیمز کی ایک لانچ پر بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جون کے ساتھ چمپا وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرشے پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے: کالے، گورے، انگریز، فرانسیسی۔ لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلنگ پر جھکے وہ لوگ باتیں کر رہے تھے:

ارے یہ پرو گریسو ہو گئیں! جون کارٹر کے ساتھ گھومتی ہیں۔ سنا ہے پہلے تو بڑی سخت لیگر تھیں انڈیا میں۔" کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

"ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے اور پھر ہندوستانی مسلمان! ان سے زیادہ دوغلا اور خطرناک کون ہو گا!" ایک مراٹھی ڈاکٹر نے کہا۔

"اور سُنا ہے"، پہلے نے کہا، "رضا، جو کمال اور طلعت کا کزن ہے، اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اُس نے گھاس نہیں ڈالی۔ وہ آج کل کیمبرج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منسٹری کا سکرٹری ہے۔"

"روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں، دراصل اس کا جی بھر گیا۔ بور ہو گیا بیچارہ۔"

"میں یہ نقطۂ نظر خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لڑکیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار۔ میں رضا کے نقطۂ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو۔ کیونکہ کل میں ایلین سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

فوراً ہلڑ شروع ہو گیا: "یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے۔ اس رات کو اچھی طرح منالو بھائیو۔" کمال نے اسٹول پر چڑھ کر رقت انگیز آواز میں کہا۔

وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پب کی طرف روانہ ہو گئے۔

عرشے پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان، جس نے سب سے پہلے یہ تذکرہ چھیڑا تھا، سیڑھیں

اترتے ہوئے کمال سے بولا:

"عامر رضا بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے بچ جاتا ہے۔"

"مگر دیکھ لینا آخر میں کرکری کھائے گا۔"

"ابھی بعد کی بات دیکھی جائے گی، فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔"

"ہاں بھائی۔"

"اور یار یہ کزن شاہ رخ سلطانہ کون ہیں۔ تمہاری رشتے دار ہیں؟"

"آج تک تو میں نے ان کا نام سنا نہیں تھا شاید پاکستان میں بھیا صاحب کی کوئی عزیزہ پیدا ہو گئی ہوں۔"

"جرمن سنتے ہوتے آئے تھے، یہ پاکستانی کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔"

"دراصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔"

"اوہ آئی سی۔"

آوازیں ڈوبتی چلی گئیں۔ کشتی آگے بڑھ گئی۔ چمپا اتر کر کنارے پر واپس آگئی اور تلو بطرہ کی سوئی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضا رات بھر یہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اس رات بھی پورنماشی کا چاند دریا کی لہروں پر بہہ رہا تھا اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا: اپنے آپ سے، دنیا کے حسن سے، مستقبل سے۔ ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے، کوئی مسائل ــــ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا مگر اس کا تعلق بیتھالوجی سے تھا اقتصادیات سے نہیں۔ تلو بطرہ کی سوئی کے سائے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان لڑکوں کا خیال آیا تھا جو تلاش معاش میں سرگرداں تھے اور ان لڑکیوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ روپیہ اور عزت۔ اور ایک کوٹھی۔ اپنی ذاتی۔ ساٹھ ہزار کی مالیت کی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی، ڈرگ روڈ، کراچی میں۔ ایک امریکن کار۔ فریجڈیر ریڈیو گرام۔ زندگی کی اصل حقیقت، اٹم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔ زندہ باد زندگی۔ مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ صبح ہوتے سیڑھیوں سے اٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے۔ دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنؤ جا رہے تھے۔

(۸۸)

"میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہوگا 'پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ورمن ترواں۔'" کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بس یونہی ـــ اب جیمز جوائس اور ڈلن طامس کے بعد۔"

"کل ڈلن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں، ترنگ میں تھے مولانا۔" شنکر نے مڑ کر کہا۔

"اجی وہ تو تھے۔ آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل؟" گلشن آہوجہ نے کمال سے پوچھا۔ "یہ کیا پڑھ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔ یار خط آیا ہے گھر سے۔ یعنی لکھنؤ سے۔"

"کیا خبریں ہیں؟" طلعت نے پوچھا۔

وہ سب سریکھا کے وسیع ڈرائنگ روم میں فرش پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سریکھا وِلیر کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑھی گوٹ سی رہی تھی۔ طلعت اور فیروز باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ ہری شنکر بھی ان دنوں وہیں موجود تھا جو واشنگٹن سے آیا ہوا تھا اور قاہرہ جا رہا تھا۔ "یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں ـــ بالکل ابنِ بطوطہ بنے ہوتے ہیں ـــ آج کل۔ صبح صبح گوتم کا فون آیا تھا کہ پھر ماسکو جا رہا ہے۔" گلشن نے اظہارِ خیال کیا۔

"گوتم تو ہیوین سانگ بھی ہے۔" کمال نے کہا۔ "اکثر یہاں سے آیا کرتا ہے۔"

باغ میں چندرا ماتھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ ان سب کی پرانی دوست چندرا، جو نیویارک سے دلّی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی، بہت اچھا گاتی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر طفیان صاحب سریکھا کے شوہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ صبح صبح جب چمپا جون کارٹر کے گھر سے سریکھا کے یہاں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کنڈکٹر

اسے دیکھ کر خوشدلی سے مسکرایا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا: "مائی ڈیر، تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارا بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہوگا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ۔"

دنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار۔ کون کہتا ہے کہ دنیا غم خانہ ہے اور فلانا ہے اور ڈھمکانا ہے۔ دنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی۔ کل اس نے گوتم سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سُنی تھی۔

وہ سریکھا کے یہاں پہنچی۔ یہاں محفل جمی تھی۔ وہ بے حد مسرت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

"رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈوخانہ رہا۔" کمال نے اس سے کہا۔ "آپ کئے بجے تک گھر پہنچ گئی تھیں؟"

"ہم جب پہنچے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے۔"

"کیا خبریں ہیں بھئی۔ کس کا خط ہے؟" طلعت نے باورچی خانے میں سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

"ولایتی کا۔" کمال نے جواب دیا۔

"میاں ہری شنکر — اے بھائی ہری شنکر ہوت۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے آواز دی۔

ہری شنکر، جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا، پلٹ کر اندر آیا۔ "لو یہ گرم گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ ان کو دے آؤ۔"

وہی گلفشاں کا گھریلو ماحول یہاں بھی موجود تھا — گھر — جو اسے کبھی میسر نہیں ہوگا۔ چمپا کو ایک دریچے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری سی آئی۔

ہری شنکر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرے سرے پر دریچے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ نگارخانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ دریچے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدھم سورج۔ بوہیمیا۔ برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں۔ دھاری دار سن شیڈ۔ ایک کاہل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے اور دنیا فرانسیسی ادب۔ بڑے سائز کے کمفی کے ریکارڈ۔ سالزبرگ کے موسیقی کے تہوار۔ کیمبرج کے کواڈرینگل۔ اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرینچ ولیج، پیرس کے بائیں ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز ووڈ میں آباد تھی۔ اس دنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گہرے جذباتی تجربے تھے اور ادراک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔

چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دوسرے سرے پر پہنچ گئیں۔ پتا نہیں اب تم کھل کر ہنستی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھا یا نہیں، جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سریکھا، طلعت، فیروزان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔ کیسی سمجھ دار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں بنا یا رنگ گئی تو رنگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے ہیں ـــ" "چمپا باجی، لو پوریاں کھاؤ ـــ" اس نے باواز بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

"ان سب کو کیا ہو گیا۔ سب چپ ہو گئے ایک دم ـــ" طغیان صاحب نے باتیں کرتے کرتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

"ان سب پر خیالات سوار ہیں۔" گلشن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بڑا پُرسکون سمے ہے۔" طغیان صاحب نے کہا۔ "سریکھا دیوی کپڑے سینا بھی جانتی ہیں، مجھے گیان نہ تھا۔ کمال جی پوریاں کھا رہے ہیں۔ چندرا دیوی پھلواری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طلعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں۔ یہ تو بالکل گرو دیو ٹیگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے۔ پُرسکون۔ شاعرانہ۔ مدھر۔"

"ابھی دیکھتے جاتے ٹیگور کے ناول۔" گلشن نے چڑ کر کہا۔ "طلعت تم نے ساری پوریاں جلا دیں اٹھا کر۔ چاء بھجواؤ ـــ"

طغیان صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔

"ہلو ـــ ہری شنکر۔" چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔ "کیا بات ہے۔"

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔ "کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی ـــ چاء پئیں گی۔"

"بنا دو۔"

اس نے پیالی اٹھائی۔ چمچہ نیچے گر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں گھسے رہتے ہیں اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے جلاتے رہتے ہیں۔ "چمپا باجی ـــ" ہری شنکر نے کہا۔ "تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتھاہ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔" اس نے دفعتاً آہستہ سے کہا۔ "سنو ـــ یو۔ این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ نکلی ہے انڈیا کے کوٹے میں ـــ اس کے لیے کروں کوشش تمہارے لیے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا — میں عمر بھر اسی طرح ماری ماری پھروں گی؟"

"اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹی موٹی اینٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا۔ مگر یہ تو بڑی بہادر، فراخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا بُرا مانیں گی۔ "میرا مطلب ہے" — اس نے ہڑبڑا کر بات بنائی "کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چولھا ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ۔" اس نے باورچی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اجی میں تو کہتا ہوں کہ تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دندناتی ہوئی۔ تم بڑی گریٹ ہو چمپا باجی۔" اب اس کی آواز میں رقت آگئی — اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔

چمپا کو یکلخت ایسا لگا جیسے خاتمہ اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی ہنڈولا اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیان صاحب اسے ایک بہت عظیم بطخ نظر آئے جو نیچے سُروں میں قائیں قائیں کر رہی تھی۔

میں دیوانی ہو جاؤں گی — اس نے آہستہ سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہری شنکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

"چمپا باجی۔" اس نے کہا۔ "محبت کو خدارا جذباتیت میں تبدیل نہ کرو — توازن، ضبط، تناسب، کلاسیک گریک آئیڈیلز اصل چیز ہیں — یعنی کہ —"

"کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو —" چمپا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ "میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں معروف ہوں —"

"چمپا باجی —" ہری شنکر نے اسی طرح احتجاجاً کہا۔ "تمہارے خیالات گوتھک ہیں۔ ہمیشہ سے تھے۔ تمہارے جذبات میں واگز کا بوجھ ہے۔ پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی بیوروٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو — دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بدلیں۔"

جوں ہور او جیت بہادر ٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور کمال کی طرف چلے گئے۔

"ہری شنکر۔" چمپا نے جھک کر کہا۔ "مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔ مجھے شکست کا احساس آج تک

نہیں ہوا۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔"

ڈائننگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی۔ "ہم سب سائے ہیں سائے۔" وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

"جی ہاں درست ہے۔" گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

"کمیونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔" طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انھوں نے ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہرنس جائے طغیان صبا گلبودی تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

"میرے حضرت نے مجھ سے کہا۔" انھوں نے کہنا شروع کیا۔

ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سرسنگر میں رہتے ہیں۔" ہری شنکر نے چپکے سے چمپا کو بتلایا۔

"میرے حضرت نے مجھ سے کہا: بچہ تو روس جا۔"

"اور ان ملعون ملحدوں کو سچی سوشلزم کی مشعلِ ہدایت دکھلا کر راہِ راست پر لا۔" طلعت نے باورچی خانے میں سے لقمہ دیا۔

"انھوں نے تو بھئی اپنے حضرت کو بھی اچھا سدھایا۔" چندرا نے باغ کے دروازے میں آ کر کہا۔

طغیان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ کون بھیلا ہیں؟" انھوں نے سریکھا سے دریافت کیا۔

"یہ بھیلا بھی بڑے پروگریسو وچاروں کی مالک ہیں۔ لیکن ڈالر کمانے کی لالچ میں نیویارک کی آکاش وانی سے ہندی میں سماچار سنایا کرتی ہیں۔ ان کا ومان ابھی ہی یہاں پہنچا ہے۔" کمال نے جواب دیا۔

"آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟" چندرا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" طغیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ "ہوں تو سہی۔ پھر؟"

"ارے۔ میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوتم نیلمبر کو جانتے ہوں۔ اس نے پٹنہ یونیورسٹی

میں پڑھا ہے۔"

"جانتا ہوں — بیوقوف چھوکرا ہے۔" طغیان صاحب نے مختصراً کہا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ یہ بھی۔ تم بھی۔ گوتم نیلمبر بھی تمہارا — میرے حضرت نے کہا تھا۔"

"کمال — "طلعت پتیلیاں چولھے سے اتار کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی باہر آئی۔ "اپّی نے کیا لکھا ہے خط میں —"

"ارے ہاں —" کمال نے ادجیت سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ "وہ کچھ نہیں۔ بھیا صاحب کی شادی ہو گئی۔"

"ہائیں — وہ کب؟" کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم گپ چپ کالاڈو بنے بیٹھے ہو۔" طلعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھئی۔ ہم سب سائے ہیں۔" کمال نے اطمینان سے کہا۔ "ابھی تم نے سنا ہے طغیان صاحب کے حضرت کیا کہتے ہیں۔"

"تم بکواس مت کرو —" ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ "تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپّی نے۔"

"یار — ہوا یہ کہ —"

"شروع سے شروع کرو —" طلعت نے حکم دیا۔

"خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا —" گلشن نے حسبِ معمول اینٹھ سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب کمال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ کمال نے ماہرِ فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا دریچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

"بھائیو اور بہنو — تم کو معلوم ہی ہے کہ بھیا صاحب نے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبر —"

"یہ کیسے۔ لکھنؤ میں تو نہیں تھے۔" فیروز نے اعتراض کیا۔

"تم اپنا لکھنؤ لیے بھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب اور ان کے وہاں کی ویلیوز —"

"پھر سیاست شروع ہوئی —" گلشن نے کہا۔ "یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے۔"

"سنانے لگے تھے نہیں یار سنانے والے تھے۔ تم پنجابی او بدا کر غلط اردو بولتے ہو۔" ہری شنکر

نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"ارے جا۔ یو۔ پی۔ کے بنیے۔" گلشن نے جواب دیا۔

"لاؤ بھئی۔ اپّی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔" فیروز نے تنگ آ کر کہا۔ "تم لوگوں کی لونڈہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہیں۔ ہونہہ۔"

"ہاں۔ تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سوشل کلائمبر۔ جب روشن کراچی واپس گئی ہے اس سے بہت پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہ رُخ سلطانہ منظر پر آئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔"

"ایں۔ اس کا کیا مطلب جو بات کی بے تکی۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ارے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزن شاہ رُخ کے ابا منسٹر نہیں رہے۔"

"اوہ۔"

"اب لکھنؤ سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسا لو۔ ایک ایک کر کے گلستاں سے پنچھی اڑ گئے۔ کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا ڈولا ہی لے جاؤ۔ طلعت ذرا چار بنانا۔"

چار کا دور چلا۔ کمال نے سانس لے کر پھر داستان شروع کی۔ "تو بھائیو اب پوزیشن یہ ہے کہ سارے مسلمان بیچلرز پاکستان میں ہیں اور لڑکیاں انڈیا میں۔ تو لڑکیاں وہاں سے جہیز بنا بنا کر پاکستان لاتی ہیں اور وہاں ان کی شادیاں ہوتی ہیں یا بیچلر لوگ چھٹی لے کر انڈیا جاتے ہیں اور وہاں سے دلہنیں بیاہ لاتے ہیں۔ انڈیا آج کل بڑی تعداد میں علاوہ علی گڑھ کے گریجویٹوں کے مسلمان لڑکیاں پاکستان ایکسپورٹ کر رہا ہے۔ تو بھائی ہمارے بھیا صاحب نے بھی امی کے ان خطوط سے متاثر ہو کر چھٹی لی اور ایسا پیانٹ مارا کہ لندن سے پہنچے لکھنؤ سیدھے۔ اپّی نے لکھا ہے کہ گلستاں میں بڑے گلے شکوے ہوئے۔ بھیا صاحب اتی کے گلے لگے۔ گنگا دین سے بغل گیر ملے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑا ڈریامر رہا۔ نئے سننے والوں کی خدمت میں عرض ہے۔" اس نے سر یکھا، چندرا اور نرگیش کی طرف مڑ کر اضافہ کیا۔ "وہ کہ میری بڑی بہن، جن کا یہ خط ہے، بھیا صاحب کی بچپن کی منگیتر تھیں اور بھیا صاحب نے ان سے بیاہ نہیں کیا تھا یا انھوں نے بھیا صاحب سے بیاہ نہیں کیا خیر بہر حال اس کا بھی بڑا زبردست ڈریامہ رہا تھا۔ اب اپّی کی شادی کافی عرصہ ہوا ایک صالح نوجوان سے ہو چکی ہے جو یو۔ پی۔ گورنمنٹ کے محکمہ زراعت کا افسر ہے اور اپّی بقول شخصے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ ہاں۔ تو اب بھیا صاحب نے الٹی میٹم دیا کہ وہ صرف چند ہفتے کی رخصت پر

آئے ہیں۔ انڈیا پاکستان کا معاملہ۔ بہت مشکل سے چھٹی منظور ہوتی ہے۔ لہٰذا جلد از جلد ان کے لیے لڑکی تلاش کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ لڑکی بڑے آدمی ہی کی درکار تھی۔ کیونکہ آپ جانو ہم لوگوں کا خاندان بھی بہت بڑے آدمیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل سے۔"

"آپ لوگ لکھنؤ کے نواب ہیں؟" طغیان صاحب نے گردن بڑھا کر بے حد دلچسپی سے عینک کے پیچھے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ ان کو اپنے نئے ناول کا پلاٹ سجھائی دے گیا تھا۔

"جی ہاں — ہیں۔" کمال نے مختصراً جواب دے کر بات جاری رکھی۔ "ان کی وہ منہ بولی بہن یاد ہے؟" اس نے ہری شنکر کو مخاطب کیا۔ "وہ پہاڑی لڑکی یونیورسٹی والی —"

"ہاں ہاں۔ کہے جاؤ۔ وہی سیتا ڈکنسٹ —" ہری شنکر نے سر ہلایا۔

"ہاں۔ وہی چھوٹی سی ناک والی، گوری سی موٹی سی لونڈیا۔ وہ جو راکھی باندھ کر ان کی بہن بنی تھی۔ ایک دفعہ۔ بس جناب وہ سارے میں ان کے لیے رشتے ڈھونڈتی پھری۔ کوئی موٹی اسامی ہاتھ آئے۔ کوئی موٹی اسامی ہاتھ آئے۔ اس معاملے میں بھی بھیا صاحب اپنے حساب خوش قسمت ہی رہے — مسٹر فلاں کو جانتے ہو — نام نہیں لوں گا۔"

"وہی جن کی ایک لڑکی ایک مرتبہ —" ہری شنکر نے منقار کھولی ہی تھی کہ کمال نے جلدی سے بات کاٹی — "ہاں۔ ہاں وہی — وہ آج کل انڈیا میں فلاں صوبے کے ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ بس اے جناب سیتا فوراً ٹکٹ کٹا کر مسوری پہنچی جہاں مسٹر فلاں کا خاندان موجود تھا۔ اور جب دیکھو تب سوائے میں موجود۔ بھیا صاحب کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر کے رکھ دیا اُس نے۔ مگر لونڈیوں کے دماغ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اپی نے لکھا ہے کہ جب ایسی ایسی تعریفیں کرے سیتا تو اس دوسری لونڈیا نے جل کر کہا کہ ایسے ہیں آپ کے چہیتے بھیا صاحب تو آپ خود ان سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ اس پر سیتا بہت روئی اور بھیا صاحب کو اس نے لکھ دیا کہ میں اس معاملے سے ہاتھ دھوتی ہوں۔ تم خود آن کر لڑکی دیکھ جاؤ۔ بھیا صاحب ترت ہی مسوری پہنچے۔ لونڈیا کی ماں نے کہا: ہمارے تو پاکستان سے ایک سے ایک بڑھیا پیغام آئے ہوئے ہیں۔ خیر اس طرح کے نخرے تو لڑکی والے کرتے ہی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ بات طے ہو گئی۔ سیتا جھٹ پٹ بری خریدنے دلی پہنچی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: میری کوئی سگی بہن نہیں۔ دو چچا زاد بہنیں تھیں۔ دونوں گھر پر موجود نہیں۔ طلعت ولایت میں ہے۔ تہمینہ اپنے سسرال میں ہیں۔ اب تم ہی سارا انتظام کرو شادی کا۔ چنانچہ صاحب تاریخ مقرر ہو گئی۔ مگر یار ہری شنکر —"

"ہاں یار کمال —"

"بھیا صاحب کا وہ زمانہ یاد ہے ۳۹ء والا۔ جب ہم تم ان کے اسٹوج بنے پھرا کرتے تھے۔ جو لوگ اس دھوم دھام سے اٹھتے ہیں اُن کا انجام کتنا پھسپھسا ہوتا ہے۔"

"پر یہ سیتا کا کیا قصہ ہے یار۔"

"کچھ بھی نہیں یار۔ طلعت — چار منگاؤ۔"

چائے کا دوسرا دور چلا۔ سب تازہ دم ہوئے۔ چمپا اس اثنا میں اٹھ کر باہر باغ میں جا چکی تھی۔

"یار اس سیتا ڈکشٹ پر روشنی ڈالو" — ہری شنکر نے پھر مطالبہ کیا۔ "میں یہ انٹرلیوڈ بالکل بھول چکا ہوں۔"

"ارے میاں۔ وہ چمپا باجی ہی کی کلاس فیلو تو تھی۔ ان کے ساتھ بعد میں چاند باغ والی اس کاٹج میں رہا کرتی تھی اور پرمساتی تھی آئی ٹی میں۔ چمپا باجی کے واقعے کے بعد بھیا صاحب نے سکونِ دل کی خاطر اسے بہن بنایا۔ راکھی وکھی باندھ کر باقاعدہ۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ وہ بنی دل سے ان کی بہن۔ یہ چیز میں ہندو لونڈیوں کی مانتا ہوں۔ بہن بنتی ہیں تو صدقِ دل سے یہ رشتہ مانتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے یہاں زیادہ تر مسلمان لڑکیوں کی افسوسناک سائیکولوجی یہ ہے کہ —"

"ارے چھوڑو یار مسلمان لڑکیوں کی سائیکولوجی — اچھا تو بھیا صاحب نے سکونِ دل کی خاطر۔"

"ہاں۔ اصل میں ان کی سائیکولوجی یہ تھی۔"

"اس سے ہم سب واقف ہیں۔ تم آگے چلو۔"

"بات تو پوری کرنے دے، بیچ میں بولے جاتا ہے نامعقول۔ تو بھیا صاحب کا یہ تھا کہ جب تک تین چار لونڈیاں دور نزدیک سے ان کی پرستش میں نہ جٹی رہیں ان کی زندگی ان کو نامکمل دکھلائی دیتی تھی۔ اس قدر عادی ہو گئے تھے وہ اس کے۔ دراصل ان کو ان کے فریج بولنے نے مارا۔ میں کہے دیتا ہوں نہ آئے ہوتے بھیا صاحب سوئٹزرلینڈ سے تشوں دل کرتے، کندھے اچکاتے نہ لونڈیوں کا یہ بیڑا ہوتا۔ مگر خیر وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اب یوں سمجھ لو کہ سیتا ڈکشٹ کے واقعے میں بھی بڑے گہرے نفسیاتی نکتے تھے۔"

"ایں —؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ ہندو لونڈیاں دل سے بھائی سمجھتی ہیں۔" گلشن نے کہا۔

"یہی تو لاشعور کا ایک اہم نکتہ ہے۔ سیتا کے لاشعور میں یہ پنہاں تھا —"

کمال ڈرون کرتا رہا۔ چمپا باغ میں ٹہلتی ہوئی کمرے کے پاس سے گزری۔ کمال کی آواز آتی رہی۔

"یہ نکتہ پنہاں تھا کہ سیتا میں احساسِ ملکیت بہت شدید تھا۔ سب لونڈیوں کے یہاں ہوتا ہے —

شعوری طور پر چاہتی تو وہ یہ تھی کہ بھیا صاحب بیاہ کر لیں وہ سندرین کر قاعدے کے موافق ان کے سر پر دوپٹہ ڈال کر برات لے جائے مگر تحت الشعور میں یہ خواہش تھی کہ بھیا کی شادی نہ ہوے۔"

"یہ سب بصیرت افروز باتیں آپی نے لکھی ہیں؟" فیروز نے بور ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ یہ اس نیاز مند کی ریڈنگ ہے۔ چنانچہ جناب اس نے جولڑکی تجویز کی گئی اسی کو کھٹ دینی سے ناپسند کر دیا اور بھیا صاحب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ چمپا باجی کی طرف سے دل اسی سیتا ڈکشٹ نے برا کرایا تھا بھیا صاحب کا لکھنؤ میں۔ گو چمپا باجی خود آخر میں کون سی گھاس ڈالے دے رہی تھیں بھیا صاحب کے آگے مگر گوئیاں کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ ——— مگر میں نے یہ اسٹڈی کیا ہے بھائی گلشن، کہ لونڈیاں، جہاں کسی لونڈے کا معاملہ آیا، سارا بہناپا بھول جاتی ہیں۔ خیر صاحب تو آپی رقم طراز ہیں کہ پچھلے اتوار کو نکاح ہوا۔ ہنی مون کے لیے نینی تال گئے ہیں بھیا صاحب۔ اگلے مہینے لندن واپس پہنچ جائیں گے دلہن کو لے کے۔"

"یار سنا ہے شانتا ادھر دل میں کھٹ بٹ رہنے لگی ہے۔" طلعت نے جھک کر اطلاع دی۔

"اور دل چھوٹنے والا ہے اسے۔"

"زیادہ تر اینگلو انڈین لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں ——— اگرچہ وہ خود بھی اینگلو انڈین ہوتی ہیں ——" کمال نے لاپروائی سے کہا۔ "تم لوگ تو یار لندن کی ایک انسائیکلوپیڈیا اسکینڈلیکا مرتب کر ڈالو ——— ریفرنس کے لیے آسانی رہے گی۔"

"روشن کی بھی سنا ہے شادی ہو گئی کسی بڑے افسر سے۔" طلعت نے کہا۔

"مبارک ہو ——" کمال نے جواب دیا۔

"بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں ——" فیروز بولی۔ "بیکار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔"

"یہ لڑکیاں عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں؟ آج تک میرے پلے نہ پڑا۔" طلعت نے کہا۔

"ارے یار خدا کے لیے آہستہ بولو ——— وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں ——" کمال نے کہا۔

"ہماری نگریا میں آئے لبسو بنواری ——" طلعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع کیا۔ لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

"آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے ——" سریکھا نے چپکے سے پوچھا۔

"میاؤں میاؤں ——" کمال نے دور سے چڑایا۔

"یار وہ سرل ایشلے تو کل میں نے دیکھا شیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکونِ دل

کی خاطر—" طلعت نے پوچھا۔

"واہ عین بین معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ ائیر میں پڑھنے والی لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں"، کمال نے کہا۔ سریکھا اور طلعت اور ترگیش سُنی ان سنی کر کے کھُس پھُس کرتی رہیں۔

"یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں رہیں گی وہی کشمیری محلہ گرلز اسکول لکھنؤ"، کمال نے دوبارہ کہا۔

"سوال یہ ہے" فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا، "کہ مڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں"۔

"ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریوولیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم"۔ طلعت نے کہا۔

"مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں۔ وہ برلین والا قصہ یاد ہے۔ وہ تو جب ہم لوگ بخارسٹ جا رہے تھے تو پیچھی ہمارے ساتھ ساتھ آسٹریا کی سرحد تک بھی پہنچ گئی۔ وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر—" فیروز بولی۔

"مگر کیا یار۔ ڈرپوک تھی۔ بچانوے فیصدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس رومانس دماغ میں ٹھنسا تھا۔ وہ رومانس۔ وہ بورژوا فلسفہ۔ لاحول ولا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے— بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے"، طلعت نے کہا۔

"اب وہ اس 'بڑے آدمی' کی بیوی بن کر جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی۔ کیا ڈاؤن فال ہوا ہے"۔ سریکھا نے کہا۔

"تمہارا تخیل اس وقت زوروں پر ہے"، طلعت نے کہا۔

"میرے تخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے"، سریکھا نے اداسی سے کہا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھکی ہاری پروفیسرنی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ وقت بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیراگراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شریمتی سریکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رقاصہ تھیں۔ طلعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گمنام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا؟"

"ایسی ڈیکیڈنٹ باتیں مت کرو"، طلعت نے ڈانٹا۔

"میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" سریکھا نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا۔" کمرے کے دوسرے سرے پر ہری شنکر نے کمال سے کہا۔ "لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیسی مگن ہیں اس سمے۔ ایک نے نیا بلاؤز سی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ دوسری ادھر ادھر کی بے ضرر گپیں ہانک کر ہی مسرور ہے۔ مگر دراصل انھیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ بےچاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

طلعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ یہی مبالغہ طلعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمبر کے کردار میں، چمپا میں، اپنی میں۔ یہ لوگ گویا انسانوں کی انلارجڈ تصاویر تھیں۔ اسی مارے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔

"میاں، کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بھرے کسی اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا — یہ شاعری رکھو چھپر پر۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔"

"یہی بات تو تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس سمے باغ میں چکر نہ کاٹ رہی ہوتیں۔" شنکر نے جواب دیا۔

"اونھ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔" طلعت نے کہا۔

"اے لیجیے۔ اتنی قابل لڑکی۔ کیمبرج میں سب پر دھاک بٹھا کر آ رہی ہے۔ جس سے ملتی ہے وہی غلام ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔"

"کیوں بھئی کمیونسٹ لوگ عشق نہیں کرتے؟" طغیان صاحب نے نہایت بھونڈے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" طلعت جل کر واپس چلی گئی۔

"بی بی۔" ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا۔ وہ نرملا کی قائم مقام تھی۔ "ابھی تم اور پڑھو۔ اب تم لگے ہاتھوں پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔" وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طلعت کو خفا کر دیا ہے۔

"پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر کے بڑے لڈو مل جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت، صرف تین سو کی۔" اس نے عین ہری شنکر کی ناک کے آگے تین انگلیاں لہرائیں۔ وہ بالکل سننے کی موڈ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی

کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں خواہ جاہل چپٹ، برائے فروخت دکان پر رکھی جاتی ہیں۔

"ارے تو روپیہ پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس کے لیے کام کرنا ہے۔ کملا کو دیکھو، صولت کو، کیسی ٹھاٹھ دار کیریر ویمن ہیں۔"

چمپا نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب کو باتوں میں مصروف پا کر باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آ گئی۔

(۸۹)

برفباری شدید ہو گئی۔ شنیلا دیبی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔

سوامی ویویکانند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا۔ یہ وہی کمال اور ہری شنکر کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لامارٹینیر کالج لکھنؤ سے اچانک غائب ہو گئے تھے اور کمال اور ہری شنکر ان کے تعاقب میں ہردوار کی گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے، داڑھی بڑھائے، یورپ اور امریکہ میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکرجی سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ کمال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفافے آئے رکھے تھے۔ وہ ان کو کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر کمال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سریکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ کمال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیلا مکرجی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہلو کامریڈ — موسکو واسے کب لوٹے —" مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔

"آج صبح —"

"بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔" مائیکل نے کہا۔

"بھول گئے۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے کمال کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے یہ دورے پر نکلے ہیں۔"

"تم اب تک اسرائیل نہیں گئے۔" گوتم نے دریافت کیا۔

"بس اب جانے ہی والا ہوں۔"

"سب جا رہے ہیں۔" تنیلا دیبی مائیکل کی بات سن کر ان کی طرف آئیں۔ "نومسکار مسٹر نیلومبر۔" انھوں نے کہا۔

"نمسکار تنیلا دیوی۔"

بہت سے پھول اٹھائے نرگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ "روشنی میں آکر دیکھا تو یہ سب سرخ نکلے۔ میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔" اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

"نرگیش۔" گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ "یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو؟"

"گوتم — کلچر کی خاطر — یہ سب کلچر کی خاطر ہے۔" اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کمال کہاں ہے۔"

"سر یکھا کے یہاں دیکھ لیا، شاید وہ لوگ مڈہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔"

"مڈہرسٹ۔" گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔ "مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔"

"ہاں۔ لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے۔ تم کو معلوم نہیں؟ ارے ہاں، تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔"

"سب جا رہے ہیں — سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں —" تنیلا مکرجی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا۔ "تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔ نرگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ڈینس کو نیروبی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے۔"

"تنیلا دیوی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔" گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔ "لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ بلکہ چلے جاتے ہیں۔ آتے کبھی نہیں۔"

اب وہ بھی پھر گرو دیو ٹیگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اٹھا۔ "نرگیش۔" اس نے مڑ کر کہا۔ "مجھے کمال کی بڑی سخت تلاش ہے۔ اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔"

"بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔"

"ارے ہاں۔" وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور ان کے پیر چھوئے۔ سوامی دیویکانند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیملٹن — نے اسے آشیرواد دی اور اوکسفرڈ کے لہجے میں اس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آجاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے یہاں بلوا کر ایک محفل منعقد کریں۔" شنیلا دیوی نے کہا۔ "سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔"

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔

وہ اوورکوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چل دیا۔ شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

(۹۰)

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنسان پڑی تھی۔ صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویٹرس سے پوچھنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ چمپا احمد تھی۔

"ہلو — تم یہاں موجود ہو۔" گوتم نے بے ساختہ کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے۔ ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔"

"اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔" گوتم نے ذرا برا مان کر کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کو لٹرل سمجھ لیا جائے۔"

"لٹرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔"

"وہ کیسے؟" گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں سمت نظریں دوڑا کر پوچھا۔

"میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعاتی بات تھی۔ تم اس کو مجاز کی طرف لے گئے۔۔۔ یہ سب تمہارا قصور ہے۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"مابعد الطبیعات کا ذکر مت کرو۔" گوتم بے انتہا چڑ کر بولا۔ "میں ابھی خیسلا دیوی کے یہاں سوامی ویویکانند سے مل کر آ رہا ہوں۔ تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔"

"نہیں۔" چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ آدمی پل پل میں کیسے رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھ نہیں پائی۔ "تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز ۔۔۔ جون کارٹر کے یہاں۔ یورپ جانے سے پہلے۔"

"ہاں۔ کیا تو تھا۔" گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ "کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر۔"

"گوتم، یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو، بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے۔ میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تو تمیز سے پیش آؤ۔"

"چمپا۔" گوتم نے کہا۔ "میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ کمال کے کئی ضروری خط ہیں۔ ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لیے دلی پہنچنا ہو۔ نرملا کا دوسرا آپریشن ہوا ہے۔ تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو۔ باقی کی دنیا بھی تمہارے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔"

"ارے۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ "چلو کمال کو ڈھونڈتے ہیں۔ مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔" گوتم نے اسے دیکھا۔ یہ کیسی عجیب دلکش عورت تھی۔

وہ سرائے سے باہر نکلے اور سریکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرے سرے سے جواب دیا: "کمال کا پتا نہیں۔ شاید سر روجر کے یہاں نرملا کی رپورٹ لینے گیا ہے۔ سریکھا ابھی راڈا سے نہیں لوٹی۔ کمال نے کہا تھا کہ وہ سر روجر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا۔ تم آ جاؤ۔ میں کالج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیے جاتا ہوں۔"

"کوئی مڈ ہرسٹ گیا ہے؟" گوتم نے پوچھا۔

"طلعت اور ہری شنکر گئے ہیں۔ اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا۔ نرملا کو بھجوانے کے لیے سریکھا نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ طلعت لے جانا بھول گئی۔"

"اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

گوتم کار کی طرف لوٹا اور وہ سینٹ جانز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آشا کے یہاں سے کنجی لے

کر وہ سریکھا کے مکان میں داخل ہوئے۔ گیلری میں دو بڑے بڑے مجسمے رکھے تھے۔

"او ہو۔ ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر رکھی ہے۔"

"یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں۔" چمپا نے فوراً کہا۔

گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا، طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا۔ وہ گارڈن روم میں گئے اور باغ کی طرف کا بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا۔ اب برف پھر مدھم سی دھوپ میں روشن تھی۔

"کتنا آرام دہ گھر ہے سریکھا اور گلشن کا۔" گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کاہل اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بہرائچ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات علامہ اقبال۔ فیض۔ کرشن چندر پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی۔ بیلے۔ کریو گرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں بچی تھیں جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا، چین کے فوادرز، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی او فرانس کی پینٹنگز۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ اور رقاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخط شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بالی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردنگم اور ترکاری کی ٹوکری۔ گوتم مسکرایا۔ یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متلاشی تھا۔

"میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے گزارے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا۔" وہ کہتا رہا۔ "کمروں سے مکینوں کی شخصیت کس قدر عیاں ہوتی ہے۔ ذرا سوچو تو، وہ اللہ بیٹھا۔ چیلسی میں کملا کا الٹرا موڈرن فلیٹ دیکھا ہے؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید انٹلکچول، شدید خوش ذوق اور انتہا کی مزاحی حس کی مالک ہے۔ اور ڈائریکٹ۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اوسٹرلی میں نرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستھرا، خوبصورت اور گھریلو۔ سینٹ جانز ووڈ میں طلعت اور کمال کا گھر عین مین گلفشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی ہنگامہ، وہی افراتفری، ہما ہمی، نہما نذاری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے ہیں یہاں۔ میں نے واشنگٹن میں بیری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سنگھاڑے والی کوٹھی کا ایکسٹنشن معلوم ہوتا ہے۔

بھر شینلا دیبی کا کمرۂ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔"

"تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔" چمپا نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں چمپا"، وہ کہتا رہا، "ہم خود کو اپنے پس منظر سے، کبھی اپنے ظاہر کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔" پھر وہ رکا۔ "مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمھارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ چوڑے کی سرائے کے اسٹول پر بیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے نا۔"

"اچھی بات ہے یا بُری؟"

"پتا نہیں۔ مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیے جو شاید تم نہیں رہیں۔"

"یہ غلط ہے۔" چمپا نے سُرخ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

"تم سب الگ الگ دور دور نکل گئے ہو۔ میں تنہا کھڑی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی پھر تم شکایت کرتے ہو کہ میں وفادار نہیں رہی۔"

"تم کو معلوم ہے"، گوتم نے کہا، "پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا۔ میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک ریڈ وار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے یہ دقتاً فوقتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ بہرحال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد — مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں۔"

"مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔"

"اب تم پھر رومانٹک ہو گئیں!"

برابر کے مکان میں آشا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

"گوتم — کیسے پی پربت اتروں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تمھارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے۔ اور تم روتی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو بیٹھے بٹھائے۔ ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھتیا صاحب کو لو۔ آج میں نے ان کو سلفر جیز سے نکلتے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں۔ کھلے جا رہے تھے۔ بڑے تپاک سے انھوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں نے بھی بہت بشاشت محسوس کیا۔ دماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے بھتیا صاحب ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" چمپا نے کہا اور آتش دان کے کوئلے ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگئی۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہوگئیں۔ اوجیت اور ترونا کی آواز ان سب میں اونچی تھی۔ چمپا دریچے کے قریب جاکر سنتی رہی۔ پھر واپس آگئی۔

"دریچہ بند کر دو۔" گوتم نے منّا کہا۔

"ہاں۔" چمپا نے جواب دیا۔ "یہ تو رات گئے تک ہلڑ مچتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔"

"ارے رے رے۔" گوتم نے چونک کر کہا۔ "وہاں شاید کمال بھی پہنچ گیا ہو۔ یہ لوگ رت جگا کیوں کرنے والے ہیں؟"

"صبح یہ سب بوڈاپیسٹ جا رہے ہیں اس لیے۔"

"بوڈاپیسٹ؟"

"ہاں۔ وہیں۔ بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔"

گوتم نے کان لگا کر آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔

"وہی سارے پرانے کورس ہیں اور راپٹا کے گیت۔" چمپا نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ "ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔"

"ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم؟"

"اوہ — میں بھول گئی تھی کامریڈ گوتم — مگر تم ہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کر دو۔"

اب وہ "بوجھ اٹھالو ہیا ہیا" گا رہے تھے۔ گوتم نے باہر جاکر باغ کی دیوار پر سے جھانکا۔ بہت سے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر ویو کیا اور واپس آگیا۔ "نہیں کمال وہاں نہیں ہے۔"

"گوتم ماشٹر۔"

"ہاں بھائی۔"

"کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں؟"

"نہیں تو۔ لیکن کچھ ایسی زیادہ عقلمند بھی نہیں۔"

"بس — میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتلا دیا۔ اب مجھے اطمینان رہے گا۔"

"گرو گوتم کو بلاؤ۔ گرو گوتم کہاں ہے۔" آشا کے گھر میں سے صدائیں بلند ہوئیں۔

"گرو گوتم سریکھا کے یہاں بیٹھا ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ "نہیں میں آ نہیں سکتا۔ ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کود کر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا پھر اکیلی رہ گئی۔ اس کی دنیا کی کشش اس کے لیے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔

بہت دیر بعد وہ سہرکھا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ کمال کا فون تو نہیں آیا تھا؟" اس نے سوال کیا۔ چمپا آتشدان کے سامنے قالین پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں چلے جانے کی معذرت نہیں کی۔ وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ "یار چار بنائی جائے۔" کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

"تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے۔"

"ہاں، مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آشا تم کو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنا لو چار اپنے لیے۔"

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔ چمپا نے کہنا چاہا مگر وہ جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

"آ آ بھی بے چولھا سلگانا۔" گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

"بنارس میں میری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"مگر تم تو کیمبرج پلٹ ہو!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چمپا رانی۔" گوتم آ کر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ "آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو؟"

"اور کیا کروں۔ ناچوں؟"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔"

"وہ دیکھو توس جلا دیا تم نے۔"

"افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔"

"چمپا، ایسی واہیات باتیں مت کرو۔"

"گوتم۔" چمپا نے کیتلی اٹھاتے ہوئے رسان سے کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں

تو میں ابھی چلی جاؤں گی اور آئندہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں گی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔"

"چمپا رانی۔" گوتم باورچی خانے میں آکر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ "چمپا رانی۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا متمنی ہوں۔ اتنا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دہرا رہے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چولھے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پرسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"ادھر آجاؤ۔" اس نے ذرا درشتی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا۔ وہ پھر آتشدان کے سامنے آن بیٹھے۔

محض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا جو کرسی پر رکھا تھا۔ "کتنا خوبصورت ہے۔" اس نے کہا۔

"اس میں میں اپنے کاغذات رکھ دوں؟"

"رکھ دو۔"

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دیئے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

"اس بیگ میں —" اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمہارا سامان ہے نا۔ چلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"زیرِ بحث بیگ"، چمپا نے تلخی سے کہا، "میرا نہیں سر یکھا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ، نہ کاغذات، نہ یہ مکان، چیزیں حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہے۔ لیکن تم اپنے دکھ بھی اپنے لیے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔"

گوتم خاموش رہا۔

"کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلمبر کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتا ہے کہ تم ہر سمے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو؟"

"ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیسر ہے۔ میرا سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کیے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمھارے جرم سے مختلف ہے۔ تمھارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے۔ ایک بات بتاؤ۔" اس نے رک کر کہا۔ "تصورِ گناہ تمھارے نزدیک کیا ہے؟"

"کسی کا دل دکھانا۔" چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

"اور؟"

"ریاکاری۔"

"اور؟"

"اور — اور کمینہ پن۔" اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب دیا۔

"سنڈے اسکول کے سبق۔"

"ایں؟" چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

"میں نے دل دکھایا ہے — تمھارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے؟"

"بہت بڑا۔"

"لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔"

"قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے۔ ورنہ وہ قاتل ہی کیوں بنتا؟"

گوتم پھر خاموش ہو گیا۔

"سُر اونچے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔" کچھ دیر بعد انھوں نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتاً رک گئے ہیں۔" اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر انگلیاں پھیریں۔

"اس کا ایک سُر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔" چمپا نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو میں، بہرائچ میں، اکثر

آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر نارمل پر دوڑ دوڑ کر سمفنی بجایا کرتا تھا۔"

"تم نے مجھ سے بڑا بیچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔"

"بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا وطن ہے۔"

"ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں۔ یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔" اس نے چند لمحوں بعد الجھ کر کہا۔

حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آ رہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔

"یہ جوتا دیکھو۔" معاً گوتم نے ٹانگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ "زندگی اس کی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔" پھر اس نے ایک توس کا ٹکڑا اٹھا کر بلی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے توس سونگھ کر چھوڑ دیا۔

"یہ بھی بوہیمین بلی ہے۔ توس نہیں کھاتی۔ اس کے لیے لوبسٹر اور شیمپین لاؤ۔"

پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا: "چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔"

وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت بیوقوف۔ اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوار ہونے کے باوجود مجھ جیسے لیاڈی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے۔ بے وقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم۔ بورژوا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی نالتو مٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیراکوٹا۔" طلعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔" اس نے بآواز بلند کہا۔ "تم نے کبھی اس سے اپنا سر بنوا کے نہ دیا۔ اب بھی وقت ہے بنوا لو۔ تم کہیں جا تو نہیں رہیں؟" اس نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔"

"تمہاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بے کار ایک دم۔" وہ ٹہلتا ہوا مجسموں کی طرف چلا گیا اور ان کے سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ "کیونکہ ۔۔۔" اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ "ہر دفعہ تم پکڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا اس لیے اب ہر بات آسان ہے حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔"

وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا چکر کاٹتا ناچتا رہا۔ لمحے کا بھنور دور دور تک پھیل گیا۔

ختم ہو گیا۔ باقی رہا۔ جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھسلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہیمٹرن مکمل ترین بن گیا۔ وہ ساکت و صامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلّی بھی شریک تھی۔ ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موٹریں، راہگیر، دکانیں — سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجود ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سمے تک کئی بار پڑھوں گی۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں۔" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک پُل ہے۔ جس روز یہ پُل ٹوٹ گیا تو کیا ہو گا۔"

"پُل تم خود توڑو گے۔"

"نہیں۔ لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں توپیں چھپی ہیں۔ اوپر بادل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے۔"

"تم اپنی اسپوٹ لائٹ لیے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو۔ جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رُخ اس کی طرف کر دیتے ہو۔ وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔"

"میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔"

"نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو۔ اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہو گا۔ اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے۔ کھڑکیوں میں لوگ تمھیں نظر آئیں گے۔ اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے، کھانا پکاتے، کھلتے تم کسی آوارہ گرد بلّے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے تالوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمھارا چہرہ ہلکی کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا — بوگی مین!"

"اور اس سمے میں تمھارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا: اسٹوو کے گرد۔ بحثیں کرتا، کھانا بناتا، کھاتا۔ اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی — بوگ ومن!!"

وہ خاموش ہو گئے۔

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا۔ پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔

"آج بہت برف پڑی۔" دریچے میں کھڑے کھڑے گوتم نے ایک جنرل اسٹیٹمنٹ دیا۔

ابھی اس کے بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا، موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"سریکھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔" گوتم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا۔ — سورج ڈھل چکا — شام آگئی — میں ابھی یہیں ہوں — میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت — وہ بڑبڑایا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار مڈہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جھک کر دارجلنگ کے بیگ سے کمال کے نام کے وہ بلیے لیے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔ ایک ایک کر کے ہر ٹائپ شدہ خط میں کمال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو نامنظور کیا گیا تھا۔

(۹۱)

"آئے پریم پگے پروانے۔ جوال مئی چھوی کے دیوانے

جر جر چلمن کے پیچھے رہے بیٹھی

دیپ شیکھا لہرائے رہے۔ دیپ شیکھا لہرائے رہے۔

دیپ شیکھا لہرائے رہے"

چندرا گاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آگئی۔

"طلعت — چائے" اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

طلعت نے چائے انڈیلی۔

سریکھا انہماک سے میڈیٹیشن کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رخ دروازے میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑوسن نے باڑ پر سے سر نکال کر تھوڑی سی شکر مانگی۔

ختم ہو گیا- باقی رہا- جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھسلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی- پیٹرن مکمل ترین بن گیا- وہ ساکت و صامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی- کمرے کے تجربے میں بلّی بھی شریک تھی- ہوائیں بھی جانتی تھیں- بہت دور سڑک کی موٹریں، راہگیر، دکانیں — سب کو معلوم ہو چکا تھا-

اب سارا وجود ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سمے تک کئی بار پڑھوں گی چمپا نے اپنے آپ سے کہا-

"دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں- ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں-" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا- "دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں- دونوں کے درمیان ایک پُل ہے- جس روز یہ پُل ٹوٹ گیا تو کیا ہو گا-"

"پُل تم خود توڑو گے-"

"نہیں- لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں- جھاڑیوں میں توپیں چھپی ہیں- اوپر بادل گرج رہے ہیں- ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی- میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا- یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے-"

"تم اپنی اسپوٹ لائٹ لیے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو- جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رُخ اس کی طرف کر دیتے ہو- وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے-"

"میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں-"

"نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو- اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہو گا- اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے- کھڑکیوں میں لوگ تمھیں نظر آئیں گے- اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے، کھانا پکاتے، کھاتے تم کسی آوارہ گرد بلّے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے ٹائلوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے- تمھارا چہرہ ہلکی کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا — لونگی مین!"

"اور اس سمے میں تمھارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا: اسٹوو کے گرد بحثیں کرتا، کھانا بناتا، کھاتا اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی — بوگی مین!!"

وہ خاموش ہو گئے-

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا- پھر دریچے کی طرف چلا گیا-

"آج بہت برف پڑی-" دریچے میں کھڑے کھڑے گوتم نے ایک جنرل اسٹیٹمنٹ دیا-

ابھی اُس کے بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا، موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"سریکھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔" گوتم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا۔ — سورج ڈھل چکا — شام آگئی — میں ابھی یہیں ہوں — میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت — وہ بڑبڑایا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اُس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار مڈہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جھک کر دارجلنگ کے بیگ سے کمال کے نام کے وہ بلے بلیے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹائپ شدہ خط میں کمال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو نامنظور کیا گیا تھا۔

(۹۱)

"آئے پریم پگھے پروانے۔ جوال مئی پھوکے دیوانے
جر جر چلمن کے پیچھے رے بیٹھی
دیپ شیکھا لہرائے رے۔ دیپ شیکھا لہرائے رے۔
دیپ شیکھا لہرائے رے"

چندرا گاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آگئی۔

"طلعت — چا رے" اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

طلعت نے چا رانڈیلی۔

سریکھا انہماک سے ریڈیو ٹیون کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رُخ دروازے میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑوسن نے باڑ پر سے سر نکال کر تھوڑی سی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔ بلکہ جب سے نرملا مری تھی دنیا کا کام اور زیادہ سکون سے جاری تھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جٹے تھے گویا اس سے پہلے انھیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اسی شدید مصروفیت کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ طلعت اخبار کی رپورٹیں لکھتی۔ کملا ماڈل ٹیبل میں ڈنر کھاتی۔ فیروز کتابیں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رُخ کرتی۔ کمال شکنتلا یا سریکھا کے ڈرائنگ روم میں آتش دان کے سامنے اوندھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھتا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔

وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نرملا کو مرے آج محض دسواں روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت ربر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہوگا۔

"اب ہمیں نرملا کے دسویں کی فکر کرنا چاہیے نا؟" شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح کمال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا:

"اب ہمیں نرملا کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیے نا۔"

"ہاں۔ شاید۔" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔" طلعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ برا بھلا زندگی کا کاروبار نرملا نپٹا کر چلی گئی تھی مگر اس کی موت کے بعد کے کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

فون کی گھنٹی بجی۔

شیلا دیدی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سوامی دیویکانند جی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سنٹر میں —

"جی — جی ہاں — جی بہت اچھا — شکریہ —" کمال نے ریسیور رکھ دیا۔

موت بھی سوامی دیویکانند کی طرح فراڈ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طلعت نے ایک مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ سریکھا گیلری میں جا کر ڈانس کی مشق میں مصروف ہو گئی۔ ہری شنکر نے پروں کا البم اٹھا لیا۔

وقت کا سناٹا بہت سی توپوں کی طرح گرجنے لگا۔ گھڑی نے تین بجائے۔ کمال نے بزبانِ خاموشی ہری شنکر سے کہا۔ ”وہ مسز روجرز سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے جانا ہے“ کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جا سکتا تھا۔

”لے آؤ“ ہری شنکر نے اسی خاموشی سے جواب دیا۔

”مڈہرسٹ سے نرملا کا سامان بھی آنا ہے“ طلعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی سناٹے میں انڈیل دیے۔

”لیکن ہم مڈہرسٹ کس طرح جا سکتے ہیں؟“ کمال نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہری شنکر نے ان الفاظ کو ڈی کوڈ کیا۔ ہاں۔ مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ ہم سرٹیفکیٹ بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو اٹھو۔ اپنے اپنے زرہ بکتر پہنو۔ لفٹ رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پرانے آزمودہ ہتھیار سنبھالو۔ چلو ہم جا کر نرملا کے زرہ بکتر اور ہتھیار واپس لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔

اس پینٹو مائم کے بعد جسے کسی نے، خود انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ سب باہر نکلے، موٹر میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے رستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس سڑک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔

اب وہ آخری بار مڈہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ خاموشی سے موٹر سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سائے میں بیٹھ کر چاء پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موٹی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چاء رکھی۔ وہ بھی اس پینٹو مائم میں شامل ہو گئی۔

سینٹ جانز ووڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر کمال نے سارا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیا جس میں ہری شنکر ٹھہرا ہوا تھا۔

جب سب لوگ اپنے مورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طلعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا، اپنا زرہ بکتر اتار کر گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔

ہری شنکر یروں کا البم میز پر ڈال کر کمال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز لیمپ کی روشنی میں ہری، واضح نظر آ رہی تھی۔ آبنوس کا فرنیچر۔ وکٹورین وضع کا اونچا سائیڈ بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈرن پینٹنگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طلعت کسی کباڑی کی دکان سے بہت سستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سو سال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طلعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑیے

سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ نرملا کا سامان اس کے قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشّان کباڑی کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

موت؟

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا سریواستو کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو گنگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس وطن لے جائے گا۔ جو اس وقت کمال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ گیتا کا پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی۔ وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھیچڑ سیکنڈ ریٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجیے کہ دوسروں کی موت پر جھکو بھکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہو گیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ رودولی والی ثریا باجی کی مرنے کی خبر سُن کر کتنا روئی تھیں۔ جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں ثریا باجی سے، اس قدر دہاڑیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رو رہی ہوں۔ جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہیے؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انہوں نے شادی رچالی تھی اور اس صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک رودولی کی نیم تاریک کوٹھری میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رقاصہ تھیں نہ اسمگلر نہ ٹھیکیدار نہ جرنلسٹ نہ مصور نہ مذہبی لیڈر لہٰذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدرآبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوا دی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آکر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج پر پردہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انھوں نے ایف۔ اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔

ٹپیکل مسلم سوشل پکچر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہو گئی۔

اری نرملا کی بچی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔ کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی۔ مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ — وغیرہ۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی، ساری عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔ سچی۔ پھر ملک اور قوم کی فکر میں جلی جا رہی ہیں۔ کڑھتی پھر رہی ہیں۔ جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ ہر بحث میں یہ کودنے کو موجود۔ پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انھوں نے ٹھناٹھ مچا دی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا۔ وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔ سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے، جلد ٹوٹ جائے گا۔ پھر پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔ بھتیں کے لیے بہو ڈھونڈیں گی۔ پری زاد بالکل۔ پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسکو کی سیر کریں گی جا کر۔ (یہ جانے میکسکو جانے کا اتنا شوق کیوں تھا۔) یہ موہوم سی امید بھی تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہو گا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی — کسی قسم کا کنج۔ یا کچھ اور۔ خیر — کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ خیا ہوہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چنتا۔ پھر یہ کہ بلیاں پل رہی ہیں۔ کتے، کبوتر، گائیں۔ بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور سارنگیوں پر تو خیر دم

سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ نرملا کا سامان اس کے قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان کباڑی کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

موت؟

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا سریواستو کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو گنگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس وطن لے جائے گا۔ جو اس وقت کمال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ گیس کا پائپ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی۔ وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھیچڑ سیکنڈ ریٹ بات کیا ہو گی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجیے کہ دوسروں کی موت پر چیکو پیکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہو گیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ ردولی والی ثریا باجی کی مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں۔ جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں ثریا باجی سے، اس قدر دھاڑیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رو رہی ہوں۔ جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہیے؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انہوں نے شادی رچالی تھی اور اس صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک ردولی کی نیم تاریک کوٹھری میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رقاصہ تھیں نہ اسکالر نہ ایکٹرس نہ مصور نہ چترکار نہ ہی لیڈر لہٰذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدرآبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوادی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد، جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آکر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج پر پردہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انھوں نے الف۔ اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔

ٹیپکل مسلم سوشل پکچر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہو گئی۔

اری نرملا کی بچی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔ کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی۔ مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ — وغیرہ۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی، ساری عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ بلتے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔ سچی۔ پھر ملک اور قوم کی فکر میں جان دے رہی ہیں۔ تڑپتی پھر رہی ہیں۔ جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ ہر بحث میں یہ کودنے کو موجود۔ پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انھوں نے ہنگامہ مچا دی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا۔ وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔ سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے، جلد ٹوٹ جائے گا۔ پھر پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔ بھتیں کے لیے بہو ڈھونڈیں گی۔ پیسی زاد بالکل۔ پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسکو کی سیر کریں گی جا کر۔ (یہ جانے میکسکو جانے کا اتنا شوق کیوں تھا۔) یہ موہوم سی امید بھی تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہوگا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی — کسی قسم کا کنج — یا کچھ اور — خیر — کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ شاعرہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چنتا۔ پھر یہ کہ بلیاں پل رہی ہیں۔ کتے، کبوتر، گائیں، بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور سارنگیوں پر تو خیر دم

نکلتا ہے۔ نیا اوورکوٹ بنانے کے لیے وہ مہابھارت مچائے ہوئے ہیں۔ ضد ہے کہ جیسے زمرد کے گہنے لاج کے بنے ہیں ایسے ہی میرے بھی بنیں۔ اپنی سہیلیوں کے لیے جان حاضر ہے۔ چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔ محبت کی اہلیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے۔

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار ٹھہر گیا۔ ان کو ہسپتال پہنچایا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد فرما دی۔

تو کیا اس موت پر اصولاً رونا چاہیے۔ قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سخت ہنسی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طلعت نے بہت دنوں سے نہیں سُنی تھی۔

اُس نے کمرے کا چکر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ چندرا اور سریکھا کے سائے دریچے میں سے نظر آ رہے تھے۔ گھوم پھر کر وہ پھر ہری شنکر کے کمرے میں واپس آ گئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے نرملا کے سامان کو اکٹھا کر کے سگوانا چاہا۔ بےدلی سے اُس نے چیزیں اُلٹیں پلٹیں۔ کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔ اسے نکال کر وہ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

لیمپ جلا کر اُس نے اصولاً گیتا کا صفحہ کھولا اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ شانتی کے حصول کے لیے اس آسمانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بےحد دھیان سے پڑھنا شروع کیا:

—ان کو بہادری سے جھیل۔

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی روحیں امر ہیں۔ چنانچہ لڑ — او بھارت کے فرزند۔ آتما نہ قتل کرتی ہے نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار اسے زخمی نہیں کر سکتی۔ آگ اُسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگو نہیں سکتا۔ ہوا اسے خشک کرنے سے قاصر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی موت یقینی ہے۔ جو مرا اس کی پیدائش اٹل۔ اس میں دکھ کی کیا بات ہے؟

دکھ اور سکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تو جنگ کر۔

تب ارجن نے کہا: او کیشو، اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تو مجھے جنگ کرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے —

بھگوان نے جواب دیا: انسانوں کو کام نہ کر کے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بےنیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے کیونکہ پراکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے زیرِ اثر انسان متواتر مصروفِ عمل رہتا ہے۔

او ارجن! تُو اور مَیں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوندِ عالم ہوں لیکن اپنی پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او بھرت، جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو مجسم کر لیتا ہوں۔ اور جو میری الوہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے، اے ارجن، وہ اپنا جسم چھوٹنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوان گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہ کرم کیا۔ وہ جو نہ کرم میں کرم اور کرم میں نہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوان ہے۔ او ارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

او جنار دھن، میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور انانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ درجے کی پراکرتی ہے لیکن مضبوط بازوؤں والے شہزادے، میری اعلیٰ پراکرتی وجود اور حیات کے احساس اور شعور میں موجود ہے جس کے سہارے یہ کائنات قائم ہے۔ میں ہی ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! او کنتی کے بیٹے، میں پانی کا سواد ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خود آگہی ہوں میں زمین کی متبرک خوشبو ہوں۔ میں سارے جانداروں کی جان ہوں۔ راہبوں کا زہد ہوں۔ جو جس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے میں اسے بھگتی میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوجا کی آگ۔ میں خود ہی پوجا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنات کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ راستہ ہوں اور گواہ۔ اور آخری جائے پناہ۔ ابتدا۔ انتہا۔ آرام گاہ۔ گنجینہ اور ازلی بیج۔ او ارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں۔ مینہ برساتا ہوں — میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں۔ میں وجود اور عدم وجود ہوں۔ میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں مَیں سام وید ہوں۔ دیوتاؤں میں اندر۔ حواس میں ذہن ہوں اور خود آگہی۔ رودروں میں شنکر ہوں۔ پہاڑوں میں کوہ میرو۔ میں بزرگ ترین کاہن برہسپتی ہوں۔ سپہ سالاروں میں مَیں سکند ہوں۔ پانیوں میں مہاساگر۔ الفاظ میں اوم۔ عبادت میں جاپ۔ نہ ہلنے والی چیزوں میں ہمالیہ ہوں۔ رشیوں میں نارد۔ میں فلسفی کپل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا بادشاہ کا رتبہ ہے۔ ناگوں میں مَیں اننت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں ورون۔ فرمانرواؤں میں یم۔ پیمائش میں مَیں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر۔ پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام۔ دریاؤں میں گنگا ہوں۔ میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور ذہانت، وفاداری اور رحمدلی ہوں۔ میں گائتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔ صوفیوں میں میں ویاس ہوں۔ رُتوں میں بسنت ہوں۔

اناجوں میں جَو۔ میں سنسار کا آد، مدھ اور انت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ او ارجن! میرے الوہی مظاہر بیکراں ہیں۔

او ارجن ——

او ارجن کے بچے۔ ایڈیٹ ——

وہ کتاب زور سے بند کرکے پھر اٹھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والا تھا۔ ابھی ہری شنکر اور کمال لوٹتے ہوں گے۔ اس نے ابھی ہری شنکر کا کمرہ بھی ٹھیک نہیں کیا تھا۔ وہ دوبارہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر بیٹھ کر اُس نے ایک بار پھر نرملا کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی: ساریاں۔ جوتے۔ چوڑیاں۔ میک اپ کے پٹارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دنیا بھر کی الا بلا جمع تھی جو لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ بس کے ٹکٹ۔ لانڈری کے بل۔ پرانے خالی لپ اسٹک۔ کانوں کے بندے۔ پنیں۔ پیسے۔ خریداری کی فہرستیں۔ اور جانے کیا کیا۔ ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔ چار سال سے نرملا دنیا سے الگ تھلگ سینی ٹوریم میں مقید تھی۔ پھر اس نے نرملا کی کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ ایک کتاب میں سے ایک تصویر ٹپ سے نیچے گری۔ طلعت نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ گوتم نیلمبر کی تصویر تھی جو آج سے دس سال قبل بردھوتے کے لیے بہرائچ سے سنگھارہ والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔ طلعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکے واپس آچکے تھے۔

سریکھا نے کھانے کی میز پر سے آواز لگائی۔

طلعت، ہری شنکر کا کمرہ قرینے سے ٹھیک کرکے محاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہوچکی تھی۔

اُس رات، جب ہری شنکر سوچکا تھا، طلعت نے اس کے کمرے میں دبے پاؤں جاکر کتاب میں سے گوتم کی تصویر نکالی۔ اپنے کمرے میں آکر اس تصویر کو جوتوں سے خوب ہی مارا جب جاکر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔ تب وہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہوگئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ایک اور ہنگامہ شروع ہوگیا۔

(۹۲)

ساری دنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔ سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوتے درخت ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کسی مصور نے کینوس پر پھیلے ہوئے چائنا وائٹ پر سیاہ رنگ سے ادھر ادھر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی ہوں جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھنتی ہوئی اداس زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس عظیم کینوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دو منزلہ کاٹج تھا جیسے کاٹج عام طور پر اودسٹرلی میں جا بجا ہیں۔ ایونیو میں داخل ہو تو بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔ سامنے چھوٹا سا روک گارڈن تھا جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔ سامنے ننھا سا برآمدہ تھا جس کی سرخ اینٹوں کی دیوار پر تانبے کی لالٹین نصب تھی۔ اندر گیلری تھی جس میں سے زینہ اوپر بیڈ رومز کو جاتا تھا۔ نیچے نشست کا کمرہ تھا اور کھانا کمرہ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔ اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ پیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔ گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا جہاں وائرلیس سیٹ اور ٹیلی ویژن رکھا تھا۔ وہیں کھانا بنتا، برتن دھوئے جاتے، اسٹوو کے پاس بیٹھ کر گپیں ہوتیں۔ جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتلون پہنے باہر کوٹھری میں سے لکڑیاں نکال کر سوں سوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائنگ روم کا آتش دان دہک اٹھتا۔ تب دنیا ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی۔ آتش دان پر ایک موڈرن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشا کا بڑا سا پورٹریٹ تھا جو زرینہ نے ماتیس کی طرز میں بنایا تھا۔ بڑا سا ایرانی قالین تھا۔ بڑے بڑے اسٹینڈرڈ لیمپ۔ دریچے میں سے باہر حدِ نظر تک برف دکھلائی دیتی۔ ریڈیو پر پسندیدہ نغمے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے۔ اب تک بڑی پُرامن، سیدھے سادے پُرسکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور یونیورسٹی میں روسی ادب اور فارسی میں بی۔ اے آنرز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلوما لے چکی تھی۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ اس کی جواں سال، سرخ بالوں والی ماں، جو نسلاً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤ زبان میں گفتگو کرتی تھیں، ٹکسالی محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور پُرمذاق۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لیے ہمیشہ جائے پناہ کا کام دیتا اور وہ ان سے بڑی بہنوں

کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت ذرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روسی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

اتنے میں گیلری کی گھنٹی بجی۔ زرینہ نے اُٹھ کر دریچے میں سے جھانکا۔ برف سے جوتے لت پت کیے، اوورکوٹ کے کالر سے مُنہ ڈھانپے سامنے گوتم کھڑا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آگیا۔

"میرا یخ‌ستہ شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہوگی۔"

"مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آجاؤ۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔"

"ان کو بھی بلالو اندر۔"

"کیسے بلالوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں"

"بہت سے بھوت۔ لاشیں۔ ارواحِ خبیثہ۔ وہ سب میری دوست ہیں اور باہر اندھیرے میں دانت نکوسے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔"

"تمہیں ان سے ڈر نہیں لگے گا۔"

"تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مگر—" اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہوگی۔ یہاں اندھیرا ہوگا۔ لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منا رکھی ہے۔ روشنی میں تم کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی؟"

وہ اکتا کر اپنے اٹیچی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

"گوتم — میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آگئے ہو۔ جہاں بھی گئے تھے — یعنی کہ — دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے۔"

"میں تم سب کا ممنون ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ— ویلکم ہوم— ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی — ہر سفر کے بعد کا عارضی پڑاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے شانِ استغنا سے ہاتھ ہلایا۔ "میں نے تمہارا سواگت قبول کیا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ "یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے جس میں تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان۔"

"وہی ہے۔"

"اچھا۔" اُس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ زرینہ کیا میں خبطی ہو گیا ہوں؟"

"نہیں تو۔" اُس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "محض تم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے ہو۔"

"متواتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہی تو جاتا ہے۔ میں جانے کتنے لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک۔"

"تم کہاں تھے؟"

"میں — یہ کیوں بتاؤں۔" اُس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔ "کئی راتیں میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوسے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشتیوں میں گھسا بیٹھا رہا۔ اسٹیشنوں کے ویٹنگ روم میں چھپتا پھرا۔ سارے میں پولیس کی نظروں سے بچا بچا گھوما کیا۔ تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر انسان کی طرح سامنے آکر اقبالِ جرم کر لوں۔"

"پولیس؟"

"ہاں۔ کیا تم کو نہیں معلوم؟"

"نہیں تو — کیا؟"

"میں نے، زرینہ بیگم —" اُس نے بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ "میں نے دو قتل کیے ہیں۔ تب سے مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سر چھپانے کو ٹھکانا مل جائے۔ واپس آ کر سارے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا لاؤ تمہیں بھی آزماؤں۔"

"اندر آجاؤ گوتم — یہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کر دوگی۔" اُس نے سہم کر پوچھا۔

"قطعی نہیں۔"

"نہیں میں یہیں بیٹھوں گا۔ گھروں کی چھتیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔" زرینہ نے اسکارف سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔ برف کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

"سنو زرینہ بیگم۔" اُس نے اٹیچی کیس پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اُس سے کہا۔ "میں اعتراف کرنا

چاہتا ہوں کہ میں نے دو قتل کیے ہیں اور کمال یہ ہے۔" وہ ہنسا۔ "کہ میں اس قدر چار سو بیس ہوں کہ میرے دونوں مقتولوں کو اس کا علم تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے۔" اب دفعتاً اس کی آواز بالکل نارمل ہو گئی۔ "اس روز جب میں سریکھا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا تو نرملا نے مجھے پہچان کر نہ دیا کیونکہ وہ مر چکی تھی۔ اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے چیلسی کے ایک پب میں چمپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا — کیونکہ وہ بے حد ڈرنک تھی — چنانچہ" اس نے بڑے فخر سے کہا۔ "میں اس قدر کا ماہرِ فن کروک ہوں — دیکھا تم نے۔"

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور برفیلی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی ایک موٹر ڈرائیو پر آ کر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پر ایک پیلا راستہ سا بن گیا۔

کمال اور ہری شنکر موٹر میں سے اترے۔

"زرینہ" — انھوں نے ڈرائیو پر سے آواز دی۔ "گوتم تو یہاں نہیں آیا؟"

وہ دونوں برف پر بھاری بھاری قدم رکھتے سیڑھیوں پر آ گئے۔

"سوامی جی کے سنٹر میں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور شاید ادھر ہی کی طرف گیا ہے۔" کمال کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موٹر میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔

(۹۳)

"کوئی نہیں آیا،" شیلا دیوی نے دروازے میں آ کر کہا۔ "تینوں کے تینوں دہریے ہیں سورگباشی نرملا کے گھر والے۔ سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدراسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سویس کاٹیج سے آ گئی تھی۔ مگر یہ لوگ شانتی کا مارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔"

"اور جانتی ہو اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس انڈین ڈانسر کے فلیٹ میں جمع ہو کر صبح سے شام تک تاش کھیلتے ہیں — حد ہے۔" ایک بے حد روحانی انگریز بڑھیا نے دریچے میں سے منہ باہر نکال کر بات کی۔

چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔
"تم کسی کی متلاشی معلوم ہوتی ہو" دوسری دیانت پرست امریکن بڑھیا نے دریچے میں سے سر نکال کر کہا "دیکھو — وہ یہاں موجود ہے — تمہیں — ہم سب کو بلا رہا ہے —" انھوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ "اسے دیکھنے کے لیے وہ تیسری آنکھ چاہیے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔"

چمپا ہڑبڑا کر دوڑتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماتھوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔

وہ دوڑ کر ایک ۷۳ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔
سنٹر میں سوامی دیویکا نند نے اپنا لیکچر چلانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پران کا لیکچر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑھیں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صبح کے برتن دھوئیں گی اور موزے رفو کریں گی اور گیس کے بل کی فکر کریں گی۔ اس وقت لارڈ کرشنا ان کے کتنے کام آئیں گے۔
وہ بس سے اتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی۔
ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نئی ٹولی گپوں میں مصروف تھی۔
"میں چمپا احمد ہوں" اس نے دروازے میں جا کر کہا۔
"یس ؟"
ایک مدراسی طالب علم نے آگے آ کر پوچھا۔
اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کا نام کتنا غیر اہم تھا۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا کسی کو اس کی ضرورت نہ تھی۔
"کچھ نہیں — کچھ نہیں —"
"جی — آپ کو کیا چاہیے ؟" ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا۔
"کچھ بھی تو نہیں —" اس نے اور زیادہ ہڑبڑا کر جواب دیا۔ "ایسے ہی آپ لوگوں کا سنٹر دیکھنے چلی آئی تھی۔"
چند لڑکوں نے اسے شک و شبے کی نظروں سے گھورا۔
وہ الٹے پاؤں پھر سڑک پر آ گئی۔
اسٹرینڈ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی۔ لفٹ میں اوپر کی منزل تک پہنچی جہاں کینٹین میں حسب

معمول خوب شور مچ رہا تھا۔

"میں چمپا احمد ہوں۔" اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا۔ اسے اپنی اس احمقانہ حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا۔

"یس ڈیر۔" ادھیڑ عمر کی ہندوستانی عیسائی عورت نے، جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی، انگریز عورتوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا، "کھانا تو ختم ہو چکا ہے۔ اسنیکس ہیں۔"

"نہیں — ٹھیک ہے۔" وہ سٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سریکھا کا میاں گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ پھر باہر آگئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پہنچی۔ وہاں اسے کمال ملا جو کاؤنٹر پر کھڑا کسی کو فون کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر باہر آ کر اس نے بی بی سی کی کینٹین میں جھانکا۔ چچا صدیقی کوئی لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بٹالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تقی سید منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یاور عباس کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی انڈر گراؤنڈ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈاویل کا ٹکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈاویل کی چوڑی سڑک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سریکھا اور آشا کے مکان تھے۔ باڑ کی دوسری طرف چند قدم پر طلعت اور کمال کا فلیٹ تھا۔ اسٹیشن کے مقابل کے جدید بلاک میں شانتا اور ولیم کرینگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسری کی دکان سے سبزی کا تھیلا اٹھائے سریکھا باہر نکلی۔ "ارے ہو چمپا۔" اس نے چلا کر کہا۔ "وہاں کیسی کھڑی ہو — آؤ — آؤ —"

وہ خاموشی سے سریکھا کے ساتھ ہولی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

"چنانچہ یہی گوکل تھا — شارمیلا — یہی گوکل تھا —" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا۔" سریکھا نے پلٹ کر پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"بیٹھو۔ گلشن ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔"

"اچھا۔"

ڈرائنگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا اجالا باقی تھا۔ بہت سی سُرخ پتیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آکر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سیڑھیوں پر، ڈرائیو پر۔ چار یا پانچ پتیاں دریچے کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی سنہری لکیر نے گھاس پر حلقہ سا بنالیا۔

کیا پتا انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

"ارے چمپا۔ یہاں اس صوفے پر بیٹھ جاؤ آرام سے۔" سریکھا نے ترکاریاں سینی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اس صوفے پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا جو اس روز تھا۔" چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

"اُس روز — کس روز؟ کیسا تھا؟" سریکھا نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا معلوم ہے۔"

خالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ شدید سردی۔ شفاف، پاکیزہ برف۔ سارا وجود بے حد ہلکا پھلکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سریکھا نے شال اوڑھی اور کمرے میں آکر آتش دان جلایا۔

"کل"، اُس نے بالٹی میں سے کوئلے الٹتے ہوئے بات کی۔ "بہت سے لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔"

"گھر؟" چمپا نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہندوستان۔" سریکھا نے راکھ کریدنا شروع کی۔

"کون — کون —؟" چمپا نے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی سے کیا مطلب۔ وہ اس خالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سریکھا گھریلو انداز میں پلو کمر میں کھونسنے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔

"سبھی —" اُس نے جواب دیا۔ "کمال۔ ہری۔ کملا۔ ہری فلائی کر رہا ہے۔ کمال پرسوں کیلئے ڈوور جائے گا۔ گوتم تو آج صبح کرشنا مینن کے ساتھ پھر نیویارک چل دیا۔"

باہر چھتوں کے پرے ایک دم سُورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈیو میں اپنا بگل بجایا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو دفعتاً دنیا کو آ دبوچتی ہے۔ وہ سریکھا کی مدد کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے۔ وہ باورچی خانے کے

دروازے سے نکل کر سرد باغ میں سے گزرتی آشا کے گھر چلی گئی۔

سریکھا کی آواز پردہ واپس لوٹی۔ اس نے دریچے میں سے اندر جھانکا۔ شام کا اثر کمرے میں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ رات نے لے لی تھی۔ وہ دوبارہ اس کمرے میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائے دوسرے تھے، رنگ، فضا کا سُر۔ وقت بھی کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا۔ اس کا ذرا سا ٹکڑا ابھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

سریکھا کے گھر سے باہر نکل کر اسے کمال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں۔

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ — مجھے چھوڑ کر مت جاؤ — مجھے چھوڑ کر مت — اُس نے چلا چلا کر کہنا چاہا مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی اور جون کارٹر کی گلی میں پہنچی اور اصطبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مگر دفعتاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ دریچے میں رکھے ہوئے جیرینیم کے پودوں پر جھک گئی۔ اب تک رات میرے خلاف تھی۔ اُس نے سوچا۔ اب شاید میری ساتھی بن جائے۔ اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا، گھاس کی سرسراہٹ، پتوں پر جمی ہوئی برف۔ زمین پر رات کی موجیں بہتی چلی جا رہی ہیں اور اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعتاً مکمل طور پر آزاد ہوں۔ وہ ہنسی۔ نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے اور اس زمین پر مجھے موت تک چلتے جانا ہے۔ قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے۔ (اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا گویا آج تک وہ اسے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔) رات میرے ہاتھ میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھامے دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سکھی ہے۔ کہو سکھی کیسی ہو — میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ برساتوں میں، پھاگن کی رت میں، پورنماشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سے بتایا ہے۔ ایک روز تم ہی جیتو گی۔

اور تم، اس نے دوسری بات شروع کی، میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسرا ہٹ میں چھوڑتی ہوں۔ میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جون کارٹر کے فلیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جون بھی سو چکی تھی۔ ادجیت اپنی میٹنگ سے نہیں لوٹا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے ٹکرائیں۔ وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا

خیال تھا ملے اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن۔ پردوں کے پیچھے تہ در تہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں۔ میں حدِ فاصل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جا سکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے پھاٹک ہے۔ اب دوسرا دیس شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانۂ راہداری، نئے کاغذات کا انتظام کرنا ہوگا۔ نئے سرے سے خانہ پری اور دستخط کرنے ہوں گے کیوں کہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میں نے اب تک بہت سے سحر توڑے ہیں۔ تمہارا والا سحر تو بہت ہی غیر اہم تھا۔

مجھے پہچانو۔ میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔ تم کم از کم مجھ سے نہیں بھاگ سکتیں۔ لوگ تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں۔ تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی دقت پیش آ رہی تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے، سارے ارادے میری وجہ سے خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھاؤں گا۔ اب مجھ سے صلح کر لو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ پھٹپھٹانے لگا۔ کمرہ کہرے سے بھر گیا۔ تب اُسے معاً محسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔ اس نے جلدی سے دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

(۹۴)

"آپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بنواؤں گی، کار چوبی۔" نرملا کہہ رہی تھی۔

میں خاموش رہی۔

"مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈر والی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" مالتی نے ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ مالتی رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملا اس سے ایک سال چھوٹی تھی میں نرملا سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں ملبوسات کے متعلق اپنی وسیع

معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔
پھر طلعت دفعتاً خاموش ہوگئی۔ "دیکھو،" اس نے کمال سے کہا، "میں نے آج یہ محسوس کیا ہے میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔"
"میرا ماضی محض میرا ماضی ہے" کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔
"اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔" ہری شنکر کی آواز گونجی۔
"لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدے بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔" طلعت نے کہا۔ "میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔"
"تمھاری مدد طلعت بیگم شاید آئن اسٹائن بھی نہیں کر سکتا۔"
"میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے" کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔
"وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔" طلعت نے کہا۔
یہ لوگ جو لندن کے سینٹ جانز وُوڈ میں بیٹھے ۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی موٹریں آ جا رہی تھیں۔ وائرلیس میں سے دی آنا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اونچی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔
وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۱ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے جوانی میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ وقت جو سیال تھا، وقت جو منجمد تھا۔
"تم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔ "کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔"
"اور گوتم نیلمبر تک کس قدر خوف زدہ نکلا۔" کمال نے کہا۔
"گوتم نیلمبر کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے

کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔" ہری شنکر نے کہا۔ "میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا۔ اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے کنی یگ ہم لوگ ہیں، ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔"

وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔ اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے۔ اور آگے — پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

کمال گویا اسٹیج پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ طلعت کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کریگ۔ زرینہ۔ وہ سب صبح صبح گوتم نیلمبر کو ایرپورٹ پہنچا کر واپس لوٹے تھے اور کمال کے کمرے میں ہری شنکر اور کمال کے بندھے ہوئے اسباب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آ کر پندرہ دن تک کمال کے گھر پہ بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھر تاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماؤس کے کومک اور فلمی رسالے تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لیے اسے پھر نیویارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ کمال اور ہری شنکر کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو ایر انڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ کمال کو کل صبح بوٹ ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ کملا بھی جا رہی تھی۔ مائیکل بھی جا رہا تھا۔

طلعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۱۵، دسمبر ۵۴ء۔ ۱ سے پھر بی بی سی آئی۔ "مائیکل دروازہ بند کر دو۔"

مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طلعت کو کلدار کھلونوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں (مائیکل)۔ سر ہلاتے ہوئے سفید چگی داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شنکر)۔ مہاراجہ چندر گپت کے دربار کی نرتکی (سریکھا)۔ دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ ننگے پاؤں چلتے گولہ گنج والے کمر خمیدہ نواب کمن صاحب (کمال)۔ دیوالی کے گڑیوں گڈوں کی طرح وہ سب سامنے سجے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے کمہاروں نے بنایا تھا۔ (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔) ابھی بہشتی آئے گا، چھڑکاؤ ہو گا، تخت بچھے گا، تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لونا چماری کا جادو چلے گا۔ پھر یہ سب جا کر اپنے اپنے طاقوں میں بیٹھ جائیں گے۔

"میں بالکل ٹھیک تھی۔" اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مگر پھر ایک دم چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔"

کمال نے گویا اس سے کیو لے کر کہا: "یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گڑبڑ ہے۔"

"اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پُرخطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔"

"الفاظ کیا تھے؟ حقیقت کیا تھی؟ کتابوں نے کہا الفاظ غلط ہیں۔ حقیقت کوئی شے نہیں۔ سمبندھ لایعنی ہیں۔ پِتارم، ماترم، بُترم، پوترم — سب — ہر شے فالتو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا برہسپتی راکھشسوں کو اپنا علم پڑھا رہا ہے۔ کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم راکھشسی نظر آئی یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چڑیل جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاؤں میں ناچتی پھر رہی تھی۔

ان تاریک خلاؤں میں اور بہت سی جھاڑوئیں سن سے پاس سے گزر جاتیں جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں: تہمینہ، نرملا، روشن، جون کارٹر، فیروزہ، چمپا، زرینہ اور جانے کون کون۔ یہ جھاڑوئیں اب اتنی اوپر اڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دُنیا کے آسمان ان جھاڑوؤں سے پُر تھے۔

ان سب میں چمپا ایک بڑی قابلِ ذکر ہستی تھی۔ اس نے غلطی یہ ہوئی خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو لامحالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو ٹکرا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہدِ عتیق کے بھگتوں کی مانند گاتی پھری۔ گرجاؤں میں گئی۔ راہبات کو رشک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو یکجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض تھوڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صبح منہ اندھیرے اٹھ کر بھیرو گاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ میں رادھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگدلین ہوں۔ میں زریں تاج طاہرہ ہوں۔ مدتیں گزریں اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیپل میں جاتی ہوں اور بشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یوکرائسٹ کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں۔ گوتم نیلمبر کی طرح اسے ہر واقعے میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ کمال نے ناک اُٹھا کر کہرے کو سونگھا۔

"چیزوں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت دُکھ اٹھائے ہیں۔"

مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں،" طلعت نے جواب دیا۔ وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کیے۔ شام کی کلرنگ روشنی میں وہ ہیمپسٹیڈ ہیتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں کے چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن، کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ، تنگ گلیارے جن کے سرے پر نیم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفتروں سے لوٹ رہی تھیں۔

"یہ منظر میرے لیے لرزہ خیز ہے،" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں۔" طلعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بور ہوئے۔

"وہ دیکھو تروناد وغیرہ آ رہے ہیں۔"

"آہا۔"

نیچے میلہ لگا تھا۔ جپسی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلا رہی تھیں۔ بچے مونگ پھلی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔

"سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھسیٹنے کی کوشش کریں۔" مائیکل نے کہا۔

"ہاں،" طلعت نے دہرایا۔ "میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف میرے ہیں۔ وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے، گو خیال رکھو۔" اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ "میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں۔ مستقبل ہم سب کا مشترک ہے۔"

مائیکل نے ایک کنکر اٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ "خدا کے لیے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائن مت چلاؤ۔ مستقبل مشترک نہیں ہے۔ مستقبل اس پہاڑی کے ادھر ہم سب کے لیے الگ الگ منہ پھاڑے کھڑا ہے، ہری کے دس سر والے خدا کی طرح۔"

"او مائیکل۔" طلعت نے بچوں کی طرح کہا۔ "یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں۔"

"ہاں۔"

"میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام دہ گھر۔ بیگ کھولتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراسلے۔ شیئرز کے کاغذات۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی رپورٹیں جن پر نام ہوتے۔ لارڈ سنہا۔ سر بیرین مکرجی۔ مسٹری تھاپڑ۔ ان سب ناموں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اگو نیچی

مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائیک۔ بھوک۔ بے روزگاری۔ ڈائریکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائیو رو کلکتہ۔ بشپ گیٹ۔ چورنگھی۔ ٹاٹا نگر۔ اینڈریو یول کلکتہ۔

"میں ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دستخط کرتی، جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے درجے دولت مندر جے کے گواہ تھے۔ یہ سب کیوں ہے ہمجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھٹراگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔ روپیہ۔ دفعتاً روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا؛ یوتروں کے رئیس ایسے ہی غنی ہوتے ہیں، وغیرہ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آتی۔"

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں جھیل کے پانی پر ڈوبتے سورج کی کرنیں رقصاں رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجاتا سامنے سے گزرا۔

کمال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معاً طلعت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں نے ایک مرتبہ نرملا سے پوچھا تھا: رانی بی بی! تمہیں ڈر کاہے کا ہے۔ نرملا نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں۔ وہ میرے خواب جانتا ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ نرملا کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ گوتم بالآخر لاعلم رہا۔ ہم لاعلمی میں پیدا ہو کر لاعلمی میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔ یہی اصل سد سانت ہے۔"

کمال ان کی طرف بڑھتا دکھلائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتا توڑا۔ میلے میں بجتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔

ایک جیٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھا کیے۔

"لاعلمی کا جو شہر ہم نے بسا رکھا تھا اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے چُنی تھیں۔" طلعت نے بات جاری رکھی "ایک روز سینڈ ھ لگا کر موت ہمارے شہر میں داخل ہوئی۔

"ایک مرتبہ جب فارن برا کے ایر فیسٹول کے موقع پر بے چارہ جان ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر تماشائیوں کے اوپر آن گرا تھا——

بیسیوں لوگ مرے تھے۔ اس سمے، جب طیارہ دہکتے ہوئے آتشیں گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا، اس لمحے مجھے پتا تھا کہ یہ موت ہے۔ آن کی آن میں میں بھی جل کر بھسم ہو جاؤں گی۔ مگر جانتے ہو۔ زمین پر اوندھے لیٹنے کے بجائے میں طیارے کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ میں چندرا اور رزرینہ کو پکارتی پھری کہیں وہ نہ مر گئی ہوں — مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔ اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔

"لہٰذا نرملا نے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو گا گویہی ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا لہٰذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی دریا کے تاریک دھارے میں بہہ گئی۔

"ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے: جاگتا ہوا انسان، خواب، بغیر خواب کی نیند اور موت۔

"جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت گہری نیند سو رہی ہوں، خالی اس گہری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیے۔ میری آتما جا کر اندھیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما دوسرے غیر مرئی لیکن مادی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھر نا تھا مگر واپس نہیں آنا تھا۔ یا نہ جانے کیا ہوتا تھا۔ مہاراجہ جنک نے کہا تھا: متھلا جل رہا ہے مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔" طلعت نے کہا۔

"ہم سب جلے جا رہے ہیں۔" ہری شنکر نے مائیکل سے کہا۔ "کیا آگ کی لپٹیں تم تک نہیں پہنچیں۔"

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

نیچے نیم تاریک گھاٹی میں کمال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طلعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی: "اس سمے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔" اس نے کہا۔ "مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیولوک میں، وایو کی دنیا میں ہوا، سورج اور بجلی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، ہوا، دھوئیں، بادل اور بارش اور

پودوں میں پہنچی۔ قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں، دھوئیں سے کہر میں، کہر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری روحیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔"

"خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔" شنکر نے کہا۔

"موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ ہوائیں میرے سانس کو اڑا لے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سلا دے گا۔ آتما فضا میں گھل جائے گی۔ میرے انگ کے روئیں جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ سر کے بالوں سے درخت اگتے ہیں۔ خون پانی میں گھل کر پانی بن گیا۔ طلعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دہرایا۔

"گہری نیند۔ گہرا پانی۔ گہرا خواب۔" شنکر نے کہا، "عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سو چکے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔"

"جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ختم ہوا تو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی اگنی، سرد پانی، خنک ہوائیں۔ سب اپنے سبھاؤ سے آپ پیدا ہوتی ہیں۔ گوتم نے چمپا سے کہا تھا: اگر تمھارا جسم تمھارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیٰحدہ کر دو اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ۔ مگر تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" مادہ پرست گلشن نے کہا۔

"آئے پریم پکے پروانے جوال مئی جھوی کے دیوانے
چرڑ چلمن سے کے پیچھے رے بیٹھی دیپ شکھا لہرائے رہے۔
دیپ شکھا لہرائے رہے۔"

چندرا نے گایا۔

"ابھی بہت سوں کو مرنا ہے، میں ان کے پہلے جا رہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں، میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں، جو مر گئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں، جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہو گا؟" ہری شنکر نے کہا۔

"چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے
ایک اچنبھا ہم نے دیکھا، بیچ ندیا ڈوبی جائے۔"

گھاٹی میں سے کمال کے گانے کی آواز آئی۔

"میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔" سرلیکھا نے کہا۔

"میں جو کچھ کرتا ہوں، میرا ہر فعل، لگتا ہے ساری کائنات کے چکر سے اس کا براہِ راست تعلق

ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہنستا ہوں۔ ویسے میں تم کو یہ بتلا دوں" مائیکل نے انگلی اٹھا کر کہا، "ہمارا حشر بہت برا ہوگا۔"

"کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں"، ڈراؤنے کورس کی مانند ان کی آواز پہاڑی پر گونجی۔

"سامنے مستقبل کی دیوار ہے اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی چلا چلا کر رو رہی ہوں۔ کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟" طلعت نے کہا۔

"کسی امریکن نیگرو کو بلاؤ۔ کسی جرمن یہودی کو پیش کرو۔ کسی عرب پناہ گزین کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔ کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرنارتھی کو آواز دو ——— اور ان سب سے پوچھو کہ تمہارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی؟" گلشن نے کہا۔

"میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو۔" مائیکل نے کہا۔

"اسرائیل کے نئے نغمہ نواز! ہم تو محض ڈیبورا کا گیت تم سے سننا چاہتے تھے۔" طلعت نے کہا۔ "مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اٹھالی۔"

"ہم ہزاروں برس تک روتے رہے۔ صحراؤں کی بھوک۔ غصہ۔ بے کسی۔ چیخ چیخ کر ہم نے یہوواہ سے فریادیں کیں۔ داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔ بے چارگی۔ خواب۔ میں طلعت کا سوال دہراتا ہوں ——— کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟ روح کی تنہائی انہوں نے اپنے لحن میں انڈیل دی۔ گہرائی کی تنہائی۔ اونچائی کی تنہائی۔ دکھ، شک، ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔ کسی کشمکش میں گرفتار ہو کر انسان خود کو کس قدر اکیلا محسوس کرتا ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔ میں نے ان کی آوازیں سنیں۔" ہری شنکر نے کہا۔

"بابل اور فلسطین کے سبزہ زاروں پر میں گاتا پھر رہا تھا۔" مائیکل نے کہا۔

"میں نے تمہاری آواز بھی سنی تھی۔" طلعت نے کہا۔

"یہ سارے تصورات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پردہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں کے شیشے رنگ دو۔ تمہارا تخیل بازنطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھرپور ہے۔" مادہ پرست گلشن نے کہا۔

"تاریخ کا احساس میرے سر پر تلوار کی طرح معلق ہے۔ میں اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔" مائیکل نے کہا۔

"کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔" کورس نے کہا۔

"کتابیں وہی تھیں جواب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔ نئی کتابیں چھپتی تھیں۔ مضمون لکھے جاتے تھے۔ نئی کہانیاں بنتی تھیں۔ روز صبح کو پہاڑوں پر روشنی پھیلتی تھی۔ کلیساؤں میں داؤد کے نغمے دہرائے جاتے تھے۔ میرے ربائی نے کہا: انسان کو سبت کی رات پانی نہیں پینا چاہیے۔ اگر پیئے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پر ہے۔ لیکن انسان پیاسا ہے تو اس کا کیا علاج ہو؟ اس سے کہو، انسان سے کہو داؤد کے ساتھ سات آوازوں کو دہرائے۔ خداوند خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قہرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیودار ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرز اٹھتے ہیں۔ جنگل سُونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پجاری کہہ اُٹھتے ہیں۔ تقدیس ہو—تقدیس ہو—تقدیس ہو—مگر تم پھر بھی کہتے ہو: میں پیاسا ہوں۔ میں پیاسا ہوں—" مائیکل نے کہا۔

"بھوک سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی۔" مادہ پرست گلشن نے کہا۔ "بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں۔ میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی۔"

کمال کا تانگا چڑھائی پر آگیا۔

"لوگوں کو احساسِ جرم اکٹھا کرتا ہے۔ یہاں احساسِ معصومیت نے کہیں کا نہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساسِ معصومیت کی رسیوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسی کو توڑا ہم سب، ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔" ہری شنکر نے کہا۔

طلعت اب ایک دوسری چٹان پر جا بیٹھی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے وادی کو دیکھ رہی تھی۔ "ایسا کبھی نہ ہو گا۔" اس نے مڑ کر جواب دیا۔ "ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیک گراؤنڈ، ہمارا بے حد اونچا مورل کوڈ آڑے آجائے گا۔"

"نہیں طلعت بیگم۔" ہری شنکر نے کہا۔ "ہماری کلچر کی رسی تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلق لٹک رہے ہیں۔"

"اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ، اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ۔" گلشن نے کہا۔

پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آرہے تھے ان میں چمپا بھی تھی۔ ہلو—

اس نے کہا اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کون جگہ ہے؟ یہ چوزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے دفتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی سنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے مگر مجھے بے حد ڈر لگا۔ چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ ساری بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو جل رہا ہے اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کوئی رنج کوئی جھنجھلاہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے پیچھا چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ تو مجھے ہرگز فکر نہ ہوگی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو دیکھا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھ دار، سنجیدہ، بردبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔" میں نے سنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اردو میں ڈب کر رہی ہیں کسی فلم کے لیے۔ شاید آپ کہہ رہا تھا۔" میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ مجھے کوئی بڑی اہم بات بتانا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ "چمپا باجی سامنے کون فلم ہو رہا ہے؟" میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماؤں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے اداس تھے۔ بیزاری سارے ماحول پر چھائی تھی۔ روشنیاں غمگیں تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پژمردگی تھی۔ وقت گھسٹتا جا رہا تھا۔ وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپکا کر کھڑی ہو گئی اور باہر ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

"اب میں نے اس کو بہت پیچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ اسی بیکراں اداسی، سناٹے کے اس پر شور بھنور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے بیٹھ جانے دو۔" کمال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی راکھ
میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ"

چندر انے گایا۔

"چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے اپنے دیوتا جگاتے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوٹ

دے گئے۔" طلعت نے کہا۔

"کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس دو نیناں مت کھائیو، پیا ملن کی آس۔"

چندرا نے گایا۔

"سبز رنگ کا کہرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کہرے میں بستے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اجالے اور خوف کے سنگم پر پاؤں ٹکائے، سونے کے رنگ والے خدا پرجاپتی کی مانند از سرِ نو چیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔" طلعت نے کہا۔

"دیکھو۔" اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر افق کی طرف اشارہ کیا، "مائیکل — ادھر تمہارا یروشلم ہے — ہم سب کا یروشلم ہے۔"

"اور یروشلم بھی تقسیم شدہ ہے۔" ہری شنکر نے اسے یاد دلایا۔

"اور پہاڑیوں پر داؤد کے نغمہ نواز کرا ہتے پھر رہے ہیں۔ لحن ختم ہو چکے۔ صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سولی پر چڑھتے ہیں کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہی تھی۔" طلعت نے کہا۔

"وہی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ سڑکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی چمنیوں پر سے چاند لڑھکتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے ندی کے کنارے، گلپوش سنہرے باغوں میں۔ ایسٹ اینگلیا کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ سنسان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرند چکر کاٹ رہے ہیں۔

میرے سامنے سے لوگوں کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں، جو چپکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہو گا۔" کمال نے کہا۔

کہرہ اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

"سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روتے
بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے۔"

چندرا گاتی ہوئی پہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

"روپ اور نام روپ۔" ہری شنکر نے کہا۔
"ودّیا اور اودّیا۔" طلعت نے کہا
"کانٹ اور ویدانت۔" مائیکل نے کہا۔
"اب ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔" سب نے یکزباں ہوکر کہا۔
"کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازلی اور ابدی جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور کمال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔"

سرد تاریک ہواؤں میں ان کی آواز ڈوب گئی اور سبز کہرے نے ان کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔

(۹۵)

طلعت دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ٹیوب میں بیٹھ کر چیلسی روانہ ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھند کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ چیلسی پہنچ کر اس مانوس سڑک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا۔ کملا کے بلاک پر پہنچ کر حسبِ عادت فرن کے پتوں کو چھوا۔ بوڑھے پورٹر نے، جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرایا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز۔ اور طلعت میں یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا: کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے یا بہار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز، زندگی کے اس ڈرامے کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنکنز، جس کا دایاں ہاتھ برما کے محاذ پر کٹ گیا تھا، لفٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طلعت اوپر پہنچی۔ گیلری کے دبیز سرخ قالینوں پر سے گزر کر اس نے کملا کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا ایک اداس سے رمز کی حیثیت رکھتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دونوں پیکنگ میں جٹ گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گرہستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، ملبوسات۔ یہ بھی تم لے لو، یہ بھی تم لے لو۔ کملا میکانکی انداز سے کہتی چلی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرنک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان

کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اٹیچی کیس بند کرتے کرتے کملا نے یکلخت ہوا میں ہاتھ لہرا کر Ash Wed-nesday پڑھنا شروع کر دی اور پھر اسی طرح جھکی ہوئی سلیپر اور ہاؤس کوٹ سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باہر ابھی دھندلکا موجود تھا۔ ایک آدھ روشنی کسی فلیٹ میں جھلملا جاتی تھی۔ "یہ گوتم صاحب بھول گئے یہاں پر۔" طلعت نے ایک کتاب اٹھا کر اُسے اُلٹا پلٹا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنائی گئی۔ سویرا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کملا کینیڈا کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طلعت نے کمال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رُخ کیا۔ صبح دس بجے کمال کی بوٹ ٹرین چھٹ رہی تھی۔

(۹۶)

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹرا کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ کمال کا دفعتاً دل بھر آیا۔ وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پونچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ ادجیت اور ترونا نے تو چَل چَل چَل بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا۔ گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کودنے جا رہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹسمتھ میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ۔ اجنبی مسافر۔ دنیا کی اجنبیت ابھی سے اس کے لیے شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ برابر میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے شفقت سے اُس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کمال نے چند بار تشکر میں ڈوب کر اسے دیکھا۔ بوڑھا سونی سونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو وہ اپنے کیبن میں آ گیا اور سارا دن اُس نے اپنے کیبن میں گزار دیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطالوی معمار تھا۔

دوسرے روز اس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فارن سروس کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان۔ فوجی افسر۔ طالب علم جو سرکاری وظیفوں پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی ہندوستانی

اور لنکا کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولتِ مشترکہ اور امریکن امداد کے پروگراموں کے تحت برِّ صغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلبا ء جو اپنے خرچے پر پڑھنے آئے تھے۔ اَن پڑھ سکھ اور کاروباری۔ مشنری۔ کیتھولک راہبات۔ ایک فرانسیسی بھکشو۔ برلن کی مسجد کے قادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی، جن کو کمال لندن میں بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے، اور اُنٹل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ ہندی بولتے تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنگھریالے لمبے لمبے بال۔ لڑکیوں کی ایسی خوبصورت شکل۔ دبلے پتلے نازک سے، مہاتما گاندھی کے چیلے۔ بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ چلّے کے جاڑوں میں بھی لندن میں دھوتی اور چپل پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوک گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ ”ری اماں مورے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا“ خوب لہک لہک کر گاتے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کمال سے فرداً فرداً سارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور کماری نرملا کے دیہانت پر اظہارِ تعزیت کیا۔ مائیکل بھی، جو جبرالٹر تک جا رہا تھا، ٹورسٹ کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرسٹ کلاس کی لڑکیوں نے کمال کو بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اُس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز کمال برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ریلنگ میں پیر اٹکائے واقعتاً سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی:

”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

”ضرور۔“ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز کمال کو خاموشی سے دلاسا دیا تھا۔ وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی مہربانی کا بے حد ممنون تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور اس کے لیے دوسری آرام کرسی کھینچ لی۔

”فریڈ، پال، تم لوگ بھی ادھر آ جاؤ۔“

”ٹھہرو، ہم بیئر لے آئیں۔“

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آ کر قریب بیٹھ گئے۔

”میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹرین ہوں۔ میں اور میرے دونوں دوست، جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈین ہو؟“

”ہاں۔“

"اسی لیے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی لڑکی کو انڈین کہہ دیا تو وہ بپھر گئی۔ وہ پاکستانی ہے۔" تیمنوں کھوکھلی سی ہنسی ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

"تم انڈیا میں رہتے ہو۔"

"جی۔"

"میں بودھ گیا جینتی کے لیے جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر کریم نے کہا۔

"اوہ، اوہ! بُدھ جینتی!!"

"بودھا تاریخ کا سب سے بڑا آدمی تھا" پال نے اظہارِ خیال کیا۔ "تم ہندو ہو نا؟"

"جی نہیں۔"

"اوہ، معاف کرنا۔ مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمڈن ہو؟"

"جی۔"

"تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو؟"

"یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔" کمال نے جواب دیا۔

"ہائی ڈوک۔" ایک امریکن نے بشاشت سے قریب آتے ہوئے کہا۔ "ہائی!" اس نے بے تکلفی سے کمال کو مخاطب کیا۔

"ہائی!!" کمال نے جواب دیا۔

"میرا نام ٹامس جیرلڈ الیگزنڈر ہے۔ مگر مجھے ٹام پکارو۔ اور تم؟"

"مجھے کمال کہتے ہیں۔"

"میں تم کو کم کہوں گا — کیپٹنگ کا کم!!"

"ٹو یور ہیو اولڈ ٹام۔" کمال نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

"باقی جرنلسٹ لوگ کہاں ہیں؟" فریڈ نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی تھا، مارلیس، جو ہند چینی جا رہا تھا۔ دوسرا ایک مشہور برطانوی شاعر تھا جو بی بی سی کے نمائندے کی حیثیت سے بدھ کی پچیس صد سالہ برسی میں شرکت کے لیے عازمِ ہند تھا۔ چند دولت مند امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یاترا پر نکلی تھیں۔ ایک فرانسیسی بھکشو نارنجی چادر میں ملبوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ وہ بھی گیا

اور بنارس جارہا تھا۔ وہ ٹورسٹ مسافر تھا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کر نیچے بہت جاتے ہو۔" کھانے کے وقت ٹام نے مسکرا کر دوستانہ لہجے میں کمال سے کہا۔ "کیا وہاں تمھاری گرل فرینڈ سفر کر رہی ہے؟"

"نہیں میرا پرانا دوست ہے، مائیکل گولڈ اسٹائین کیمبرج میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس سے آپ سب ضرور ملیے گا۔"

"مائیکل گولڈ اسٹائین، یہودی ہے؟" پال نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اوہ۔"

خاموشی چھا گئی۔

"اور سونے پر سہاگہ یہ۔" کمال نے گلا صاف کر کے کہا، "کہ اسرائیل جارہا ہے۔"

شام کو کمال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی اٹھک بیٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے، جو نیویارک سے آرہی تھیں، کئی مرتبہ کمال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمراہ تھی اور یونیورسٹی آف ہن سناٹی سے سوشل سائنس میں ایم۔ اے کر کے آرہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ دو مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ گنگنایا کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یوریشین اور رومن کیتھولک لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں۔ کمال کی شکل و صورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھا گئی تھی کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہر وقت ہڑبڑ مچانے والا لڑکا ہے جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب اِدھر اُدھر کرسیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے۔ فلسفہ، تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے۔ لیلا بھاسکر گاتی۔ رات کو رقص ہوتا۔ سینما دکھایا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلرٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصے تیار ہو گئے تھے۔ شادی شدہ بیگمات مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے۔ ایک کراچی کی ماہرِ تعلیم صاحبزادی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ڈیک پر کھڑے ہو کر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو لامحالہ مس رشیدہ سلطانہ کے کانوں میں شادی کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ، جو تنہا سفر کر رہے تھے، مس ایڈوینا رتن وردھن پر بہت مہربان ہو گئے جو کولمبو جا رہی تھیں۔ اس کا بڑا

قصہ رہا۔ کمال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی محدود دنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا۔ وہ بعض مرتبہ جھنجھلا کر سوچتا اور پھر ڈاکٹر کریر کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی بچھڑ گئے تھے مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبرالٹر پہنچنے والا تھا۔ کمال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سن کر، تاش کھیل کر، سوئمنگ کر کے، لائبریری میں رسالے پڑھ کر اب بُری طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھرا اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا، دور کشتیوں کے پاس ڈاکٹر ہینس کریر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل ریلنگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پر دری بچھائے کہنیوں کے بل لیٹی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

"لکھو—" مائیکل کی آواز آئی۔

"کیا لکھوں—" ٹام نے کہا۔

"جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو کیونکہ خداوند تعالیٰ کی دعا ہے کی ہوئی روٹی تم اسی طرح کماتے ہو۔" مائیکل گرجا۔

"اوہ—" کمال نے سوچا، مائیکل اور ٹام میں پھر جھگڑا شروع ہوا۔

"وہ دیکھو، کمال رضا آ رہا ہے۔ اس کی باتیں بھی غور سے سنو اور واپس جا کر جو کتاب لکھو اس میں ذکر کرنا کس طرح ایک انڈین مسلم تمہیں جہاز پر ملا جو پاکستان کا شدید مخالف تھا مگر ۵۵ء کے ہندوستان میں کوئی اس کی بات نہ پوچھتا تھا۔"

"مصیبت یہ ہے مائیک" ٹام نے کہا، "کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہو نا اصل نسل ایشیائی!"

"میں جذبات کو باعثِ شرم یا گالی نہیں سمجھتا" مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

"آہا ہا" پنڈت جی نے زلفیں جھٹکا کر کہا "آئیے شری رجا جی۔ اپنا مائیکل ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔"

"آہا، پنڈت جی! اس کی کٹوتا کا دتی ناشک میرے پاس بھی نہیں۔"

کمال نے ہنس کر جواب دیا۔

برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا رہا۔
"مصیبت یہ ہے،" ثام نے کمال سے کہا، "جو غیر ملکی تمہارے ملک کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ای۔ ایم۔ فارسٹر کے پیمانے سے ناپتے ہو جو بے چارہ خود آئیڈلیسٹ تھا۔ بونوں کی دنیا میں رہنے والا دیو۔"
"فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔" برطانوی شاعر نے کہا۔
"آج اگر فارسٹر دوسرا "پیسج ٹو انڈیا" لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔ اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان لامحالہ پاکستانی ہے۔ اب ہندو ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔"
"ہاں۔" کمال نے جواب دیا۔
"کمال تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں؟" شاعر نے پوچھا۔
"ہاں۔ مگر میں مظلوم کے روپ میں نظر نہیں آنا چاہتا۔ ہندوستان کی ازلی اور ابدی، دکھ سہنے والی روح! یہ تحمل، یہ گریس، یہ دکھ اٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بلاں کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بیٹھ جاؤ، تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔"
"سینٹ آگسٹائن تو بنارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔" مارلیس نے پوچھا۔
"کیتھولک نظریۂ حیات ایک مخصوص cult تھا۔ ساری زندگی کو اس نے اپنے اندر نہیں سمیٹا۔ ورنہ تم آج کیتھولک ہونے کے باوجود انڈو چائنا لڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔" کمال نے چڑ کر جواب دیا۔
"آبزرور اور combatant میں کیا فرق ہے؟" مارلیس نے پوچھا۔
"یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔ دوسرے جنگ کریں تم آبزرو کرتے رہو، اس سے کیا احساسِ جرم کم ہو جاتا ہے؟" کمال نے کہا۔
"تم تو مجھے کو ئیکرز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو۔" ثام نے کہا۔
"بھور بھئے گیتن کے پاچھے مدھو بن موہے پٹھا یو۔" ڈیک کے بہرے پر لیلا بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ کمال ثام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیلا بھاسکر کی طرف چلے گئے۔

"ہر کلچر کی ایک خفیہ زبان ہے جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے۔" برطانوی شاعر نے کہا۔

"مزید اشپنگلر!" ٹام نے کہا۔ "پنڈت اور سرکم کی کلچر ایک کہاں ہے؟"

"تم تو خیر مائیکل کی بھی خفیہ زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔" برطانوی شاعر نے مسکرا کر کہا۔ "اسرار تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ٹامس بے اٹیکنز!!"

مائیکل ڈرائی مارٹینی کے اثر میں مبتلا ایک کونے میں چپکا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سُن کر وہ چونکا۔ میکانکی انداز سے اس نے پلٹ کر وہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے اس کا سلسلۂ تقریر منقطع ہوا تھا:

"دیکھو۔" مائیکل پھر گرجا، "دنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آبادکاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا تسلسل شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکالا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے۔ پندرھویں میں اسپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزارا گر میں خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کا شکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابنِ خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں رائج کیا۔ میں نے ––"

"ٹھہرو –– تم بھولتے ہو کہ ––" ٹام نے بحثنا شروع کیا۔

لیلا بھاسکر گاتی رہی۔ کمال نچلے ڈیک پر اُتر آیا جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بیگمات خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقے میں بیٹھی تھیں۔ ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسری طرف سینما دکھایا جا رہا تھا۔ کمال ایک کھمبے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچھے عمیق بیکراں اندھیرا تھا۔ اسکرین پر ایک غنڈہ صفت لوفروں کی سی شکل والا مشرقی برلین کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیروئن کو اڑا لے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ پھر ہیروئن موزہ اتار کر چھت پر چڑھ گئی۔ دوسری طرف سے ہیرو، جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا، کود کر سامنے آیا اور کمیونسٹ ولین کو چاروں شانے چت گرا کر ہیروئن کو بچانے کے لیے لپکا۔

"آئیے، آئیے، بیٹھیے کمال صاحب" مس خان نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہلے دیکھ چکا ہوں دراصل۔"

لڑکیوں کو کھسر پھسر کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتے کے چند ملک التجار بلیس بنگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں محو تھیں۔ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

"کیوں جی، اب کے سے مرسی ڈیز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیلجائیے کراچی۔کیا خیال ہے؟ وہ فورڈ کونسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔" دریچے کے نیچے برآمدے میں باتیں ہو رہی تھیں۔

"اچھا جی۔میں اپریل میں یو۔این۔سیشن کے لیے نیویارک جا رہی ہوں۔مجھے اپنی بھابھی کا پتا ضرور دے دیجیے گا۔شیو تو اب میں ۵۶ء کا موڈل ہی لاؤں گی۔"

"میں نے بھی اپنی لڑکی کو انگلستان کے اسکول میں داخل کرا دیا ہے جی۔پاکستان میں تو اسکول بالکل نکمے ہیں۔میرا ارادہ ہے چھوٹے بچوں کو بھی ولایت ہی بھیج دوں۔"

"کیا کیا جائے، پاؤنڈ نہیں ملتے۔"

"میری بڑی لڑکی نے لاہور سے ایم۔اے کر لیا ہے کہیں اس کی شادی کرا دیجئے۔"

"کیسا لڑکا چاہیے۔"

"کم از کم سی ایس پی تو ہو۔"

"کہیں کام کر رہی ہے بچی۔"

"جی ہاں۔کنڈر گارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے۔ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالرشپ بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی —"

"ہاں جی۔یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔یہ بیگ روم سے لیا؟"

"جی— آپ —اب کے امریکہ سے بہت چھتا دری فریجڈیر لے آئیں۔"

"جی کیا بتاؤں— ضروریاتِ زندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

کمال دریچے سے ہٹ آیا۔سیڑھیاں اتر کر ٹورسٹ کلاس کا چکر لگانے میں مصروف ہو گیا۔ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے ہیر گانے میں محو تھے۔دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ڈرائنگ روم میں تاش کھیلے جا رہے تھے۔کمال مائیکل کے کیبن کے سامنے سے گزرا اور اسے یکلخت خیال آیا کہ کل صبح مائیکل جبرالٹر پر اتر جائے گا اور اس کے عین بعد ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔کیسی عجیب بات تھی۔سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدھم پڑ گئی۔وہ مائیکل کے کیبن

کے باہر ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔ سامنے پورنماشی کا چاند افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ سمندر بے حد پر سکون تھے۔ جہاز لہروں کو چیرتا ہوا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈیک کے اس حصے میں مکمل تنہائی تھی۔ صرف فرانسیسی بھکشو ایک سرے پر کمال کی طرف سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے ٹام اور برطانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا جی بیٹھنے سا لگا۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اسٹیٹ لیس ہوں، میں اسٹیٹ لیس ہوں۔" اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔

سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔ دور دور دنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔ کانسٹی ٹیوشن اور کوئین الزبتھ۔ امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ ان کشتیوں سے موسیقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ یورپ اور انگلستان کے عالم۔ اٹلی کے راہب۔ امریکن سیاح۔ میکسیکو کے نقاش۔ ہندوستان کے رقاص۔ دنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔ دلی میں پنڈت نہرو حکومت کرتے تھے۔ زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

"خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔ مجھے شانتی چاہیے۔" کمال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور رلازوال مسرت۔ ایسی ہی ایک پورنماشی کی رات، ڈھائی ہزار سال ادھر، اس سمندر کے اس پار ایک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

"مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔" کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پر اسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ "خیال — خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذاتِ مطلق ہے جو سناٹا ہے۔" اس نے فرانسیسی میں کہا۔

"مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" کمال نے کہا۔

"شُونیا۔ سنّاٹا۔ شونیتا۔ سُونا جو ذاتِ مطلق ہے، جو صفر کا تصور ہے۔"

"مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔" کمال نے کہا۔ "اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔" اس نے مہایانِ مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا جو سوربون یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

"میں اسٹیٹ لیس ہوں اور یہ تمہاری سمجھ وتی نہیں ہے۔" اس نے دل میں کہا اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پر واپس آگیا۔ رات گزر گئی۔

جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزلیں گویا قریب تر آتی گئیں۔

(۹۷)

ہندوستان کا ساحل! بمبئی!! گھر!!! گھر؟؟

کمال لکھنؤ پہنچا۔ گلفشاں کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ موٹر خانہ اور اصطبل گودام بنے ہوئے تھے۔ (جتنے عزیز پاکستان ہجرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں، خالہ بیگم نے کہا۔) شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں نے گنگادین کو ڈھونڈا۔ قدیر اور قمرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتار اور جھنگی کو آوازیں دیں۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ دنیا وہی تھی۔ گلفشاں، لکھنؤ، عزیز رشتے دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا تھا؟ کیا وہ اپنے باپ کی تنگدستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی ساری عمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ (بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے۔ لو بوڑھے باپ کو تکیے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہو لو، نواب صاحب بہادر نے کہا۔) بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو گئیں تو ہم کس گنتی میں ہیں، شام کو اُپی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ نانیارہ کی کرا کرہ ہی بک رہی ہے۔ راجہ سورج سنگھ کے پاس ایک دھیلا نہیں رہا۔ امی نے اپنے آدھے زیور بیچ ڈالے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" کمال نے اپنے بابا سے پوچھا۔ "کربلا ہجرت کیجیے گا پاکستان؟"

"یہیں رہوں گا۔" انھوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔"

کمال ہکا بکا رہ گیا۔ "مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔"

"ہاں ہاں تو پھر؟ پاکستان بن گیا، ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں یہاں سے۔"

"آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں دربدر مارے پھریں گے یا اس لیے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بنا پر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔"

کمال آج قطعی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفسیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئیڈیلز، ان کی منطق، ان کی بہادری یا بزدلی۔۔

"اب تم سے جرح کون کرے۔ تمھاری کھوپڑی ہمیشہ کی الٹی ہے۔" نواب صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضے کی قسط کے دو سو روپے لانے تھے جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

"اب میں عامر بھیا کی دلہن کے در پر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔ اگر چلے گئے تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم۔ وہاں کون کلیم ولیم کرتا پھرے گا۔ ویسے میرا دل نہیں لگتا اب یہاں۔" امی بیگم نے کہا۔

"مگر یہ تو آپ کا گھر ہے، آپ کا شہر، آپ کا وطن، جنم جنم کا دیس۔"

"مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہاں وطن ہے۔" چھوٹے پھوپھا نے کہا جو حال ہی میں ہجرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دنوں سامان کا تیا پانچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

کمال نے مزید تبادلۂ خیالات اس موضوع پر لاحاصل سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

چند روز بعد اس نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرنٹی کالج، کیمبرج۔ امپریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم۔ ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے۔ وہ دلّی کے چکر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

"میاں کسی سے سفارش کروالو۔" نواب صاحب نے کہا۔

"سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔ کیا مجھے اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھروں۔"

"یہی تو تمہارے دماغ میں خنّاس ہے۔"

اب وہ سارا سارا دن گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طلعت کو خط لکھتا: انڈیا ہرگز مت آنا۔ جہاں تک ہو سکے وہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہو گا جو میرا ہو رہا ہے۔

"تم کو کیا ہو گیا ہے۔" طلعت جواب دیتی۔ "اتنے ڈی مورلائزڈ کیوں ہو گئے۔ جدوجہد کی ہمت ہار بیٹھے۔ یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ ڈٹے رہو۔ مزدوری کرو، ہل چلاؤ۔ آخر انقلاب کا سامنا کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟"

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے؟ وہ سوچتا۔ یا وہ آئیڈیلسٹ پرلے درجے کی ہوتی ہیں۔ بہر حال طلعت کے خطوط سے اس کو بڑا سہارا مل جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔ اُس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے لوٹ چکا تھا اور بنگلور میں تعینات تھا۔ کمال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیّا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھا دی: فوراً یہاں آ جاؤ۔ ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔ بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ ضد چھوڑ دو۔" وہ دوبارہ تبدیل ہو کر برازیل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور برابر لکھا کرتے: آجاؤ — آجاؤ — آجاؤ۔

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔ چند روز بعد اسے بارہ بنکی کے کالج میں لیکچررشپ مل گئی مگر چونکہ بھیّا صاحب پاکستانی تھے اور "گلفشاں" اور موروثی جائیداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہٰذا کسٹوڈین کا قضیہ شروع ہو گیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر کمال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اودھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

"بورژوا انقلابی تھے حضرت۔ جب اصلیت کا سامنا کرنا پڑا تو بیٹا جیں بول گئے۔" کافی ہاؤس میں کامریڈز نے کہا۔

حسینی اور ان کی بی بی بھیا صاحب کی دلہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ قدیر اور قمرن مدتیں گزریں، موٹر بکنے کے بعد، مرزا پور واپس چلے گئے۔

ایک روز وہ حسبِ معمول دلّی میں لاج کے یہاں جمنا روڈ پر ٹھہرا تھا اور ایک درخواست مکمہ گرمیڈ منز ہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ٹامس ایکنز مل گیا جو جہاز پر اس کا ہم سفر رہ چکا تھا۔

"ہلو۔ تم یہاں کہاں۔" کمال نے پوچھا۔

"میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں۔ جنوب، بنگال اور آسام اور اڑیسہ۔ اب راجستھان کا قصد ہے۔"

"تم نے دلّی کی سیر کر لی؟"

"ابھی نہیں۔"

"تم نے ہمارا راشٹرپتی بھون دیکھا۔" کمال نے فخر سے کہا۔ "اور براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلّی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سمبل ہیں اور پوسا انسٹیٹیوٹ اور راج گھاٹ اور — اور —" وہ دفعتاً پرانا کمال بن گیا۔ فکرِ معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیلا فرزند۔ وہ دلّی کی ایک ایک چیز ٹام کو دکھاتا پھرا۔ شام کو اس نے ٹیرو طمل میں کونسرٹ سنانے کا پروگرام بنایا۔

"آج کل تم کیا کر رہے ہو؟" الیس میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے ٹام نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈھ رہا ہوں۔" اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

"بے روزگاری بڑا زبردست پرابلم ہے۔" ٹام نے کہا۔

"سب کے لیے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لیے آئے گی۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈوبیں گے اکٹھے ابھریں گے۔"

"لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔" گلشن نے کہا جسے انھوں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ "تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔"

"بالکل غلط ہے۔"

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلاؤ ٹریکٹر۔"

"اگر میں نے ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا مگر افسوس کہ میں آٹھ سال تیو کلر فزکس میں برباد کر کے آیا ہوں۔"

"سنا ہے پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے۔ وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔" گلشن نے رائے دی۔

"تم بھی یہی کہتے ہو؟"

"بالکل۔"

رات کی ٹرین سے وہ لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے۔ وہ بھی تعلق سے کراچی آ چکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

"کہو کمال میاں کیا حال ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔"

"اچھا تو ہمیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایں؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔" اس نے جلدی سے ان کو آداب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب کمال نے دہلی جا کر ویزا کی درخواست دی۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں۔ وہ دنیا کی نظروں سے بچتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلفشاں میں صرف سلئے ڈولتے نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھڑپھڑاتے۔ اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانسنے کی آواز آتی۔ امی بیگم پچھلے دالانے میں تخت پر بیٹھی وظیفے پر وظیفے کیے جاتیں۔ ہزاروں منتیں انھوں نے مان ڈالیں۔ جناب عباس کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبطین آباد کے امام باڑے میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبر کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا مولا کمن بھیا کام پر لگ جائیں، یا مولا کمن بھیا کی مدد کر۔ (بارہ بنکی کی لیکچرر شپ ختم ہو چکی تھی۔) وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ جاری رکھتا: تم بزدل ہو، کمینے، ڈرپوک۔ تمھاری وہ ساری نیشنلسٹ ٹریننگ کہاں گئی؟ طلعت ٹھیک کہتی ہے۔ گھاس کھودو، ہل چلاؤ۔ لعنت ہو تم پر۔ موقع پرست، بے ایمان، ڈھلمل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا اور آسرا رہ گیا تھا مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترک وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ گلفشاں کمال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب مرحوم

کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث پاکستانی تھا۔ گلفشاں متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب کمال کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں ریفیوجی پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں تالے ڈالنے کے لیے آگئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا اور اپنے بوڑھے والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین دلی پہنچی۔ چھٹے دن ٹرین نے بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔

ساتواں روز یوم سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا۔

(۶۸)

"کراچی۔ مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک "جھگیاں" جو قائداعظم کے مزار کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیرملکیوں بالخصوص امریکنوں کی بہت بڑی نوآبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے۔ یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے۔ اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگا لو، کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رُخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹیے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کر سکتا۔ بائیں بازو کا انٹلکچول روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں۔ جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزار طرح کی فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی ہے۔ اوپر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور

مقامی آبادی کی کشمکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کشمکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخری امید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی اس کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہاری کلچر اور تمھارے نظریے علٰحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیوں سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم "مہاجر" بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک اور مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہٰذا ہر مہاجر نے ادھر ادھر کراچی کا رُخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کر لیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی "دو کولونیاں" قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ ادھر رامپوریوں کا جتھا ہے۔ وہ حیدرآباد دکن کے جانبازوں کا محلہ ہے۔ اس طرف علی گڈھ والے، لکھنؤ والے، دلّی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ یہ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، الٰہی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں، بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں، ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصّہ لیتی ہیں، ڈیمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں۔ کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کھچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو اب تک یہ "گھر" کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مراد آباد ہے، ملک پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصّہ، جو برصغیر ہندو پاکستان کی مسلمان قوم کہلاتا ہے، اس کی نفسیات سمجھنا کوئی آسان بات نہیں!

دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے۔ پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے اور محتاجِ تعارف نہیں۔

اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے کہ اب "قصہ سوتے جاگتے کا" اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھو۔ یعنی کل جو صاحب بالکل گمنام اور ہما شما قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑپتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فراٹے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاولرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانے راجہ بنے بیٹھے ہیں۔

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کا اوفیشل آرگن ماہنامہ مرر ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدھی آبادی صرف ڈنر اور رایٹ ہوم کھاتی ہے اور سیمبا ناچتی ہے۔

ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔ پاکستان یہ ثابت کرتا ہے تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور میاں کی کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علٰحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

ادھر ہندوستان کہتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا منبع اس کی کلچر ہے۔ ادھر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے ادھر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کا پروپیگنڈہ غرضیکہ بڑے زوروں میں چالو ہے اور اس چاندماری کا نشانہ مغربی ممالک۔

ایک اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔ اقتصادی مشکلات، گرانی، رشوت ستانی، اقربا پروری، بے ایمانی، چار سو بیسی، سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ وغیرہ کا ذکر روزانہ بلاناغہ اخباروں کے اڈیٹوریل میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں مگر اس کے باوجود کوئی ان حالات کا مداوا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہوتی ہے، ان کو پتا ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ

یا سفارش کے ذریعے چٹکی بجاتے میں پورا کر لیا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے مگر اس کے لیے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں لیکن لیڈر کو بھی چند ایسے گر یاد ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کردار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث القوم اتنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش و خروش یہاں طاری تھا اب اس سے چوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساسِ کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیٹر ہیں نہ کانسرٹ نہ سیمنار نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں۔ تھوڑی بہت دلچسپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کونسل نے ایلیٹ پر ایک لیکچر کر دیا یا تصویروں کی نمائش منعقد کر لی گئی، کسی روز امریکن اطلاعات کے دفتر میں کوئی پروگرام ہو گیا، کبھی ایران یا انڈونیزیا یا فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی، کبھی جرمن سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا زور ہے جن میں ہم یہ غم لنڈھاتے جاتے ہیں۔ پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موٹروں کا لین دین ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی پتنگ لڑائی جاتی ہے۔ مکانوں اور زمینوں کے الاٹمنٹ کا کاروبار ہوتا ہے۔

یہاں مجموعی طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔

اعلیٰ طبقہ جو بڑے بڑے تاجروں، اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے، اس کی علیحدہ برادری ہے۔ اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انھوں نے لاکھوں روپیہ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ، جو بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حبِ وطن کا سارا ٹھیکہ انھوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

مسلمان قوم کی تاریخ کا یہ ہولناک ترین دَور ہے۔

پاکستانی انٹلکچولز کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھیانک خلاء میں برباد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے، کوئی راستہ، کوئی مقاصد۔ یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلخی اور بیزاری اور مایوسی کا فلسفہ ہے۔ میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں جو ان ہی کی نسل کے نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں انڈیا میں ہر پیسنے اہم، ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں چھپتی ہیں، مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے، کیسے کیسے رسالے نکل رہے ہیں، کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے، حکومت فنونِ لطیفہ اور ادب اور علم کی کتنی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اکثر مجھ سے کہتا ہے: "یار! قسم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرسٹریشن ہوتا ہے۔"

فرسٹریشن — یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سمبل ہے۔

دوسرا لفظ ریکٹ ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب — ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر ریکٹ چلایا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیاز انداز میں سوال کرتے ہیں: "کہو بھئی آج کل کون سا ریکٹ چلا رہے ہو؟"

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصّہ اس خلاء میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اپنے کام پر نکلتے ہیں، دوپہر کو ایک نیم تاریک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر کوئی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ منگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے ضمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہر حال رہنا ہے، روزی بہر حال کمانا ہے۔ اگر بھوکوں ہی مرنا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات "مہاجر" ہیں)۔ جرنلسٹ ایمانداری سے رپورٹنگ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے۔ ادیبوں کے پاس لکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں)۔ ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہو چکی حتیٰ کہ ادب میں جمود کا نعرہ بھی پرانا ہو گیا

اسلام — اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے)۔ ہر دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آ کر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک

اس بات پر خوب چڑتے ہیں۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب ـــ سب کو "مُلا" کے نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام، جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں ہوا تھا، اب وہ سمٹ سمٹا کر ایک مَڈیالے نالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بیہڑ میں بہہ رہا ہے جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جا رہے ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو فلسفۂ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی اسپین پر حکومت کی، ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عثمانیوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے کرام کی وسیع القلبی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ علیؓ اور حسینؓ کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں، اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرزِ زندگی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشد اہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زوروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے، کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مُووی میں لے لے، ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دیے جائیں۔

انگریزی جرنلزم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ ملی تھی اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھے لکھنے والے نمودار ہونے چاہئیں تھے ـــ ان گنت خواتین و حضرات یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر لوٹتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکا دکا خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لاد دیتے ہیں۔ یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں، کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے) ـ ان گنت لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور لیکچرر بن رہی ہیں، ملازمتیں کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کی ملازمت کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت ترقی کی ہے اور یہ ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

رات گزرتی جا رہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہوگا مگر اتنی بہت سی باتیں تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے ملک کو دیکھ لو، میری ہمت بڑھاؤ تاکہ میں اس ملک کے لیے اپنے بھر بُرا بھلا کچھ کر سکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچہ اب تک فیوڈل رہا ہے لہٰذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مڈل ایسٹ کے بادشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہانگیر پارک میں جمع ہو کر وزیرِ اعظم کی تقریر سننے کے بعد زندہ باد اور مخالف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہنستے بولتے خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلسے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں۔ نعرہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔

سیاسی لیڈرشپ بڑے بڑے کاروباریوں اور سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

عوام کی نفسیات اور ہسٹیریا کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے پولیس کورڈن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پنڈت جی خود ایک نمبر کے جذباتی آدمی۔ ان پر خوب رقت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھاٹک بنائے گئے۔ تقریبیں ہوئیں۔ یہی عوام وقتاً فوقتاً مخالفین کی ارتھی کے جلوس نکالتے ہیں اور ان کے پتلے سڑکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسٹیریا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لیے گمان ہوتا تھا پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور لاہور اور امرتسر حسبِ سابق ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جوق در جوق سائیکلوں پر بیٹھ کر لاہور آئے۔ لاہور کے حلوائیوں نے ان کو مفت مٹھائی کھلائی۔ تانگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔ قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئیڈیلسٹ قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمتِ انسان کے گن گائے۔ بڑے دلخراش واقعات بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے در و دیوار چھوتا پھرا۔ اس نے کہا مجھے میرے پرانے مکان لے چلو جو کہیں شاہ عالمی میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رو دیا۔

میں اس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹیریو ٹائپ کے متعلق ہم نے سوشیولوجی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دوچار ہوتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے۔ یہاں ہنوز روزِ اوّل ہے۔ ۴۷ء میں جو ہندوستان میں جو حالت شرنارتھیوں کی تھی وہ آج آٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز خوفناک تر ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ میں ٹیکنیکل طور پر خود "مہاجر" ہوں لہٰذا اس پرابلم پر میں نے بہت غور کیا۔

دیکھو بیٹا، بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ وہی اسٹریوٹائپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آجانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان لڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہند کی دفاعی افواج میں اس لیے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان بٹ چکے ہیں۔ ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں، تیسرا آزاد کشمیر ریڈیو میں نوکر ہے، اس کا چوتھا بھائی، جو ابھی پٹنہ میں بی ایس سی کر رہا ہے، انڈین ایئر فورس میں درخواست بھیجنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا لہٰذا وہ یہاں پہنچ کر جٹ پائلٹ بن جاتا ہے، پٹنے میں شاید کلرک بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے، جو زیادہ محنتی ہوتا ہے، نہیں جیت سکے گا۔ اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑاؤ کا کیمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشستیں مخصوص تھیں، نامزدگی کا دستور تھا۔ اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب برتا جا رہا ہے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہوگا۔

مسلمان کے لاشعور میں ہجرت کا فسوں بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیا میں سیاسی بیداری کے پہلے ہی یہ قوم متضاد و مخالف وفاداریوں کی کشمکش کا شکار ہوگئی۔ رہا ہند میں لیکن "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان اسلامزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دلآویز بنایا اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اوّل الذکر میں ہندوازم بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ 'ہندوت' کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیت اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیسی لامحالہ عیسائی بھی ہے مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی رنگین تہذیب اور

مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا لہٰذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر بھی اس سے مدافعت کرتا رہا۔ مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مبصرین کا، جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آتے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی، یہ کہنا کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچاؤ شدید تر ہو گیا۔ ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفسیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانیکر دونوں نے کیا ہے۔ یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا "اگر" ہے کہ اس خوف کا تدارک کیا جا سکتا، جو کہ کانگریس کر سکتی تھی، تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صیہون، حجاز تھا۔ یورپین یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفسا نفسی کا عالم اور حبِّ وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی لگاؤ نہیں۔ وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گومتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کر کے روتے ہیں ان کی اولاد، جو یہاں بڑی ہو رہی ہے، اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں۔ یہ نسل خالص پاکستانی ہو گی اور اس طرح ان متضاد وفاداریوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے مڈل کلاس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لیے سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ انسان اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی بیخ کنی برداشت نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے چنانچہ یہ اس کی دوسری بڑی زبردست نفسیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو انہی اسکولوں میں اردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان

میں رہ گئے تو اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے، اور اسی میں ان کی عافیت ہے۔ اگر وہ اسے بھی resist کرنا چاہتے ہیں تو لامحالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جائسی نے پدماوت، کبیر داس نے اپنے دوہے اور تلسی داس نے رامائن لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے محض ایک اور 'جات' سمجھا جاتا رہا ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی مڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علمبردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھیا صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے پبلسٹی کے لٹریچر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اٹھا لایا۔ رات کو میں نے پچھلے برسوں کے وزرائے اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طلعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اسکیموں کا ایک ریلہ ہے جو آٹھ سال سے اب تک بہتا چلا آرہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے مڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے لہٰذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے پروگرام میں تقسیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا۔ وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی طبقے کی حکومت ہے۔

آج جمعے کی رات ہے اور میں ایک انٹلکچول محفل سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بنائے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشگافیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنتیں۔ (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں۔ میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اعتنائی دیکھی۔)

اس محفل کے غیر ملکی اراکین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ الفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے۔ جو لندن اسٹیج پر رہ چکا ہے۔ جولیں ایک اور انگریز لڑکا ہے، رومن کیتھولک انٹلکچول۔ اس کا ساتھی رونلڈ ہے، یہ بھی اوکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہان کے مسائل پر زور و شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک

کورنر ہے جہاں لوگ باگ آکر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتھولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھی اور دوسری طرف مغرب کے رجعت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پر الجیریا کے سلسلے میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن امداد کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھا رہے تھے۔ میں دوسری طرف مڑا۔ استالین کے ایک سرے پر اجلا کا گروپ فرانسیسی انٹیلکچول سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ تھا۔

"فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔ فرانس، جو یورپ کی کلچر اور ذہن کا سمبل تھا، اس کے موجودہ رویے نے مغربی انٹیلکچولز کو ہڑبڑا دیا ہے۔ مغرب کا اب واقعی زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔" تنویر گرج رہا تھا۔ "اب اگر کل کو سارتر دوبارہ تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔"

"برطانوی دانشوروں کی کیا مضحکہ خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے ہیں۔۔۔"

یوجین دوسری طرف گوہر افشانی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹہلتا ہوا جا کر امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔

"میری — ذرا امریکن ایڈ دینا۔" رونلڈ نے سگریٹ لینے کے لیے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ بڑی خوش اخلاق لڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چند بین الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز کے لیے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوتا تو ہم لوگوں کا آج تک جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔" امریکن مورخ نے کہا۔ "تم اپنی وہ تھیوری مت دہرانا کہ تقسیم کی وجہ اقتصادی تھی۔" اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ "اس کے علاوہ اور کیا تھا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے؟" فرنی نے کہا۔ "میں نے ٹوئنبی سے بھی یہ پوچھا۔ وہ حیران ہیں ہندوستان کا اٹھارھویں صدی میں کیوں زوال ہوا۔"

"ہندوستان کی نہری آبپاشی کا انتظام ناقص تھا۔" جیکب موریسن نے کہا۔ "یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔"

اب رونلڈ اور یوجین اور میری رچرڈز ایک اور بحث کر رہے تھے۔

"مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔"

"ایں؟"

ریفرمیشن کے بعد عیسائی یورپ نے انتقاد کی اسپرٹ پیدا کی۔ وہ اسلام میں آج تک موجود نہیں۔

تم اعلانیہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو؟ تمہارا جینا دوبھر کر دیا جائے گا۔"

"واہ، اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔" فرنی نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اپنے رسولؐ یا خدا کے تصوّر یا قرآن — کسی چیز پر بھی تنقید کر سکتی ہو؟ عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور ملحدوں کی فوج موجود ہے۔ عیسائی بڑے اطمینان سے تثلیث اور ورجن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے ہیں، کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنٹیفک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں۔"

"جبھی ٹوئنبی نے کہا ہے کہ انڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ رواداری ہے۔"

"بدھ ازم اور —"

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ ایرپورٹ جا کر قہوہ پیا۔ جب میں واپس گھر پہنچا اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔

سامنے ٹام کی کوٹھی ہے۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ ٹام بھی کسی پارٹی سے لوٹ کر سونے جا چکا ہے۔ یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بمبئی آیا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہے۔ کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا۔ اب محکمہ فشریز یعنی مچھلیوں کا ایڈوائزر ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ فشریز کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کو بھی ایڈوائز کرتا ہے۔

ایڈوائزرز کی ہر طرف ریل پیل ہے۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈوائزر منسلک ہیں جو جانے کیا جادو سکھاتے ہیں مگر اب تک کوئی خاص ترقی کہیں نظر نہیں آئی۔

چہار سو اسکنڈلز کا بازار گرم ہے۔ رشوت کے اسکنڈل، دھاندلی اور سیاسی غنڈہ گردی کے اسکنڈل۔

آج کا سب سے بڑا واقعہ، طلعت میری بھتیجی بہن، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا انقلابی، کانگریس کا سرگرم کارکن، متحدہ ہندوستان کی عظمت کا جوشیلا نقیب، آج صبح میں بارہ سو روپے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے سٹ اپ کرنا ہے۔ اس کے لیے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا جاؤں۔ فی الحال اسی کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں۔ اگلا خط تم کو ڈھاکے سے لکھوں گا۔

اب صبح ہو رہی ہے۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی۔ حد ہے۔ میں نے جانے

کتنے صفحے سیاہ کر دیے ہوں گے۔ ابھی میں نے دریچوں کے پردے ہٹائے اور باہر جھانکا۔ کراچی جگ اٹھا ہے۔ کراچی اپنے کام پہ جا رہا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چھکڑا ایسی بسوں، سائیکل رکشاؤں پر سوار کارخانوں اور دفتروں کی طرف رواں ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں بٹیا جن کو عرف عام میں جنتا کہا جاتا ہے۔ طلعت! ان لوگوں نے تو کوئی قصور نہیں کیا، کوئی جرم۔ ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو بھوکا رکھا گیا۔ ان کو جس لاٹھی سے ہانک دو ہنک جائیں گے۔ یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر روٹی کھانے، آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔ طلعت جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریلا پی آئی ڈی سی کے نئے ڈاک یارڈز کی طرف بڑھتا ہے اس وقت، قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں۔ یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں۔ یہ لوگ جو اس جنید ابے ہودہ بدشکل ٹوم ٹاؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں۔ یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدورنیں، مسعود آباد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جولاہے (جن کے پرکھے کبیر کے ساتھ پنچ گنگا گھاٹ پر دوتارہ بجاتے پھرتے ہوں گے)، لالوکھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔پی۔ کے کاریگر، دلی کے بساطی، بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور اور چار خانے والے، فٹ پاتھ پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری، انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاند تارے کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔ اپوا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لیے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچرڈ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سوشیولوجسٹ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر ناقابل یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس قدر امن پسند کس طرح ہے۔ یہ انقلاب کیوں نہیں بپا کرتی۔ تشدد پہ کیوں نہیں اتر آتی۔ کمال ہے کہ اس کا جواب میری رچرڈز کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔

نہیں طلعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لیے متنفر نہ ہو کہ انھوں نے بلوہ کر کے تمھاری دنیا تقسیم کروا دی۔ یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو ان مباحثوں، تاریخ کی ان موشگافیوں اور تجزیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ رونالڈ کہہ رہا تھا، جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا، میری رچرڈ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام

پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے۔ یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں ملک پھر متحد ہو جائیں گے۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگِ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کٹتا ہے مگر دل کہاں تک کٹے گا۔ زندگی آدھی گزر گئی۔ تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس بچے کھچے وقت کو سوارت کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کو بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلا میں داخل ہو کر میں اپنے آپ کو کھو دوں گا؟ نہیں طلعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

میں تعمیر کروں گا۔

پی۔ ایس:

تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوٹھی، جس میں مَیں مقیم ہوں، بے حد شاندار ہے۔ ایک اطالوی آرکی ٹیکٹ نے بنائی ہے خالص جدید ترین کیلی فورنین وضع کی۔

بھیا صاحب کی دلہن خاصی بدذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کرو گی۔ وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

دلہن بھابھی میری آبادکاری کے لیے بے حد کوشاں ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خریدوائی اور اپنے ایک بااثر چچا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکی ٹیکٹ مکان کا نقشہ لے کر میرے پاس آیا تو میرا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

(دلہن بھابھی کی چھوٹی بہن نینی تال کانونٹ میں پڑھ رہی ہے۔) عنقریب بھیا صاحب اور دلہن بھابھی برازیل جانے والے ہیں۔ کوٹھی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھا دی جائے گی۔ بابا اور امی اس کاٹیج میں رہیں گے جو بھیا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے۔ بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان براج رہے ہیں۔ بابا اور امی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پھٹتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ لہٰذا خدا حافظ۔

تمہارا

کمّن

مزید پی۔ ایس:

پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آرا ر سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موٹی ہوگئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن سے معلوم ہوا کہ تمھاری ساجدہ آپا بھی آج کل امریکہ میں ہیں۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرے گروہ میں شامل ہوگئی۔

(۹۹)

ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستان گھاس پھونس جس کی دیواروں سے اُگ رہا ہے۔ پرانی دلّی کی عمارتیں۔ اجمیر۔ خاندیش۔ بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڑ کا داخل دروازہ۔ تانتی پاڑا۔ فیروز مینار۔ گن منت مسجد۔ احمد آباد اور گجرات۔ چندیری اور جودھپور کی مساجد۔ رانی سپاری کی مسجد۔ چمپانیر۔ دھروار۔ مانڈو کا ہنڈولا محل۔ باز بہادر کا محل۔ کالپی کا چوراسی گنبد۔ جونپور کی اٹالا دیوی کی مسجد۔ دولت آباد کے قلعے۔ بہمنی بادشاہوں کی عمارتیں۔ سری نگر کی پگوڈا ایسی چوبی مساجد۔ چندیری کا بادل محل۔ بیدر اور گلبرگہ۔ دکھن۔ دکھن۔

اتر پردیش میں للت پور تھا اور کالپی اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جونپور۔ مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ۔ مدراس۔ کرناٹک۔ آندھرا پردیش۔ حیدر آباد کا دلفریب، پرشکوہ، شاندار شہر۔ اجنتا۔ ایلورا۔ نیلگری کے پہاڑ۔ بنگلور۔ کیرالا۔ ٹراونکور۔ سرل گھوم پھر کر دوبارہ ازمنۂ وسطیٰ کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام۔ ان گنت زمانے۔ وقت کے پیٹرن۔ وہ۔ جو یورپ کے قدیم کیتھڈرلوں کی محرابوں کے نیچے گھومتا تھا اب خانہ بدوشوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ ہاتھ رکھتا۔ کنول کے پھول۔ ہاتھی۔ گندھرو۔ حوض۔ سیڑھیاں۔ مینار۔ طاق۔ کسی تاریک اجاڑ محراب کے نیچے سے کوئی دیہاتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی لڑکا پیپل کی شاخ پر سے باؤلی میں کود جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹوٹتا ٹوٹتا محل کے ایک شکستہ کونے میں بیٹھ کر چلم سلگانے میں مصروف ہوجاتا۔ اوپر ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور وسیع صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سنسناتا رہتا۔ بادل مغربی گھاٹ سے جھوم کر اُٹھتے

اور دھرواڑ اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے گھٹائیں بڑھتیں اور راج شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا اداس، خاموش، اجاڑ ہندوستان بارش میں نہاتا، گھاس کے پودے ہوا میں لہراتے۔

یہ پیکر ماضی اور حال دونوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح برستے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً ماؤف ہو جائے گا۔ وہ بھاگ کر حال میں پناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متلاشی تھا؟ اُس نے کئی مرتبہ جھنجھلا کر خود سے سوال کیا۔) وہ پھر کلکتہ پہنچا۔ پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اُترا۔ ڈھاکہ کلب کی بار میں متواتر بیئر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

منزلِ مقصود بالآخر یہ تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دھچکے سے ٹرین رُکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں تیرتی ہوئی اس تک پہنچیں۔ ڈیم (انڈے) بوائلڈ۔ بوائلڈ ڈیم — سار (چار) گرم — ساگرم — ساگرم۔ ڈیم بوائلڈ۔ اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منظر میں کس قدر بے پناہ اداسی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ باہر فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے ترو تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی۔ ایک بوڑھا مفلوس ہندو بے شمار گٹھریاں اور اسباب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ وہ دیر تک اس بوڑھے کو دیکھا کیا حتیٰ کہ وہ اسٹیشن کے مجمع میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُفوہ۔ یہاں کس قدر آبادی تھی۔ عورتیں، جن کے ماتھوں پر بڑی بڑی سُرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سُرخ سیندور رچا تھا۔ رنگ برنگی سوتی ساریاں پہنے، بچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنبھالے ہندو۔ چارخانہ تہمد باندھے مسلمان جن کی زیادہ تر داڑھیاں تھیں۔ فاقہ کش کالے کالے لڑکے۔ حکام، اینگلو انڈین گارڈ۔ پالکی بردار (یہاں اب تک پالکیاں چل رہی تھیں)۔ پھر ٹرین چلی۔ بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہو گئیں۔ ٹرین دوبارہ تالابوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی جن میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی بیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اودی ساری پہنے کھڑی نظر آ جاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈ کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے؟ آمنہ، سکینہ، ربیا، رادھا۔ ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھلا! ان کا نظریۂ کائنات، ان کا فلسفہ!! زندہ رہنے سے مر جانے تک کی داستان: تکالیف، افلاس، قحط، قحط، قحط۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ کو پڑ دے۔ پانی دے۔ بھات دے رے —

اللہ بھات دے۔ — اس کے کانوں میں اس کورس کے الفاظ گونجے جو اس نے کئی بار ڈھاکے کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے۔ اللہ بھات دے۔ اللہ بھات دے۔ یہ یہاں کا قومی ترانہ ہونا چاہیے، اس نے سوچا۔ اور بنگال کے متعلق اس نے ہمیشہ سے کتنے رومانی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شیلا دیبی نے اسے ٹیگور پر کیا کیا لیکچر پلائے تھے۔ اور وہ ساری کتابیں جو اس نے پڑھی تھیں، ڈی۔ سی۔ سین اور جسیم الدین اور لیلا رائے۔ فوک گیت جمع کرنے والوں کی ٹولیاں۔ ادبی کانفرنسیں۔ کلکتہ کے تھیٹر اور تہذیبی سرگرمیاں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا پس منظر اور کمپنی کے زمانے کی بنی ہوئی کوٹھیاں۔ کلائیو روڈ جواب سبھاش چندر بوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ۔ مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلکتہ اور اس کی طلسماتی فضائیں دوسری طرف رہ گئیں۔ ٹرین ایک اور اسٹیشن پر رکی۔

اللہ بھات دے۔ بھات دے۔ بھات دے۔

چندپور بنیں گٹھڑیاں اور بچے اٹھائے دھکا پیل میں لڑھکتی پڑھکتی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈائننگ کار کے بیرے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

"ڈنر صاحب ؟"

"ہاں "

اُس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں بہار کے باغات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام دئی۔ رام اوتار۔ لچھمن اور سیتا۔ ترلوچن اور چنبیلیا۔ پوربیوں کے یہاں یہ دو نام بہت مقبول تھے: رام اور سیتا۔ ہند کا عہدِ عتیق۔ زرّیں زمانہ۔ پاٹلی پتر۔ اندر پرستھ۔ ایودھیا۔ کشن وتی۔ شراوستی۔ ڈگ وجے رام چندر اور متھلا کی جنک کماری سیتا۔ ارے واہ رے تاریخ واہ۔

"ڈنر صاحب — کافی لاؤں —" بیرے نے ٹرے لاکر سامنے رکھ دی اور سرگوشی کے لہجے میں اس طرح سے مخاطب کیا گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر حال میں واپس آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچنا ہے اور رنگاماٹی اور بندربن۔ اسے مزید روپیہ کمانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی۔ اسٹیشن پر اس کا منیجر پیٹر جیکسن حسبِ معمول کار لیے اس کے

استقبال کو موجود تھا۔ وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سرما ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کار روکی۔ اب شام کی تاریکی چھا رہی تھی۔ لالٹین لیے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے یا اتر رہے تھے۔ بوٹ گھڑ گھڑ کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی۔ ساحل پر شکستہ لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے۔ ایک اندھا فقیر قرآن کی آیتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی۔ دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے۔ ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے۔ کتنے بے شمار اندھے۔

بوٹ سے تختے جوڑ کر اس کی کار کشتی پر چڑھائی گئی۔ کشتی مسافروں سے لد گئی۔

"بڑا گندا مجمع ہے۔ چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں۔" پیٹر نے کہا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ تو خودکشتی کی طرح سطح پر بہے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کود کر ایک نوکے میں سوار ہو گئے۔ نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا۔ ساحل دور رہ گیا جس پر مٹی کے تیل کے چراغ ٹمٹما رہے تھے اور جس کے عقب میں جھونپڑوں پر پان کی بیلیں چڑھی تھیں۔ ایک چائے خانے کے آگے لوگ لالٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ افق پر سپاری کے درخت ہوا میں جھومتے تھے۔ کس قدر سکون تھا، امٹ سکون۔

دفعتاً زور کی ہوا چلی۔ نوکا ہچکولے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا مانجھی اپنا پورا زور لگا کر نوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں معروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اُس کے بوڑھے ملاح کا نوکا لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے میں عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ "پیٹر ہم طوفانوں میں تو نہیں پھنس گئے؟" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"نہیں یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "مگر ذرا اس کالے سور سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا الاپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح

تک نہ پہنچ پائیں گے۔"

"بے چارہ بوڑھا۔" سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

"یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ چستی ان میں نام کو نہیں۔" پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی: "او آدمی — کیا نام ہے تمہارا؟"

"ابوالمونشور — صاحب۔"

"ابوالمونشور۔" سرل نے دہرایا۔

"جی صاحب۔" وہ پھر پتوار پر جھک گیا۔ نوکا اب سرعت سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر دونوں طرف اناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کے اندر جھانکا جہاں ابوالمونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جا نماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا۔ یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ دفعتاً سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب و غریب، حسین ملک میں جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک سمپان گزر گیا۔ چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

(۱۰۰)

"یہاں گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر آتی ہیں پر بارش نہیں ہوتی۔
یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔
لوگ سچائی میں جمع نہیں ہو۔ تم۔"

خوبصورت باغ اور عبادت خانے تعمیر نہیں کیے جاتے۔

یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چرواہے اور کسان دروازوں کی چوکھٹ پر چڑھا کر سوتے ہیں۔

بغیر پانی کی ندی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چرواہے کا گلّہ۔"

پڑھتے پڑھتے کمال نے رامائن بند کر دی۔

"یہ کہاں کا ذکر ہے؟" سرل نے پوچھا۔

"کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائن دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔ مدتوں پرانی۔ اس پر سنہ ۱۹۲۷ء کی تاریخ پڑی ہے۔" وہ اداسی سے کتاب کے سرورق پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی دھندلی ہو چکی تھی۔

"تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تلسی داس جی کمیونسٹ تھے۔" سرل نے کہا۔

"ہاں۔ بھگت ویاس بھی پارٹی ممبر تھے۔" کمال نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "انھوں نے لکھا ہے مہابھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت کرو۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہیے۔"

"واہ پنڈت جی۔" سرل نے ہنس کر کہا۔ "کیا بات ہے۔ مگر یہ بتا دوں کہ اب تم یہ رامائن مہابھارت بھول جاؤ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔"

"ہاں۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔" کمال نے کہا۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ گزرے ہوئے برس بیئر کے گلاسوں میں بلبلوں کی طرح تیرا کیے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سرل چپ چاپ بیٹھا نیلی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا جن کے اس پار برما تھا۔

"کیوں بھائی، کیا سوچتے ہو؟" کمال نے اسی الم سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ برما اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جایا جائے تو کتنی دور ہوگا۔"

"بس یہی سوچ رہے تھے؟"

ایک آوارہ فاقہ زدہ کتا نیچے سے کود کر برآمدے میں آگیا۔

"دیکھو یہ بھی برما سے آرہا ہے۔"

"یا برما جانا چاہتا ہے۔" کمال نے بھینے پن سے کہا۔

کتا دم ہلاتا رہا۔

"ہلو۔ ہلو۔ تو بسکٹ کھاؤ۔" سرل نے کتے کی خاطر کی۔

"یار، یہ تو ریڈ چائنا سے بھاگ کر آیا ہے۔" کمال نے اسے غور سے دیکھ کر بڑی متانت سے کہا۔ "اینٹی کمیونسٹ کتا ہے۔ آزادی کی تلاش میں یہاں پہنچا ہے۔"

سرل نے منہ لٹکا کر کمال کو دیکھا۔ "تم اب بھی کالج کے زمانے کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اب بھی — کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔"

میز پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ کمال نے ایک سینڈوچ کتے کے سامنے پھینکا اور بولا: "نہیں سرل — میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں۔ دیکھو میرا پاسپورٹ۔" اس نے جیب سے سبز رنگ کا نیا نویلا پاسپورٹ نکالا۔

"ریلے برادرز میں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوا دیتا۔" سرل نے کہا۔ "کیا کرنافلی مل کی پلاننگ کرنے آئے ہو تم؟ یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔"

"میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب؟ تم بنگالی مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے نہیں آن موجود ہوئے۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں باون چھید۔ میں تو یوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند۔"

اب اس پر پھرا اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے۔ سرل نے بڑے دکھ سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سرل ہاورڈ ایشلے ندیوں، پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کل صبح ہی یہاں پہنچا تھا۔ وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چاٹگام آیا تھا جہاں سے اس کی چائے ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چاٹگام میں پھر دل کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پہاڑیوں کا رخ کیا۔ وہ دو ہزاری اور بندربن اور چندر گونا کے جنگلوں میں مارا مارا پھرا اور رانگا ماٹی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا جس میں آسام اور سلہٹ اور چاٹگام کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سن کر سرل نے روزمیری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی)۔ اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا تھا کہ بوہیمیا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بالآخر اب اپنی دنیا کو واپس لوٹ آئے گا۔ لارڈ موصوف نے کلکتے سے اپنا کاروبار سمیٹ کر اب بڑے پیمانے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا جہاں ان کے چائے کے باغات بھی

تھے۔ سرل، جو اب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اُسے ایک روز انہوں نے اپنے کلب میں بلایا اور بغیر تمہید اس سے کہا: "میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔"

"بہت اچھا" سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھگڑا کرنے کی گنجائش کہاں تھی!

پچھلے چھ مہینے سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، مائیکل، سریکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اُس نے تہمینلا دیبی کو فون کیا اور طلعت کو بھی مگر طلعت گھر پر موجود نہ تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتے ہی ہندوستان کا چکر لگا آتا تھا۔ دارجلنگ، شیلانگ، کلکتہ، بمبئی، حیدرآباد دکن، عمارتیں، کھنڈر، مکانات اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک پگوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پشت پر اُس کی نظر پڑی جو پچھلے برآمدے کی ریلنگ پر جھکا نیچے کرنافلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نوجوان نے پلٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجوان کمال رضا تھا۔

کمال نے اسے اپنی داستان سنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صبح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ملازمین نے سرکٹ ہاؤس میں لیمپ روشن کر دیے۔

چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برابر کے کمروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکے دار ایک اینگلو انڈین مع اپنے اینگلو انڈین عملے کے ٹھہرا ہوا تھا جو شراب پینے کے بعد بے حد فلسفیانہ باتیں کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڑھ کے تھے۔ کمال کی ان سے علیک سلیک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلے کا تذکرہ کرنے لگے۔

"بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا زور ہے جتنا سارے برصغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنا سخت پردہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔" کمال نے کہا۔

"سارا روپیہ یہاں کلکتے کی کمیونسٹ پارٹی سے آتا ہے۔" افضل نے کہا۔

"بنگال کا مسئلہ ہے — نازک —"

کمال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور کمال پھر پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مڑتی تھی وہاں پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گھڑگھڑاہٹ بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے قریب بالسن کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے "بیجو باورا" کے گانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس تک آ رہی تھی۔ کمال جنگلے پر سر رکھے اس آواز کو سنتا رہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے، اُس نے سوچا۔

"تم نے لتا کو سنا ہے؟" اُس نے بآواز بلند سرل کو مخاطب کیا۔

"وہ کون ہے؟" سرل نے چونک کر پوچھا۔

کمال بوریت کے دریا میں غوطہ زن رہا۔

خانساماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

کمال کی اس خانساماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔

"کہیے خانساماں جی، کیا حال چال ہے؟" کمال نے کہا۔

"مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگی رہتی ہے ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔"

"تم بڑی صاف اردو بولتے ہو۔ ڈھکیا ہو کیا؟"

"جی نہیں سرکار، ہم تو کلکتیہ ہیں۔"

"اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کلکتیہ تھے ایک زمانے میں۔"

"جی حضور۔"

کمال نے ایک اور جمائی لی۔ خانساماں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسبِ معمول آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور ان کی پارٹی کمیلا کے بعد سندربن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ ان کی آمد کے لیے باشا کا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آراستہ کروایا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان و شوکت دیکھ کر خانساماں کو سر فریڈرک کا زمانہ یاد آگیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخشیش ملتی تھی۔

"پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پہل رہی ہوگی۔" کمال نے کہا۔

"جی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہیے۔ دور دور سے صاحب لوگ آیا تھا۔ اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاٹ صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے۔"

"کون جلتے ہیں؟" کمال نے پوچھا۔

"ارے صاحب،" اس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔"

"یہاں کہاں؟" کمال کو اس کے رازدارانہ لہجے سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے چید کمیونسٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرضِ منصبی انجام دیتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانساماں نے کافی کے برتن اٹھا لیے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائنگ روم میں سے نکل کر جلتے جلتے ڈگ بھرتا بے تکلفی سے آن کر کمال کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہاؤڈی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ارے ہاؤ ڈو یو ڈو۔" کمال نے ہاتھ ملایا۔

"میں جان نائی ٹس ایبل جونیر ہوں۔ مجھے جونی کہو۔"

"ہلو جونی۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟" پھر دفعتاً کمال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

"میں حکمہ قبائل کے متعلق ایک ڈوکومنٹری فلم بنا رہا ہوں۔"

"او — ہاؤ اکسائیٹنگ!" کمال اور ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹ رہا۔ "سگریٹ؟"
"تھینکس۔"

دوسرے لمحے جونی بھی فضا کے اس سحر میں کھو گیا۔ وہ جنگلے پر بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جونی کی بش شرٹ پر جو اخبار چھپے تھے کمال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مدھم اجالے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس سے بھی اکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکوت کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کسی ملاح کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ اب گھپ اندھیرا سامنے وادی پر چھا گیا تھا۔

پھر جونی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں کمال سے باتیں شروع کر دیں۔ کمال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈریسنگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا اور کمال کو امریکن کے ساتھ مرکھپاتا دیکھ کر چپکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ اندھیرا چکر کاٹتا سارے میں چھایا جا رہا تھا۔ برآمدے میں جونی اپنی یکساں آواز میں کمال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے لیکن انڈر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ ویت نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پریس فوٹو گرافر ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس نے جیب سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دیر تک اپنے چھوٹے بچے کا تذکرہ کرتا رہا۔ جو دو سال کا تھا۔ پھر اس نے ایشیا میں کمیونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور کمال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کمیونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

"اب تو کافی پی لو۔" کمال نے جماہی لے کر کہا۔

"نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔" اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ کمال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ساری تفصیلات، اعداد و شمار، ہر چیز اسے نوک زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن رنگین بش شرٹ پہنے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت اخلاق کی باتیں کی گئیں۔ یہ دونوں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس۔ ڈھاکے کے افراد تھے اور اسی جونی کے ہمراہ رانگا ماٹی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے سلسلے میں۔

وہ سارا دن چکمہ گاؤوں میں گھومتے پھرے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آلود تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ بچوں کے ایسے جوش و خروش سے وہ کمال کو اپنے ایڈونچرز سناتے رہے۔

"تم کو معلوم ہے۔ ریڈ جائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے —— ان پہاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر ۔" جونی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گار نے آن کر اطلاع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے۔ وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے منڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جھانکا۔

"گئے؟ تمہارے یار دوست ۔"

"آجاؤ — اب میدان صاف ہے ۔" کمال نے جواب دیا۔

سرل باہر آکر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراقبے میں ڈوب گئے۔

کمال اور سرل پانچ چھ دن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنافلی رواں تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چندر گونا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر اینگلو انڈین ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جین سفید ساری پہنے پہاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر سے منگول شکلوں والے پہاڑی بوجھ پیٹھ پر لادے گزرا کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندروں پر گھنٹے بجتے۔ ہاٹ میں وادی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برنگے سوتی کپڑے، مونگے اور فیروزے کے ہار، چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پائپ پیتی ہوئی ہنس مکھ پہاڑی عورتیں دکانیں لیے بیٹھی رہتیں۔ ہندو، مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اناس کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لا رہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اونچی پگڈنڈی پر کمال کو ایک بوڑھا تہمد باندھے، سر پر بانسوں کا بھاری گٹھا اٹھائے اپنا راستہ طے کرتا دکھلائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کر وہ چند آنے کمائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آرہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چکمہ اور ماگھ اور مونگ قبیلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ بیسیوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لیے رانگا ماٹی آتے تھے۔ یہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ یا ریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروس۔

یہ حسین ترین، پرامن علاقہ 'وحشیوں کا ملک' کہلاتا تھا۔ یہ جگہ اینتھروپولوجسٹ کے لیے جنت ہے، جونی کہتا اور ان کو اپنے ساتھ لوکیشن پر گھسیٹ کر لے جاتا۔ یا وہ دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر ساگوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چہکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی لڑکیاں سیاہ دھاری دار پیرونگ باندھے، گگریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشو کے نارنجی لباس کی جھلک دکھلائی دے جاتی۔ کرنافلی کے دھارے پر انھوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندربن جاکر موگھ راجہ سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

"آسام میں اس سال جو سیلاب آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کرکے یہاں آگئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔" ایک افسر نے کمال کو بتایا۔

"تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں، جن کا کھیدا ہوا، مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟" کمال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

انہوں نے بندربن کے سارے علاقے کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ کمال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا۔ وہ کمال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جو اب تک تقریباً پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف ستھری، پاکیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگا ماٹی سے کرنافلی کے اس پار راج باڑی گئے جہاں چکمہ راجہ رہتا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دمِ واپسیں کا بڑا موثر منظر کمال کو دکھلائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کوئلیں چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے کیونکہ رانگا ماٹی کا پاور ہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں راجہ کے پرکھوں کی قدِ آدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ "ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورنر بھی شامل تھے۔" سرل نے فوراً اس علاقے کی ہسٹری کی اس کرم خوردہ کتاب کا حوالہ دیا جو سرکٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان راجہ اور اس کی ماں نے سرل اور کمال کا استقبال کیا۔

ڈرائنگ روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر رکھی تھی۔ کیشب چندر سین کی تصویر آتشدان پر موجود تھی۔ راج ماتا کیشب چندر سین کی پوتی اور سادھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ وہ کیشب چندر سین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے کر دی تو برہمو سماج میں بڑا ہنگامہ

ہوا تھا۔" کمال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

"ہاں۔ میں نے سنی دیوی، مہارانی کوچ بہار کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ تینلا دیبی نے پڑھنے کو دی تھی جب وہ برہمو سماج پر لیکچر دیتی تھیں۔" سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپ پاکستان سے آئے ہیں؟" راج ماتا نے پوچھا۔

کمال ایک لحظے کے لیے ہڑ بڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے۔ پھر دوسرے لحظے اس نے صورتِ حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کسی ملک کا تصور دراصل کیا ہے؟ یہ راج باڑی اب کس ملک میں شامل ہے؟ کیشپ چندر سین اب کدھر کھیلتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں گزاری تھی۔ وہ دونوں فوراً تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ کمال کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب راجہ، جو کافی خوش شکل تھا، اوکسفرڈ کے لہجے میں سرل سے کہہ رہا تھا:

"حکومت کرنا فلی میں بند باندھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لیے ہائیڈرو الیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیرِ آب ہو گا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کہیں اور بسا دے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگاماٹی کے غرقاب ہو جائے گا۔"

"تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہاں۔" راجہ نے کہا۔

راج ماتا کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ کمال کا ذہن پھر در در بھٹک گیا۔ بنگال کے راجواڑوں کا ماحول، بردوان، کوچ بہار، میمن سنگھ۔ یہ اس الف لیلوی سلسلے کی ایک چھوٹی سی گمنام کڑی تھی جو اب ہائیڈرو الیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

کمال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماتا دروازے تک پہنچانے آئے —

"پھر کبھی ضرور تشریف لائیے گا۔" راج ماتا نے کمال سے کہا۔

"ضرور — خدا حافظ۔"

وہ باہر آ گئے۔ راج باڑی کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ کرنا فلی پر کشتیوں کا ٹریفک اب کم ہو چلا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح وہ رانگاماٹی کو خیرباد کہہ کر نیچے میدانوں میں اُتر آئے۔

پھاگانگ سے دہ ٹرین میں بیٹھ کر سیتا کنڈ روانہ ہوئے۔
راستے میں نوجوان ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔
"تشریف رکھیے۔ سگریٹ لیجیے گا؟" کمال نے کہا۔
اُس نے ذرا ہونچکا ہو کر کمال کو دیکھا اور پھر جھجکتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر ٹک گیا۔
"آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟" کمال نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔" ٹکٹ چیکر نے جواب دیا۔
کمال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں: اس کو ٹی بی ہو چکی ہے۔ اس کی تنخواہ بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے۔ وہ موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلل گفتگو کر رہا تھا حالانکہ وہ محض ایک مدقوق ٹکٹ چیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے گزرتی تھی۔
"پاکستان بننے سے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔" اس نے کمال سے کہا۔
اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہونا شروع ہوئی۔
"آپ کو پتا ہے۔" ٹکٹ چیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً کمال کو مخاطب کیا، "دس برس سے آج تک اس لائن پر چیکنگ کرتے مجھے۔ تنے برس بیت گئے — آپ پہلے بڑے افسر ہیں جنھوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"
دوسرے لمحے وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔
کمال اور سرل اسٹیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو تھی۔
"ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔" کمال نے ایک آدمی سے پوچھا۔
"اب اس وقت نہ جائیے۔ پہاڑی کی چوٹی بہت اونچی اور پُر خطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔" اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔
"ہم ضرور جائیں گے۔" سرل نے ضد کی۔
اسٹیشن ماسٹر نے ذرا محظوظ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ، جھجکتے ہوئے ان کے

آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ اسٹیشن کا عملہ۔ پولس کانسٹبل۔ چائے کی اسٹال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پر سکون دنیا میں یہ دو الو کے اجنبی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بستی میں خبر پھیل گئی: دو یاتری آئے ہیں اور ان میں سے ایک انگریز ہے۔ (انگریز بھی یاتری ہی ہوگا ورنہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جوکھم میں ڈال کر اتنی دور سیتا جی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پالکی لاکر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پالکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ ہمارے بڑے مولوی صاحب کی بٹیا ہے۔ اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔" کانٹا بدلنے والے نے بتایا۔

کانسٹبل آگے بڑھا۔ "آئیے آپ کو گاؤں تک پہنچا دوں۔" اس نے کہا۔ گاؤں کے رستے میں اس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرانی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے۔ کے۔ فضل الحق۔ کمال کا سر چکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا کمال کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ کانسٹبل سے چٹا گانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"پرفلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔" کانسٹبل نے کہا۔

"ہلو پرفلا۔" سرل نے اس سے مصافحہ کیا۔

"تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

کمال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

"پرفلا کمار بسواس۔"

"اسکول میں پڑھتے ہو؟"

"جی نہیں۔ کھیتی کرتا ہوں۔"

"یہاں آرام سے رہتے ہو؟"

"آرام سے کیوں نہیں رہوں گا؟" پرفلا نے حیرت سے پوچھا۔

کمال خاموش ہو گیا۔

بازار کی لمبی سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لوگ جمع تھے۔ سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔ سفید دیو کی طرح سرل آگے آگے اس مجمعے سے بازار میں داخل ہوا۔ کمال ایک چائے خانے کے سامنے رک گیا۔ صاف ستھرے بانس کی ٹٹیوں سے بنے ہوئے چائے خانے میں بلڑ بازی نہیں تھا اور نہ غنڈہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔ چند آدمی چادریں لپیٹے بنچوں پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کونے میں گراموفون بج رہا تھا۔ دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ "ہمارے لیے خوب گرم چائے بنانا۔ ہم ابھی پہاڑی پر سے واپس آتے ہیں۔" کمال نے چائے خانے کے مالک سے کہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لیے آن موجود ہوئے۔

"آپ یاتری ہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔" ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نواکھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پرنٹا کی معیت میں انھوں نے پہاڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سرسبز کنج۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور رنگ مورتیاں رکھی تھیں جن کو کمہاروں نے خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کمال ایک مورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ "علم کی دیوی۔ بطخ پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برہما کی بی بی۔ مادرِ کائنات۔" اس نے کہا۔ "ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا؟"

سرل بھی گھاس پر دو زانو بیٹھ گیا۔ "تمہارے گاؤں کے کمہار کس قدر زبردست ماہرِ فن ہیں۔" اس نے مورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔" کمال نے فخریہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سرخ مندر تھے اور سنگِ سرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر برگد کی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں لڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑیوں اور مکانوں پر ترئی کے زرد پھولوں کی بیلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر

پھول گر رہے تھے۔

"یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔" کمال نے کہا۔

"بنگال کے گاؤں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول اپنی خطوں کے عکاس تھے۔" سرل نے جواب دیا۔

وہ پہاڑی کی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹروپیکل جنگل تھے۔ اور عمیق غار اور کھنڈ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھ درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ خیز ڈراؤنے معبد جن کی مقفل کوٹھریوں میں تمنت دفن تھے۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدتمندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزارہا شکستہ سیڑھیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں جہاں گندمک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

"سیتا مہارانی کو راون نے لنکا سے لاکر یہاں چھوڑ دیا تھا۔" پرفلا نے بڑے تیقن اور عقیدت کے ساتھ میٹر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادھو نشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھلائی دیے۔ سرل اوپر پہنچ کر ایک درخت سے ٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیڑھیوں کے نیچے جھرنا گر رہا تھا۔ شام کے گہرے سناٹے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز اور شعلوں کی سنسناہٹ پجاریوں کے منتروں کی مدھم صداؤں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، نشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پرفلا اطمینان سے ایک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ "صاحب! ذرا دھیان رکھیے گا۔ یہاں اژدھے اور بچھو بہت ہیں۔"

"اچھا۔" سرل نے کہا۔ مگر ان دونوں نے بالکل دھیان نہ رکھا اور مزید سیڑھیاں طے کر کے ایک اور مٹھ تک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں، جو اب تک پہاڑی کے جنگل پر طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھیں، تاریکی میں گم ہو گئیں۔ "اب واپس چلو۔ ہمیں دس بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔" کمال نے یاد دلایا۔

انھوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو ایک گھنٹہ لگ گیا کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی۔

گاؤں کے چائے خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر ایک صاف ستھرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چائے اور دو دو پیسے والے بسکٹ رکھے گئے۔ میزبان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہمے سہمے، مہمانوں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

"سرل۔"

"ہاں۔"

"دنیا میں اس چائے خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی ہے؟"

"نہیں۔" سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ پرفلا پرانے دوستوں کی طرح چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشیش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پرفلا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے روپے کی پیش کش کر کے کمال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

"میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا ہوں۔ اگر کوئی بھیک مسترد کر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہیے؟" کمال نے کہا۔

"ہاں۔" سرل نے جواب دیا۔

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ کمال ٹھٹھک گیا۔ دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے اندر جھانکا۔ ایک بوڑھا پھونسں ہندو سفید براق دھوتی اور چادر لپیٹے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی تا عارہ پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرو کے لیے انھوں نے ایک بوسیدہ چٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبرا کر باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہ منظر کبھی بھول سکو گے؟" سرل نے کہا۔

"نہیں۔" کمال نے جواب دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی۔ وہ چٹا گانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگمگاتے کلب میں پیٹر جیکس بار روم میں ان کا منتظر تھا۔

"آپ سیتا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں؟" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "غضب خدا کا۔ معلوم ہے وہ پہاڑی اژدھوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے۔ وہاں تو دن کے وقت بھی کچھ دار

آدمی بندوق لیے بغیر نہیں چلتے۔"

"مگر وہاں جو اتنے انسان بستے ہیں ان؟" کمال نے اعتراض کیا۔

"ابھی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کاٹنے سے مرتے رہتے ہیں۔ اور پھر ان کا کیا ہے، وہ تو ہیں ہی جنگلی، وحشی، بن مانس لوگ۔"

دوسرے دن انہوں نے سلہٹ کا رخ کیا۔ وہاں سے سرل کمال کو راج شاہی لے جا کر پہاڑپور کے گپتا عہد کی سنگتراشی کے شاہکار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پرانے مندر، مٹھ، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں سرل کسی ماہر آرکیالوجسٹ کی طرح ان کے متعلق کمال کو بتاتا رہا۔

"تم کو آرکیالوجی میں کب سے دخل ہو گیا؟" ایک روز باریسال جاتے ہوئے کمال نے اُداسی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں"، سرل نے اسٹیمر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پُر شور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، "کہ میرے پاس صرف ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے، جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، جو وقت کی دسترس سے باہر ہے۔ میں خود اب ماضی ہوں تمہاری طرح۔ اور ہندو پاکستان کے یہ پرانے کھنڈر ہی میرے دوست ہیں۔ میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے برصغیر میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے متضاد نظریوں کو مسترد کر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سنا رہے ہیں۔ میں ان کا واحد، تنِ تنہا آڈینس ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ کمال، خدارا یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یورپین برطانوی ٹوی جنریٹ ڈیکیڈنٹ انٹلکچول بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پرواہ نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخیٔ جذبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔"

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔ سامنے لکڑی کا بڑے سے شہتیر کا پھاٹک تھا جس کے ادھر پاکستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہتیر کے دوسری طرف چند آسامی کاہی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سرسبز پہاڑیاں تھیں جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ کمال لکڑی کے شہتیر پر کہنیاں ٹیکے دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز انہوں نے سری منگل کا رخ کیا۔ یہ بہت لمبا سفر تھا۔ ندیاں اور گھنے جنگل اور مولوی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا

بنگلہ تھا جس کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک بخت کمال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پہچانا سرل کسی پُراسرار طریقے سے پل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کار روک کر وہ سر اٹھائے سامنے کی اور دیکھتا برساتی کی سیڑھیاں چڑھا۔ اس کے ملازمین کی پلٹن استقبال کے لیے لپک کر آگے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اس نے آواز دی: "عبدالرحمٰن، غسل کا پانی لگاؤ۔" پھر وہ کمال کو ساتھ لیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔

"یہ تمھارا کمرہ ہے۔" اُس نے کہا۔

بنگلہ شیر کی کھالوں اور چیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت ساگوان کے فرنیچر سے مزین تھا۔ کمال کو محسوس ہوا وہ ۱۹۳۶ء کے ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے۔ اسے گلفشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جو دہرہ دون میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اسے امیر خاں کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو پکارا تو کمال نے محسوس کیا شاید میاں قدیر لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلاوطنی — جلاوطنی — خداوندا! تو نے مجھے کیوں جلاوطن ہونے دیا؟ کمال نے آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈائننگ روم میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سارے ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر کام میں سرعت سے مصروف ہو گئے۔

بنگالی منشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹریڈ یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملازمین کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا: بیرے، خانساماں، خدمتگار، بوائے۔ اس کا یوریشین کلرک رالف جوزف برآمدے میں کاغذات لیے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری کاغذات پر ان کے دستخط درکار تھے۔ کئی چپراسی ادھر ادھر موجود تھے۔ ایک تن تنہا سرل اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے: مالی اور گراس کٹ اور سائیس اور بہشتی، چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موٹر لانچ تھی۔ اس سلطنت کا، جو سری منگل میں دور دور تک پھیلی تھی، سرل اپنے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کی شرکت کے ساتھ مالک تھا۔ وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا۔ وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بودلیئر اور رابیلیٹ کی کتابیں لیے گھوما کرتا تھا اور کوہ نور میں مائیکل کے ساتھ

جاکر آلو کھاتا تھا۔

صبح سات بجے چوکیدار نے بنگلے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اٹھا۔ کمال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ "یادِ صبحِ وطن دے رہی تھی ہوا — داغِ دل پھول بن بن کر کھلنے لگے — میری پلکوں پہ بدرِ کمال آگیا۔" اس نے زیرِ لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جس کی دیواریں ملک ڈرے، ابی بوس، ابانی سین، رضا اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کونوں میں تانبے کے مجسمے رکھے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چنی تھیں۔ بریکفاسٹ کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سولا ہیٹ پہنی۔ وہ دونوں کار میں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور ولف جوزف کی قیادت میں منشیوں اور کارکنوں کا جلوس جیپ گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے کمال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چائے کی پتیاں تیار کی جارہی تھیں۔

دوپہر کو لنچ کے لیے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلانٹرز سے نارائن گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلۂ خیالات کیا۔ اسٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا اور ڈھاکے کے مارننگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیئر کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً کمال غائب ہوگیا۔

"مسٹر رضا کہاں گئے؟" برآمدے میں آکر سرل نے بیرے سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نورالاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

"نورالاسلام چودھری!" سرل خاموش ہوگیا۔

چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کردیا تھا اور کہا تھا کہ صبح دفتر میں آئے۔

سرل کار میں بیٹھ کر کمال کو ڈھونڈھنے کے لیے نکلا۔ اپنی ٹی اسٹیٹ میں پہنچ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھرا مگر کمال کا کہیں پتا نہ تھا۔ آخر اکتا کر اس نے ایک جگہ کار روک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چہچہا رہے تھے۔ تناخوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ نے چائے کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے پیٹرن بنا دیے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے دفعتاً نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پوربن لڑکی بڑے ماہرانہ انداز میں پتیاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لمحے کے لیے ساحل پر آکر سوال کیا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمرا نام؟ چمپا۔"

"چمپا۔" اُس نے اس طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔ "چمپا۔ اچھا نام ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی پچھلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سنکی۔ بد دماغ۔ بیہودہ۔ بے حد داروپینے والے۔ یہ والا بڑا صاحب سنکی تھا۔

کلب واپس آکر وہ دھڑام سے ایک آرام کرسی پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ الزبتھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید ٹوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنبھالے مودے پر بیٹھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی دادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آکر مہاراجاؤں کے ساتھ ٹائیگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گڈ مارننگ! گرینی۔ آج کی صبح تم کیسی ہو؟ اس نے دل میں کہا اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ کمال اس وقت کہاں ہوگا۔

شام کو سرل نے کمال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی ہی میں سرل نے پلانٹر مہمانوں کو ڈنر کھلایا اور برج کھیلا۔

بہت رات گئے کمال سرل کے بنگلے پر واپس لوٹا۔ سرل اس کے انتظار میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

"آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

"کہیں نہیں۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔"

"مزدوروں کی بستی گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"میرا یہی خیال تھا۔"

"تم ناراض ہو؟"

"نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے روز مزدوری ملتی ہے؟"

"ہاں۔"

"کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی کمیونسٹ عناصر؟"

"پتا نہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کو سب پتا ہے۔"

"کمال کائنات کی ذمے داری کا بوجھ میں نے بھی بہت دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اتار پھینکا۔ تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس ہٹ دھرمی کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسکین دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں؟ تم بہت بڑے مجرم ہو کمال رضا، مجھ سے کہیں بڑے مجرم۔"

کمال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لیے وہسکی اور گلاس نکالا۔

"پھر میں تمھارے جیسے ایک نہایت پُرخدا انسان سے ملا۔ وہ بھی تمھارے ساتھی پلانر ہیں شری نہار رنجن داس گپتا۔" کمال نے کہا۔

"داس گپتا۔ اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کب گئے تھے؟"

"نہیں۔ میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آ رہا تھا۔ میرا سوٹ بوٹ دیکھ کر انھوں نے لفٹ دینے کے لیے کار روک لی۔ وہی مجھے تمھارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تمھاری طرح کے رئیس ابنِ رئیس ہیں۔"

سرل نے وہسکی دو گلاسوں میں انڈیلی۔ کمال کہتا رہا، "میں نے ان سے پوچھا آپ ترکِ وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ فرمایا، آپ بھی حد کرتے ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تُلی ہوئی ہے۔ سرمایہ داروں پر دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم ٹیکس لگائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ میرا دماغ خراب ہوا ہے جو ترکِ وطن کروں گا؟ یہ منطق کوئی قابلِ تعریف تھی۔"

سرل خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا: "میں تم کو پھر یہی رائے دوں گا، دنیا بھر کی ہر چیز میں ناک ڈبونے کی جو تمھاری عادت ہے اسے خدارا اب چھوڑ دو۔ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔"

کمال وہسکی کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرے روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔ کئی دن تک اس خوبصورت ضلعے کی وسعتوں میں خاک چھانتے پھرے۔ دور افتادہ سنتھال گاؤں میں پہنچے جہاں راستے اتنے خراب تھے کہ کئی بار ان کی

جیپ الٹتے الٹتے بچی۔ سنتھالوں نے کمال کو اور زیادہ مغموم کر دیا۔

"ان بیچاروں کے لیے تو میں ذہن میں بڑا رومینٹک تصور لیے بیٹھا تھا۔ لوک ناچ اور زین العابدین کی مشہور و معروف آبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔"

"اور اصلیت میں بوجہ اپنے افلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی جانوروں کی طرح زندہ ہیں؟ ہے نا؟" سرل نے جیپ چلاتے چلاتے مڑ کر کہا: "میرا بھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔"

"جونی یہاں نہیں آیا اپنی مووی بنانے کے لیے۔" کمال نے کہا۔

"یہاں بھی آ جائے گا۔" سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنتھالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ جس روز وہ لوگ واپس لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ ان کا مکھیا، جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی، جس سے اس نے لاٹھی باندھ رکھی تھی، ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قمیص پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ڈرائنگ روم میں سے چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جونی سنتھالوں کے متعلق ایسٹ مین کلر میں ڈاکومنٹری بنانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشد آباد تھا۔

مرشد آباد؟ سراج الدولہ؟ کرنل کلائیو؟ کیا بے کار کی باتیں ہیں۔ وہ سنو۔ زن سے گولی چلی۔ کوئی اودبلاؤ مارا گیا۔ وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش سڑک پر ٹہلا کرتے۔ اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں۔ اس کے بعد بازار۔ چھوٹے چھوٹے چوراہے۔ گلیاں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اداس مکانات۔

"مکان کیسی کیسی کہانیاں سناتے ہیں" سرل نے پھر دہرایا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھیں جن میں سے بیشتر سنسان پڑی تھیں۔

"سنا ہے زمینداری ختم کردی گئی ہے"، کمال نے کہا۔

سرل نے اسے پھر دیکھا۔ "اب تم نے پھر ناک ڈبونا شروع کی" اس نے ڈانٹا۔

وہ اسٹیشن واپس جا رہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹرین دریا کے گھاٹ پر رکی۔ مسافر اتر کر اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ ٹرین کا تجارتی مال اتار کر اسٹیمر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کرین نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آوازیں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو کمال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کورس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سُنے تھے مگر اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا sequence ہے۔

جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقعہ پوش عورتیں آکر تھرڈ کلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سیکنڈ کلاس میں ٹھنس رہی تھیں۔

اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آکر بیٹھنا شروع ہوتے۔ کیبن میں گئے۔ ڈیک پر بکھر گئے۔ دوربینیں اور کیمرے نکالے گئے۔ اخبار کھولے گئے۔ دو اسمارٹ بیگمات نے نٹنگ شروع کر دی۔ چند امریکن، جو کسی دور افتادہ ضلعے میں یو۔ایس۔آئی۔ایس۔ کی شاخ کھولنے جا رہے تھے، ایک نوجوان طالب علم سے مصروفِ گفتگو ہو گئے جو تعطیلات کے بعد ڈھاکے واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکے کا ایک اردو اخبار نویس یو ایس آئی ایس والوں کی دعوت پر بحیثیت ان کے مہمان ان کا ہمسفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کیبن میں بیٹھے تھے۔

کمال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلا تھا؟ یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آگئی تھی؟ یہ گتھی کس نہج پر سلجھے گی؟ اور اس سارے جھگڑے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلاوطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں۔

کمال ریلنگ پر جھک کر افق کو دیکھتا رہا جہاں تک ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ عظیم دریا، عظیم ملک، عظیم انسان — کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے ادھر مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے؟

اردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔

"آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟" انھوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت

کیا۔

"جی۔" کمال نے مختصراً جواب دیا۔

"کراچی؟"

"جی۔"

انھوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔ "صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھیے کہ کالے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کے لیے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔پی کے رہنے والے تھے۔) سچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطّے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل نتھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔"

ایک نوجوان سرل سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔ اخبار نویس اک ذرا کی ذرا رکے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: "دیکھا آپ نے۔ انگریزی کیا لاجواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ بس آگئے جوٹ کوٹا میں۔"

"جوٹ کوٹا۔" کمال نے حیرت سے دہرایا۔ اُس نے یہ اصطلاح آج ہی سنی تھی۔

"جی ہاں صاحب۔ آپ کا قیام ڈھاکے میں ہے؟ شاہ باغ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں۔"

اب اعلیٰ افسر بھی کیبن سے باہر نکل آئے۔ انھوں نے کمال کو سگریٹ پیش کیا۔ دریا کا پانی سورج کی کرنوں میں سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ برابر سے ایک جوٹ کی باربرداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہیب کارگو بوٹ بڑی تمکنت سے تیرتی ہوئی نکل گئی۔ کمال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"کس قدر حسین منظر ہے۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

"جی ہاں۔" اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ان مناظر کی پبلسٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام نہیں سوجھتا۔ مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ ہم کو دیکھیے۔ تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

"قیدِ تنہائی؟"

"جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ۔ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی، متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔"

کمال کو یاد آیا: اٹھارہویں انیسویں صدی کے انگریزی سفرناموں میں اہل بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ اٹھارھویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

"یقین فرمائیے"، اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، "جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیر اعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔ سنسکرت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔"

بیرے نے چائے لا کر میز پر رکھی۔ "جہاج جگن ناتھ گھاٹ کو بے پہنچے۔"

کمال نے اس سے پوچھا: "امرا اونی کھن دھورے جہاجے روتے چھی؟"

اخبار نویس اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

"معاف کیجیے گا، آپ کے لب و لہجے سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنؤ کی طرف کے ہیں۔" اخبار نویس نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

"جناب کا اسم شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں۔"

"سید کمال رضا۔"

"آپ مٹیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟"

"جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"او ہو — ہو — ہو — بڑی خوش قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔" اخبار نویس نے تیسری بار کمال سے مصافحہ کیا۔ "کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات۔ کلکتے میں۔ واہ — واہ — وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنا ہے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔"

"جی ہاں۔"

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سالی گوگلز لگائے آرام کرسیوں پر دھوپ کے رُخ بیٹھی تھیں۔ سالی فلم فیئر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ سرل مقابل کی ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آ رہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ ایک سیاہ فام اینگلو انڈین لڑکی جالی سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دار جلنگ کا بنا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں اس کی نٹنگ، میک اپ کا سامان اور ایک ٹافی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ کے فلمی رسالے اور برطانیہ کا زنانہ رسالہ وومن اور ایک رومانی ناول ٹھنسا ہوا تھا۔ ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک سنہرے بالوں والا ہیرو، نائیلوں کے نائٹ گاؤن میں ملبوس، ہیروئن کو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ دیر بعد سہمی رومانی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیرو کو دیکھتے دیکھتے ان کی نظر پھر چند سم انگریز تک پہنچی جو جالی کے ادھر ریلنگ کے سہارے کھڑا بالکل مارلن برانڈو معلوم دے رہا تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس سانولی سلونی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازابل کرسٹینا ٹیبر ڈیل تھا لیکن اس کے بوائے فرینڈ اور دفتر کے ساتھی اسے میگی کہتے تھے۔ گو اس کے اتنے لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پردادی مارگریٹ ازابل، سرسرل ایشلے کی اور ایک نیٹو عورت کی اولاد تھی۔ سر سرل ایشلے پچھلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے۔ قحط کے زمانے میں اس کی ماں ڈھاکے سے کلکتہ آ کر نواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازابل نے بڑے ہو کر کانپور چھاؤنی کے سارجنٹ جارج ٹیبر ڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل نسل گورا تھا اور بوجہ کثرتِ شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ مارگریٹ ازابل اپنے بچوں کو لے کر پھر کلکتہ واپس آ گئی اور اس کا خاندان کلکتے کے نچلے طبقے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں رَل مل گیا۔

میگی ٹیبر ڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے۔ وہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ٹیلی فون آپریٹر تھی اور چھٹی لے کر اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھی جو پکسی میں رہتی تھی۔ اب وہ پکسی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کلائمکس تک پہنچی ہی تھی کہ جس میں ہیرو اسپین جا کر ہیروئن کو ایک بدمعاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسٹیمر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے عرشے پر کھڑا ہوا ہیرو بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اُس نے جھک کر اپنی سینڈل کے تسمے باندھے۔ اپنے رنگین پھولدار اسکرٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں۔ آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرل اور کمال جہاز سے اتر کر کنارے پر پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جم غفیر ٹرین کی طرف بڑھا

جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہلِ ہنود کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بدحال ہندو مرد اور عورتیں۔ کمال اٹیچی کیس اٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پٹری پر چلتا رہا۔ "ان اضلاع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔" سرل نے کہا۔

"یہاں کس قدر سکون ہے۔" کمال نے دوبارہ کہا۔ "دراصل میری سائیکولوجی اتنی خراب ہوگئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پرابلم اس تکلیف دہ شدت سے مسلط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پُرسکون انداز میں اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔"

چڑھائی پر کالی اینگلو انڈین لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جارہی تھی۔ ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ پونچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر کمال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ روز شام کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام پر واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے بعد سرل ڈھاکے کی گلیاں اور کونے کھدرے سونگھتا پھرتا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بند گھوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً ٹیگور اور سیتا دیوی کے ناولوں کا حوالہ دیتا۔ پیچ در پیچ قدیم محلوں میں سے نکلتے ہوئے ارمنی ٹولہ کے چار سو سال پرانے قبرستان میں جا کر اس نے سارا دن ارمنی تاجروں کی قبروں کے کتبے پڑھنے میں گزارا۔

اسٹیٹ بنک کی عمارت کے جغادری بیل بوٹے دکھا کر اس نے کمال کو بتایا کہ یہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روز وہ دیز گھاٹ گئے جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، کھنڈر ایسی دو منزلہ کوٹھی میں بلبل اکیڈیمی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بلبل کی تصویر آویزاں تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل میں بڑے بڑے ڈھنڈار لق و دق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ زینے کی لکڑی پر بڑا انتہائی خوبصورت نقش و نگار کا کام بنا تھا۔ وہ سارے کمروں میں گھومتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے گھنگھروؤں کی آواز آئی۔ وہ دونوں اندر گئے جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاسٹر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ

سے اکھڑا ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کی گت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی طرز کے رقص میں مصروف تھیں۔ ایک بوڑھا پھونس لمبی سفید داڑھی والا بنگالی مسلمان وائلن بجا رہا تھا۔ دُبلے پتلے شری سوشل کمار میترا اچک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھانے میں مصروف تھے۔ کمال دروازے کی چوکھٹ میں مسحور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم وستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لیے تال اور سُر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے نو وارد روں پر توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ کمال دبے پاؤں وہاں سے لوٹا اور وسطی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹیکو کی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کُم کُم کے بڑے بڑے ٹیکے لگاتے دریا کے رُخ، شکستہ سیڑھیوں پر خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اوپر کی منزل میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلی تھیں اور پیتل کی گڈویاں چم چما رہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، اتھاہ اُداسی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیسا الم برس رہا تھا یا ممکن ہے وہ سب بے حد بشاش ہوں، کمال ہی کو ہر شے میں غم نظر آتا تھا۔ وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ نواب پور روڈ کی رکشاؤں، کھچڑا الیسی بسوں، گداگروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں سے گزرتے رمنا کی طرف واپس لوٹے۔

ریس کورس کی سڑک پر ڈھاکہ کلب جگمگا رہا تھا۔ آج وہاں گیسٹ نائٹ تھی۔ اعلیٰ طبقے کی موٹریں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگمات رقصاں تھیں جو کلکتے سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور جن میں سے اکثر کے بچے دارجلنگ اور شیلانگ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاؤنج میں بڑے بڑے تاجر اور مل اونر بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔

دوسرے روز وہ سرل کے ہمراہ لانچ کے ذریعے بوڑھی گنگا پر سرکاری کام سے ایک اور ضلعے کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پھر معاً اس نے مڑ کر کمال کو مخاطب کیا:

”وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟“

”ہاں۔“

”یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سر جگدیش چندر بوس(؟) ... یہاں سر برجین نائیڈو اور ریبی سی رائے وغیرہ کے بے حد خوبصورت گارڈن ہاؤس

ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال ہجرت کر گئے۔ چلتے ہو دیکھنے؟"

"میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جلنے نہیں دو گے۔"

"نہیں۔" سرل نے جواب دیا۔

"مہاراجہ وکرم سین کی مانند، جو لاش کو کندھے پر اٹھائے مرگھٹ سے آتا تھا اور لاش کا عفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لیے روزان کو ایک قصہ سناتا تھا، تم مجھے قصے سناتے ہو۔ میں نہیں سنوں گا تمہارے قصے۔" کمال نے ضد سے کہا۔

"وہ دو منزلہ کارذن ہاؤس نظر آیا تمہیں؟" سرل نے اسی طرح ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں رابندرناتھ ٹیگور رہا کرتے تھے۔"

"چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں۔" لانچ پانی پر چکر کاٹ کر نارائن گنج کی سمت مڑ گئی۔ اور کمال نے ریلنگ پر جھک کر سرل کو مخاطب کیا:

"ہم آدم جی جوٹ مل جا رہے ہیں۔" اس نے فاتحانہ انداز میں سرل سے کہا۔

"اور وہاں پہنچ کر تم منیجر کے ساتھ لنچ کھانے کے بجائے مزدوروں کی اجرت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا شروع کر دینا، مفسد کہیں کے!!" سرل نے جواب دیا۔

کمال مسکراتا رہا۔

وہ مل پہنچ گئے۔ عظیم الشان کارخانے جن میں بہاری عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے۔ بھاری بھاری مشینیں شور مچا رہی تھیں۔ کمال مبہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آ رہی تھیں۔ کسان تنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسٹیمر اور لانچ رواں تھے جن کے انگریزی نام تھے: میری اینڈرسن، اینی لاری، لیڈی فلورا، روز ماؤنٹ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔

لانچ دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی۔ آسمان کے اودے بادلوں میں سے سورج سرخ تلک کی طرح چمک رہا تھا۔ لہریں سورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلملانے لگیں۔ ہزاروں کشتیاں سطح پر حدِ نظر تک تیر رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا ناؤ کھیتی ہوئی لانچ کے قریب سے

نکل گئی۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت ور دنیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہُوا۔ کشتیوں میں چراغ جلے۔ پانی پر دیوالی منائی گئی۔ مانجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہوا اٹھی اور روشنی کی مخالف سمت میں جاتے ہوئے کشتیوں کے بادبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفنی تھا۔ بڑا گمبھیر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبا تھا۔ دُکھ کا راگ۔ موت کا راگ۔ زندگی کا راگ۔

رات کو رمنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دور ایک مندر سے ایک ویشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور کمال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کر آ رہی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی: "تالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرجتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آ جاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے، پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے؟ او گمرمے! پانی میں بوند کی طرح ڈوب جا۔ میں بھی تیری طرح اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی ہوں۔"

سرل قرونِ وسطیٰ کے بنگالی لوک گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ لیمپ کی مضمحل سی زرد روشنی برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بجلی کی چمک کے ساتھ زور کی گھٹا اٹھی اور ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

"میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔" کمال کہہ رہا تھا۔ سرل چونکا۔

"معلوم ہے۔"

"تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"ہاں۔"

ہوا کا جھکڑ تیز ہو گیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں سرسرانے لگیں۔

"اسوک کا درخت!" سرل نے گویا اسے مخاطب کیا۔ "جسے کوئی حسین لڑکی چھو لے تو اس میں فوراً پھول کھل جاتے ہیں!"

کمال نے بارش کی بھوار سے بچنے کے لیے کرسی اندر کو گھسیٹ لی۔

"کتنا کالا ہے۔" سرل نے پڑھا۔ "کوئل اس سے زیادہ کالی ہے اور سنجا کھالی ندی کا پانی اس

سے بھی زیادہ کالا ہے — پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔"

بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بجلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتا ایک پل کے لیے اس میں جگمگا اُٹھا۔

"چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجیں بیکار شور کر رہی ہیں۔" سرل نے کہا۔ "ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر لیے ہیں۔ میں اپنی کشتی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔"

"اچھا میں کہہ دوں گا۔" کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

دوسری صبح کمال نے سرل ایشلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلائنگ کلب کا طیارہ لے کر کلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو اپنی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھوا اور مطمئن ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔

ٹرین چلا کی۔ بردوان۔ آسنسول۔ پٹنہ۔ مغل سرائے۔ الٰہ آباد۔ لکھنؤ۔ ٹرین ایک اجنبی سرزمین میں چل رہی تھی۔ سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا۔ اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو۔ مسلمان — جاسوس — مسلمان جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدار — جاسوس — غدار — جاسوس — اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسبِ معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چار باغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چار باغ — لکھنؤ — لکھنؤ —

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھہرا۔ اب اسے خیابان کے کلیم کی خانہ پری کے سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔ تیسرے دن وہ لکھنؤ سے چلا۔ (یہاں اب کیا رکھا تھا۔ وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا۔ وہ بدل چکا تھا لہٰذا لکھنؤ بھی بدل گیا تھا۔) جب ٹرین مراد آباد کے قریب پہنچی تو اسے معاً یاد آیا کہ لکھنؤ میں سیتا ڈکشٹ نے اسے بتایا تھا کہ چمپا ولایت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس مراد آباد میں مقیم ہیں۔ اسی اطلاع پر کمال نے ویزا پر مراد آباد کا اضافہ کروا لیا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔ اسٹیشن سے باہر آ کر اس نے ایک

تانگہ لیا اور سیتا ڈکشٹ کا بتایا ہوا پتا دیکھنے کے لیے جیب سے نوٹ بک نکالی۔ پھر اس نے تانگے والے سے کہا: ''کٹھ گھر چلو۔''

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہسپتالوں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ایک سمت کو چلا۔ سڑک پر بیلے چل رہے تھے اور پردے دار ریڑھے اور ڈولیاں اور یکے۔ لڑکے بالے۔ برقعہ پوش عورتیں سلیپر گھسیٹتی گلیوں میں گھس رہی تھیں۔ تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید کمال کی منزل مقصود تھی۔ دروازوں کے آگے ٹوٹے پھوٹے چبوترے تھے اور مسجد کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی اونگھتی تھی۔ یہ چمپا باجی کا محلہ تھا؟

وہ تانگے سے اترا۔ سامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا پھاٹک تھا جس کے دروازے میں ایک اور چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔ اندر سیلن تھی اور بھوسے کا ڈھیر۔ دو تین کھٹیاں پڑی تھیں۔ اندر ایک اور بے حد تنگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھارھویں صدی میں بنا ہوگا۔ پھاٹک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا۔ جب کسی نے اس کو جواب نہ دیا تو وہ ہمت کر کے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر چھوٹا سا آنگن تھا جس میں چینی کے گملے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کرسی پڑی تھی اور ایک مسہری۔ ایک الماری میں خدائی فوجدار اور اودھ پنچ کی جلدیں رکھی تھیں۔ دروازوں میں ان گنت اودے، نارنجی، سبز اور سرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رخ چھجا تھا جو پھاٹک کے عین اوپر شہ نشین کی طرح نظر آتا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اس نے نیچے کی اور نظر ڈالی۔ گلی دائیں جانب کو مڑ کر محلے کے دوسرے مکانوں کی طرف چلی گئی تھی۔ ادھر ڈھلان تھی۔ اینٹوں کے فرش کی گلی بے حد صاف تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ نیچے مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی جانماز کے سامنے سجدہ گاہ کے قریب تام چینی کی رکابی میں کچھ رکھا تھا اور محلے کے تین چار لڑکے بالے ''بٹ کلیجی، بٹ کلیجی'' کہہ کر ان کو چڑا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پھیر کر جلدی سے اٹھے۔ لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگا نے کے بعد پھر جانماز پر واپس چلے گئے۔ وہ زینے پر سے اتر کر پھر گلی میں آیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس گھر کے مکین کہاں چلے گئے۔ ناقابلِ بیان سناٹا سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سرسبز ڈھلان پر قبرستان تھا۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ زندہ روحیں۔ مری ہوئی روحیں۔ یہاں کتنی نحوست تھی۔ مردوں کا شہر۔ چمپا باجی تم یہاں کہاں ہو؟ قبرستان کے سرے پر چھپر تھا اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑکی میں سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ کمال کو اپنی طرف دیکھتا پاکر اس نے جھٹ کھڑکی بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر دوسرے پھاٹک کے سامنے آیا۔ اس کی بھی وہی وضع تھی۔ رنگ برنگے

شیشوں والا شہ نشین۔ پیچھے دربان کے کھڑے ہونے کے لیے طاقچے۔ شکستہ چبوترہ۔ اس نے پھاٹک کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈیپریشن کی وجہ سے کمال کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔

"کون ہے؟" دھاری دار گبرون کا سیاہ تنگ پاجامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر سے جھانکا۔

"میں ہوں۔"

"تُمے کیا بات ہوئی۔ اے نام تو بتاؤ بھیئے۔"

"میں ہوں کمال رضا۔ پاکستان سے آیا ہوں۔"

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آکر کھڑکی کھولی۔

"آؤ — آجاؤ میاں۔" اس نے کہا:

وہ اندر آگیا۔ انگنائی میں اینٹوں کا فرش تھا۔ دیوار کے ساتھ کیاری میں کسی زمانے میں پودے رہے ہوں گے۔ اب وہ ویران پڑی تھی۔ باورچی خانے کے سامنے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ مرغیوں کے پر ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ سامنے بڑا دالان تھا۔ دالان میں تخت، اس پر چمپا بیٹھی تھی۔

"ارے ہلو — کمال — بھئی حد ہوگئی!!"

"چمپا باجی!"

"تم! گڈ گاڈ!!" وہ آہستہ سے اٹھی اور معذرت طلب انداز میں جلدی جلدی تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

"میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا۔" کمال نے کہنا شروع کیا۔

"میرے گھر والے سب بڑے چچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ وہیں چلو۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

اس نے الگنی پر سے دُلائی اُتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھا تاکہ سر سے پاؤں تک دلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگھٹ سا نکال کر کمال کے ساتھ گلی میں آگئی۔ "ہمارے یہاں برقعے کا رواج نہیں ہے۔ اب تک چادریں اور دلائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔" اس نے گویا تشریح کی۔ وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسری گلی میں مڑ گئی جو قبرستان کی ڈھلان کے برابر سے گزرتی تھی۔ یہ بھی بے حد صاف ستھری تھی۔ دیواروں میں گھاس اور پیپل کے درخت اُگ آئے تھے۔

"یہ؟" کمال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم ہی لوگ ہیں۔" چمپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔ "یہیں جیتے ہیں اور یہیں مریں گے۔" اس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

چند قدم چل کر "دیوان خانہ" آگیا۔

"چچا میاں کا مکان؟"

"ہاں۔"

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ آنگن میں بہت سے تخت بچھے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنسنا رہی تھی۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا؟" کمال نے ذرا دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں" چمپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "یہ امام باڑہ ہے۔ یہ جو تخت پڑے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور "تختوں کی مجلس" ہوا کرتی تھی۔"

اب انھوں نے پھر مٹی کی گردان شروع کر دی، کمال نے بوکھلا کر سوچا۔ "اصل مکان اندر ہے۔" چمپا نے بات جاری رکھی۔ "چلے آؤ۔ تم سے پردہ کوئی نہیں کرے گا۔"

وہ ڈیوڑھی میں سے گزرتا اندر چلا گیا۔ صحن میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک چارپائی پر کڑھا ہوا پلنگ پوش پڑا تھا۔ باورچی خانے میں سے بگھار کی تیز مہک آرہی تھی۔ دو تین غیر واضح، غیر اہم سے لوگ ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید حبس ہو گیا تھا۔ برساتی کیڑے چراغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

"چا ابا۔ یہ کمال ہیں۔" نیم تاریکی میں چمپا کی آواز آئی۔

"آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو میاں۔ بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری۔" چا ابا نے، جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لالٹین اٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی اور لپکی۔ ایک اور لڑکی دالان میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ یا اللہ! مڈل کلاس اس قدر ڈپریسنگ ہوتا ہے؟ کمال نے لرز کر سوچا۔ آنگن میں آنے والوں کی آہٹ سن کر دالان والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا۔ کمال نے جلدی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مسلمان مڈل کلاس لڑکیوں کے فرسٹریشن اور رومان پرستی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی یا وہ لڑکی جو باورچی خانے میں اس کے لیے چائے بنا رہی تھی اس کے ساتھ

وقتی رومان شروع کر دیں اور بعد میں اسے بلبے بلبے کھڑے لکھا کریں۔ محبت نامے۔
اس کی کونٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔

"یہ میری کزنز ہیں دونوں۔" چمپا اسی آواز میں پائینتی بیٹھی اسے بتا رہی تھی۔ "وہ والی زیب النساء ہیں۔ انھوں نے دلّی سے لائبریری سائنس میں ایم۔ اے۔ کیا ہے۔ چھوٹی والی مریم زمانی ہیں۔ یہ آگرہ کالج میں ایم۔ ایس سی۔ کر رہی ہیں۔ جب میں انٹر کے بعد لکھنؤ پڑھنے گئی تھی یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔ زمانہ کس قدر تیزی سے گزرتا ہے۔ تم کو چپ کیوں لگ گئی؟"

"کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔"

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہی پرانے قصّے — پاکستان۔ ہندوستان۔ ہماری تو میاں بدھیا بیٹھ گئی۔" انھوں نے کہا۔

"یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟" کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔
"ساری آبادی کہاں چلی گئی۔"

"وہیں جہاں تم چلے گئے۔" چچا میاں نے جواب دیا۔ "کھوکھرا پار کے راستے سے سب نکل لیے۔ روہیل کھنڈ خالی ہو گیا بس ہم چند بڈھے ٹھڈے باقی رہ گئے ہیں۔ دو تین سال کی بات اور ہے۔ جب ہم مر جائنگے تو یہاں ہمارے بعد گدھے لوٹیں گے۔"

کمال اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مریم زمانی نہایت بے تعلقی سے چائے بنا کر لا رہی تھی۔ اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ کمال نے ذرا اطمینان اور ذرا مایوسی سے سوچا۔

"پاکستان کے کیا حال ہیں؟" چچا ابا پوچھتے رہے۔ "سنا ہے یہاں سے دُھنیے جولاہے جاکر وہاں لکھ پتی ہو گئے۔ اپنے کو سید کہتے ہیں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھانجے نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی۔ والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اندھیر گردی مچی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے۔ تباہ اور وہاں بھی کون سے لڈو مل جائنگے۔ میرے بھانجے کا خط کل ہی آیا ہے۔ جنم سے۔ اس نے شعر لکھا ہے۔ وہ کیا شعر ہے زیبا بیٹی؟

عزت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہتی۔ بیتی۔" انھوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "مریم بسکٹ بھی تو لاؤ بھیّے کے لیے۔ کمال میاں اسی ڈیوڑھی پر چار چار ملازم موجود تھے۔ اب یہاں سارے میں الّو بول رہا ہے۔"

کمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی محبوب تیموری دل میں دہرائی

شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۱۹۴۶ء میں سٹی مسلم لیگ کے صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتالیس تک سوچتے ہوں گے کہ لشکرِ اسلام سری نگر فتح کرنے کے بعد لال قلعہ، دلی پر فتح کے پرچم لہراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریٹ کرنے کے لیے بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔ کمال کا دم گھبرانے لگا۔

"یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی۔" چمپا غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔ "محلے میں تو کب کی آ چکی ہے جہاں پھوا اماں کی کوٹھی تھی۔ وہ چلی گئیں حیدرآباد سندھ مع اپنے گھر والوں کے لہٰذا کوٹھی کسٹوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بجلی منگالی ہے۔ ہمارے مکانوں میں نہیں آسکی۔" چمپا کی آواز نیم تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

"بجلی کے لیے میاں پیسے چاہئیں۔" چاچا نے چائے کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ جگ ٹوٹنے سے سارا دودھ انگنائی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔ "اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔" انھوں نے کہا۔

"اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔" کمال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔

چمپا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

کمال نے چمپا کو آج ان کی زندگی کی ایک اور سیڑھی پر ایک اور پس منظر میں دیکھا جو ان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبرج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا۔ مراد آباد کے محلے کٹھ گھر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا۔ مڈل کلاس چمپا۔ بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقل اور دلاور حسینہ

واہ بھیا۔ تمہارا جواب نہیں۔ مانتا ہوں۔

کمال مراد آباد میں دو دن رکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آدھی رات تک وہ چھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا، جہاں چاند نے اپنی مٹیالی روشنی مکانوں کی چھتوں، مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قیلولے کے لیے اس کا کھٹولا زینے کی آخری سیڑھی پر بچھا دیا گیا جہاں رام گنگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔

"سنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔" چمپا باجی نے آکر دہلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بشاشت سے بات شروع کی۔ "تمہاری ہم وطن اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دکانوں پر یلغار کرتی ہیں۔ سنا ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی ۔۔"

"کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو۔" کمال نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹی۔ "یہ نہ بھولو چمپا باجی

کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ سال لگے۔"

چمپا زور سے ہنسی۔" طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کزنز سے گفتگو کرو۔ زیبا اور مریم۔ بڑی بھاری اسٹوڈنٹ ورکرز ہیں دونوں۔ دلّی کے سالانہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں۔ عوامی ناچ۔ موسیقی کے مقابلے۔ زیبا نے پچھلے سال کے فیسٹول میں سنگتراشی میں پہلا انعام حاصل کیا۔"

کمال کی سمجھ میں آگیا۔ اس کا خدشہ بے کار تھا۔ یہ مڈل کلاس لڑکیاں اپنے فرسٹریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح رومان پرست ہوتیں۔ یہ نئی لڑکیاں تھیں۔ چمپا عبوری دور کی لڑکی تھی اس لیے لا محالہ اُس نے تجربے کیے اور ٹھوکریں کھائیں۔

زیبا اور مریم۔ ہمت والی لڑکیاں۔ ان کے دماغوں میں کوئی الجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دیس میں ایسی لڑکیاں نہیں۔ وہاں ابھی عبوری دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

"کاش میں ۱۹۴۷ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔" چمپا نے گویا کمال کے دل کی بات پڑھ لی۔

"اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔" کمال نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا، جو اس کے سامنے چوکھٹ پر بیٹھی ہے، کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے من کی دنیاؤں کی کتنی لمبی سیاحت کی۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر میں ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پریشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات۔ مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزے کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھگھر، یہ زینہ، چمپا احمد، زیبا، مریم، چچا ابا، سب یہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہیے؟ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آگیا ہے۔ ضبط۔ توازن اور سکون۔ گریک آئیڈیلز ۔۔۔ اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرایا: "کہاں ہے تمہارا ہمزاد ہری شنکر؟"

"چمپا باجی،" اس نے ذرا غصّے سے کہا، "ہری شنکر اب میرا ہمزاد نہیں رہا۔ مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟"

"چمپا باجی" اس نے پہلو بدل کر کہا، "تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دوستوں کو خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سریواستوا کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟"

"اب تک جذباتی ہو!"

"نہیں۔" اس نے بل کھایا۔ چمپا نے اسے پھر چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔ "بتائیے چمپا باجی۔" اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "میں اس سارے انڈو پاکستان میلوڈراما سے، جو چاروں طرف کھیلا جا رہا ہے، قسم خدا کی عاجز آچکا ہوں۔ ہری شنکر آج کل شاید بنگلور میں ہے۔ اب میں کیا جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤں؟ لاحول ولاقوۃ۔"

"تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔ "تم ہری شنکر سے ملنا نہیں چاہتے کیونکہ تم کو ڈر ہے کہ واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ گے — اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے؟ یہ بھی بڑی سخت میلوڈریمٹک بات تھی۔"

"آخر انسان ملتا ملاتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔" کمال سے کوئی اور معقول جواب نہ بن پڑا۔

"اور پھر مرادآباد راستے میں ہی پڑتا تھا۔" اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹین کے چھجے پر برسنے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی خوشبو اڑ کر کمال تک پہنچی۔ ایک عورت تنگ پاجامہ پہنے، آم کی کھانچی سر پر اٹھائے، آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہلیز پر بیٹھی موکھے سے باہر دیکھتی رہی۔

بہت دیر سے کمال ایک سوال دل میں لیے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ آخر اس نے دبی زبان سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا:

"چمپا باجی! اب تم کیا کرنے والی ہو؟"

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح پوچھ سکتے ہیں!

"میں؟" اس نے جواب دیا۔ "میں بالآخر بنارس واپس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے کیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا: میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنارس لوٹتی ہوں۔ جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟"

"شیوپوری۔"

"ہاں۔ مسرت کا شہر۔ وہ بھی ایک نہ ایک دن واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا۔ سارے شہروں کی طرح۔ اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟" اُس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انھیں دیکھا۔ "رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں —— یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

"کمال!" کچھ دیر بعد اس نے کہا، "مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمھارا اپنا وطن ہے۔" اُس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں۔ "اور تم کیوں چلے گئے؟ کیا میں تمھارے یہاں آ جاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عمدہ نہ مل جائے گا! دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں۔"

ہرسنگھار میں رنگے دوپٹے اور پتمبری ساڑیاں پہنے چمپا کی رشتے دار لڑکیاں نیچے دالان میں پکوان چڑھا رہی تھیں۔ "بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ۔" چمپا نے کھڑکی میں سے سر نکال کر آواز دی۔

"اچھا بجیا۔ ابھی لیجیے۔" پھر انھوں نے ایک گیت شروع کر دیا —— جھولا کن نے ڈالو ری امریاں۔

کمال نے کھٹولے پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بچپن سے یہ گیت سنتا چلا آ رہا تھا۔ برسات آتے ہی اس کے خاندان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت الاپنا شروع کر دیتی تھیں۔

زینے پر پائنچے کی جھونک دکھلائی دی۔ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آ رہی تھی۔ سہج سہج وہ اندر آئی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگناتی ہوئی پھر نیچے اتر گئی۔

چمپا چوکھٹے پر بیٹھی رہی۔ "تم سوچ رہے ہو؟" اُس نے آہستہ سے کہا، "کہ اب میرے دوار کون آئے گا۔ لیکن کمال میں سمجھتی ہوں، جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے، میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پا لیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔"

نیچے حوض میں برکھا کی پھوار کا جھالا بج رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریالی اور تر و تازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں ننھی ننھی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ چھجوں اور پرنالوں سے پانی کے آبشار گر رہے تھے۔ نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی۔ اور چینی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں لہلہا رہے تھے۔ "یہ میرا اجل محل ہے۔" چمپا نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔"

دالان میں لڑکیوں کے دوپٹے لہرائے۔ ہلکی کاسنی، زرد اور سبز رنگ کی چنری اوڑھے ایک لڑکی نے، جو شاید مریم تھی، میرا کا گیت شروع کر دیا۔

"میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔" چمپا کہتی رہی۔ "اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی۔ میرا، کمتا بائی، سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے۔ میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سُرخ ہوتا۔ میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوتیں۔ میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا۔ مجھے وِش کے پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے۔ لیکن میں محض چمپا احمد ہوں۔ میرے زخم کسی کو نظر نہیں آسکتے کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں۔ وہ کمزور اور فانی انسان ہیں۔ چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے بھی ہوں جبکہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے۔"

ہوا کے زور سے بہت سی جامنیں ٹپ ٹپ کرتی سیڑھیوں پر آن گریں۔ چمپا نے اپنے بالوں میں سے ایک زرد پتا نکالا۔

"کمال۔" اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے؟ برسوں تک وہ کینوس پر کینوس رنگتی چلی گئی۔ دنیا کے نگارخانوں کی اس نے خاک چھانی۔ لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں اور فراک پہن کر آتیں، معزز مہمان تقریریں کرتے، تصویریں لی جاتیں، پریس کے نمائندے اس کا انٹرویو کرتے، وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کرتی، آخر میں سب چلے جاتے، اس کا ہال خالی ہو جاتا، اپنی پینٹنگز کی معیت میں وہ تنہا رہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں بیٹھتی اور گھر کی راہ لیتی ـــ تین مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔

"میں نے طرح طرح کے جینئس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی اپنی جگہ پر خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔ تم خوش کیوں ہو؟ میں ہر ایک سے پوچھتی۔ اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی بشاش ہو ـــ حد ہے۔ میں بڑا ماں کر کہتی۔ مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کو جنھوں نے دنیا کے غم میں سمو دیا تھا۔ کس قدر آسان بات تھی۔ پہاڑ کے نیچے پہنچے تو معلوم ہوا ہم خود اور ہمارا ذاتی الم کس قدر حقیر شے ہے۔

"آٹھ سال بعد تمھاری طرح میں بھی اپنے وطن واپس لوٹی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سر فخر سے اونچا اور دل مسرت سے معمور ہو گیا۔ ایسی چیزیں دیکھیں جن سے میرا سر ندامت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہو گیا۔ میرے سامنے مسائل کا بہت اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔ تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔ اس نے کانوں میں ہاتھی لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔

"اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟"

دوسرے روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔ اُس کے لیے تانگہ منگوایا گیا۔ چمپا اور مریم اور زینبا اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔ "ہم اب تک اس محلے میں زبردست پردہ کرتے ہیں ورنہ چا ابا کو خواہ مخواہ صدمہ ہوگا اس لیے ہم بوجہ پردے کے تم کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جا سکتے۔" چمپا نے ہنس کر کہا۔

کمال تانگے پر بیٹھا۔ تانگہ گلی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور کمال نے دیکھا: چمپا باجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں، ٹوٹے ہوئے مکان کی دہلیز پر۔ اسی طرح اس نے ان کو اوکسفرڈ اسٹریٹ پر چوزرے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گلفشاں کے پھاٹک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب بھیا صاحب ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں۔ اب وہ ہجوم کا حصہ تھیں۔ انھوں نے بالآخر غیر مشروط طور پر ہجوم کی دوسراہٹ قبول کرلی تھی۔ چند سال پہلے کمال سوچا کرتا تھا: وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں۔ وہ دور نکل جائے گا — نئی دنیائیں۔ نئے خواب۔ عزائم۔ آئیڈیلز۔

مگر آج، اس سمے، اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا۔ وہ اپنی دنیا کے مسلسل و مستقل مراجعت میں ہے اور تنہا ہے۔ چمپا، جواب تنہا نہیں، جلوس میں شامل ہیں، آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زینبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، ٹھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا باجی ان سب کی ساتھن بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں۔ آج نہیں، کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر سرل کے فلسفے کے سارے غیر مرئی تار جھن جھنا کر ٹوٹ گئے۔

تانگہ اب تامنی کے بازار سے گزر رہا تھا۔ دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ چائے خانوں میں ریڈیو بج رہے تھے۔ سینما گھروں کے آگے ہجوم تھا۔ مغرب کے آسمان پر ایک آدھ کنکوا اڑتا ہوا دکھلائی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر — ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا — میرا بڑا افسوسناک خاتمہ ہوا ہے۔

ٹرین شوالک کی پہاڑیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں پہنچی۔ ہردوار۔ رشی کیش۔ ہرکی پوڑی۔ دیودار کے جنگل۔ بانسوں کے جھنڈ۔ جھرنے۔ پہاڑی ندیاں۔ مندر۔ سادھو۔ چٹانیں۔ پھولوں سے لدے ہوئے درخت۔ دہرہ دون کے اسٹیشن پر اتر کر وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ کلیم اور منقولہ

اور غیر منقولہ کے کاغذات اور مکان کے قبالے نکالے گئے۔ سرکاری قسم کی گفتگو ہوئی۔ پھر اس نے ڈالن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔ اُس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

"یار ہری شنکر" کمال نے کہا۔

"ہاں یار"

"یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی قسم۔"

اس روز انھوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہی۔

"آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے۔" چلتے چلتے رُک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

"ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔" کمال نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر جذبات زدہ ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔"

"خوابستان — لاحول ولا قوۃ۔"

"مگر تم خود گلفشاں میں رہتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔"

"یار کمال۔"

"ہاں یار۔"

"ذرا سوچو لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں، یہاں سے وہاں تک، ایک سے ایک خوبصورت۔ ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں یار، بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ "وہ ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔"

"اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ معنی کے معنی۔"

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے "نسترن"، "دولت خانہ"، "شیم روک"، "آشیانہ"، "راج محل"۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوتے پہاڑی پھلوں کی مہک سارے میں اڑ رہی تھی اور یہ دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پُلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے۔ جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمبی سی کار آ کر اس کے قریب رُکی۔ وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کر اُس نے چاروں اور دیکھا۔ ہری شنکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء نہیں تھا۔ وہ ۱۹۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں ملیں۔ وہ تو اپنے ہی مکان کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کر اس کی طرف بڑھے۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں جی؟"

"میں — میں —" وہ گڑبڑا گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائنگ روم سے ریڈیو چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اُس نے دوبارہ پھاٹک میں لگی ہوئی سنگِ مرمر کی تختی پڑھی: نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا۔ وہ پُلیا پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اُس نے ثبوت کے طور پر قبالے کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کیے اور کھسیانی ہنسی ہنسا۔

"اوہ — آپ موو ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں آئے ہو۔ تشریف لاؤ جی تُسی —"

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی سڑک پر داخل ہوا۔

"آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کنجی لائے ہو آپ؟"

"جی ہاں —"

ڈرائنگ روم میں لے جا کر سردار جی نے اسے چار پلائی اور کھانا کھلانے پر مصر رہے۔ سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ دیر تک وہ اپنے وطن کی یاد میں رویا گایا کیے۔ کمال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"باکس روم کھولنے میں کل صبح آ سکتا ہوں؟"

"ضرور جی اپنا ہی گھر سمجھو۔" سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھال کر اس کی قیام گاہ تک پہنچایا۔

صبح کو وہ پھر "خیابان" پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں دو نوجوان لڑکیاں ننگے سر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ سردارنی جی نوکروں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں۔ اور بھینسوں کی سانی کروا رہی تھیں۔ اندر

ریڈیو بج رہا تھا۔ بڑا پُرسکون منظر تھا۔ وہ پہلو کے راستے سے گزرتا اسٹور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی "گم شدہ نسل" کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے خاندان والوں کی دنیا، خزاں زدہ جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پہاڑی کاٹجوں اور تیسرے پہر کی چار میں چاندی کی جھلملاتی ہوئی چار دانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پگڈنڈی گزرتی تھی اُس کے خاندان کی خواتین رنگین چھتریاں سنبھالے اس پہ چلتی ہوئی کسی پرانے ترکی یا یورپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی تھیں۔

"خیابان" میں چھ بڑے بڑے کمرے تھے جن کے چاروں اور مزید کمرے اور برآمدے اور گیلریاں۔ جاڑوں میں جب کبھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدے بچھا دیے جاتے۔ پہاڑی خانساماں فقیرا چار کی کشتی لا کر آتشدان کے سامنے رکھ دیتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسٹور روم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھریلو ماحول رہتا جس کا ذکر سرت چندر کے ناولوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں میں کمال اور طلعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں، پریوں کی کہانیاں، گڑیاں اور میکینو سیٹ۔ جب کبھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجسس اور اشتیاق سے وہ بھی اماں بیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پراسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق۔ ٹوکریاں۔ برتن۔ جھاڑ فانوس۔ بڑے بڑے لیمپ۔ پرانے رسائل۔ خطوں سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس۔ نواڑوں کے بنڈل۔ دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بجری پر ڈالے بابا بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ لیچیوں کے درختوں پر سے کہرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مالی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگین تصویر لئی سے چپکا رکھی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں بُرے کام کرتے ہیں نرک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی مریل سے بیلوں پر منوں بوجھ لادے گاڑی ہنکاتا چلا جا رہا ہے۔ برابر کی تصویر میں وہی آدمی نرک میں ایک گاڑی میں جتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندر نما فرشتے گرز مار مار کر اس کو ہانک رہے تھے۔) اور روزی جمعدارنی جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیاگیری کرتی تھی۔ جب چائے دانی کوڑے کی بالٹی میں انڈیلی جاتی تو وہ چائے کی پتیاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چائے بنا کر پیتی۔

لکھنؤ سے سارا عملہ ساتھ آتا۔ قدیر جو ہرے رنگ کی ٹوپی اوڑھے ٹھاٹھ سے بے ٹانگ کی کرسی پر لیٹے

کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھل کا درخت تھا۔ حسینی کی بی بی روز کھڑے ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنیچر پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ مونج کے فرش۔ سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے کے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگین تصویر فریم میں لگی تھی جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کا آتشدان بانات کی کارچوبی جھالر سے آراستہ تھا۔ اس پر چاندی کے فریموں میں اہلِ خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پیتل کے بول اسٹینڈز پر رکھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائنگ روم کی چلمچی میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈنرز کے موقعے پر میز خالص انگریزی اسٹائل سے سجائی جاتی۔ چھری کانٹے۔ فنگر بول جن میں گلاب کی پتیاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ باضابطہ چپکن پہنتا اور صافے پر چاندی کا بِلّا لگاتا اور کمر میں پٹکا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو کمال چپکے سے باہر نکل کر بیچیوں کے خنک جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ ایک عظیم آفاقی کاہلی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پرسکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیوداروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلاتے جاتا: میں سوتا تھا — میں سوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پرند شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اسے کبھی کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ پہاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پرجاپتی دنیا بنا رہے تھے اور سارے جانداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بانٹے جا رہے تھے (مور کو پَر ملے، کوئل کو آواز، وغیرہ۔) اس وقت یہ بلبل کہیں پڑا سو رہا تھا لہٰذا اب یہ اس کا جنم جنم کا رونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سنو تو صاف سنائی دیتا تھا: میں سوتا تھا۔

مسز داس گپتا ننگے پیر سٹر پٹر کرتی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں۔ انھوں نے زور سے پنڈری کا دروازہ بند کیا۔

کمال چونک کر ۳۵ء کے دوپہروں سے بھی واپس آگیا۔

سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے دھیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانکا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اس نے اس انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے پشتارے ابھی گلفشاں اور کلیان پور کی حویلی کے کمروں میں مقفل تھے۔ کمرے کے وسط میں تھوڑی سی خالی جگہ کا جو جزیرہ سا بن گیا تھا اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا: اس ملکیت کے لیے دُنیا مری جاتی ہے! ان سب کے بدلے میں ایک مرگ چھالا — ایک مرگ چھالا!

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دنیا تج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔

پھر اُس نے اکڑوں بیٹھ کر کاغذات کی صندوقچیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اُس نے "خط و کتابت" کا ایک ٹوٹا پھوٹا ٹیچی کیس اُٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب و غریب مہریں تھیں۔ پٹنہ ۱۹۲۳ء۔ بلاسپور ۱۹۲۸ء۔ جھالاوار ۱۹۲۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مثلاً رس بہاری لال کا خط جو ۱۹۲۴ء میں پیلی بھیت سے آیا تھا اور شکست میں لکھا تھا۔ یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے؟ اور وشوا نندن پانڈے، رانی کھیت۔ اور محمد احمد عبّاسی منصف ضلع گونڈہ۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اُس نے "خط و کتابت" کے صندوقچے واپس ایک الماری میں ٹھونس دیے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فائلیں دبی تھیں۔ مقدمات۔ زمینیں۔ مکانات۔ نان و نفقہ۔ خالہ چُنّی بیگم کا جھگڑا جب میر مرغی سے ہوا تھا اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ باتصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ جس کے اوّلین صفحے پر ہز ہائی نس دی آنریبل سر مہاراجہ ڈگبجے سنگھ بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ بلرام پور و تُلسی پور، صوبہ اودھ کی نہایت مسخر بے چین کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہوا نہایت مقفّیٰ و مسجّع عبارت کا دیباچہ تھا: "القصہ ایسی بے اتفاقی کی باتوں سے مضطر ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبانِ سفاہت شعار بغور تامّل و فکر و تامّل اندیشی لباس گیروا فقرا کا پہن کر بوریے پر بیٹھے اور رفقائے خاص بھی اسی صورت سے بنے انگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفع بدنامی سمجھ کر علی ابراہیم خاں کو نواب عالیہ کی طرف سے کہلا بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے ..."

کمال نے دوسرا صفحہ پلٹا:

"پس صاحبانِ عالی شان نے سمجھا تسخیر بلادِ ہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔ شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی لہٰذا اس زینۂ وزارت پر مستقل رہنا چاہیے پھر مدارج سلطنت پر جانا آسان ہو جاوے گا اور یکا یک کسی کے گھر میں چلے نہ جانا چاہیے اگرچہ اس میں ایک مدت گزر جائے۔ اب یہ سب حقیقتِ حال اس زمانے کی کھل گئی۔ اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔ گویا سب چراغ ہندوستان بجھ گئے۔"

"— انتقال مرزا وزیر علی خان — بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء۔ کلکتہ کے کاسی باغ میں، جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے، مدفون ہوئے۔ چند غربائے شہر وزیرِ ہند سمجھ کر ساتھ تھے۔ کچھ شہر کی کسبیاں ان کی سخاوت و بیکسی یاد کر کے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی روتی تھیں۔ صاحب نے حکم دیا گورے قنات

کے باہر کھڑے رہیں۔ تابوت پر گوروں کا پہرہ تھا۔ اوس عہد میں صاحب ریذیڈنٹ لکھنؤ جان لمسڈن صاحب۔ بنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تفضّل حسین خاں تھے۔"

"۔۔۔ مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ ایک دفعہ اپنی اولوالعزمی و طمع دنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے۔ لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ ہوئے۔ جب ناکام لکھنؤ پھرے یہیں بیگم منجلہ بی بی ہائے جرنل مارٹن سے نکاح کیا اونھیں کی پنشن میں بسر اوقات رہی۔ بعد گوری بی بی کے مرنے کے انھیں کے مکان میں رہتے تھے۔"

"جانا کرنل ڈبوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسماعیل کا لندن کو بسفارت مع ہدایا تے شاہ جم جاہ جارج چہارم ۔۔۔"

کتاب اُس نے ٹوکری میں واپس پھینک دی۔ اُس کے ہاتھ پر جو گرد لگ گئی تھی چند لمحوں تک وہ اسے افسردگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اُس نے اپنے ہاتھ نہیں پونچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے دو۔ اُس نے دل میں کہا۔ گودام سے نکلتے ہوئے اُس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فوٹو فرش پر سے اُٹھا لیا۔ اس میں بڑے ابا مرحوم ہاربھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے۔ یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپٹی کلکٹران اور وکلاء قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے دروازوں والا برآمدہ تھا۔ سکسینہ صاحب۔ رضوی صاحب۔ ٹھاکر رام نرائن صاحب۔ مسعود الحسن صاحب۔ یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ شریف۔ بھولے بھالے۔ جعلسازی غالباً ان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ رکیٹ چلانا ان کا مشغلہ نہ رہا ہوگا۔ فراڈ اور چار سو بیس سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بے وقوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے۔ مخصوص مشغلے۔ مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار۔ پکے گانے کی محفلیں۔ کیسی پُرامن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چہرہ گلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دونا دھرا ہے اور وہ ہائے توبہ کر رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی توند پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔ جھڑیوں کے میلے کا تذکرہ ہے۔ سارے ہنود تیموں کی چوٹ میں چل رہے ہیں۔ کیسا پُرسکون ان کا معاشرہ تھا۔ کمال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا؟ بے چارے بوڑھو ۔۔۔ میں تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا منہ چھپا کر دور بھاگ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ اُس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا اور تالہ لگا کر باہر آ گیا۔

دیوداروں میں پرندہ بدستور چلائے جا رہا تھا: میں سوتا تھا۔ میں سوتا تھا۔

ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا؟ کمال نے جھنجھلا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پرجا پتی تجھے کون بڑا اسکے سٹا کر دیتے۔ مگر پچھتاوے کے احساس اور توبہ تلا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز۔ کمال رضا اور سرل ایشلے اور گوتم نیلمبر؟ — جو طرح طرح کی ٹرٹر لگا رکھی ہے۔

دلی کے اسٹیشن پر چچا جی اس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمنا روڈ آیا۔

لاج برآمدے میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی: "مت جاؤ کمّن۔ نرمل سورگباشی ہوگئی۔ شنکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے۔" روتے روتے لاج دتی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ "کاہے روتی ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ "روؤ متی۔"

اس کی ٹرین شام کو امرتسر جاتی تھی مگر وہ جلد از جلد لاج دتی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چچا جی کے ساتھ نئی دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔

"ارے گوتم کو تو فون کر لو۔ وہ چندی گڑھ گیا ہوا تھا، شاید لوٹ آیا ہو۔" چچا جی نے کہا۔

کمال نے بے دلی سے ٹیلیفون ڈائرکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت سے جانے پہچانے نام صفحات پر اسے نظر آئے۔ مس صولت رحمٰن، فلمز ڈویژن۔ مس کملا جیسوال، منسٹری آف ایکسٹرنل افیرز۔

اس نے صفحے پلٹے ترولا، ہریش چند، نرائن ایم۔ جے۔ نیلمبر، گوتم — اس نے نمبر ڈائل کیا۔

"ہلو — ارے تم یہیں موجود ہو — الّو کے پٹھے —" اس نے بے حد کوشش کر کے نارمل بشاشت آواز میں بات شروع کی۔ "ابے یار — ہاں ہاں آج ہی صبح دہرہ دون سے — ہیں؟ ہاں ڈھاکہ سے آ رہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔ لکھنؤ میں؟ ہاں۔ ابی نے تم کو دعا کہلوائی ہے — ہاں — ہاں مزے میں ہیں۔ سب مزے میں ہیں الّا میرے۔ کیا کہا میں نے؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی بہت ٹھاٹھ کر رہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں؟ پوچھو — قدیر اور قمرن؟ بھئی واہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے؟ سب یاد ہے؟ تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاءاللہ۔ قدیر تو زمانہ ہوا مرزاپور واپس چلے گئے۔ موٹر کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی؟ ابے یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موٹر لیے پھرتے ہو۔ تم نہیں بکے؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ بوہنی کا وقت تھا۔

"اور پوچھو۔ کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے۔ جھینگی۔ رم دیا؟ غضب خدا کا، تم کو جھینگی اب تک

یاد ہے؟ اس غریب کا انتقال ہو گیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا۔ کیسے؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی، سانپ نے کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہو گئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ پردیش میں ٹریکٹر چلا رہا ہے۔ اس نے ابی بتا رہی تھیں ایف۔ اے۔ پاس کر لیا ہے ہاں۔ اسے اصل ترقی کہتے ہیں۔ میں گنگا دین کے کیریر کا احوال سن کر بہت خوش ہوا۔ اور باتیں کروں؟ نہیں میں تم سے مل نہیں سکتا۔ مجھے فرصت نہیں۔ نہیں، تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہوگی، اس کے بعد تم میرا انتظار کرو گے، الیس میں؟ کیا کرو گے انتظار کر کے۔ نہیں۔ میں کسٹوڈین سے ملنے جا رہا ہوں پی بلاک۔ اس کے بعد۔۔۔ اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرنا۔۔۔ اچھا۔ سو لونگ۔"

کمال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ لاج وتی دروازے میں کھڑی تھی۔ "اچھا اب میں چلا۔"

"جلدی آنا۔"

"ہاں ہاں۔"

"تمہارے ناشتے کے لیے کیا کیا بنا دوں۔"

"وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو۔" وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔ تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو۔ میرا دل اس سے تھوڑا ہی پسیج سکے گا۔ نہ میرے قدم ڈگمگائیں گے۔ میں مضبوط ہوں۔ میں بوڑھا ہوں۔ مجھ میں ضبط اور توازن اور سکون ہے۔ اس نے دل میں کہا

وہ جھنڈے والان سے نکلا۔ علی پور روڈ۔ کشمیری گیٹ۔ سینما کے بڑے بڑے اشتہار۔ لال قلعے کا میدان۔ دکانیں۔ نئے نئے بازار۔ کناٹ پلیس پہنچ کر وہ دکانوں میں رکھی ہوئی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا۔ برآمدے میں سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سریکھا کی جھلک نظر آئی۔ وہ ذرا آگے بڑھا۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تین بجنے میں بہت دیر تھی۔ سارا دن باقی پڑا تھا۔ سریکھا ہی سے چل کر مل لوں۔ اس نے کاہلی سے سوچا۔ "یہاں ڈانس اکیڈمی کا پتا بتا سکتے ہیں؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"کون سی ڈانس اکیڈمی؟ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جائیے۔ وہاں سے آپ کو شریمتی سریکھا دیوی کا پتا معلوم ہو جائے گا۔" اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا۔ اپنے جانے پہچانے کناٹ پلیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ موٹر کاروں، خوشحال، مطمئن انسانوں، مصروف کاروباریوں، عظیم الشان دکانوں کے وسط میں کھڑے ہوتے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پہلے اسے سول لائنز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

پہاڑوں کے پسینے کی دھوپ بڑی سخت تھی۔ وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر کراچی واپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کر لیا اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

"وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے؟" اس نے ڈاکٹر ہینس کریمر کو دیکھ کر مصنوعی بشاشت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پہاڑ سی دوپہر ان کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

"ہلو۔ ہلو۔ ہائی ڈیر ہوائیے۔" ڈاکٹر ہینس کریمر نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "کیا عجیب اتفاق ہے۔"

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اُس نے متانت سے کمال کے سلام کا جواب دیا اور ایک پمفلٹ سے پنکھیا جھلتی رہی۔

"بڑی شدید گرمی ہے۔" ڈاکٹر ہینس کریمر نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔ "بالکل خالص مشرقی موسم!!"

کمال بھی تکلفاً ہنسا۔

"میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلیے اگر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو۔" لڑکی نے، جس کا نام شاید کماری ارونا باجپئی تھا، کمال کو مخاطب کیا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر نرملا زندہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

"جی ہاں۔ ضرور۔" اُس نے جواب دیا۔

براڈکاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یورپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹرپتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہینس کریمر اور ان کے ساتھی اُسی دنیا کے باسی تھے جس میں کمال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع ترا اوٹ لک تھا۔ انہیں بھی چیزوں میں رمزیت نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ ادراک تھا۔ یہ بدھ جینتی کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سری نگر کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فنِ سنگتراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے انہی کی طرح دوسرے ملکی اور غیر ملکی دانشوران کے یہاں جاتے۔ یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور سبز چائے تیار کرتے اور کپل کا تذکرہ ہوتا۔ "ابھی میں راہل سنکرتائن سے ملنے الموڑے گیا تھا۔" ڈاکٹر کریمر نے کمال سے کہا۔

"خوب۔"

"مارگ میں میرا نیا مضمون ضرور پڑھنا۔"

"ضرور۔"

"تم ملک راج سے واقف ہو۔"

"جی ہاں۔"

پھر انھوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا: ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ ذاکر حسین۔ کارل کھنڈلا والا۔ کمال موٹر کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹرپتی بھون کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہینس کریمر نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا "ستیہ میو جیتے" بآوازِ بلند پڑھا۔ "سچ جیتے گا۔" انھوں نے کمال کی خاطر اس کا ترجمہ کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کرلیں پھر وہ سب کماری ارونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔ سابق وائسریگل لاج کے عظیم الشان مرمریں ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہدِ عتیق اور قرونِ وسطیٰ کے مجسموں نے کمال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسمے کے سامنے ٹھٹھک کر فرانسیسی یا جرمن میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائسرائے ہند کے تخت کی جگہ مہاتما بدھ کا شاندار قدیم مجسمہ استادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخملیں پردوں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ کمال تخت کی سیڑھیوں پر جاکر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف برٹش میوزیم کا سا ماحول طاری تھا۔

"یہ تو عارضی میوزیم ہے۔" اس کے قریب آکر کماری ارونا نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔ "ہمارا زیرِ تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے شایانِ شان ہوگا۔"

"جی۔ یقیناً۔" کمال نے جواب دیا۔ سال بھر قبل وہ خود اسی دلّی میں ٹام سے اسی لہجے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ آپ نے ہماری تازہ ترین عمارات دیکھیں؟ ریزرو بنک آف انڈیا — اور — اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اسوکا ہوٹل —" کماری ارونا نے بحیثیت ایک فرض شناس انفارمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

"جی۔" کمال نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔

"آئیے ادھر چلیں۔ آپ نے ہمارے موہن جوڈارو کی قدیم تہذیب کی "ڈانسنگ گرل" دیکھی؟"

کماری ارونا اسے سنگِ مرمر کی گیلریوں میں گھماتی پھری۔ چین ہو دارو۔ موہن جوڈارو وادیِ سوات۔ ہڑپہ ٹیکسلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جارہے ہیں۔" اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ "یہ پتھر دیکھیے۔ یہ اشوک مہیدرا تیسری صدی قبل مسیح میں دہرہ دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا۔ یہ اسی پتھر کے

مجسّمے ہیں۔ اسی پتھر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں۔" اس نے مڑ کر ہیلینس کریر سے کہا جو اس دوران میں ان کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے مجسّمے کے سامنے آئے۔ archaic وضع کا تھا۔" یہ شرادستی کی کھدائی سے اسی سال نکلا ہے۔" ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔" سُرخ مٹی کی اس مورتی کا سنہ غالباً چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔" ڈاکٹر ہیلینس کریر نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل آرکیالوجسٹوں کے انداز میں اپنے فریق سالتی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بیٹھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی۔ زندگی کی سُرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اپنی تخلیق۔ اس کی بانہیں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی۔ جسم مضبوط اور سڈول۔ خطوط اور رچم اور توازن شانت اور ودج اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج۔ ایک لرزہ خیز حُسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے: بھاری۔ منجمد۔ خوفناک۔ موسیو راول نے ایٹس کی مانند کہا۔

"فن سنگ تراشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔" ڈاکٹر کریر نے کہا۔" یہ متھرا اسکول سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت سی تھیوریز کو بدلنا پڑے گا۔"

"اس عہد کے فن کاروں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہو گا کہ خیال محض علامت کے ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے بعد اصنام پرستی کی ترویج کی۔" ارونا نے اظہار خیال کیا۔

روپ اور اروپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ کمال نے سوچا۔ اس حیرت انگیز مورتی کے پاس اس کے لیے کوئی پیغام نہیں۔

"ویدانت کے نزدیک خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔" ڈاکٹر راول نے کہا۔" بجلی کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سو پرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصوّر دشواکرمن کے تصوّر میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خود میں موجود ہے جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے۔ دشوا روپ ردیم سدیم پرتی روپ۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریے کے متعلق؟ تمہیں یہ مجسّمہ اچھا لگا یا تم متھرا کے اسٹائل کو ترجیح دو گے؟" ڈاکٹر موصوف نے مڑ کر کمال سے پوچھا۔

"بھوکشتم نا یہ ترتی بھاتی کم چت (بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی)۔ میں جمالیات اور مابعد الطبیعات کی موشگافیاں کرنے سے قاصر ہوں۔" اس کی آواز کی بے پناہ تلخی اور ادا سی نے سب کو چونکا دیا۔

"یہ کمیونسٹ ہے۔" ڈاکٹر آئیورٹ نے طے کیا۔

اس کے فرسٹریشن کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ کماری ارونا نے سوچا جو امریکہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ اور کتنا خوش شکل۔ "آپ سنسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔" اس نے توصیفاً پوچھا۔

"پڑھی تھی ایک زمانے میں۔" کمال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کسٹوڈین سے ملنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

وہ مورتی کے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مورتی کا پتھر خنک تھا۔ پتھر جو timeless کی علامت ہے۔ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ جیتے جی پچھلے کلیوں سے بہتے ہوئے آ رہے ہیں۔ وہ become اب ان کر دابوں میں پھنس گئے ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔ جبھی سے تو میں کہتا ہوں، ایک کدال لے کر ان بتوں، اس کوڑے کرکٹ کی صفائی کر دو۔ آج کل میں صفائی میں لگا ہوں۔ دماغ کی، دل کی، ذہن کی، عقل کی صفائی، اسپرنگ کلیننگ۔ اس ماضی سے میں ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا۔ پھر وہ مورتی کی طرف مڑا۔ اسی لیے، شراوستی کی سدرشن یکشنی! جو کوئی بھی تیرا بنانے والا تھا وہ اپنا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکتا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کمیونی کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ قومی عجائب خانہ مع سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے کماری ارونا کو سونپا۔

وہ وہاں سے آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلتا ہوا گیلری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں یورپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

"کاش ہم جان سکتے کہ سنگتراش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس عجیب و غریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔" ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔ "واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ لافانی ہے۔ انسان گمنام ہے۔ اس کی تخلیقات، فن پارے، تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی علیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔"

"ہاں۔" موسیو راول نے کہا۔ "انسان مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔"

"کوئی کرائسس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ کرائسس بھی وقت میں شامل ہے،

تاریخ نہیں ہے۔ ماضی، مستقبل، فنا، بقا۔ کسی شے کا وجود نہیں لہٰذا اب اس جسم کو جلا دو کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے کہا۔

"اسی لیے مشرق کے فن کار نے اپنا نام ثبت کرنے کی ضرورت کبھی نہ سمجھی۔ کاش ہم ان سنگ تراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے۔" ڈاکٹر کریر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "یہاں کتنے مائیکل اینجلو اطمینان سے ہنسی خوشی گمنام مر گئے!"

کمال گیلری سے باہر نکل آیا۔

"یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں۔" موسیو راؤل کہہ رہے تھے۔

"وسعت کو محسوس کیا جاتا ہے، وقت کو صرف سوچا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر کریر کہہ رہے تھے۔

کمال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بجری کی چوڑی سڑک پر آ گیا اور پی بلاک کی طرف روانہ ہو گیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے واپس نہیں گیا۔ وہ سیدھا لاج کے گھر پہنچا اور اس نے لاج سے کہا، "اگر میرا فون آئے تو کہہ دینا میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں۔" پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اسٹیشن جانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔

گوتم ایک گھنٹے تک ریستوران میں کمال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ ٹیلیفون کیے۔ جب کمال کی طرف سے بالکل ناامید ہو گیا تو پھر اپنے دفتر لوٹا۔ بدھ جینتی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پبلسٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی نمبر ٹو کماری ارونا باجپئی کو فون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ کماری ارونا باجپئی ڈاکٹر ہینس کریر کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں۔

لاحول ولاقوۃ! اس نے غصے سے کہا۔ کمال سے نہ مل سکنے کی وجہ سے وہ بے حد مضمحل تھا۔ اسے اس ملک پر، اپنے آپ پر، کمال پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریر اور ڈاکٹر اسٹیوارٹ اور کماری ارونا باجپئی ـــ ان سب کو کچا چبا ڈالتا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسے جلد از جلد محکمے کے جوائنٹ سیکرٹری کو پہنچانا تھا۔ وہ کار میں بیٹھ کر راشٹرپتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔

ایک مورتی کے سامنے انڈونیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریر یہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے۔ پھر اس نے بے دھیانی سے مورتی کو دیکھا۔ شراوستی کی سدرشن یکشنی۔

اس کی شکل بھلا کیسی تھی؟ اس نے دفعتاً سوچنا شروع کیا۔ پھر اس نے غصّے سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر ذرا زور سے پیر پٹخے۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں نے تو تمہیں کبھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل تو محض ہیولےٰ ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف دشواؔکرمن ہی پہچان سکتا ہے۔

مورتی، جو شراوستی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی، گردن کی ٹہنی جھکائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو چھوا۔ archaic سنگتراشی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ کلچرل پبلسٹی کے رسائل میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہیے۔ اس نے ایک مستعد اور فرض شناس پبلسٹی ایکسپرٹ کی طرح سوچا۔ پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے کمال لاج کے گھر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔

"ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھما لائیں۔" بھابھی جی نے تجویز کیا۔ "تم دن بھر گھام میں مارے مارے پھرے ہو اب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ پہاڑی پر گئے۔ حدِ نظر تک نئی بستیوں کی روشنیاں تیزی سے جگمگا رہی تھیں۔ پٹیل نگر۔ آزاد نگر۔ قرول باغ۔ رج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چل پہل تھی۔ یونیورسٹی۔ میرانڈا ہاؤس۔ سینٹ اسٹیونز۔ بے شمار نئے کالج بن گئے تھے۔ سپرو ہال میں بڑے غلام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیٹر میں ہیر رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرٹ گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔ بڑی بڑی دکانوں پر ساریاں پہنے، جوڑے باندھے سیلز گرلز باوقار انداز میں سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلا مندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اور پرسنگِ مرمر کے فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

لکشمی نرائن کی بھدی، بدذوق، خالص مڈل کلاس، بنیا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمعے کو دیکھ رہی تھیں۔ اوپر گیتا بھون میں ہارمونیم پر کیرتن ہو رہا تھا۔ چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دکانیں لیے بیٹھے تھے۔

"دلّی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔" کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی لاج خوشی سے کہہ رہی تھی۔ "کل امریکن سفیر کی بیوی روشن آرا کلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکیو کی طرح ترقی یافتہ ——— اور پرانی دلّی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔ تم تو دنیا گھوم آئے ہو، ٹھیک ہے یہ بات؟"

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔ فوّارے چل رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت گاندھی جی کی سمادھی کے سامنے بھجن گا رہی تھی۔

ٹرین کا وقت ہوگیا۔ وہ لاج اور حجاجی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جمنا کا پل۔ لال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔ سڑکیں۔ مکانات۔ وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ جا رہا ہے۔

براڈکاسٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوا نٹ راج کا عظیم الشان مجسمہ۔ جامعہ نگر۔ نظام الدین اولیاء۔ متھرا روڈ۔ سب یہیں رہ جائے گا۔ زندگی جاری رہے گی۔ ایک آدمی کے نکل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے۔ ان کے اور کمال کے پاس اب کوئی موضوع مشترک نہیں۔ اسے اب ان سے کوئی غرض نہیں۔ وہ بھی اب کمال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پریس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ لوک سبھا میں پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر ریسرچ کی جا رہی تھی۔ للت کلا مندر میں سریکھا دیوی رقصاں تھیں۔ موسیقی۔ تھیٹر۔ مووی۔ ڈاکومنٹری فلمز۔ بچوں کے تھیٹر اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ بیلے۔ یونیورسٹیوں کی ایرکنڈیشنڈ لائبریریاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان کے بلیو پرنٹ۔ بھاری انڈسٹری۔ افلاس۔ سوشلسٹ اسٹیٹ۔ نئی دلی کے انتہائی پوش ریستوران۔ امپریل دلی۔ سوشلسٹ دلی۔ ضلعوں کی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خواتین۔ سادھو اور لیلا کاری۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے قصبے اور گاؤں۔ بھودان کی تحریک۔

قدسیہ باغ، روشن آرا باغ اور بیلارڈ پر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اولڈ سول لائنز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کاشتہ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طباطبائی کی شاعری پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

نیشنل فزیکل لیباریٹریز کی عظیم الشان ایرکنڈیشنڈ گیلریوں میں سے سائنسدان لڑکیاں سُرعت کے ساتھ نکل کر امرا ماڈرن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دلی میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آرا کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سیٹھوں کی بیبیاں تاش کھیلنے میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آگئی۔ ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے اُدھر جانا۔ ایک مرتبہ گوتم نے کہا تھا جب وہ بقول طلعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالمے ادا کیا کرتا تھا۔
ہندوستان کا سارا کمبل سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت — شاید اشپنگلر نے لکھا تھا۔
اُس نے رادھا کرشنن کی کتاب اٹھائی:

"ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا: یہ ضرور کرو یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔ یہاں انسان اپنے فعل کا خود مختار ہے۔"

اُس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے اسٹیشن گزرتے رہے۔ انبالہ۔ لدھیانہ۔ امرتسر۔ دیواروں پر اردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگین شلواریں رات کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔

صبح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈنڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہلواہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔ امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سلاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

"امینہ۔ یہ میری بیٹی سکینہ ہے۔ یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔" پاکستانی سکینہ اپنی بھارتی ماں امینہ سے علیحدہ، سلاخوں کے اس پار کھڑی، سہمی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ "اس کا وی جا ٹھیک ہے نا۔" ماں پُر امید آواز سے پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

یکایک دوسرا ملک شروع ہو گیا۔ دو سردار جی گھاس پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مہاجر۔ یو۔ پی کا مسلمان۔

مہاجر — پناہ گزین — بے خانماں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ، جو اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کھمبے کے پاس ایک سردار جی کو کھیسیں نکالے، بندوق تانے کھڑے دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر، جو پولیس کا افسر تھا اور امرتسر سے واپس جا رہا تھا، اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔

کمال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس افسر کہہ رہا ہے: تم اب تک دو متضاد وفاداریوں کے دو راہے پر کھڑے ہو۔ لعنت ہو تم پر۔

اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو۔ ہندوستانی جاسوس۔

ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے۔ جاسوس۔ غدار۔ جاسوس غدار۔
اُس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین آہستہ آہستہ لاہور اسٹیشن کے کسٹم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔
اب اس کی نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا فلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کرانا تھی۔ کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ اس نے خود سے سوال کیا۔ خراب، انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس مسئلے پر بھی سوچنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایر ہوسٹس سے پھر کافی منگوائی اور ڈان اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔
کابینہ میں کرائسس۔ وزیر اعظم کا استعفیٰ۔ نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک میں ملت سے خطاب۔
اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل تیزی سے پھیلنے لگے۔ کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔
اُس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔
میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی نوحہ گر۔ اُس نے دل میں کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

(١٠١)

پکی سڑک پر لدا ہوا بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن دھواں چھوڑتی، دھول اُڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے بیل کی دُم مروڑ کر موٹر والوں کو ڈانٹا ”دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹریا۔ ابھی جو ہمرا بیل چمک جایت۔“ امریکن اخبار نویس نے فوراً کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز راج واڑے نے منڈیا نکال کر جھانکا اور پھر لیڈی کملیش ورما سے باتوں میں لگ گئیں۔ شراوستی ابھی بہت دور تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی اسٹیشن

ڈگی میں بیٹھے ہوئے کماری ارونا باجپئی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اُس نے فوراً پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابوں کا بنڈل ان کی ناک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لیے نٹنگ میں جٹ گئی۔ تیسری موٹر میں لنکا اور جاپان کے چند بھکشو لدے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فلمز ڈویژن کا کیمرہ مین تھا۔ دو تین کسان لڑکیاں منڈیر پر کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں پھر ارہر کے کھیت میں کود کر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ٹریکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موٹر میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا۔ پچھلی سیٹ پر زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز گوتم نیلمبر نے، جو اب تک موٹر چلا رہا تھا، مڑ کر کماری ارونا باجپئی سے کہا "اگر وہیل تم لے لو تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔"

"کیا بہت بور ہو گئے؟" کماری ارونا نے پوچھا۔ اُسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔

"ہاں۔ میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا۔ شارٹ کٹ ہے۔ ذرا جا کر نہا دھو کر آرام کروں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موسیو راول اگر آپ اجازت دیں —" اس نے فرنچ مصنف کو مخاطب کیا۔

اُس نے موٹر روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موٹریں ایک ایک کر کے دھول اُڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اُس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کو سونگھا اور ارہر کا ایک ڈنٹھل توڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اُس نے پھوار سے بچنے کے لیے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتّوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حدِّ نظر تک کھیت لہلہا رہے تھے۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اَٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرّد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اشوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور کمٹے کمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ

آرسی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھا رہے تھے۔

بہرائچ کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول لائنز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کر وہ اپنے باپ کی زرد رنگ کی دو منزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سر دیپ نرائن لان پر ٹہل رہے تھے۔

"ہلو بیٹے۔" انھوں نے کہا۔ "میں سمجھا تھا تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے سمت سمت چلے گئے۔"

"جی نہیں بابا۔" اس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ "پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کانفرنسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں۔"

"تمھاری ڈاکٹر باجپئی تو بڑی قابل لڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوپ دے رہی ہوگی۔"

"جی۔"

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

"دمینتی بُوا کہاں ہیں؟" اس نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے آواز دی۔

"شہر میں۔ ان کے پاس بھی ہو آنا۔"

"جی اچھا۔"

"تم اچھی طرح ہو بیٹے؟"

"جی ہاں۔ چمن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟"

"اگلے پھاگن میں۔" ماں نے جواب دیا۔

"پرکاش چاچا کی کوٹھی بن گئی؟"

"نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسین، نہیں تھے، ریٹائرڈ جج۔ وہ پاکستان چلے گئے۔ ان کی کوٹھی نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پرکاش نے لے لی۔ بہت سستی مل گئی۔"

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دو چار اور گھریلو باتیں لیڈی دیپ نرائن سے اس نے کیں۔ پاکستان کے نام پر اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلائے رکھتا تھا حالانکہ ابھی اسے شراوستی کے ان مغربی زائرین کو کشمیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہوگا۔

اس کا دم بے طور گھبرانے لگا۔ اس پر وہی دہشت طاری ہو گئی جس نے چند روز قبل اسے نئی

دتی میں آن دبو چا تھا۔

"میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔" اس نے اپنی ماں سے کہا۔

"ابھی تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آ رہے ہو، اب پھر چل دیے۔ لیٹ کر آرام کرو۔" ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا، کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور — نروان — جو زندگی سے، موت سے، سونے جاگنے، محبت، رحم اور لاتعلقی سے ماورا ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت — صفر — صفر —

کیا یہ غیر ملکی منکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے، ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟ اس نے سگریٹ سلگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے، یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا گویا جنگل سے اس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا بڑھا تھا۔

دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"تم کون ہو بھائی؟" نیچے سے کسی نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈیر کود کر اندر آ گیا۔

"یہ کیا وحشت ہے؟ میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے اماں ابا نے بتلایا کہ تم دریا پر براج رہے ہو۔"

"ہاں یار۔ اس وقت غیر معمولی حبس طاری ہے۔ ایک پتا تک نہیں ہل رہا۔ تمہارا دن کیسا بیتا؟"

"بور ہو گئے میاں۔" ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بُدھا جینتی کچھ دن اور اسی طرح چالو رہی تو استعفٰے مرا با حسرت و یاس۔ دیکھو اسی چکر میں مَیں لکھنؤ نہ جا سکا۔ بنگلور سے جب۔ ایس کا تار ملتے ہی پہنچا دتی اور اب یہ یاتری لوگ، اور نا باجیئی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے

کپل وستو اور گیا جانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ راستے بھر ڈاکٹر ہینس کریمر نے مجھے نہایانا اور ژین کے فرق پر وہ وہ لیکچر دیے ہیں کہ پٹرا ہو گیا میرا۔ تمہاری موٹر میں تو صرف موسیو راول ہی تھے۔"

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

"یار گوتم۔"

"ہاں۔"

"یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔" ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔"

"تم کو پتا ہے سالا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آکر وہیں مل لیتا۔"

"میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔" گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"جانے اس وقت وہ کہاں ہو گا؟" ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

"کراچی میں ہو گا اور کہاں ہو گا۔" گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابو المنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی رواں رہی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پھینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی پروجیکٹ کے سنٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹول کے لیے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آ رہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں نوٹنکی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آلہا اودل گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لائنز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یورپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک الٹی ہوئی ناؤ پر پیر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا

چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اُس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو دیکھا، بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی! وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اُس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اُس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھُوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا، زمین، تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور ربیگی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاؤ اوجَو کی بالیو تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو۔ جَو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو۔ وہ سب امر ہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اُتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلاتے تھے۔ بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آ گئیں۔

منڈلی نے گایا:

بنجر آج ہرے رے

کھیتن میں ناج بھرے رے

بجوں آج پھل رے

اچھی وصان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں:

ڈالوں کے بیچ بیچ پتیوں کے بیچ بیچ

موتیوں کی نالمن کی لڑیاں اگائے ہو۔
اوندیرے آئے ہو۔

وہ غور سے سنا کیا جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔

چٹانیں، اوالانش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ۔ ان سب میں سے گزرتا، نہر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہارا شکست خوردہ۔ بشاش۔ پُر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو
قانون کا پرچار مبارک ہو
سنگھ میں امن مبارک ہو
ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو
جنہیں شانتی میسر آگئی ہے
شاکیہ منی نے کہا۔

وہ منڈیر پر سے اترا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔

گورنمنٹ
اردو لائبریری
پٹنہ ۔ ۴
۱۹۳۸

ماری پور، کراچی
اگست ۵۶ء ۔۔۔ دسمبر ۵۷ء

ہماری مطبوعات

ناول اور افسانے

آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
گردشِ رنگ چمن	قرۃ العین حیدر
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر
آخری آدمی	انتظار حسین
سیاہ کاغذ کی دھجیاں	عبد الصمد
بچ کے سوا	جیلانی بانو
انقلاب کا ایک دن	زاہدہ زیدی
خالد بن ولید	قاضی عبد الستار
آئینۂ ایام	قاضی عبد الستار
خواب رو	جوگندر پال
کینچلی	غضنفر
موج ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی
میری شناخت تم ہو	کشمیری لال ذاکر
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر
اس صدی کا آخری گرہن	کشمیری لال ذاکر
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی
نمرتا	صلاح الدین پرویز
سنہری بت جھڑ	نثار راہی
راکھل	نثار راہی
اے پرندو کیا تمہیں یاد ہے	جمشید مرزا
دیکھیں پاپا!	جمشید مرزا
دو کشتیوں میں سوار	خالد سہیل
فسانہ کہیں جسے	عاشور کاظمی
یروشلم یروشلم	قیصر تمکین
انداز	م۔ع۔ غم
جیت	م۔ع۔ غم
پانچ اسٹیج ڈرامے	انیس اعظمی
تعاقب	سیدہ نسیم چشتی
ناروے کے افسانے	ہرچرن چاولہ
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	یوگیش کمار
بے نام قاتل	یوگیش کمار
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر مہدی رضوی
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری
بازگوئی	سریندر پرکاش

شاعری

دیوان غالب	اسد اللہ خاں غالب
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز
بھی رنگ کے ساون	صلاح الدین پرویز
آتما کے پتر پرماتما کے نام	صلاح الدین پرویز
مہر دو نیم	افتخار عارف
صراطِ منزل	عاشور کاظمی
خوشبو	پروین شاکر
صد برگ	پروین شاکر
انکار	پروین شاکر
خود کلامی	پروین شاکر
کفِ آئینہ	پروین شاکر
ماہِ تمام (کلیات)	پروین شاکر
شام بے سحر	سیدہ نسیم چشتی
درد کی آنچ	ثریا رحمن
بے نشان	شاہین
جب زمینوں سے شجر اُگتے ہیں	علی ظہیر
تازہ ہوا	باقر نقوی
پیمانۂ دل	مظفر شکوہ

Educational Publishing House

3108-Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit,
Lal Kuan, Delhi-110006 (India)
Ph:352,6162 7774965

81-85360-65-0